چونکا دینے والی خوفناک کہانیوں کا انتخاب

ماہنامہ

ڈر ڈائجسٹ

کراچی

قیمت -/90 روپے

Nov. 2018



چونکا دینے والی خوفناک کہانیوں کا انتخاب

ماہنامہ ڈر ڈائجسٹ کراچی

جلد نمبر 20 شمارہ نمبر 2 نومبر 2018ء

منیجنگ ایڈیٹر خالد علی

چیف ایڈیٹر آصف حسن

ایڈیٹر شاہد علی

سب ایڈیٹر محمد ذیشان

ای میل ایڈریس: Dardigest01@gmail.com

قیمت -/90 روپے

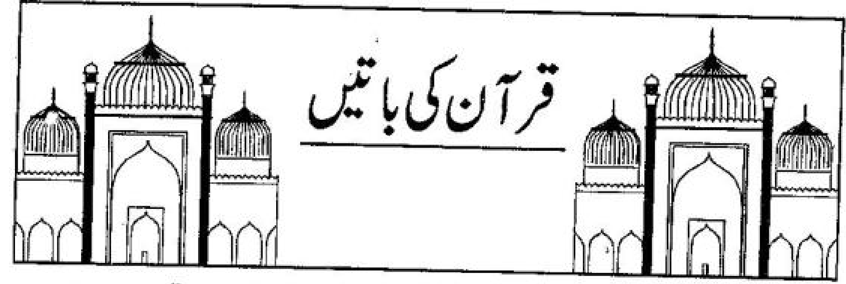
سالانہ قیمت -/1500 روپے





ایڈیٹر و پبلشر آصف علی نے سٹی پریس تالپور روڈ کراچی سے چھپوا کر شائع کیا۔

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ ڈر ڈائجسٹ نورانی آرکیڈ نیو اردو بازار کراچی: 32744391



قرآن کی باتیں

☆ لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہاری قومیں اور قبیلے بنائے تاکہ ایک دوسرے کو شناخت کرو۔ اور اللہ کے نزدیک تم میں زیادہ عزت والا وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے بے شک اللہ سب کچھ جاننے والا اور سب سے خبردار ہے۔ (سورۃ حجرات 49 آیت 13)

☆ اور کہہ دو کہ حق آ گیا اور باطل نابود ہوگیا بے شک باطل نابود ہونے والا ہے۔ (سورۃ بنی اسرائیل 17 آیت 81)

☆ اور جن لوگوں نے باطل کو مانا اور اللہ سے انکار کیا وہی نقصان اٹھانے والے ہیں۔ (سورۃ عنکبوت 29 آیت 52)

☆ اور تم سے حیض کے بارے میں دریافت کرتے ہیں کہہ دو وہ تو نجاست ہے سو ایام حیض میں عورتوں سے کنارہ کش رہو۔ اور جب تک پاک نہ ہو جائیں ان سے مقاربت نہ کرو۔ ہاں جب پاک ہو جائیں تو جس طریق سے اللہ نے تمہیں ارشاد فرمایا ہے ان کے پاس جاؤ کچھ شک نہیں کہ اللہ توبہ کرنے والوں اور پاک صاف رہنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ (سورۃ بقرہ 2 آیت 222)

☆ اور ہم نے آسمان اور زمین کو اور جو مخلوقات ان دنوں کے درمیان ہے اس کو لہو و لعب کے لئے پیدا نہیں کیا۔ (سورۃ انبیاء 21 آیت 16)

☆ ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان دونوں میں ہے مبنی برحکمت اور ایک وقت مقرر تک کے لئے پیدا کیا ہے۔ (سورۃ احقاف 46 آیت 3)

☆ اللہ تکبر کرنے والے بڑائی مارنے والے کو دوست نہیں رکھتا۔ (سورۃ نساء 4 آیت 36)

☆ سو دوزخ کے دروازوں میں داخل ہو جاؤ ہمیشہ اس میں رہو گے اب تکبر کرنے والوں کا برا ٹھکانہ ہے۔ (سورۃ نحل 16 آیت 29)

☆ کچھ شک نہیں کہ اللہ توبہ کرنے والوں اور پاک صاف رہنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ (سورۃ بقرہ 2 آیت 222)

☆ پھر جن لوگوں نے جہالت سے برا کام کیا۔ پھر اسکے بعد توبہ کی اور نیکوکار ہو گئے تو تمہارا رب ان کو توبہ کرنے اور نیکوکار ہو جانے کے بعد بخشنے والا اور ان پر رحمت کرنے والا ہے۔ (سورۃ نحل 16 آیت 119)

☆ اور جو لوگ بن دیکھے اپنے رب سے ڈرتے ہیں، ان کے لئے بخشش اور اجر عظیم ہے۔ (سورۃ ملک 67 آیت 12)

(کتاب کا نام "قرآن مجید کے روشن موتی" بشکریہ شمع بک ایجنسی کراچی)

خطوط

مسز زینت خان، رواٹ سے، محترم ایڈیٹر صاحب، اُمید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔ پچھلے دو ماہ سے کچھ ایسے حالات میں گھری رہی ہوں کہ نہ تو ڈر کو دیکھنے کا موقع ملا اور نہ ہی اتنا وقت ملا کہ کوئی اور سرگرمی کی خبر و فکر کرتی۔ زندگی کچھ ایسی معروفیات کا نام بن کر رہ گئی جو میرے اور میرے اہل خانہ کے لئے ناگزیر تھیں۔ بہرحال، یہ سب زندگی کا ایک حصہ ہے۔ اس مرتبہ ڈر 29 ستمبر کو ملا اور چونکہ کہانیاں زیادہ تھیں اس لئے پورا ہفتہ لگا کر ڈر کو پڑھا اور تمام تر ڈائجسٹ کو مطالعہ کرنے کے بعد یہ چند سطور زیر تحریر ہیں۔ ڈر ڈائجسٹ کا سالنامہ شائع ہوا لیکن ایس حبیب خان، فلک زاہد صاحبہ، شکیل نیازی اور احسان الحق صاحب کو نظرانداز کیا گیا۔ دیکھئے! ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ یہ حضرات کہانی بروقت نہیں لکھ سکے تو کیوں نہ لکھ سکے؟ دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ لکھنا نہیں چاہتے تو کیوں نہیں لکھنا چاہتے؟ اور تجویز یہ ہے کہ 26 کہانیاں شائع کرنا کوئی کمال نہیں ہے۔ بہترین 26 کہانیاں ایک سالگرہ نمبر میں پیش کر دینا ایک کمال بھی ہے اور اس ڈر ڈائجسٹ کا حق بھی۔ اب مشورہ یہ ہے کہ آپ آئندہ ایڈوانس میں ان رائٹرز کی سالگرہ نمبر کے لئے کہانیاں جمع خاطر رکھیں۔ اور انہیں بتا دیں کہ آپ کی کہانی سالگرہ نمبر کے لئے محفوظ ہے۔ یہ رائٹرز ہوں گے، احسان الحق صاحب، ایس حبیب خان صاحبہ، فلک زاہد، شکیل نیازی، عمران قریشی، ایس امتیاز، شہزادہ چاندزیب عباسی صاحب، ناصر محمود فرہاد صاحب، محمد شعیب، گلاب خان سولنگی، مہر پرویز دولو صاحب، شہزاد خان۔ آپ ایڈیٹر ہیں، آپ زیادہ جانتے ہیں کہ سالگرہ نمبر ایک خاص شمارہ ہوتا ہے اور اس میں خاص لوگوں کو سب سے پہلے جگہ دی جاتی ہے تاکہ شمارے کا معیار واضح کیا جائے۔ نہ صرف عوام الناس کے سامنے بلکہ دیگر لکھنے والوں کے لئے بھی کہ لکھنا ہے تو کم از کم ان رائٹرز کے لکھے ہوئے فن سے سیکھ کر لکھ سکیں۔ مجھے اُمید ہے کہ 2019 اکتوبر کا شمارہ نمایاں خصوصیات کا حامل شمارہ ہوگا۔ اب ہر بات پر ALL IS WELL کی چھاپ نہیں لگائی جا سکتی۔ سب اچھا ہے! کی بنیادوں پر اچھے خاصے ملک تباہ ہو جاتے ہیں تو یہ تو پھر ایک کاغذی ڈائجسٹ ہے۔ سرورق پر خصوصی محنت درکار ہے۔ خیر! اب تو ملک کے بڑے ڈائجسٹ بھی ایک تھرڈ کلاس سرورق بنا کر پیش کر رہے ہیں۔ ان کے مدمقابل ڈر کا سرورق پھر بھی قابل قبول دکھائی دیتا ہے۔ نیک تمنائیں!

☆☆ زینت صاحبہ: آپ کا خط پڑھ کر دلی سکون ملا، کیونکہ آپ ہر خط میں حقیقت پر مبنی باتیں کرتی ہیں، اور خوب سے خوب کے لئے مشورہ دیتی ہیں، یہ حقیقت ہے کہ سالگرہ نمبر پورے سال کا نچوڑ ہوتا ہے اور ہر دل عزیز رائٹروں کو خاص کر جگہ دی جاتی ہے، اور ساتھ ہی ساتھ نئے رائٹر بھی نمایاں نظر آتے ہیں۔ آپ کی بات حقیقت پر مبنی ہے اور جن رائٹروں کی آپ نے نشاندہی کی ہے کہ انہوں نے سالگرہ نمبر میں کہانی کیوں نہ لکھ سکے، تو ان رائٹر حضرات نے اپنی معروفیات کا ذکر کیا تھا، اور ہم ان کے حق میں دعائے خیر کرتے رہ گئے، اور آئندہ آپ کے مشورے پر عمل ہوگا کہ ان رائٹر حضرات کی کہانی سالگرہ نمبر کے لئے رکھ دی جائے اور امید ہے کہ رائٹر حضرات بھی اس مشورے سے خوش ہوں گے۔ خیر ہماری اور قارئین کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اور تمام اہل خانہ پر اپنا فضل و کرم کرے اور خوشیوں سے نوازے۔ (آمین)

بلقیس خان پشاور سے، السلام علیکم! ماہ اکتوبر کا ڈر بہت جلد مل گیا، ٹائٹل بہت جاندار اور شاندار تھا۔ سب سے پہلے قرآن کی باتیں پڑھی ہمیشہ کی طرح سب سے زیادہ خوشی ملی۔ اپنی بات میں خالد صاحب سے ملاقات ہوگئی، بہت اچھا لگا۔ اللہ ڈر کو کبھی بند نہ کرے، اور ادارے کو ہمت اور طاقت دے، تاکہ ڈر بروقت ہمیں ملتا رہے۔ خطوط سب اچھے تھے۔ ماہ روش کو سلام، عثمان غنی کا خط بہت شاندار تھا۔ آپ کو جرم محبت کی کامیابی بہت بہت مبارک ہو، جبکہ اس ماہ ایس حبیب خان کی کہانی کی کمی محسوس کی۔ اس کے علاوہ بہت سے نئے نام نظر آئے۔ اچھی بات ہے، کہانیوں میں پہلی کہانی، پراسرار لڑکی نے، عمران قریشی، کو بہترین رائیٹر ثابت کیا۔ اس ماہ کی سب سے بہترین کہانی عثمان غنی کی بدصورت رہی۔ اس کہانی میں تسلسل تھا۔ اس کا اینڈنگ ڈرانے والا تھا، یہ ڈر ڈائجسٹ کی ایک بہترین انگلش تحریر تھی۔ جس نے عثمان غنی کی کامیابی میں اہم کردار ادا کیا۔ نینا خان کی عبرت ناک نے بھی بے حد متاثر کیا۔ باقی کچھ کہانیاں یا تو شائع شدہ تھیں، یا پھر مجھے ایسی لگیں۔ ایڈیٹر صاحب آپ شائع شدہ کہانیاں کیوں شائع کرتے ہیں۔ جبکہ برفانی چڑیل

متاثر نہیں کر سکی۔ عفریت کی یہ قسط متاثر نہیں کر سکی، آدم خور ایک بہترین کہانی رہی۔ اس کے علاوہ قسط وار تحریروں میں صرف اور صرف جان لیوا اپنی نام کی طرح بہترین ہے، موم کی گڑیا ایک گزارہ لائق تحریر ہے۔ اس پورے شمارے میں نمبر ون کہانی بدصورت تھی۔ یہ بلا شبہ ایک سپرہٹ تحریر تھی۔ اس کے بعد عمران قریشی کی پراسرار لڑکی نمبر ٹو کہانی رہی، ؟ تیسری نمبر آدم خور نے یہ پوزیشن حاصل کر لی۔ ڈر کا سالگرہ سب رائیٹرز کو میری طرف سے دل کی گہرائیوں سے مبارک ہو۔ ڈر کے لئے دعا گو۔

☆☆ بلقیس صاحبہ: یہ خوشی کی بات ہے کہ آج کل عثمان غنی دل لگا کر انتھک محنت کر رہے ہیں اور امید ہے اسی طرح محنت کرتے رہیں گے، آپ کو سالگرہ نمبر پسند آیا اس کے لئے شکریہ، رائٹر حضرات اب زیادہ محنت کر رہے ہیں، اب اتنی کہانیوں میں ایک آدھ ایسی ہوتی ہیں، جو کہ ہر کسی کو پسند نہیں آتی، خیر آئندہ ماہ بھی نوازش نامہ کا شدت سے انتظار رہے گا۔

مہرینہ غلام علی بدین سے، السلام علیکم! امید واثق ہے کہ ادارہ بخیر و خیریت ہوگا، ڈر کا نیا شمارہ کافی لیٹ ملا۔ پتہ نہیں کیوں اس بار ایسا ہوا، اپنی بات میں خالد علی صاحب نے سوچنے پر مجبور کر دیا کہ یعنی اس بار ڈالر کی مہنگائی کی وجہ سے ڈائجسٹ کا کاغذ بھی تو مہنگا نہیں ہو گیا۔ اور آپ ایک بار پھر پرچے کی قیمت بڑھا رہے ہیں۔ بڑھا نہیں رہے بلکہ بڑھا دی، خیر ماہ روش جہاں آپ زندگی سے حیران ہیں، وہاں ہم سب پریشان ہیں اور اسی کا نام زندگی ہے۔ ایس حبیب خان اور، فرح انیس آپ کو سلام، عثمان غنی، آپ تیزی سے اپنی بہترین کہانیوں کی وجہ سے سب کے فیوریٹ بن رہے ہیں،، عمران قریشی کی پراسرار لڑکی نے کمال کر دیا۔ مہر پرویز احمد آپکی باتیں ٹھیک ہیں مگر رلانے والی ہیں۔۔ میں آپ کی باتوں سے اتفاق کرتی ہوں۔ ماہ اکتوبر کے شمارے میں جو تحریر سب پر بھاری پڑ گئی، عثمان غنی، آپ نے بہت پیاری تحریر لکھی۔ نینا خان کی عبرت ناک بھی اچھے موضوع پر لکھی گئی پیاری تحریر تھی۔ آدم خور بھی پسندیدگی کی سند لینے میں کامیاب ٹھہری۔ اس شمارے میں نئی کہانیاں کافی اچھی تھیں۔ باقی پڑھی نہیں ورنہ اور زیادہ اپنی رائے پیش کرتی۔ میری دلی خواہش ہے کہ ڈر مزید ترقی کرے۔

☆☆ مہرینہ صاحبہ: ڈر ڈائجسٹ میں موسٹ ویلکم، آپ کا خط پڑھ کر اچھا لگا، اور کہانیوں کی تعریف کے لئے بہت بہت شکریہ، حالات کی ستم ظریفی کہ وطن عزیز میں ہر چیز کی قیمت آگے ہی آگے بڑھتی جا رہی ہے، اور سونے پر سہاگہ یہ کہ IMF والوں کا حکم کہ تمام ضروریات زندگی کی ہر چیز مہنگی کر دیں ورنہ...... ابھی آگے ہم لوگوں نے بہت کچھ برداشت کرنا ہے جس کا ہم پر بوجھ پڑنا ہے، ہم سب مل کر دعا کریں کہ اے اللہ ہم عوام پر رحم و کرم کر اور ہمیں سکھ کا سانس لینا نصیب ہو۔

مسز سندس اقبال، راولپنڈی سے، السلام علیکم ایڈیٹر صاحب، ڈر کا سالگرہ نمبر اس وقت ہاتھوں میں ہے اور میں نے ابھی تک اپنے من پسند رائٹرز کی تحریریں پڑھیں ہیں جن میں عمران قریشی اور راشد نذیر طاہر صاحب سرفہرست ہیں۔ بہت خوب لکھتے ہیں، قاری کے ذہن سے کھیلنا ہی رائٹر کی اصل پہچان ہے۔ جب ایک خوفناک و ڈراؤنے ڈائجسٹ میں لکھا جائے تو اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا ہے کہ کہانی پڑھ کر خوف آئے اور ڈر کا احساس دلوں میں اُبھرے۔ ایسے موضوعات جو بار بار دہرائے جا چکے ہیں ان سے اجتناب کیا جانا چاہئے اور کچھ نیا پن بھی ہونا چاہئے۔ بس یہی ایک گزارش ہے اگر قبول ہو جائے اور رائٹرز حضرات سمجھ پائیں، جزاک اللہ۔ سالگرہ نمبر کے صفحات 258 ہی تھے۔ عام ڈائجسٹ 242 صفحات کا ہو چکا ہے۔ کیا واقعی ڈائجسٹ ترقی کر رہا ہے؟ یا نیا پاکستان کی طرح یہ نیا ڈائجسٹ آ رہا ہے؟ اہل علم و دانش تو آج بھی یہ کہتے ہیں کہ پاکستان میں ہر حکومت تبدیلی لاتی رہی ہے اور لاتی رہے گی۔ کیونکہ ہم ابھی بھی ایک سوچ پر متفق نہیں۔ والسلام۔

☆☆ سندس صاحبہ: آپ کی باتیں مثبت ہیں اور دل کو لگتی ہیں کہ 71 سال گزرنے کے بعد بھی ہم تمام لوگ ایک سوچ پر متفق نہیں اور یہی وجہ ہے کہ ہم بدحالی اور پریشانیوں سے دوچار ہیں اور ویسے بھی جب بھی کوئی نئی پارٹی میدان میں آتی ہے تو اپنا ایک نیا نعرہ سے لوگوں کو اپنا گرویدہ کرتی ہے۔ اب نیا پاکستان کیا بنے گا...... پاکستان تو بننا تھا بن گیا، اب صرف ہم نے اپنی سوچ کو بدلنا ہے جس سے ہم ترقی کریں اور ہمارا وطن خوشیوں کا گہوارہ بن جائے۔ خیر امید ہے کہ آئندہ ماہ بھی خط لکھنا نہ بھولیں گی۔ Thanks۔

بینا خان اسلام آباد سے، دل نے ایک بار پھر مجبور کر دیا، کہ ڈر کو پڑھوں، اس ماہ کا ڈر بہت جلد مل گیا، مگر ایک تو سالگرہ نمبر کی خوشیاں اور اوپر سے اس حسین موقع پر ڈر کا ساتھ بہت خوبصورت دن تھے۔ اس بار، اپنی بات میں آپ نے لکھا کہ ڈر بھی مہنگا ہو گیا ہے، مہنگائی کے پیش نظر یہ بات تو بالکل ٹھیک کہی آپ نے، ڈر کو ہم بہت زیادہ چاہتے ہیں۔ جہاں سب سے آدھی ملاقات تو ہو جاتی

ہے۔ اس لیے ایک احساس ہوتا ہے، اور اس احساس کا نام خوشی ہے، خطوط میں اس بار سب خطوط بہت اچھے تھے۔ عثمان غنی نے جامع خط لکھتے ہیں، بہت اچھا لگا، مسز خائیستہ رحمان اور نینا خان کے خط نے ایمپریس کیا۔ اس ماہ کچھ زیادہ تو ڈر نہیں پڑھا، مگر جتنا پڑھا اس پر تبصرہ کر دوں، پہلی کہانی بہتر تھی، کہانی میں عموماً پراسرار لڑکی کی جیت ہوئی۔ بدصورت مجھے اس ماہ کی سب سے بہترین کہانی لگی، اس کہانی کی تعریف نہ کرنا اس کے لکھنے والے کیساتھ زیادتی ہوگی۔ کیونکہ اس کہانی میں روانی تھی، اور انتقام کا جذبہ تھا۔ بہت اعلیٰ کہانی تھی۔ اتنی اچھی کہانی پر مبارک باد قبول کریں۔ آدم خور بھی معلوماتی تحریر تھی عبرت ناک کہانی کو نینا خان نے بہت اچھا بنایا۔ باقی کہانیوں میں جان لیوا بس ڈر کے عین مطابق ہے، عفریت نہیں پڑھی۔ اس ماہ کے لئے بس اتنا ہی۔ ڈر کے لئے دعا گو۔

☆☆ بینا صاحبہ: یہ خوشی کی بات ہے کہ آپ نے بڑھتی ہوئی مہنگائی کو محسوس کیا، خط لکھنا اور دل کی گہرائی سے کہانیوں کو پسند کیا، اس کے لئے شکریہ، آپ کا ڈر سے والہانہ لگاؤ قابل دید ہے۔ اس کے لئے اور آئندہ ماہ بھی خط لکھنے کے لئے ڈھیروں شکریہ قبول کریں۔

کائنات بلوچ بلوچستان سے، السلام علیکم! ڈر ڈائجسٹ ماہ اکتوبر کا مل گیا، دل خوشی سے جیسے پاگل ہو گیا۔ کیونکہ سالگرہ نمبر جو تھا، سب سے پہلے قرآن کی باتیں پڑھی کافی دل کو سکون ملا۔ پھر خطوط کی محفل میں گئے۔ تو اپنی بات میں خالد علی صاحب ہم سے مخاطب ہوئے، خالد صاحب آپ کے ادارے پر بھی مہنگائی نے ڈیرہ جما دیا، ایس حبیب خان آپ کی ہر اسٹوری جاندار شاندار ہوتی ہے، سالگرہ نمبر میں کیوں نہیں لکھا، مریم فاطمہ اب آپ اچھا لکھ رہی ہیں، جیسے موم کی گڑیا، فرح انیس آپ کا خط پسند آیا، عثمان غنی، آپ کا خط بہت اچھا لگا۔ مہر پرویز احمد دولو صاحب آپ نے اپنے خط میں جائز باتیں لکھی ہیں۔ پہلے صفحات پر عمران قریشی کی کہانی تھی۔ ویلڈن عمران صاحب، یہ ایک بہترین کہانی ہے، اسی طرح دوسرے نمبر پر عثمان غنی کی بدصورت کہانی نے ہمیں ڈرا کر رکھ دیا، ایک بہترین کہانی، آپکی تحریر وہ کون تھی اگرچہ ایک مختصر تحریر تھی، مگر بہت اچھی تھی۔ سارے خطوط میں اس کے تبصرے اچھے تھے، نینا خان کی عبرت ناک مکمل طور پر مجھے بہت پسند آئی۔ اور ہاں ایس امتیاز کی تحریر آدم خور نے اس بار زبردست رنگ جمایا۔ انوکھی رات نے مجھے بہت دکھی کر دیا۔ اور اس کے علاوہ موت کا انتظار، نے بہتر انداز میں اپنے آپ کو ظاہر کیا۔ عفریت کہانی نے کہانی کو واضح کر دیا۔ اور یہ قسط کافی اچھی تھی۔ عثمان غنی سے گزارش ہے کہ وہ کوئی مکمل کہانی لکھیں، یا پھر کوئی نئی سلسلہ وار کہانی شروع کر دیں، آپ کی کہانی اچھی ہوگی۔

☆☆ کائنات صاحبہ: آپ نے کم لکھا مگر بہت اچھا لکھا، قلبی لگاؤ سے کہانیوں کی تعریف کے لئے بہت بہت شکریہ، آئندہ ماہ بھی خلوص نامہ کا شدت سے انتظار رہے گا۔

خدیجہ فاطمہ، اسلام آباد سے، السلام علیکم انکل! اللہ تعالیٰ آپ کو اپنی حفظ و امان میں رکھیں اور ڈر کو بُری نظروں سے محفوظ۔ ڈر کا سرورق ڈراؤنا کر دیں کیونکہ اب راتیں لمبی اور دن چھوٹے ہو گئے ہیں۔ کہانیوں کو بھی ڈراؤنا کر دیں۔ صرف خوفناک کہانیاں لیں۔ عمومی کہانیاں سائیڈ میں کر دیں۔ شائع وہ بھی کریں لیکن کم کم۔ اس طرح رائٹرز کو احساس دلایا جا سکتا ہے کہ ڈر صرف ڈراؤنی کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ اس مرتبہ سالگرہ نمبر شائع ہونے پر مبارک باد دیتی ہوں، سال کے دوران پلاننگ کر کے کوئی ایک آدھ خاص نمبر بھی شائع کر دیا کریں جن میں منجھے ہوئے رائٹرز کو ہی کہانی لکھنے کو کہا جائے تاکہ ایک انفرادی حیثیت سے خاص نمبر دکھلائی بھی دے۔ عام اشاعت اور خاص اشاعت کا نمایاں فرق ہوتا ہے، اُسے ملحوظ رکھیں تو یہ بھی ایک خاص بات ہے۔ سرورق ڈائجسٹ کی inside stories کا نمائندہ ہوتا ہے، تھوڑا اس جانب توجہ دیں۔ سب نے اپنے ذوق کے ساتھ اچھا لکھا ہے لیکن عمران قریشی، راشد نذیر طاہر، ناصر محمود فرہاد، شہزاد خان، نینا خان، ایس امتیاز احمد، شہزادہ چاند زیب عباسی صاحبان نے کچھ زیادہ خوب اور بہتر لکھا جس سے سالگرہ نمبر واقعی خاص نمبر بن گیا ہے۔ باقی آئندہ، اجازت دیں، والسلام۔

☆☆ خدیجہ صاحبہ: قلبی لگاؤ سے لکھا ہوا خط پڑھ کر دلی خوشی ہوئی، آپ کی باتیں سر آنکھوں پر آئندہ آپ کی باتوں پر عمل ہوگا کہ درمیان میں مزید خاص نمبر نکالیں، اپنا خیال رکھئے گا، اور ڈر کو خط لکھنا نہ بھولئے گا۔ Thanks۔

بسما خان نوشہرہ وا کینٹ سے، اکتوبر کا ڈر جلد مل گیا، کور پر جولڑکی تھی، وہ یقیناً ویمپائر ہوگی۔ سب سے پہلے قرآن کی باتیں پڑھیں پھر آگے بڑھے اور خطوط کی محفل میں پہنچ گئے اور تمام ساتھیوں سے ملاقات ہوگئی۔ سب کو سلام، کہانیوں میں اول کہانی پراسرار لڑکی نے کمال کر دکھایا۔ بہت اچھی کہانی تھی۔ اس کے بعد عثمان غنی کی بدصورت نے کامیابی کے جھنڈے گاڑ دیے۔ بدصورت وہ کہانی ہے، جس نے مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔ آپ کی پچھلی کہانی جرم محبت بہت اچھی اسٹوری رہی، جس کو بار بار بھی اگر پڑھا

جائے، تو کوئی بھی بور نہ ہوگا۔ عثمان غنی نے جرم محبت لکھ کر دل جیت لیا تھا۔ برفانی چڑیل بس ٹھیک تھی، حالانکہ یہ زیادہ بہتر انداز میں لکھی جا سکتی تھی، موم کی گڑیا، مریم فاطمہ آپ کی کہانی شروع میں بہت اچھی ہوتی ہے، مگر آخر میں پتہ نہیں کیا ہو جاتا ہے، آدم خور ایس امتیاز احمد کی بھی اچھی تحریر تھی، اور میں نے جہاں تک ڈائجسٹ پڑھا، باقی سب کہانیاں بھی بہتر تھیں۔ قسط وار میں جان لیوا اچھے انداز میں آگے بڑھ رہی ہے۔ اسرار کو ختم کر کے اچھا کیا۔ اب نئی کسی بہترین کہانی کو موقع دے دینا چاہیے۔ آج کل عمران قریشی، نینا خان، عثمان غنی، فلک زاہد، ایس حبیب خان، شکیل نیازی مہر پرویز احمد دولو، صاحب زیادہ، اچھا لکھ رہے ہیں، باقیوں کو ابھی بہت محنت کی ضرورت ہے، کبھی کبھار کوئی بالکل نیا لکھاری بھی اچھی کہانی لکھ سکتا ہے۔ خیر ڈر کی ترقی کے لئے شب و روز دعا گو رہتی ہوں۔

☆☆ بسما صاحبہ: آپ کا خط پڑھ کر اچھا لگا، عثمان غنی واقعی بہت اچھا لکھنے لگے ہیں اور بہت جلد کامیابی ان کے قدم چومے گی۔ اور ہاں آئندہ بھی تبصرہ ارسال کرنا بھولئے گا مت۔ Thanks۔

بشریٰ نوری ، یونی ٹاؤن سے، السلام علیکم ڈر ڈائجسٹ اکتوبر کا جلدی مل گیا، مگر اس بار کافی مہنگا ہو گیا ہے، ہم اسٹوڈنٹ ہیں، اس لیے ایسا کہہ رہے ہیں، مگر رات کے وقت ہاسٹل میں پڑھنے کا مزہ ہی کچھ اور ہے، ٹائٹل اچھا تھا، تو جیسے قیمت وصول ہو گئی، خطوط میں جو آج کل ٹاپ ون ہے، وہ عثمان غنی ہیں، ان کے لکھنے کا انداز بہت اچھا ہے، سردار اعظم، اور بلال تابش کے خطوط بھی پسند آئے، ایس حبیب خان، ایس امتیاز احمد، عثمان غنی کے تبصرے دل کو چھو گئے، کہانیاں جو مجھے سب سے زیادہ اچھی لگیں، ان میں عثمان غنی، کی بدصورت، نمبرون رہی ایس امتیاز احمد کی آدم خور، صائمہ شاہد کی، انوکھی رات، گلاب خان کی، پراسرار مینار، اور مریم فاطمہ کی موم کی گڑیا، بے حد پسند آئی۔ باقی کہانیوں میں عمران قریشی کی پراسرار لڑکی بہترین تحریر تھی، برفانی چڑیل پہلے بھی کہیں لگ چکی ہے، اور اس کے بعد باقی سب بھی اچھا تھا، جان لیوا، اچھی کہانی ہے، عفریت بھی ٹھیک ڈگر پر جا رہی ہے۔

☆☆ بشریٰ صاحبہ: خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے اور آئندہ ماہ بھی نوازش نامہ بھیجنے کے لئے ڈھیروں شکریہ قبول کریں۔

امرحہ خان ملتان سے، السلام علیکم ماہ اکتوبر کا ڈر ڈائجسٹ، بہت جلدی مل گیا۔ ٹائٹل بہت پیارا تھا۔ مجھے اچھا تو لگا، مگر پلیز اس بار مجھے اس کی قیمت کچھ زیادہ لگی۔ مگر اب ہم کچھ کہہ بھی نہیں سکتے، ڈر ہمارا محبوب رسالہ ہے۔ اور مجھے بے حد پسند ہے، اس بار زیادہ نئے لوگ ڈر میں نظر آئے، ماہ روش نے جو بھی لکھا، بہت خوب لکھا، اس بار زیادہ لوگوں نے بے لاگ تبصرہ کیا تھا۔ واقعی مجھے بھی یہ بات بے حد پسند آیا، کہ کہانیوں کی تعریف، اور تنقید قاری کو کہانی مدنظر رکھ کر کرنی چاہیے،، نینا کا خط بہت اچھا لگا، اس کے علاوہ، دل نور عبیر کا نام بہت پیارا لگا، اور مجھے عثمان غنی کا خط بھی اچھا لگا اور پسند آیا۔ عثمان غنی، آج کل چھا رہے ہیں۔ بہت سے خطوط میں ان کا نام دیکھا تو بات سمجھ میں آئی۔ مریم فاطمہ کا لکھنے کا انداز تو ٹھیک ہے۔ حالانکہ ان کی کہانی موم کی گڑیا بہت اچھی تھی، اس ماہ ڈر کی بہترین تحریر۔ عثمان غنی کی کہانی بدصورت نے ایک بار پھر سے کامیابی حاصل کی، دوسری اچھی اور پیاری کہانی آدم خور رہی، تیسری کہانی، جس نے چونکا دیا، وہ انوکھی رات تھی، نثار فاطمہ کی میلا موضوع کے لحاظ سے مختلف تحریر تھی۔ ڈر کا سالگرہ بہت بہت مبارک ہو، میری عثمان غنی سے گزارش ہے کہ آپ ڈر میں کوئی قسط وار تحریر شروع کریں۔ کیونکہ آپ کے لکھنے کے انداز میں کچھ تو خاص بات ہے۔

☆☆ امرحہ صاحبہ: خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے ویری ویری تھینکس، عثمان غنی واقعی آج کل لگن کے ساتھ محنت کر رہے ہیں اور آہستہ آہستہ افق کی طرف بڑھ رہے ہیں، قیمت کی آپ بات کر رہی ہیں تو ہم قیمت بڑھانے پر بالکل بھی راضی نہیں تھے مگر ہائے رے مجبوری...... تبدیلی آگئی ہے تو ابھی آگے آگے ہم عوام کو نہ جانے کیا کیا دیکھنا پڑے گا اور برداشت بھی کرنا پڑے گا۔ ویسے بھی ڈر کی قیمت ابھی بھی تمام رسالوں سے کم ہے۔ خیر اللہ تعالیٰ ہم عوام پر اپنا فضل و کرم رکھے۔ (آمین)

مسز خانستہ رحمان مدین بحرین سے، اکتوبر کا ڈر ڈائجسٹ، بہت جلد ملا، ٹائٹل بہت پیارا تھا۔ ماہ اکتوبر کا ڈر یعنی سالگرہ نمبر کی خوشیاں دوبالا ہو گئیں، سب سے پہلے اپنی بات سے شروعات کی، پھر خطوط کی محفل میں آئے، ارے واہ کافی نئے نام نظر آئے، سب کو خوش آمدید! اور سب کو سلام، خط میں عثمان غنی، اور ماہ روش کا تبصرہ بہتر تھا۔ اس بار خطوط میں کافی گرما گرمی دیکھنے کو ملی۔ نینا خان بھی مثبت لکھ رہی ہیں۔ اس بار ڈر میں جن تین کہانیوں نے دل جیت لیا۔ اس میں سرفہرست عثمان غنی کی کہانی بدصورت نے تمام کہانیوں پر سبقت لے لی۔ دوسری بہترین کہانی جو ڈر کے صفحات پر جگمگ جگمگ کر رہی تھی، وہ آدم خور تھی۔ مگر یہ انگلش کہانی تھی۔ پھر بھی بہترین کہانیوں میں اپنے آپ کو منوانے میں کامیاب رہی۔ ایس امتیاز احمد کی کیا بات ہے، تیسری کہانی معلومات سے بھرپور

پراسرار لڑکی نے عمران قریشی کو یہ اعزاز دلایا۔ باقی کہانیوں میں نینا خان کی عبرتناک قابل ذکر ہے، مریم فاطمہ ریگولر لکھاری ہیں، مگر آپ کی موم کی گڑیا اچھی لگی۔ باقی اچھی کہانیوں میں جنم دن، موت کا انتظار، ایک صدی بعد اچھی لگی، باقی سب کو سلام!

☆☆ خانستہ صاحبہ: اکتوبر کا ڈر آپ کو اچھا لگا اور اس کی کہانیوں نے آپ کا دل موہ لیا، اس کے لئے شکریہ، اب قوی امید ہے کہ آئندہ ماہ بھی آپ قلبی لگاؤ سے لکھا ہوا نوازش نامہ ارسال کر کے ضرور شکریہ کا موقع دیں گی۔ Thanks۔

احسان الحق ، السلام علیکم ایڈیٹر صاحب! امید ہے خیریت سے ہوں گے۔ تمام بزم کی خیریت نیک مطلوب۔ اس مرتبہ ڈر چھبیس کہانیوں کا گلدستہ تھا۔ ہر کہانی لکھنے والے کی محنت کا منہ بولتا ثبوت تھی۔ البتہ کچھ کہانیاں ایسی ہوتی ہیں جو دل پر ایک خاص تاثر چھوڑ جاتی ہیں۔ پراسرار لڑکی، انوکھی رات، گمشدہ ممی، جان لیوا، خونی کتاب، عبرت ناک انجام، آدم خور، انجام اور برفانی چڑیل ایسی ہی کہانیاں ہیں جنہیں دلوں میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ دولو صاحب کی کہانیوں کا ایک علیحدہ اثر ہے۔ سب کو سلام پیش کرتا ہوں اور بالخصوص ایس حبیب خان اور فلک زاہد کو دعاؤں کے ساتھ سلام عرض کرتا ہوں۔ والسلام۔ خیر اندیش۔

☆☆ احسان صاحب: سب سے پہلے ہم اور قارئین آپ کی کلی صحت کے لئے بارگاہ ایزدی میں دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو کلی صحت عطا کرے۔ تاکہ آپ اپنے پڑھنے والوں کی خوشی کے لئے اچھی اچھی کہانیاں لکھیں، احسان صاحب آپ کی کہانی کے بغیر بزم بالکل پھیکا پھیکا لگتا ہے۔ امید ہے غور کریں گے۔ شکریہ۔

میاں یاور حسین اسلام آباد سے، انکل السلام علیکم، امید ہے خیریت سے ہوں گے۔ میں ایم ایس سی میں مشغول ہوں۔ اس مرتبہ تو پڑھائی ضرورت سے زیادہ کرنا پڑے گی اور تب جا کر صرف پاسنگ مارکس آئیں گے۔ ٹائم فیکٹر بھی شارٹ ہے۔ معلوم نہیں کس طرح سے کنٹرول کروں گا۔ اس مرتبہ 26 کہانیاں پڑھنے کو ملیں جن میں سے عمران قریشی نے زبردست کہانی لکھی۔ شہزادہ چاندزیب نے بھی کمال لکھا۔ ایس امتیاز احمد نے تو ہمیشہ کی طرح لکھا۔ گلاب خان سولنگی، پرویز دولو، صائمہ شاہد، شہزاد خان، نینا خان نے بھی اچھا لکھا۔ ناصر محمود فرہاد صاحب تکنیکی اعتبار کے رائٹر ہیں۔ واقعی اچھا لکھتے ہیں۔ احسان الحق صاحب کی خیریت دریافت کرنا چاہتا ہوں، ان کی جانب سے کوئی معرکۃ آلارا کہانی نہیں آ رہی۔ he is my favourite writer. اُن سے التجاء ہے کہ کوئی دھماکے دار کہانی لکھیں یا ناول لکھیں یا پھر کوئی ناولٹ۔ سب کے لئے دعائیں۔ السلام علیکم۔

☆☆ یاور صاحب: ہماری دعائیں ہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو ایگزام میں کامیاب و کامران کرے اور خوشیوں سے نوازے، امید ہے احسان صاحب آپ کی دلی خواہش کا پڑھ کر ضرور پہلی فرصت میں آپ ہی نہیں بلکہ تمام قارئین کو خوش کریں گے۔ اچھی سی کہانی لکھ کر۔ کیوں ٹھیک ہے ناں۔

عثمان غنی پشاور سے، السلام علیکم! یقیناً سب خیر و عافیت سے ہونگے، اور زندگی میں مطمئن اور خوش باش ہونگے! میں بھی ٹھیک ٹھاک ہوں، ڈر کا نیا شمارہ بہت جلد مل گیا، مجھے بہت اچھا لگا، قیمت بڑھا دی، مگر ہر چیز مہنگی ہو گئی ہے، اس لیے ہمیں کوئی بھی گلا نہیں ہے۔ قرآن کی باتیں، ہمیشہ کی طرح اعلیٰ، خطوط میں جن بہن بھائیوں نے ہماری کہانی کو پسند کیا، ان سب کا دل سے شکریہ، میں آج کل واقعی دل سے اپنی کہانیوں پر محنت کر رہا ہوں۔ 26 خاص کہانیوں میں ہماری کہانی بھی تھی، اس لیے ادارے کا میں دل سے مشکور ہوں۔ پراسرار لڑکی، عمران قریشی کی ایک اعلیٰ پائے کی کہانی تھی، انوکھی رات صائمہ شاہد کی واہ کیا بات ہے۔ پیاسی آتما بس ٹھیک تھی۔ گمشدہ ممی اچھی کہانی لکھی، بدصورت آپ سب کو کیسی لگی، ضرور بتائے گا، ٹاپ کہانی، مجھے آدم خور لگی، پھر موم کی گڑیا، مریم فاطمہ نے یہ اچھا لکھا، انجام نے بھی رولایا، اور آپ کے خط نے بھی رولایا، آپ اتنے سیڈ موضوع لکھتے ہیں، پتہ نہیں لکھتے ہوئے آپ کی کیا حالت ہوتی ہوگی، برفانی چڑیل بھی بہت اچھی تھی، کافی دنوں کے بعد آپ نظر آئے، خطوط، میں ماہ روش، ایس حبیب خان، مریم فاطمہ، فلک زاہد، نینا خان، بینا خان، کائنات بلوچ، امرحہ خان، بلقیس خان، مہر پرویز احمد، ایس امتیاز احمد، بلال تابش، سردار اعظم، کو دل کی گہرائیوں سے سلام، اللہ سب کو سلامت رکھے، آمین۔

☆☆ عثمان صاحب: دل کی گہرائی سے تبصرہ کرنے پر شکریہ، اپنی محنت جاری رکھیں بہت جلد کامیابی قدم چومے گی۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ محنت کا پھل ضرور دیتا ہے۔

وصی شیخ جگہ نامعلوم سے، السلام علیکم، اکتوبر کا شمارہ اس بار جلدی ملا، مگر قیمت کچھ زیادہ ہی تھی، خیر جیب خرچ سے بچا کر ہم

لیتے ہی رہیں گے، خوشی اس بات کی ہے، کہ اب ہمارا محبوب رسالہ کبھی ہم سے جدا نہیں ہوں گا، قرآن کی باتیں، دو صفحات تنگ کر دیں۔ پہلے تو ہم ویب سائیڈ سے ڈاؤن لوڈ کر کے پڑھتے تھے، مگر اب ویب پر دستیاب کیوں نہیں ہے، خطوط میں عثمان غنی تُسی تو چھا گئے ہو، وہ بھی شاہ کرکے، اور ہر دلعزیز لکھاری بن گئے ہو، آج کل تو آپ نے وہ والا کام کر دیا ہے، جیسے کوئی بچہ بچوں کے قطار سے نکل کر بڑوں کے قطار میں جگہ نہ ہوکے بھی کھڑا ہو جاتا ہے، اور سب اس کی موجودگی نوٹ کر لیتے ہیں، خطوط میں اس ماہ عثمان غنی، کائنات بلوچ، مہر پرویز، ایس حبیب، نینا خان، بلال تابش کے خطوط پسند آئے، کہانیوں میں پر اسرار لڑکی، اول، دوسری بدصورت عثمان غنی، تیسری، آدم خور، ایس امتیاز، اور چھوتی، عبرت ناک، پانچویں، انوکھی رات، چھٹی، موم کی گڑیا، ساتویں، میلا، آٹھویں، موت کا انتظار، نویں، ایک صدی بعد، دسویں، وعدہ خلافی، پسند آئی، باقی بھی سب ٹھیک تھی۔ اور سب کچھ بہتر تھا۔

☆☆وسی صاحب: ڈرڈائجسٹ میں خوش آمدید، آئندہ ماہ بھی قلبی لگاؤ سے لکھا ہوا تبصرہ ضرور ارسال کیجئے گا، مگر شہر کا نام لکھنا بھول گئے، گامت۔ Thanks۔

فیصل مشتاق قبول شریف سے، السلام علیکم! امید ہے ڈر سے جڑے تمام ساتھی خیریت سے ہوں گے۔ اس مرتبہ ڈر کا سالگرہ نمبر موصول ہوا جس میں اپنی کہانی ''خوفناک منظر'' دیکھ کر بہت خوشی ہوئی، ڈر کا سالگرہ نمبر تمام بہترین کہانیاں اور منفرد ٹائٹل کے ساتھ منظر عام پر آیا۔ میری پسندیدہ کہانیوں میں خونی کتاب، عفریت اور موت کا انتظار رہیں۔ دیگر کہانیاں بھی اپنی نوعیت کی زبردست کہانیاں رہیں۔ اس کے علاوہ شاعری میں تمام شعر اور غزلیں لاجواب رہیں۔ عامر شہزاد ننکانہ صاحب کی غزل ہمیشہ عمدہ ہوتی ہے اور اس مرتبہ بھی ان کی غزل شاندار رہی۔ اس کے علاوہ رابعہ آفرین، عثمان غنی، نینا خان، ان تمام لوگوں کی غزلیں بھی بہت شاندار ہیں، پڑھ کر بہت اچھا لگا، مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ ایڈیٹر صاحب نے پہلی فرصت میں ہی کہانی لگادی، ان سے بات ہوئی، وہ بہت ہی شیریں لہجے اور اچھے اخلاق کے مالک اور بلاشبہ وہ نئے لکھاری کو بہت سپورٹ کرتے ہیں اور سب سے اچھی بات تمام تبصروں کے جواب دیتے ہیں، جس سے بلاشبہ حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ امید ہے میری پہلی کہانی سب کو پسند آئے گی مزید بھی ڈر کے لئے لکھتا رہوں گا۔ انشاءاللہ۔

☆☆فیصل صاحب: ہم بھی آپ کی خوشی میں خوش ہیں، ڈرڈائجسٹ میں خوش آمدید، اور امید ہے آئندہ بھی کہانی ارسال کرتے رہیں گے، کیونکہ آدمی لکھتے لکھتے لکھاری بنتا ہے، کیوں ٹھیک ہے ناں۔

ایس حبیب خان کراچی سے، السلام علیکم! امید کرتی ہوں کہ ڈر کی پوری ٹیم، اس کے خوب صورت پڑھنے والے اور رائٹرز خیریت سے ہوں گے، سالگرہ نمبر پوری آب وتاب کے ساتھ جلوہ گر ہوا جو کہ میرے ہاتھوں میں اور جسے میں نے بے حد معیاری اور منفرد پایا لیکن سب سے اہم نکتہ یہ ہے کہ اسے سجا سنوار کر ترتیب دینے والوں کی محنت بلاشبہ سراہنے کے قابل ہے۔ جس کے لئے ہم ان کے شکر گزار ہیں۔ ''قرآن کی باتیں'' سے ابتدا ہوئی جس نے روح کو معطر کر دیا۔ خطوط کی محفل میں قدم رکھا تو کافی دوستوں کو غیر حاضر پایا۔ خاص طور سے مسز زینت، مسز فرمین حامد، مسز سندس اقبال اور احسان الحق صاحب کی کمی محسوس ہوئی۔ ساتھ ہی ڈر کے مایہ ناز رائٹر ضرغام محمود صاحب بھی نظر نہیں آرہے؟ مگر دیگر دوستوں نے اپنے خطوط سے اس بزم کی رونق کو ماند نہیں پڑنے دیا اور لکھنے والوں کی بھرپور انداز میں حوصلہ افزائی کی۔ بلقیس خان کو دوبارہ دیکھ کر خوشی ہوئی۔ سالگرہ نمبر کی ابتدائی تحریر بہت ہی عمدہ ثابت ہوئی۔ یعنی ''پراسرار لڑکی'' عمران قریشی کی اس تحریر نے سالگرہ نمبر کا لطف دوبالا کر دیا۔ ان کی تحریر کا ہمیشہ انتظار رہتا ہے۔ ''انوکھی رات'' اور ''پیاسی آتما'' محنت طلب تحریریں تھیں۔ ''گمشدہ ممی'' ناصر محمود فرہاد صاحب کی کیا بات ہے! اس تحریر میں انہوں نے اپنی ذہانت سے بہت متاثر کیا۔ عامر شہزاد صاحب ہمیشہ کی طرح بہترین تحریر لے کر حاضر ہوئے۔ بہت خوب صورت آپ بیتی تھی! Awesome ''بدصورت'' عثمان غنی کی روانی میں پڑھی جانے والی خوب صورت تحریر بے حد پسند آئی۔ خوب لکھا آپ نے! ''خونی آپ بیتی، ''ویران مکان'' اور ''خوفناک منظر'' کمزور پلاٹ کی تحریریں تھیں انہیں بہتر انداز میں لکھا جا سکتا تھا: ''وعدہ خلافی'' بہت زیادہ اچھی لگی۔ محمد رضوان قیوم صاحب میرے فیورٹ رائٹر میں سے ایک ہیں۔ ان کی پیش کردہ تمام تحریریں قابل تعریف ہیں۔ ''خونی کتاب'' معذرت کے ساتھ! بالکل بے ربط تحریر ثابت ہوئی۔ ''عبرتناک انجام'' نینا خان کے بارے میں کہنا چاہوں گی کہ وقت کے ساتھ ان کے قلم میں پختگی آتی جارہی ہے اور ان کی یہ تحریر بھی ایک بہترین اور یادگار کاوش ثابت ہوئی۔ ویلڈن نینا! ''آدم خور'' اس تحریر میں ایس امتیاز احمد

صاحب نے بہترین اور عمدہ منظر نگاری کرتے ہوئے شاندار انداز سے قلم چلایا کیا کہنے ہیں آپ کے! سچ میں اس تحریر نے تو رونگٹے کھڑے کر دیئے۔ ''انجام'' معاشرے کی تلخ حقیقت اور بدصورتی کو اجاگر کرتی سبق آموز تحریر تھی۔ ''موم کی گڑیا'' مریم مائی سسٹر! اس بار تو آپ سب پر بازی لے گئیں۔ بھرپور انداز میں لکھی گئی تحریر تھی، جس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے اور کہانی کا اینڈ تو لاجواب تھا! Excellent ''خونی مینار'' ''جنم دن'' ''ایک صدی بعد اور ''موت کا انتظار'' بس ٹھیک لگیں۔ ''روحوں کا ملن'' روح اور دل دونوں کو زخمی کرتی بہت ہی حساس تحریر تھی۔ رابعہ عباس! آپ نے تو دل جیت لیا۔ Keep it up ''برفانی چڑیل'' سالگرہ نمبر کا شاندار اختتام کرتی، رائٹر کی مہارت کا منہ بولتا ثبوت ثابت ہوئی۔ آخر میں ڈرڈائجسٹ کے لئے ڈھیروں دعائیں۔

☆☆ایس حبیب صاحبہ: کئی مشہور دوستوں کو آپ نے غیر حاضر پایا، جس میں آپ کا نام بھی شامل ہے۔ اور اب قوی امید ہے کہ آپ اپنے چاہنے والوں کی خواہش کو مدنظر رکھتے ہوئے ہر ماہ کہانیاں ضور ارسال کرتی رہیں گی۔

رشک نور فیصل آباد سے، السلام علیکم! امید ہے ڈرڈائجسٹ کے تمام رائٹرز اور قارئین اور ادارے کے تمام افراد ٹھیک ہوں گے۔ سب سے پہلے تو انکل جی آپ سے شکوہ ہے کہ آپ نے میری کوئی اسٹوری شائع نہیں کی اور نہ ہی اب مجھے ڈرڈائجسٹ کی اضافی کاپی ملتی ہے۔ جہاں میں رہتی ہوں۔ وہاں ڈر نہیں ملتا۔ اس لئے جولائی اور اگست کا شمارہ میں پڑھ نہیں پائی جس کا مجھے بہت افسوس ہے۔ مہربانی میرے لئے اعزازی کاپی بھیج دیا کریں۔ انکل جی پلیز بڑی مہربانی ہوگی۔ ایک اسٹوری پراسرار واقعہ اور کچھ مواد بھیج رہی ہوں امید ہے ڈر میں جگہ دیں گے۔ اور آخر میں آپ سے درخواست ہے کہ میرے لئے دعا کریں، میری طبیعت بہت خراب ہے۔ ڈاکٹر نے دمے کی شکایت بتائی ہے پلیز میرے لئے دعا کریں میں جلدی سے صحت یاب ہو جاؤں اور آخر میں پاکستان زندہ باد۔

☆☆رشک صاحبہ: سالگرہ نمبر میں آپ کی کہانی ''خونی آپ بیتی'' چھپ چکی ہے، اور اعزازی کاپی بھیج دی ہے ہماری اور قارئین کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو کلی صحت عطا کرے اور تمام جائز خواہشات کو تکمیل تک پہنچائے۔ یہ عام سا مرض ہے۔ پرہیز اور مکمل علاج سے مرض اچھا ہو جاتا ہے۔ فکر نہ کریں۔ خوش رہیں اور خوشیاں بانٹیں۔ آپ کہانی لکھ کر دوبارہ ضرور پڑھا کریں کیونکہ اس سے اصلاح ہو جاتی ہے۔

نینا خان کراچی سے، السلام علیکم! جناب ایڈیٹر صاحب اور ادارے میں کام کرنے والے بھی حضرات کو سلام کے بعد بہت دلی دعائیں۔ اللہ تعالیٰ آپ بھی کو خیریت سے رکھے۔ (آمین) سب سے پہلے شکریہ خالد صاحب کا کہ انہوں نے ڈرو ائجسٹ کو جاری رکھا۔ افسوس تو ہے کہ مہنگائی کے پیش نظر رکھتے ہوئے ڈرڈائجسٹ کی قیمت بڑھانا وقت کا تقاضا ہے۔ بس آپ سے گزارش ہے کہ ڈائجسٹ کا سلسلہ بندمت کیجئے گا۔ اور اب ان تمام لوگوں کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گی جنہوں نے اپنے خط میں مجھے نام لے کر یاد رکھا سراہا۔ ان سبھی کے الفاظ میرے لئے قابل مسرت اور قابل اصلاح ہیں۔ ماہ روش آپ نے قیمتی لفظوں سے میری کہانی کی تعریف کی بے حد شکریہ۔ مسز خائستہ رحمان، کائنات بلوچ، امرحہ خان، بلقیس خان، بینا خان، ڈاکٹر عامر شہزاد، محمد طاہر اشتیاق، مہر پرویز احمد دولو، عثمان غنی، بلال تابش اور سردار اعظم خان صاحب آپ سبھی کی دل سے بے حد مشکور ہوں آپ نے میری تحریر کو سراہا! اور اپنے قیمتی لفظوں میں یاد رکھا۔ اسی طرح مجھے آپ اصلاح میں یاد رکھیں تاکہ میں مزید اپنی تحریر میں نکھار پیدا کر سکوں۔ حنیف شاکر صاحب میں آپ کے دکھ میں برابر کی شریک ہوں اور خداوندتعالیٰ سے آپ کی بھابھی اور ماموں کی بخشش ومغفرت کے لئے دعا گو ہوں اللہ تعالیٰ آپ سب کو صبر کاملہ عطا فرمائے۔ (آمین) ایس حبیب صاحبہ کو سالگرہ کی بہت بہت مبارک باد پیش کرتی ہوں، اتفاق سے میری سالگرہ بھی اکتوبر کے ماہ میں آتی ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی زندگی ہر آنے والے نئے سال میں مزید خوشیوں سے بھر دے آمین۔ آپ تبصرے بھی اچھے لکھتی ہیں۔ گڈ۔ عمرانہ سرور صاحبہ زندگی اور موت تو خدا تعالیٰ کے ہاتھ ہے۔ بس اپنے والد محترم کے لئے جتنی ہو سکے دعا کیا کریں۔ میرے والد صاحب بھی انتقال کر چکے ہیں۔ میں روتی نہیں ہوں بس ان کے لئے ایصال ثواب کچھ نہ کچھ کرتی رہتی ہوں رونا نہیں ایصال ثواب اچھا ہے۔ ابھی ڈر کا مطالعہ جاری ہے۔ چند کہانیاں پڑھ نہیں سکی ان پر تبصرہ کرنا مشکل ہے۔ امید ہے کہ وہ بھی ہر کہانی کی طرح اچھی ہی ہوں گی۔ پراسرار لڑکی میں عمران قریشی صاحب نے سندری کے شوق کو خوب دکھایا ہے۔ صائمہ شاہد کی انوکھی رات میں شیلا کا انجام بہت خطرناک بتایا گیا۔ ویری گڈ۔ فہیم ملک ارشاد کی پیاسی آتما بھی اچھی کہانی تھی۔ رشک نور کی خونی آپ بیتی بھی اچھی کہانی رہی۔ گڈ۔ فرح انیس ویران مکان بہت بہت کہانی لے کر آئیں۔ ویری گڈ حارث کی ہمت کو سلام۔ سچ بیتی پر مشتمل خوفناک منظر میں فیصل مشتاق صاحب نے واقعی ایک خوفناک منظر کو پیش کیا ہے۔ وعدہ خلافی میں بھی محمد رضوان قیوم صاحب نے سچ

بپتی بیان کی۔ سونم کے ساتھ واقعی بہت برا ہوا۔ شہزاد خان کی خونی کتاب بھی اچھی رہی۔ مریم فاطمہ کی موم کی گڑیا بہت اچھی کہانی رہی۔ گلاب خان سولنگی صاحب بھی خونی مینار اچھی کہانی لائے۔ لالچ اور خود غرضی کو اچھے طریقے سے بیان کیا۔ سلہ نثار فاطمہ کی کہانی بھی اچھی ثابت ہوئی۔ جنم دن میں محمد شعیب نے ایک جن کے انتقام کو خوب دکھایا۔ روحوں کا ملن رابعہ عباس کی کہانی بھی اچھی رہی۔ اقراء قریشی نے آسیبی قصے بھی اچھے سنائے۔ ایک صدی بعد ڈائن پھر سے اپنا انتقام لینے آ گئی۔ فیصل ندیم کی تحریر بھی اچھی رہی۔ چند کہانیاں ابھی زیر مطالعہ ہیں۔ عثمان غنی کی بدصورت تحریر بہت اچھی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کی آخری نصیحت بھی اچھی رہی۔ آخر میں مسز زینت خان صاحبہ، فاطمہ خان، مسز سندس اقبال، احسان الحق صاحب اور خضر حیات صاحب آپ سب کہاں ہیں، اپنی کہانیاں اور تبصرے کیوں نہیں ارسال کر رہے۔ تبصروں کی محفل میں آپ سب کی کمی واضح ہے۔ جلد از جلد تبصروں میں اپنا احوال لکھ بھیجیں اللہ تعالیٰ آپ سب کو خوش و صحت مند رکھے۔ (آمین)

☆☆ نینا صاحبہ: قلبی لگاؤ سے لکھا ہوا تبصرہ پڑھ کر دلی خوشی ہوئی اور قوی امید ہے کہ دیگر تمام ساتھی آپ کی باتیں پڑھ کر غور کریں گے۔ اور خوشی کریں گے تبصرہ و کہانی بھیج کر۔

رابعہ عباس بستی فتے والی سے، السلام علیکم! امید ہے کہ ڈر سے وابستہ تمام لوگ ٹھیک ٹھاک ہوں گے، ماہ اکتوبر کا ڈر ڈائجسٹ ہمیں 18 ستمبر کو ادارہ کی طرف سے بطور اعزازی رسالہ ملا۔ جس کو دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی، لیکن بڑھی ہوئی قیمت نے دن کے وقت ستارے دکھا دیئے۔ بات کی جائے شمارے کی پہلے انکل خالد کی اپنی بات پڑھی، تبدیلی غریب کے لئے بہت مہنگی ثابت ہو رہی ہے۔ ایس حبیب اور فلک آپی کیا حال ہیں اور کہاں غائب ہیں۔ ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ اللہ سب کو بہت ترقی دے۔ آپی فلک آپ کو بہت بہت مبارک ہو۔ آپ کی 15 کہانیاں کتاب کی شکل میں مارکیٹ میں آ گئی ہیں۔ بلقیس آپی کیا حال ہیں، کہاں غائب تھیں آپ، محسن بھائی آپ کا کیا حال ہے، عمرانہ سرور، مریم فاطمہ، نثار فاطمہ، نینا خان، کائنات، امرحہ، ایس امتیاز، محمد اسحاق، عامر، حنیف، محمد طاہر، عثمان غنی، محمد اسلم، سردار اعظم ویسے سب نے اچھا لکھا ہے۔ پلیز اسی طرح لکھتے رہئے۔ کہانیوں میں عفریت اور جان لیوا بہت اچھے طریقے سے آگے بڑھ رہی ہیں۔ باقی میں نے پڑھی نہیں کیونکہ ان دنوں مصروفیت تھوڑی زیادہ ہے۔ میں بھی دو کہانیاں بھیج رہی ہوں، جلد شائع کر کے شکریہ کا موقع دیں۔ اللہ حافظ۔

☆☆ رابعہ صاحبہ: اگلے شمارے میں کہانی چھپ چکی ہے، ارسال کردہ کہانی بھی بہت جلد شائع کر دی جائے گی، آپ اپنی کہانی کے صفحات مزید بڑھا دیں تو زیادہ اچھا ہوگا۔ آئندہ ماہ بھی تبصرے کا انتظار رہے گا۔ Thanks۔

سردار اعظم خان چترال سے، ڈر میں اپنا پچھلا خط دیکھ کر کافی خوشی ہوئی، اب تو ریگولر ڈر خریدوں گا، میرا تعلق چترال سے ہے، اور میں پورے ملک میں اپنی نوکری کی بدولت گھومتا پھرتا رہتا ہوں، مگر ڈر سے اس کے باوجود میرا تعلق نہیں ٹوٹا۔ ماہ اکتوبر کا ڈر جلد مل گیا، قرآن کی باتیں، ہمیشہ کی طرح سب سے بہترین ہیں، کہانیوں میں اس بار بار کی طرح کچھ ریگولر لکھاریوں کی تحریریں موجود تھیں، جس میں عثمان غنی کی بدصورت ہے، کیا اتنی زبردست، فنٹاسٹک کہانی جس میں مسلسل روانی تھی، بھائی جی اس بار آپ نے ڈرا کر رکھ دیا، آپ کوئی بہت میچور قسم کے بندے ہوں، ڈر میں جہاں کبھی کبھار بچکانہ کہانیاں شایع ہوتی ہیں، وہاں اتنی میچورڈ اور خوبصورت تحریر کو دیکھ کر بے ساختہ حیرانی کے سوا کچھ نہیں ہوا، عمران قریشی کی پراسرار لڑکی بہترین کہانی تھی۔ یہ تو بہت خوبصورت بہترین اور منجی ہوئی کہانی تھی، آدم خور ایس امتیاز کی کہانی نے واقعی بہت زبردست معلومات سے آگاہی فراہم کر دی۔ نینا خان کی عبرت ناک بس اچھی رہی، باقی کہانیاں گزارے لائق تھیں۔ قسط وار میں عفریت نے بس اچھی شروعات کی ہے۔ مگر کہانی میں کوئی دم خم نظر نہیں آ رہا ہے، جان لیوا ٹھیک ہے، عثمان غنی سے گزارش ہے کہ کوئی قسط وار کہانی لکھیں، برفانی چڑیل، پہلے بھی شایع ہو چکی ہے، باقی نئے لکھاریوں کی کہانیاں بھی بہترین تھیں۔

☆☆ خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے بہت بہت شکریہ، امید ہے آئندہ ماہ بھی تبصرہ ارسال کر کے شکریہ کا موقع ضرور دیں گے۔

ایس امتیاز احمد کراچی سے، امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا! سالگرہ نمبر ہاتھوں میں ہے، ایک بار پھر مہنگائی کا تبدیلی کے ساتھ یقیناً تبدیلی آئی ہے۔ ٹائٹل کے خوب صورت سرورق کی جان حسینہ دلربا کے ساتھ "نائٹ میئر کے فریڈی" اچھے لگے۔ اسٹوری کا انتخاب لاجواب رہا۔ غزلیں عمدہ رہیں۔ مزید میٹرز ارسال خدمت ہیں پلیز قریبی اشاعت میں جگہ دیں۔ ایک سال میں دو

دفعہ مہنگائی کا جن بے قابو، ہماری طرف سے آپ کو اور دیگر اسٹاف اور "ڈر" کے تمام خوب صورت لکھنے والے رائٹرز اور تمام خوب صورت پڑھنے والے ویوورز کو دعا سلام۔ اپنا خیال رکھئے گا۔

☆☆ امتیاز صاحب: خوش ہو جائیں، "گونگا طاعون" جلوہ گر ہو گئی اور اب قوی امید ہے کہ کوئی اور اچھی سی کہانی جلد از جلد ارسال کریں گے۔ شکریہ۔ ابھی تبدیلی کے تحت مہنگائی کے کئی جن بے قابو ہوں گے بس دیکھتے ہیں۔

محمد طاہر اشتیاق ڈی جی خان سے، السلام علیکم! امید ہے کہ ڈر ڈائجسٹ کے تمام رائٹرز اور قارئین خیریت سے ہوں گے۔ ماہ اکتوبر کا شمارہ جب 23 ستمبر کو مارکیٹ سے خریدا تو پتا چلا کہ ڈائجسٹ کی قیمت 90 روپے ہو چکی ہے۔ اچانک تھوڑی حیرت سی محسوس ہوئی لیکن بعد میں مہنگائی بڑھنے کا بھی خیال آیا تو دکاندار کو قیمت ادا کر کے گھر چلا آیا۔ اس ماہ کے ڈر ڈائجسٹ کا سرورق بہت پسند آیا، جلدی سے ڈائجسٹ کھول کر اپنی کہانی کو تلاش کیا لیکن نہ ملی، بہت زیادہ دکھ ہوا۔ پھر قرآن کی باتیں پڑھیں۔ تو دل کو سکون محسوس ہوا۔ پھر خطوط کی جانب رخ کیا۔ سب رائٹرز کے بے لاگ تبصرے پڑھے اور پھر اچانک نظر میرے خط پر پڑی، میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ چلو کہانی نہ سہی لیکن ڈر ڈائجسٹ نے میرا خط تو شائع کیا اور میری کہانی بھی شائع کرنے کا دلاسہ دیا۔ اس کے بعد کہانیوں کا سلسلہ شروع کیا پراسرار لڑکی سے لے کر برفانی چڑیل تک تمام کہانیاں پڑھی، سب کہانیاں اپنی مثال آپ تھیں۔ دوسرے نمبر پر رہی اور تیسرے نمبر پر آخری نصیحت رہی۔ عامر شہزاد صاحب اور نینا خان صاحبہ میرے من پسند لکھاری بنتے جا رہے ہیں۔ اس کے بعد قوس قزح کا رخ کیا، ثانیہ شیر خان کے اشعار بے حد پسند آئے، پھر غزلوں پر نظر دوڑائی، محمد اسلم کی غزل اچھی لگی۔ آخر میں اللہ تعالیٰ سے میری یہی دعا ہے کہ وہ ڈر ڈائجسٹ فیملی کو قائم و دائم رکھے اور اس کے تمام رائٹرز اپنے قلم سے ایسی ہی شاہکار کہانیاں لکھتے رہیں۔

☆☆ طاہر صاحب: خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے ویری ویری تھینکس، خوش ہو جائیں، کہانی شائع ہو گئی اب آپ اپنی کہانیوں کے صفحات مزید بڑھا دیں۔

محمد خالد عباس ننکانہ صاحب سے، السلام علیکم! میری جانب سے تمام قارئین کو ڈر کی سالگرہ مبارک ہو، اکتوبر کا شمارہ بہت خوب صورت لگا، سب لوگوں نے عمدہ تبصرہ نگاری کی، بالخصوص ایس حبیب خان، مریم فاطمہ فلک زاہد، نینا خان، کائنات بلوچ، بلقیس خان، عامر شہزاد اور مہر پرویز احمد دولو صاحب بہترین رہے۔ نینا صاحبہ گزارش ہے کہ براہ مہربانی آپ ہر ماہ ضرور لکھا کریں۔ کہانیوں میں نینا خان کی عبرت ناک سب سے بہترین کہانی رہی، عامر شہزاد کی آخری نصیحت بھی عمدہ رہی فرح انیس کی ویران مکان بھی دل کو لگی۔ رشک نور نے بھی اچھی کہانی لکھی۔ مریم فاطمہ نے موم کی گڑیا، بہتر انداز سے پیش کی واقعی لالچ بری بلا ہوتی ہے نثار فاطمہ کی میلا پڑھ کر خوف محسوس ہوا، رابعہ عباس کی روح کا ملن، ایک باپ بیٹی کی محبت کو ظاہر کرتی ہے۔ گریٹ اسٹوری اقرا قریشی کی "آسیبی کہانیاں" بھی خوف میں مبتلا کرنے میں کامیاب رہی۔ ثانیہ شیر خان، عامر شہزاد، ایس حبیب خان، پروفیسر واجد، محمد اسلم، میری سب سے پسندیدہ شاعرہ نینا خان صاحبہ، رابعہ آفرین، فلک زاہد، نے عمدہ شاعری تخلیق کر کے میرا دل جیت لیا۔ آخر میں دعا ہے کہ ڈر ہمیشہ ترقی کرتا رہے۔

☆☆ خالد صاحب: ڈر ڈائجسٹ میں موسٹ ویلکم، آپ کی کہانی آئی مگر لیٹ آئی جس کی وجہ سے شائع ہونے سے رہ گئی، اس کے لئے معذرت، اگلے ماہ کہانی ضرور شائع ہوگی۔

محمد اسلم جاوید فیصل آباد سے، السلام علیکم! خیر و عافیت کے ساتھ حاضر ہوں، آج کل کام نہیں ہوتا، سوچا شہر کا دورہ کیا جائے، موسم بڑا خوشگوار تھا۔ واپسی پر بکسٹال پر آیا تو ماہ اکتوبر 2018ء سالگرہ نمبر سے اچانک ملاقات ہو گئی۔ دل کو بڑی خوشی ہوئی، سرورق پورے جوبن پر تھا، اندر جھانکا تو خوب صورت تحریروں سے دل خوشی سے پھولا نہ سمایا اداریہ پڑھ کر کے دل کو ذرا تشفی ہوئی، اس بار پرچے کے صفحات زیادہ تھے، قیمت پہلے سے زیادہ ہے خیر کوئی بات نہیں، قارئین اس بات کو برداشت کر لیں گے، آپ کی بھی کئی مجبوریاں ہیں اس مہنگائی میں ایسا کامیاب پرچہ نکالنا آپ ہی کا کام ہے۔ قبل از وقت ڈر ڈائجسٹ سے ہماری نظریں دو چار ہوئیں، آسمان پر بادل چھائے ہوئے بارش کا امکان ہے۔ آہستہ آہستہ سردی کا آغاز ہے زندگی کی گاڑی کو چلانا آج کل اس دور میں بہت مشکل ہے۔ ہر انسان پریشان دکھائی دیتا ہے۔ تمام سلسلے اپنی اپنی جگہ پر اچھے ہیں۔ قرآن کی باتیں، خطوط، غزلیں، قوس قزح کے اشعار

وغیرہ ان کہانیوں نے دل پر گہرے نقوش چھوڑے۔ انوکھی رات، پیاسی آتما، موم کی گڑیا، روح کا ملن، خونی مینار وغیرہ اچھی تحریریں تھیں۔ آپ جس خلوص اور محبت سے ہمیں یاد کرتے ہیں اس پر میں آپ کا بے حد ممنون ہوں، یہی جذبہ ہمیں آپ کو خط تحریر کرنے پر مائل ہوتا ہے، بے شک آپ ہم سے دور ہیں لیکن خط سے آدمی ملاقات ہو جاتی ہے۔ یہ واحد پرچہ ہے جس کا اپنا ایک الگ معیار ہے۔ غزل ارسال کر رہا ہوں، کسی قریبی شمارے میں جگہ دے دیں۔ اس کے لئے شکریہ۔ خطوط پڑھ کر ڈر ڈائجسٹ کے بارے میں قارئین کی رائے معلوم ہوتی ہے۔ اس سے پرچے کی مقبولیت کا پتہ چلتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اجازت دیں زندگی نے وفا کی تو ملاقات ہوگی۔

☆☆ آپ کا خط پڑھ کر دلی سکون ملتا ہے، آپ کی چاہت ڈر سے قابل دید ہے، اچھا انسان وہ ہے جو دوسروں کی خوشی میں خوش رہے، انسان اس دنیا سے کیا لے کر جاتا ہے۔ سب کچھ یہیں رہ جاتا ہے، صرف پیار محبت، اخلاق اور توکل اللہ ہی ساتھ جاتا ہے، خیر پرخلوص خط کا اگلے ماہ بھی انتظار رہے گا۔ شکریہ۔

اعجاز احمد کراچی سے، السلام علیکم! ڈر کا سالگرہ نمبر بہت شاندار تھا مگر اس کی مناسبت سے سرورق کچھ خاص نہیں لگا۔ اس مرتبہ ڈر کی قیمت بڑھ گئی مگر خوشی اس بات کی ہے کہ قارئین کے دل کو لبھاتا ڈر ہمیشہ کی طرح اپنے چاہنے والوں کے ہاتھ میں آتا رہے گا۔ جن لوگوں نے میرے گزشتہ تبصرے کو پسند کیا ان کا شکریہ، یہاں ایک اہم بات ڈر کی ایک رائٹر کے حوالے سے کہنا چاہوں گا کہ محترمہ فلک صاحبہ! تنقید کرنے کا ایک طریقہ کار ہوتا ہے آپ نے اپنے تبصرے میں ایک رائٹر کے بارے میں لکھا۔ "انگریزی کہانی لکھنا آپ کے بس کی بات نہیں ایک دوسری رائٹر کو الگ سنائیں، آپ نے کبھی اپنی تحریروں پر غور کیا ہے؟ چند کہانیاں چھپ جانے سے آپ پرفیکٹ نہیں ہو گئیں اور دوسروں کو کہنے سے پہلے انسان اپنی اصلاح ضرور کرے۔ کہانیوں میں "اسرار" اختتام پذیر ہوئی۔ خالد صاحب نے ایک عمدہ تحریر پیش کی جس نے 27 ماہ لوگوں کو اپنی گرفت میں جکڑے رکھا اس کے علاوہ "پراسرار لڑکی" "گمشدہ ممی" "آخری نصیحت" بدصورت، وعدہ خلافی، عبرت ناک انجام، آدم خور، انجام اور روحوں کا ملن بہترین تحریریں تھیں مگر سب سے زیادہ جس تحریر نے متاثر کیا وہ تھی مریم فاطمہ کی "موم کی گڑیا" میری بہن نے اس مرتبہ بہت ہی جاندار، شاندار اور اپنے روایتی انداز سے ہٹ کر نہایت ہی عمدہ تحریر پیش کی بہت خوب! اس مرتبہ سالگرہ نمبر میں سینئر رائٹرز کی کمی شدت سے محسوس ہوئی۔ نیز اس امید کے ساتھ اب اجازت چاہوں گا کہ میرا خط ردی کی ٹوکری کی نذر نہیں ہوگا۔

☆☆ اعجاز صاحب: چلئے آپ کا خط ردی کی ٹوکری کے حوالے نہیں ہوا۔ ایک اچھا آدمی ہمیشہ خیال کرتا ہے کہ "زباں شیریں اور ملک گیری" امید ہے رائٹر حضرات آپ کی باتوں پر غور کریں گے، دل میں نرم گوشہ رکھنے والا ہی ہر دل عزیز ہوتا ہے۔

شہزاد خان صادق آباد سے، جناب ایڈیٹر صاحب السلام علیکم! سب سے پہلے تو میں ڈر ڈائجسٹ کی تمام انتظامیہ کا تہہ دل سے مشکور ہوں جو ہم جیسے رائٹروں کی حوصلہ افزائی کر کے عزت بخشتے ہیں، اور آپ سب کی یوں عزت افزائی کی بدولت ہی رائٹرز حضرات میں مزید لکھنے کا شوق پیدا ہوتا ہے۔ میرے دل میں تمام نئے رائٹرز حضرات کی بہت عزت ہے۔ کسی قسم کی بھی کوئی تحریر جیسے شاعری، کہانی، نظم، غزل، شعر لکھنا خداداد صلاحیت ہوتی ہے یہ چیز سیکھنے سے نہیں آتی اس لئے ہمیں ان تمام رائٹرز حضرات کی عزت کرنی چاہئے جو اپنا وقت نکال کر قارئین کو پڑھنے کے لئے کچھ نہ کچھ پیش کرتے رہتے ہیں اس کا وسیلہ بنتے ہیں آپ جیسے مخلص اور جہاندیدہ لوگ۔ کسی بھی نامور میگزین، ڈائجسٹ یا رسالہ کی انتظامیہ کے لئے یہ ایک بہت بڑا رسک ہوتا ہے کہ وہ نئے رائٹرز حضرات کی تحاریر کو شائع کریں۔ لیکن یہ بات تسلیم کرنے سے بھی کوئی عار نہیں کہ کوئی بھی ماں کے پیٹ سے سیکھ کر نہیں آتا، وہ دنیا میں ہی سیکھتا ہے۔ آج ہم بڑے بڑے اور نامور رائٹرز حضرات کے ڈرامے، ناول، کہانیاں، سفرنامے جو بھی دیکھتے یا پڑھتے ہیں وہ پہلی سیڑھی چڑھ کر ہی آخری سیڑھی تک پہنچے ہیں۔ میری گمنام کہانیوں کو منظر عام تک لانے میں آپ کا کردار بہت اہمیت کا حامل ہے جس کے لئے میں آپ کا ہمیشہ مشکور رہوں گا۔ اللہ آپ کو ڈر ڈائجسٹ کی تمام انتظامیہ کو ہمیشہ خوش وخرم رکھے۔ آمین۔

☆☆ شہزاد صاحب: جب انسان دل لگا کر محنت کرتا ہے تو اس کا اجر ضرور ملتا ہے۔ اور ترقی کی سیڑھیاں چڑھنے والے ہمیشہ اپنے بڑوں کی سنتے ہیں تو وہ کامیاب ہوتے ہیں، خیر آپ کا خط پڑھ کر خوشی ہوئی اور امید ہے کہ ہر ماہ تبصرہ بھیج کر شکریہ کا موقع دیتے رہیں گے۔ Thanks۔

محسن عزیز حلیم کوٹھا کلاں سے، السلام علیکم! تمام ڈر اسٹاف ریڈرز اینڈ رائٹرز کو ہماری طرف سے محبت بھرا سلام،

سالگرہ نمبر اس بار وقت پر ہی مل گیا، ٹائٹل زبردست تھا، اس بار تو مجھے پکا یقین تھا کہ میری کہانی شامل اشاعت ہوگی پر نہیں۔ خیر اب بات ہو جائے اکتوبر کے شمارے کی تو سب سے پہلے خطوط کی محفل میں گئے ماہ روش ویلکم، آپی ایس حبیب ہیپی برتھ ڈے اللہ میاں آپ کی ہر خواہش پوری کرے، آپی بلقیس میں نے آپ کو اور آپ کی کہانیوں کو بہت یاد کیا تھا ویلکم بیک، آپی نینا خان، عامر شہزاد، آپی فلک زاہد، پرویز احمد دولو، حنیف شاکر کے تبصرے بہت پیارے تھے، کہانیوں میں "پراسرار لڑکی" عمران قریشی ویری گڈ، انوکھی رات صائمہ شاہد ویری نائس، پیاسی آتما ملک فہیم ارشاد سپرہٹ گمشدہ ممی فیورٹ زبردست، آخری نصیحت عامر شہزاد گڈ، بصورت عثمان غنی ویری نائس، خونی آپ بیتی رشک نور ویری سپرہٹ، ویران مکان فرح انیس بہت زبردست، خوفناک منظر فیصل مشتاق گڈ، وعدہ خلافی محمد رضوان قیوم ویری نائس، خونی کتاب شہزاد خان ویری گڈ، عبرتناک انجام نینا خان شاندار، آدم خور امتیاز احمد گڈ، انجام پرویز احمد بہت اچھے ویسے ٹاپک پرانا تھا، روحوں کا ملن آپی رابعہ عباس بہت زبردست، میلا نثار فاطمہ گڈ، جنم دن محمد شعیب گڈ، آسیبی کہانیاں اقراء قریشی ویری نائس، ایک صدی بعد فیصل ندیم ساحل گڈ، موت کا انتظار عمیر علی گڈ باقی تمام کہانیاں شاندار رہیں۔ میری دعا ہے کہ ڈر ڈائجسٹ مزید ترقی کرے۔

☆☆ محسن صاحب: ہماری اور قارئین کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو کلی صحت عطا کرے، چلئے خوش ہو جائیں ارسال کردہ کہانی جلوہ گر ہوگئی اور اب قوی امید ہے کہ نئی کہانی جلد ارسال کریں گے، آہستہ آہستہ لکھتے رہیں، دس پندرہ دن میں مکمل ہو جائے گی، اور اس طرح آپ کے شوق کی تکمیل ہوگی۔" Thanks۔

عامر شہزاد ننکانہ صاحب سے، محترم ایڈیٹرز، اسٹاف، رائٹرز، شعراء اور قارئین السلام علیکم! سب سے پہلے میری طرف سے سب کو "ڈر" کی سالگرہ مبارک ہو۔ سالگرہ نمبر میں میری کہانی شعر، خط اور غزل شائع کرنے پر ادارہ کا شکریہ، ٹائٹل بیج خوفناک اور جاندار لگا اور یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اس شمارے میں چھبیس کہانیاں پڑھنے کو ملیں۔ ہمیشہ کی طرح قرآنی صفحہ پڑھنے سے روح کو سکون ملا۔ محترم خالد صاحب آپ بے فکر رہیں، نوے روپے کے بجائے قیمت ڈبل بھی ہو جائے، تب بھی کوئی مسئلہ نہیں، بس ڈر چلتا رہنا چاہئے۔ ایس حبیب صاحبہ احوال میں مسند صدارت پر فائز ہیں، پختہ سوچ، دھیما لہجہ اور مفصل انداز دل کو بھا گیا، مریم فاطمہ صاحبہ آپ کا خط بھی اچھا لگا، فلک زاہدہ صاحبہ آپ کی کتاب "15 پراسرار کہانیاں" شائع ہونے پر آپ کو میری طرف سے دلی مبارکباد، آپ گریٹ رائٹر ہیں، نینا خان صاحبہ آپ کا اسلوب بیان منفرد اور جامع ہیں۔ یو آر گریٹ، ایس امتیاز صاحب براہ مہربانی بھرپور تبصرے کے ساتھ تشریف لایا کریں۔ سب آپ کے تبصرے کو مس کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ ماہ روش، عمرانہ سرور، نثار فاطمہ، مسز خائستہ رحمان، کائنات بلوچ، امرحہ خان، بلقیس خان، محمد طاہر اشتیاق، عثمان غنی اور بلال تابش نے عمدہ تبصرہ نگاری کی۔ محترم پرویز احمد دولو صاحب آپ سے پیار بھری گزارش ہے کہ آپ ہر ماہ لازماً "ڈر" میں تشریف لایا کریں۔ کیونکہ "تو جو نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں ہے یہ مانا کہ محفل جواں ہے حسین ہے" کہانیوں میں رشک نور نے "خونی آپ بیتی" میں ثابت کر دیا کہ مجرم کوئی بھی ہو اسے سزا ضرور ملنی چاہئے۔ فرح انیس کی "ویران مکان" پڑھ کر دل لرز اٹھا۔ مریم فاطمہ کی کہانی سے ظاہر ہوا کہ لالچ انسان کو تباہ کر دیتی ہے۔ رابعہ عباس کی کہانی پڑھ کر آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ آپ نے اس میں معاشرتی المیہ ظاہر کر کے لوگوں کی آنکھیں کھول دیں۔ نینا خان ہمیشہ کی طرح منفرد اور خوفناک کہانی تخلیق کرنے میں کامیاب رہی۔ نیز "پراسرار لڑکی" "انوکھی رات" "پیاسی آتما" "گمشدہ ممی" "بدصورت" "خوفناک منظر" "وعدہ خلافی" "خونی کتاب" "انجام" "خونی مینار" "میلا" "جنم دن" "آسیبی کہانیاں" "ایک صدی بعد" "موت کا انتظار" اور "برفانی چڑیل" عمدہ لگیں۔ قسط وار کہانیاں بھی بہترین ہیں۔ تانیہ شیر خان، مہر پرویز صاحب، عثمان غنی، ایس حبیب صاحبہ، پروفیسر صاحب، دور حاضر کی بہترین شاعرہ نینا خان، رابعہ عباس، فلک زاہد اور ساحل ابڑو نے عمدہ اور منفرد شاعری تخلیق کی مگر فلک زاہد صاحبہ سب پر بازی لے گئیں۔ طارق عمر دراز، عاشر اور ذکاء اللہ بھٹی نے بھی خوب لکھا۔ دعائے خیر ہے کہ پاکستان کا نمبر ون "ڈر ڈائجسٹ" کا اقبال ہمیشہ بلند رہے۔ (آمین)

☆☆ عامر صاحب: قلبی لگاؤ سے لکھا ہوا خط پڑھ کر خوشی ہوئی، اور اب قوی امید ہے کہ ہر ماہ تبصرہ کے لئے ڈھیروں شکریہ قبول کریں، اور ساتھ ہی نئی کہانی بھی جلد از جلد ارسال کریں۔

☆☆



موت کا بلاوا

نینا خان۔ کراچی

سامنے کھڑی روح کی انگارہ آنکھیں دہشت پھیلا رہی تھیں، ایسا لگ رہا تھا کہ آج وہ پوری دنیا کو تہس نہس کرکے رکھ دے گی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے......

دل ودماغ کو فرحت بخشتی......دل فریفتہ اور دل گرفتہ خونچکاں......بھونچکاں کہانی

"پورے ریسٹ ہاؤس کا سروے کروانے کے بعد ایک کمرے کے سامنے رکتے ہوئے کریم الدین بولا۔

"منیجر صاحب یہ ہے آپ کا کمرہ، آج سے آپ اسی کمرے میں رہیں گے۔ میں آپ کا سوٹ کیس اندر لا کر رکھ دوں۔"

"نہیں میں رکھ لوں گا۔ کریم بابا، اتنے بڑے ریسٹ ہاؤس میں اب تک مجھے کوئی نظر نہیں آیا۔ کیا یہاں کوئی آتا نہیں ہے......؟"

کریم الدین مسکراتے ہوئے بولا۔

"منیجر صاحب میں اس ریسٹ ہاؤس کا چوکیدار ہوں۔ میری بیوی اور بیٹی کھانا بنانے کا کام کرتی ہیں۔ ایک بیٹا ہے جو میرے ساتھ مل کر پورے ریسٹ ہاؤس کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ سامنے بستی سے کچھ لوگ آجاتے ہیں، جن سے میں صفائی ستھرائی کا کام کرواتا ہوں۔ گرمیوں کے موسم میں بہت سے لوگ چھٹیاں گزارنے اور یہاں کے خوشگوار موسم اور ہریالے علاقے سے لطف اندوز ہونے کے لئے آتے ہیں، یہاں، بہتی آبشاریں، مہکتی ہوائیں، رم جھم لوگوں کو بہت متاثر کرتی ہیں۔ موسم ذرا ٹھنڈا ہے نا، اس لئے ابھی کوئی نہیں آیا۔ آپ آرام کریں، میں ابھی اپنے بیٹے رحیم الدین کے ہاتھ کافی بنا کر بھجواتا ہوں۔

"کریم بابا واقعی اس ٹھنڈی رات میں کافی کی بہت طلب ہو رہی ہے۔ میں اپنا سامان الماری میں رکھتا ہوں آپ جلدی کافی بھجوادیں۔"

"خاور نے اپنا کمرہ کھولا ہی تھا کہ اندرونی کمرہ دیکھ کر وہ بہت خوش ہوگیا۔ کیونکہ کمرہ بہت ہی خوب صورت تھا اور پھر کھڑکی کھولتے ہی ٹھنڈی مہکتی فضاؤں نے اس کا سواگت کیا۔ کچھ دیر تک ٹھنڈی ہوا سے لطف اندوز ہو کر وہ بالکنی سے ریسٹ ہاؤس کے وسیع ترین لان کو دیکھ رہا تھا۔ رات کا اندھیرا پورے لان میں چاند کی روشنی اور سفید لائٹوں سے ہرا بھرا لان و پیڑ پودے درخت بہت خوب صورت اور پرسکون سا منظر پیش کر رہے تھے۔

خاور اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے بعد بھی اچھی جاب حاصل کرنے میں ناکام رہا تھا۔ روز روز کے آفس کے دھکے کھا کھا کر انٹرویو دے دے کر بری طرح سے تنگ آچکا تھا۔ اماں ابا کی اکلوتی اولاد ہونے کی وجہ سے ذمہ داری کا احساس بھی مارے جاتا تھا کہ ابا اس عمر میں بھی جاب کر رہے ہیں۔ ابا سرکاری ملازم ہیں جبھی

خاور نے ان کی جاب چھوڑنے کی بات نہیں کی تھی۔ اس کی ایک وجہ خاور کو جاب نہ ملنا بھی تھی۔

ابا کے دوست کا ایک ریسٹ ہاؤس شہر سے دور علاقے میں تھا۔ ابا کے دوست نے جب جاب کی آفر دی تو ابا کے کہنے پر خاور اپنے اماں ابا سے دور آنے پر راضی ہوگیا تھا۔ سیلری بھی ٹھیک ٹھاک تھی۔ رہائش بھی اچھی، اماں ابا بھی خوش تھے، پر خاور اداس تھا کہ اسے ابا اماں سے دور رہنا پڑے گا۔

پر یہاں کا خوشگوار اور دلکش ماحول نے خاور کے دماغ پر مثبت اثرات مرتب کئے وہ من ہی من میں بے حد خوش تھا کہ اس کا یہاں آنے کا فیصلہ اچھا رہا۔

ابھی خاور انہی سوچوں میں گم تھا کہ دروازے پر کسی نے دستک دی۔ خاور اپنی سوچوں کی دنیا سے باہر آیا تو اسے ٹھنڈ کا بھی بہت احساس ہوا۔ اس نے فوراً دروازہ کھولا تو سامنے ایک نوجوان کھڑا تھا۔ پھر نوجوان نے جھٹ سلام یا، نوجوان ہاتھ میں کافی کا کپ دیکھ کر خاور سمجھ گیا کہ یہ رحیم الدین ہے۔ خاور نے سلام کا جواب دیا۔

اور بولا۔ ’’اندر آؤ۔‘‘

’’منیجر صاحب میرا نام رحیم الدین ہے، ابا نے آپ سے میرا ذکر کیا ہوگا۔‘‘

’’ہاں کریم بابا نے بتایا ہے۔ بیٹھو سچ پوچھو تو بہت طلب تھی کافی کی۔ بہت ٹھنڈ ہے۔ اس علاقے میں۔‘‘

’’جی صاحب یہ علاقہ ہے ہی بہت ٹھنڈا آپ ذرا اپنا خیال کیجئے گا۔‘‘

’’رحیم اگر کل صبح کام سے فارغ ہونے کے بعد تم مجھے اس علاقے کی سیر کرواؤ تو کیا ایسا ممکن ہے......‘‘

’’کیوں نہیں صاحب پورے ریسٹ ہاؤس کی صاف صفائی کروا کر فری ہوتے ہی میں آپ کو لے چلوں گا۔ اچھا اب آپ آرام کریں۔ رات کافی گہری ہوگئی ہے۔ میں چلتا ہوں۔ صبح ملتے ہیں۔‘‘

’’گڈ نائیٹ رحیم، اتنی ٹیسٹی کافی کے لئے شکریہ۔‘‘

’’جی یہ کافی تو میری بہن نازنین نے بنائی ہے۔ صاحب وہ کھانے بھی بہت ٹیسٹی بناتی ہے۔ بالکل میری اماں کی طرح دونوں مل کر بناتی ہیں۔‘‘

خاور مسکراتے ہوئے بولا۔ ’’اچھا اب تم بھی جا کر آرام کرو۔‘‘ اور اس کے بعد رحیم کمرے سے نکلتا چلا گیا۔‘‘

☆......☆......☆

’’اگلے دن صبح فریش ہو کر جب خاور اپنے کمرے سے ہال میں آیا تو ہال میں رکھے ٹیبل اور کرسیوں کو بہت خوب صورتی سے سجا کر صاف ستھرا رکھا ہوا تھا۔ پرسکون صاف ستھرا ماحول خاور کے دل کو بھا رہا تھا۔ زندگی کی تلخیاں بھول کر وہ دماغی طور پر سکون محسوس کر رہا تھا۔ کھلی ٹھنڈی ہوا اسے بہت متاثر کر رہی تھی۔ چاروں طرف گلاس وال جس سے لان کا نظارا دکھائی دے رہا تھا بہت دلکش معلوم ہو رہا تھا۔

ابھی خاور نظاروں میں کھویا ہوا ہی تھا کہ اس کی سماعتوں سے ایک نسوانی دلفریب آواز ٹکرائی تو اس نے چونکتے ہوئے آواز کی سمت دیکھا تو سامنے بہت خوب صورت ایک دوشیزہ کھڑی تھی۔ خاور اسے دیکھ کر چونک گیا کیونکہ اس دوشیزہ کی پرکشش آنکھیں اسے ماضی میں لے گئیں۔

جب وہ یونیورسٹی میں تھا۔ جہاں اس کی دوستی عائمہ سے ہوئی تھی، عائمہ اسے پہلی نظر میں پسند آ گئی تھی، عائمہ کی پرکشش آنکھوں میں وہ ایسے ڈوبا تھا کہ اب تک ان آنکھوں سے رہائی ممکن نہیں ہوئی تھی۔ خاور اس دوشیزہ کی آنکھوں میں پوری طرح سے عائمہ کو کھوجنے کی کوشش کر رہا تھا کہ کریم بابا کی آواز سے چونک اٹھا......

’’منیجر صاحب یہ میری بیٹی گل رعنا ہے۔ ہم اسے گل کہتے ہیں۔ گل نے ناشتہ لگا دیا ہے۔ آپ ٹیبل پر جائیں ناشتہ کرلیں۔‘‘

کرسی پر بیٹھتے ہوئے خاور نے ایک سرسری سی نظر

گل پر ڈالی تو وہ جھینپ سی گئی اور فوراً ہی کچن میں چلی گئی۔

☆......☆......☆

بابا آپ سے ایک بات پوچھ سکتا ہوں۔

’’خاور نے ریسپشن پر فائل رکھتے ہوئے سامنے سے آتے ہوئے کریم بابا کو روکتے ہوئے کہا۔

’’جی کہیں۔‘‘

’’بابا رات پچھلے پہر کسی عورت کے رونے کی آواز سنائی دی۔ میں نے اپنے کمرے سے نکل کر دیکھا مگر تعجب کی بات ہے کہ میں آواز کی سمت کا تعین نہ کرسکا۔ کہیں آپ کے گھر......‘‘

خاور کی بات کاٹتے ہوئے فوراً ہی کریم الدین نے کہا۔

’’بیٹا آپ یہاں نئے ہو اس لئے رات کے وقت اپنے کمرے سے نہ نکلا کرو۔ آہستہ آہستہ سب کچھ سمجھ جاؤ گے۔ اچھا بیٹا مجھے ذرا کام ہے میں چلتا ہوں۔‘‘

’’کریم بابا کی گول مول بات نے خاور کو الجھا سا دیا تھا۔ خاور نے اگنور کرتے ہوئے پھر سے فائلوں میں دھیان دینا شروع کردیا۔

☆......☆......☆

’’رات کا کھانا کھا کر خاور پچھلے ریکارڈ کو چیک کر رہا تھا کہ ریسپشن کے سائیڈ پر رکھے کمپیوٹر کی اسکرین سے نظر اٹھا کر دیکھا تو سامنے گل کھڑی تھی، اس کے ہاتھ میں کافی کا کپ تھا، خاور نے پھر سے اس کی مدہوش اور اپنی جانب کھینچنے والی آنکھوں میں عائمہ کو تلاش کرنا شروع کردیا تو گل نے گھبراتے ہوئے کہا۔

’’صاحب آپ اس طرح ہی سب لڑکیوں کو گھور کر دیکھتے ہیں۔‘‘

گل کی اس بات پر شرمندہ ہو کر نظریں جھکاتے ہوئے خاور گویا ہوا۔

نہیں ایسی بات ہرگز نہیں ہے۔ آپ مجھے غلط سمجھ رہی ہیں۔ میں مانتا ہوں کہ میری یہ حرکت نازیبا ہے۔ میں اس حرکت کے لئے آپ سے معذرت کرتا ہوں۔ آپ شاید یقین نہ کریں مگر حقیقت یہ ہے کہ آپ کی آنکھیں مجھے اپنی ایک دوست کی یاد دلاتی ہیں۔ آپ کی آنکھیں بالکل اس کی آنکھوں کی طرح گہری بڑی اور خوب صورت ہیں۔ جن کے سحر سے میرے لئے نکلنا مشکل ہے۔ میں آج تک اس کے سحر سے نہ نکل پایا۔ اسے بھلانے کی کوشش کی۔ اتنی دور چلا آیا کہ اس کی یادیں مجھے تنگ نہ کریں لیکن آج پھر سے مجھے آپ نے اس کی یاد تازہ کروادی۔‘‘

’’یعنی آپ محبت کرتے تھے اس لڑکی سے۔‘‘

’’تھے سے کیا مطلب ہے گل میں تو آج بھی اس سے بے پناہ محبت کرتا ہوں۔‘‘

’’اچھا تو پھر اس سے دور کیوں چلے آئے۔‘‘

’’میرے بس میں ہوتا اگر گل تو میں ایک پل بھی اس سے دور نہ ہوتا مگر وہ تو......‘‘

خاور کی ادھوری بات سے بے چین ہوتے ہوئے گل نے پوچھا۔

’’مگر کیا صاحب۔‘‘

’’چھوڑو گل۔ آپ بھی کیا سوچ رہی ہوں گی کہ میں کیسی باتیں کرنے لگ گیا آپ سے۔‘‘

’’نہیں صاحب آپ مجھ سے کرسکتے ہیں باتیں۔ اب تو ہمارا روز کا ملنا ہوگا۔ بتائیں نا صاحب جب آپ اس لڑکی سے اتنی محبت کرتے تھے تو پھر دور کیوں چلے آئے۔‘‘

’’میں اس سے دور نہیں آیا گل وہ تو مجھ سے محبت ہی نہیں کرتی تھی۔ ایچولی میں، امتیاز اور عائمہ تینوں بہت اچھے دوست تھے، یونیورسٹی میں ہم ایک ساتھ ہی ہوتے تھے، میں تو پہلے دن سے ہی عائمہ پر مرمٹا تھا بس کبھی ہمت نہیں ہوئی کہ اس سے اپنے دل کی بات کرسکوں اس لئے امتیاز کا سہارا لیا۔ لیکن امتیاز نے مجھے دھوکا دیا اور خود عائمہ کو جا کر پرپوز کردیا۔ کیونکہ عائمہ اور امتیاز کا تعلق امیر گھرانے سے تھا، دونوں کے گھر والوں کو کوئی اعتراض نہ ہوا اور یونیورسٹی کی پڑھائی ختم ہوتے ہی ان کی شادی ہوگئی اور عائمہ آج بھی

میرے دل کی بات سے اور میری شدت محبت سے انجان ہے۔"

خاور کی آنکھیں نم ہوچکی تھیں اپنی داستان محبت گل کو بتاتے ہوئے، گل نے خاور کے آنسو دیکھتے ہوئے مزید پوچھا۔

"صاحب جب آپ کے دوست کو معلوم تھا کہ آپ عائمہ سے محبت کرتے ہیں تو پھر اس نے آپ کے ساتھ ایسا کیوں کیا۔"

"گل امتیاز کے اس دھوکے پر میں بہت پریشان ہوا تھا۔ تمہیں پتا ہے امتیاز نے مجھے کس طرح دھوکہ دیا۔ میں اپنے دل کی بات ایک پیپر پر لکھ کر عائمہ کو امتیاز کے ہاتھ بھجواتا تھا۔ نئی نئی غزلیں، رومینٹک سی شاعری، والہانہ محبت اور والہانہ جذبات لکھتا تھا۔ عائمہ میرے لکھے ہر لفظ پر فدا تھی۔ مجھے لگا کہ اب عائمہ سے میں خود اپنے دل کی بات کروں گا۔

تو جانتی ہو اس دن کیا ہوا۔

خاور اتنا کہہ کر خاموش ہوگیا۔ اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

گل کی بے چینی مزید بڑھنے لگی اس نے بیتابی سے خاور کی نم آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"بتائیے نا صاحب اس دن کیا ہوا تھا۔ جب آپ اپنے دل کی بات عائمہ سے کرنے گئے تو......"

"عائمہ نے مجھے دوست ہونے کے ناطے بلوکلر کی ایک شرٹ میری برتھ ڈے پر گفٹ کی تھی، میں وہ شرٹ پہن کر پرفیوم لگا کر اچھی طرح سے ویل ڈریس ہوکر یونیورسٹی پہنچا۔ یونیورسٹی کے پارک میں جب میں عائمہ کا ویٹ کررہا تھا کہ آج میں اسے اپنی محبت کا اظہار کرکے صدا کے لئے اپنا بنالوں گا۔

عائمہ اور امتیاز میرے پاس آگئے۔ عائمہ اور امتیاز بہت خوش تھے۔ عائمہ نے اپنی خوشی شیئر کرتے ہوئے کہا۔

"خاور آج میں بہت خوش ہوں اور اپنی خوشی آج تم سے شیئر کرنا چاہتی ہوں۔ کیونکہ تم میرے سب سے اچھے دوست ہو۔"

"کمال کی بات ہے عائمہ آج میں بھی بہت خوش ہوں اور تم سے اپنے دل کی بات میں بھی شیئر کرکے ہی رہوں گا۔"

"میری بات سنتے ہی امتیاز نے فوراً میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"خاور لیڈیز فرسٹ۔ پہلے عائمہ اپنے دل کی بات شیئر کرے گی بعد میں تم۔"

"امتیاز اس میں حرج ہی کیا ہے اگر پہلے خاور اپنی بات کرلے ویسے بھی ہم تینوں دوست ہیں۔ ہم میں بھلا یہ فارمیلٹی (Formality) کیوں۔ تم بتاؤ خاور پہلے کیا بات کرنا چاہتے ہو۔" امتیاز نے کہا۔

"یار یہ ہماری لائف کی اتنی بڑی خوشی ہے۔ پہلے ہمارا حق ہے۔ شیئر کرنے کا اور ویسے بھی خاور ہمارا دوست ہے اسے ہمارے بارے میں جاننے کا پورا پورا حق ہے۔"

امتیاز کی اس بات نے مجھے چونکنے پر مجبور کردیا میں نے حیران ہوتے ہوئے عائمہ سے پوچھا۔

"ہمارے بارے میں کیا مطلب۔" امتیاز میں کچھ سمجھا نہیں۔

عائمہ نے خوش ہوتے ہوئے امتیاز کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔

"خاور وی آر انگیجڈ۔" ہمارے گھر والوں نے بھی ہمارے رشتے اور محبت کو قبول کرلیا ہے۔ ایگزام کے بعد ہم شادی کرنے والے ہیں۔"

عائمہ کی یہ بات میرے لئے قیامت سے کم نہ تھی۔ میں حیران اور پریشان ہوکر امتیاز کو دیکھ رہا تھا۔ امتیاز نے میرے قریب آکر میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"یار خاور مجھے پتا نہیں چلا کہ کب مجھے عائمہ سے محبت ہوگئی۔ عائمہ کی جھیل جیسی گہری آنکھوں میں، میں ڈوبتا ہی چلا گیا۔ سچ میں پتا ہی نہیں چلا۔ عائمہ کی خوب صورتی اس کا انداز بولنا چلنا ہنسنا کب میرے دل

میں اتر گیا۔ مجھے اندازہ بھی نہیں ہوا اور مجھے عائمہ سے محبت ہوگئی۔

میں امتیاز کو حیرت زدہ ہوکر دیکھ رہا تھا۔ کیوں کہ امتیاز وہ سب بول رہا تھا جو میں نے امتیاز کو بتایا تھا۔ عائمہ کے لئے اپنے احساسات اپنے جذبات یہ تمام باتیں تو میں نے امتیاز سے کہی تھیں، پھر وہ میری ہی باتیں میرے ہی سامنے عائمہ کے لئے اپنے الفاظ بنا کر ادا کررہا تھا۔ مین ابھی حیران اور پریشانی کے عالم میں امتیاز کو دیکھ ہی رہا تھا کہ عائمہ نے مجھے زور سے ہلاتے ہوئے کہا۔

"کردیا نہ ہم دونوں نے تمہیں حیران۔ یونو خاور (You Know) میں تو امتیاز سے کہہ رہی تھی کہ ہم تینوں بیسٹ فرینڈز ہیں، ہمیں تو بتا دینا چاہئے۔ مگر امتیاز نے منع کردیا۔ امتیاز تمہیں سرپرائز دینا چاہتا تھا۔ دیکھو تم ہوگئے نا سرپرائزڈ۔"

میں نے اپنے آنسو ضبط کرتے امتیاز کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں سچ میں، میں بہت سرپرائزڈ ہوں، میرے بیسٹ فریڈز نے مجھے حقیقت میں آج سرپرائزڈ کرڈالا، ویسے عائمہ مجھے تم سے یہ امید نہ تھی تم تو میری بیسٹ فرینڈ ہو پھر تم نے امتیاز کی باتوں میں آکر مجھے بتایا کیوں نہیں۔"

"عائمہ کو میں نے منع کیا تھا خاور تمہیں حیران دیکھنے کے لئے میرا مطلب ہے سرپرائز دینے کے لئے۔ ہم ایگزام کے بعد شادی کرنے والے ہیں، ہماری شادی میں ہمارے دوست کا ہونا بہت ضروری ہے۔"

"خاور تم اب تو حیران اور پریشان ہونا بند کرو۔ یار تم ہمارے بیسٹ فرینڈز ہو وہ بھی اکلوتے ہمیں مبارکباد نہیں دوگے۔"

عائمہ کی اس بات پر میں نے امتیاز پر غصے کی نظر ڈالتے ہوئے عائمہ سے پوچھا۔

"امتیاز نے تم سے اپنی محبت کا اظہار کب کیا۔"

"یار خاور مت پوچھو مجھے کبھی ایسا لگا ہی نہیں یہ امتیاز بھی اتنا رومینٹک ہوسکتا ہے۔ کیا لیٹرز لکھے کیا باتیں، کیا شاعری، اف وہ انداز وہ جذبات وہ احساسات میں تو قائل ہی ہوگئی سچ کہو تو مجھے بھی امتیاز جیسے روکھے پھیکے لڑکے سے محبت نہ ہوتی۔ مگر امتیاز اتنا رومینٹک ہوگا میں تصور بھی نہ کرسکتی تھی۔ بس اس کی باتوں کو پڑھ کر اس کے جذبات کو جان کر مجھے اس سے محبت ہوگئی۔"

"اب سمجھا میں کہ تمہیں امتیاز سے محبت کیوں ہوئی میں سوچ بھی نہیں سکتا......"

میری بات کو کاٹتے ہوئے جلدی سے امتیاز بولا......

"اب بس کرو یار یہ شکوے شکایتیں۔ اس ویک اینڈ پر ہماری فیملی نے انگیج منٹ پارٹی رکھی ہے تم نے آنا ہے خاور کلاس کا ٹائم ہوگیا۔ آئی تھنک ہمیں کلاس لینی چاہئے۔"

اپنی داستان سنانے کے بعد خاور چپ ہوگیا۔ تو گل نے آگے بڑھ کر اس سے پوچھا۔

"صاحب آپ نے عائمہ کو پھر حقیقت کیوں نہیں بتائی، عائمہ کی محبت تو آپ ہوئے نا، کیوں کہ عائمہ کو تو محبت ان خطوں کے ذریعے ہوئی جسے آپ نے لکھا تھا۔ امتیاز نے تو دھوکے سے عائمہ کی محبت حاصل کی تھی۔ آپ کو عائمہ کو بتانا چاہئے تھا۔"

"کیسے بتاتا گل اس دن کے بعد سے ہمارے ایگزام اسٹارٹ ہوگئے تھے ہم اپنی پڑھائی میں مصروف ہوگئے۔ ان کی انگیج منٹ پارٹی میں، میں گیا تھا تاکہ عائمہ کو حقیقت سے آگاہ کرسکوں۔ لیکن امتیاز نے مجھے پارٹی میں ایک روم میں لے جا کر کہا۔

"میں جانتا ہوں خاور تجھے بہت غصہ ہے مجھ پر، پر میرا یقین کر دوست میں نہیں چاہتا تھا کہ تجھے دھوکہ دوں تو جب جب عائمہ کی تعریف کرتا تھا میں بھی عائمہ کو اسی نظر سے دیکھتا تھا۔ عائمہ مجھے بھی اچھی لگنے لگی تھی میں نے تیرے لیٹرز اپنے نام سے عائمہ کو دیئے،

عائمہ بھی مجھ سے محبت کرنے لگ گئی۔ عائمہ بہت اچھی لڑکی ہے اور بہت پیاری میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ خاور تو چلا جا ہماری لائف سے۔"

"کیسے چلا جاؤں، تو نے مجھے ہی نہیں بلکہ عائمہ کو بھی دھوکہ دیا ہے۔ عائمہ تجھ سے نہیں مجھ سے محبت کرتی ہے۔ وہ لیٹرز جس کی وجہ سے عائمہ کو محبت ہوئی وہ تو نے نہیں میں نے لکھے تھے میں عائمہ کو یہ بات آج بتادوں گا آج تیرا دھوکہ کھل کر عائمہ کے سامنے آجائے گا۔"

"خاور تو ایسا ہرگز نہیں کرے گا اور ویسے بھی تیرے پاس ہے ہی کیا۔ چھوٹا سا گھر۔ نہ کار ہے بس ایک بائیک ہے۔ اس پر لے کر جایا کرے گا عائمہ کو۔ عائمہ کا تعلق امیر گھرانے سے ہے اور میرا تعلق بھی۔ میں عائمہ کو وہ تمام خوشیاں دے سکتا ہوں جو تو اسے نہیں دے سکتا۔ اس لئے عائمہ کی خوشی کی خاطر تو ہماری زندگی سے دور چلا جا ورنہ میں عائمہ کی خاطر کچھ بھی کرگزروں گا۔"

"بہت کم ظرف ہے تو امتیاز، محبت کو دولت سے تول رہا ہے۔ جب محبت ہوتی ہے نا تو حالات کا سامنا کرلیا جاتا ہے۔ اور عائمہ میری محبت ہی نہیں بہت اچھی دوست بھی ہے میں اسے اچھی طرح سے جانتا ہوں۔ وہ دولت پر مرنے والی نہیں ہے۔ وہ تو ایک سچا دل رکھنے والی لڑکی ہے۔ میں بھی دیکھتا ہوں کہ تو اپنی انگیجمنٹ کیسے کرتا ہے۔"

امتیاز کے پاپا باہر روم کے کھڑے ہوئے ہماری باتوں کو سن رہے تھے۔ امتیاز کے بلانے پر روم میں انٹر ہوتے ہی انہوں نے پولیس کو بلالیا۔

"انسپکٹر جلدی سے اندر آجاؤ اور اسے گرفتار کرکے لے جاؤ ہمارے گھر گھس کر چوری کرنے کے الزام میں اسے لاک اپ میں رکھنا، اس کے پاس سے ہمارے گھر کے یہ زیورات برآمد ہوئے۔ یہ تمام زیورات اٹھاؤ اور اسے محفل میں سے گزار کر لیتے جاؤ۔ جلدی کرو انسپکٹر۔"

"عائمہ نے جب میرے ہاتھوں میں ہتھکڑی اور زیورات برآمد کئے ہوئے دیکھے تو اس کا دل ٹوٹ گیا وہ بہت روئی یہ کہہ کر......"

"خاور مجھے تم سے یہ امید ہرگز نہ تھی۔ تم نے ہماری دوستی کو شرمندہ کیا ہے۔ آج کے بعد میں تم سے کوئی دوستی نہیں رکھوں گی۔ میں یہ بھول جاؤں گی کہ تم کبھی میرے دوست بھی ہوا کرتے تھے۔ چلے جاؤ یہاں سے۔"

میں اپنی بے بسی پر آنسو بہاتے رہ گیا۔ چند دن لاک اپ میں رہا۔ میرے اماں ابا پریشان ہوتے رہے جب گھر گیا تو ابا نے خوب ڈانٹا۔ میں چپ چاپ سب کچھ سنتا رہا۔ اندر سے بری طرح ٹوٹ چکا تھا۔ میرے اپنے ہی بیسٹ فریڈز نے مجھے اتنا بڑا دھوکہ دیا تھا۔ ایگزام کے دوران جب جب میری عائمہ سے ملاقات ہوئی۔ میں نے بات کرنا چاہی لیکن امتیاز ہمارے درمیان حائل رہا، عائمہ بھی نفرت کی نظر سے مجھے دیکھتی تھی مجھ سے برداشت نہ ہوتا تھا۔ ایگزام بڑی مشکل سے دیئے۔ اس کے بعد ان کی شادی کی خبر سننے کو ملی وہ دونوں ملک سے باہر چلے گئے اور میں نے جاب ڈھونڈنے کی ہر ممکن کوشش کی مگر امتیاز کے پاپا راشد انکل نے میری جاب کہیں لگنے ہی نہ دی۔

ابا کے ایک دوست یعنی انور انکل اس ریسٹ ہاؤس کے مالک نے مجھے جب یہاں منیجر کی پوسٹ آفر کی تو میں یہاں آگیا۔ سچ کہوں تو ابا اماں کو چھوڑ کر آنا نہیں چاہتا تھا۔ مگر دل اتنا ٹوٹ چکا ہے کہ سب سے دور یہاں آگیا۔ اور مجھے نہیں پتا میں تم سے اتنی باتیں کیوں کررہا ہوں۔ یونیورسٹی کے بعد آج میں نے یہ تمام باتیں کسی سے شیئر کی ہیں۔ پر تم سے بات کرکے اچھا لگا۔ دل کا بوجھ کچھ کم ہوا ہے۔"

خاور کی باتیں سن کر گل نے ہمدردی جتانے کے انداز میں کہا۔

"صاحب دل کا بوجھ کم کرلینا ہی سمجھداری ہے۔ اب دیکھے گا۔ کتنا سکون ملے گا آپ کو۔"

خاور نے زبردستی مسکراتے ہوئے کہا۔

"کاش سکون مل پاتا مجھے۔ کاش ایک بار عائمہ سے میں یہ تمام کرسکوں۔ اسے بتاسکوں کہ میں نے امتیاز کے گھر زیورات کی چوری نہیں کی تھی۔ میں بے قصور ہوتے ہوئے بھی لاک میں کئی دن رہا۔ اور آج بھی میں صرف عائمہ سے ہی محبت کرتا ہوں۔ کاش میں اپنی محبت کا اسے یقین دلا پاتا......"

"باتوں باتوں میں وقت کا اندازہ نہ ہوا کافی کا کپ بھی ٹھنڈا ہوچکا تھا کہ اچانک اسی عورت کے رونے کی آواز آنا شروع ہوگئی تو خاور پریشان سا ہوکر گل کو دیکھنے لگا۔ گل نے جھٹ سے کہا......"

"صاحب اب اپ کو کمرے میں جاکر آرام کرنا چاہئے۔ میں بھی چلتی ہوں اماں پریشان ہوں گی۔"

"گل یہ کس کی آواز ہے کون رورہا ہے۔ میں نے کریم بابا سے پوچھا تو وہ بات کو گول مول کرگئے۔ تم بتاؤ یہ کون رورہی ہے۔ یہ کس عورت کی آواز ہے۔"

"صاحب اس آواز پر غور نہ کریں بس اپنے روم میں جاکر سو جائیں۔ صبح ملتے ہیں۔"

خاور جاتی ہوئی گل کو دیکھتا رہ گیا اور پھر خاور خود سے گویا ہوا۔

"یہاں کوئی عورت رورہی ہے اور کسی کو کوئی فرق ہی نہیں پڑرہا۔ ویسے یہ آواز آ کہاں سے رہی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کسی کو مدد کی ضرورت ہو۔"

خاور آواز کی سمت جانے کی کوشش کرتا تو آواز دوسری سمت سے آنا شروع ہوجاتی جب دوسری سمت جاتا تو آواز پہلی سمت سے آنے لگی۔ خاور عجیب کشمکش و پنج میں مبتلا تھا کہ آخر یہ ماجرا کیا ہے۔ اس آواز کی سمت کیا ہے آخر یہ آواز کس کی ہے اور آ کہاں سے رہی ہے۔ ایک گھنٹے تک سمت کا تعین کرنے کے بعد جب آواز آنا بند ہوئی تو خاور اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اور بستر پر لیٹ گیا۔

☆......☆......☆

دیکھو بیٹا اب موسم بدل رہا ہے۔ لوگوں کی آمد شروع ہونے والی ہے۔ بہت سے لوگ اپنی اپنی فیملی کو لے کر یہاں آئیں گے۔ ہم منیجر صاحب سے تو تمہاری حقیقت چھپاسکتے ہیں لیکن اپنی بستی والوں سے کیسے تمہاری حقیقت چھپاسکتے ہیں۔ اب تمہیں احتیاط کرنی پڑے گی۔ تمہیں ہر کسی کے سامنے نہیں آنا چاہئے ورنہ سمجھتی ہو نا کیا ہوسکتا ہے۔ انور صاحب کے ہم پر بہت احسانات ہیں بہت مدد کی ہے انہوں نے ہماری۔ تمہاری ایک غلطی سے انور صاحب کا بہت نقصان ہوسکتا ہے۔"

کریم الدین نے گل کو سمجھاتے ہوئے کہا تو رحیم بھی بول پڑا۔

گل رعنا ہمیں بہت افسوس ہے کہ ہم تمہیں انصاف نہ دلاسکے مگر تمہیں یوں اس طرح ریسٹ ہاؤس میں نہیں گھومنا پھرنا چاہئے۔ منیجر صاحب سے رات دیر تک باتیں کرتی رہیں تم، یہ ٹھیک نہیں ہے۔ ہم انہیں تو باتوں میں بناسکتے ہیں لیکن بستی والوں کو کیسے......"

"رحیم اور کریم الدین کی بات کی تصدیق میں والدہ سائرہ خاتون بولیں۔"

"بیٹا تیرا بھائی اور ابا بالکل ٹھیک کہتے ہیں۔ اب موسم بدل رہا ہے۔ تجھے چھپ کر رہنا ہوگا۔ تمہاری حقیقت بستی والوں کے سامنے نہیں آنا چاہئے۔"

اور گل جو اتنی دیر سے خاموش ایک کونے پر کھڑی تھی کہنے لگی......

"میں آپ تینوں کی بات سمجھ رہی ہوں۔ میں کسی کے سامنے نہیں آؤں گی۔ منیجر صاحب کے سامنے بھی میری حقیقت نہیں آئے گی اماں آپ سب بے فکر رہیں۔ میں بستی والوں کے سامنے بھی نہیں آؤں گی۔

مگر ہاں اب انصاف دور نہیں ہے خدا کی لاٹھی بے آواز ہے۔ اب وہ وقت دور نہیں جب مجھے اور اس کمرے میں بند نصرت جہاں کو انصاف ملے گا۔ منیجر صاحب کا یہاں آنا طے تھا۔ یہ تو پہلے ہی لکھا جاچکا تھا قسمت میں، خدا کا انصاف اب سب کو نظر آئے گا۔"

سائرہ خاتون نے اپنے بہتے آنسوؤں کو دوپٹے کے پلو سے صاف کرتے ہوئے کہا۔

''انشاءاللہ بیٹا۔ خدا انصاف ضرور کرتا ہے۔ وہ تمہارے اور نصرت کے ساتھ انصاف ضرور کرے گا۔''

☆......☆......☆

''مجھے سمجھ نہیں آتا کہ آخر تمہیں پریشانی کیا ہے۔ کس چیز کی کمی ہے تمہیں۔ آخر چاہئے کیا تمہیں۔''

امتیاز نے غصے سے عائمہ کو کہا تو عائمہ نے آنسو سے بھیگی آنکھیں اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔

''سچ صرف سچ چاہئے۔ مجھے تم سے۔ ایک سچا رشتہ چاہئے تھا جو تم نے مجھے کبھی نہیں دیا۔ میں تمہیں کیا سمجھتی تھی اور تم کیا نکلے امتیاز۔ رات پھر سے تمہاری شرٹ پر لپ اسٹک کے نشانات ملے ہیں۔ اگر میں تمہیں اتنی ہی ناپسند ہوں تو چھوڑ کیوں نہیں دیتے مجھے تم۔''

''ہاں چھوڑ دوں گا۔ تمہاری یہ خواہش بھی پوری کردوں گا۔ فکر مت کرو تم۔ اب میرے سامنے سے دفع ہوجاؤ اور اپنی منحوس روتی صورت میرے سامنے مت لانا۔ جب دیکھو رونا رونا۔ جارہا ہوں، رات گھر دیر سے آؤں گا۔ گھر میں تو سکون ملتا نہیں باہر ہی سکون سے رہوں گا۔''

امتیاز کو جاتا دیکھ کر روتے ہوئے خود گوئی کرتے ہوئے بولی۔

''کاش ایک بار خاور تم نے اپنی محبت کا اظہار کیا ہوتا۔ شادی کے بعد جب مجھے پتا چلا کہ وہ لیٹرز تم نے لکھے تھے، تم مجھ سے سچی محبت کرتے تھے میں کبھی تم سے دور نہ جاتی، میری محبت تو تم تھے خاور، کیوں کہ مجھے تم سے محبت ہی تمہارے لیٹرز میں لکھے خیالات اور احساسات، جذبات جان کر ہوئی تھی، امتیاز اتنا بڑا دھوکہ کرے گا۔ میں یہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ اس نے مجھے ہی نہیں تمہیں بھی دھوکہ دیا ہے۔ کاش تم ایک بار مل جاؤ اور میں تم سے اپنے دل کی بات کرسکوں۔''

☆......☆......☆

''رحیم بہت خوب صورت جگہ ہے میں تو بہت سکون محسوس کررہا ہوں یہاں آ کر۔''

خاور کی بات پر رحیم مسکرا کر بولا...... ''منیجر صاحب ہاں یہ کافی پرسکون جگہ ہے۔ اب دیکھئے گا کہ لوگوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوگا تو کتنی ریل پیل ہوگی یہاں۔ میلے لگیں گے بہت تفریح کریں گے لوگ۔''

''رحیم ایک بات تو بتاؤ۔ میں جب سے یہاں آیا ہوں کچھ عجیب عجیب سا محسوس ہورہا ہے۔''

''عجیب کیا منیجر صاحب؟؟؟''

''عجیب یہ کہ رات پچھلے پہر ایک عورت کے رونے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ میں جب اپنے کمرے سے نکل کر اس آواز کی سمت جانے کی کوشش کرتا ہوں تو اس آواز کی سمت بدل جاتی ہے۔ جب دوسری سمت جاتا ہوں تو آواز پہلی سمت سے آنے لگی ہے۔ میں اب تک سمت کا تعین نہیں کرسکا۔ یہ تمہیں بہت عجیب نہیں لگتا۔''

''منیجر صاحب ایسا کچھ نہیں ہے۔ بستی کے لوگ ہیں اتنے پڑھے لکھے تو نہیں ہیں۔ اکثر میاں بیوی میں لڑائی جھگڑے ہوتے رہتے ہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں آپ فکر مند کیوں ہوتے ہیں۔''

''نہیں رحیم بات کچھ اور ہے بستی ہمارے ریسٹ ہاؤس سے دور ہے اور ریسٹ ہاؤس اتنا بڑا ہے کہ بستی میں کسی عورت کے رونے کی آواز ریسٹ ہاؤس تک آئے ایسا ممکن نہیں کسی کمرے سے یہ آواز آتی ہے۔ بس اس کمرے کا تعین کرنا مشکل ہورہا ہے۔ کریم بابا بھی بات بتانے سے کتراتے ہیں اور تم بھی۔''

''ارے نہیں منیجر صاحب ایسا کچھ نہیں ہے یہ سب آپ کا وہم ہے۔ چلیں اب چلتے ہیں آج کے لئے اتنی ہی سیر و تفریح کافی ہے۔''

خاور نے مسکراتے ہوئے رحیم کو دیکھا اور خاموش ہوگیا۔

☆......☆......☆

رات کے پچھلے پہر پھر سے کسی عورت کے

رونے کی آواز سنائی دی۔ خاور اپنے بستر سے اٹھا اور کمرے سے باہر آ گیا خود سے گویا ہوا۔

''آج چاہے ساری رات گزر جائے میں اس عورت کو ڈھونڈ کر ہی رہوں گا آخر کیا وجہ ہے۔ کیوں روتی ہے یہ عورت اور کتنا درد ہے اس کے رونے میں۔ ایسی کون سی تکلیف ہے جو اسے پریشان کرتی ہے اتنا درد اس عورت کی آواز میں مجھے اس عورت کو ڈھونڈ کر اس کی مدد کرنی چاہئے۔ اس کا درد بھرا رونا مجھے پریشان کرتا ہے۔ اس کی مدد میں ضرور کروں گا۔ پتا نہیں کیوں کریم بابا اور رحیم مجھے اس عورت کے بارے میں نہیں بتا رہے۔ مجھے خود کچھ کرنا ہے۔''

خاور آواز کی سمت جاتا تو آواز دوسری سمت سے آنے لگتی۔ خاور بری طرح سے الجھ چکا تھا۔ چاروں طرف چکر لگا کر آواز کی سمت ڈھونڈنے کی کوشش کر کر کے تھک ہار کر باہر لان میں آیا تو گل باغیچے میں بیٹھی نظر آئی تو خاور اس کے پاس آ گیا اور بولا۔

''گل اتنی رات گئے تم یہاں کھلے آسمان کے نیچے درختوں اور پودوں کے درمیان یوں اس طرح اکیلی کیوں بیٹھی ہو۔ اور یہاں اس طرف تو روشنی بھی کم ہے۔ مین انٹرنس کی طرف ہی بیٹھ جاتیں روشنی میں۔ یوں درختوں کے اور پیڑ پودوں کے جھنڈ میں کیوں اکیلے بیٹھی ہو۔''

''صاحب نیند نہیں آرہی تھی تو سوچا یہاں آ کر بیٹھ جاؤں آپ اتنی رات میں اس طرف کیوں آ گئے۔ یہ ایریا تو ریسٹ ہاؤس کے لان کے دوسری طرف ہے۔ یہاں لوگ بہت کم آتے ہیں۔ آپ رات میں درختوں اور پیڑ پودوں کے درمیان آ گئے۔ رات کے اس اندھیرے میں درختوں اور پیڑ پودوں کی خاموشی ہوا کی سرسراہٹ، پتوں کا اڑنا، آپ کو ڈر نہیں لگتا صاحب۔''

گل کی اس بات پر خاور بے ساختہ زور سے قہقہہ لگائے بغیر نہ رہ سکا۔

پھر بولا۔ ''گل تم بھی کمال کرتی ہو۔ میں تو مرد ہوں اعصابی طور پر مضبوط بھی ہوں۔ تم تو نازک پیاری سی لڑکی ہو۔ تمہیں لان کے آؤٹ سائیڈ آنے سے ڈر نہیں لگتا۔ کہیں تم پر کوئی جن عاشق ہوگیا تو......''

''ارے صاحب ڈر اور مجھے میں اب کیا کروں گی ڈر کر ہاں ایک وقت تھا جب ڈر لگا کرتا تھا۔ پر اب نہیں لگتا ڈر اب ڈر کو مجھ سے ڈر لگتا ہے۔''

''کیا مطلب ڈر کو تم سے ڈر لگتا ہے۔ تم بہت دلچسپ ہو گل......''

''صاحب آپ کو اپنے روم میں جانا چاہئے۔''

''آں ہاں! آج نہیں۔ آج میں تم سے اپنے کچھ سوالوں کے جوابات لئے بغیر یہاں سے نہیں جاؤں گا۔ کریم بابا اور رحیم نے تو مجھے ٹال دیا، تم سے آج مجھے جوابات چاہئیں، ویسے بھی تم پورے دو دن کے بعد آج اتنی رات میں نظر آئی ہو۔ بائی دا وے تم دو دن سے تھیں کہاں۔''

''اس رات آپ سے دیر تک باتیں کیں تو اماں ابا نے منع کردیا تھا کہ رات گئے آپ سے ملنا ٹھیک نہیں۔ پر صاحب ایک بات کہوں آپ سے۔''

''ہاں کہو۔'' خاور بولا۔

آپ سے باتیں کرکے آپ کی باتیں سن کر بہت اچھا لگا دل کو بہت تسلی ہوئی۔''

''تسلی؟ کیوں تسلی۔ بھئی میں ہی تم سے اپنے دل کی باتیں کرکے اپنا بوجھ بانٹ رہا تھا۔ تم نے تو مجھ سے اپنی کوئی بات شیئر نہیں کی۔ پھر تمہیں تسلی......؟ میں کچھ سمجھا نہیں۔''

''آپ نہیں سمجھیں گے ابھی صاحب۔ آپ نہیں سمجھیں گے۔'' گل بولی۔

''تو سمجھا دو ناں۔'' خاور جھٹ سے بولا۔

''ابھی کچھ بھی سمجھانے کا وقت نہیں آیا۔ جب وقت آئے گا تو سمجھا دوں گی۔ اچھا اب میں چلتی ہوں۔ اماں ابا میں سے کوئی اٹھ گیا اور مجھے نہ پا کر پریشان ہوں گے۔''

''اچھا سنو گل، مجھے تم سے کچھ ضروری بات

کرنی تھی۔ کیا تم صبح مجھ سے بات کرسکتی ہو۔"

"نہیں صاحب کل سے یہاں لوگوں کی رہائش ہوجائے گی۔ نئی نئی فیملی یہاں آجائے گی میں کام میں مصروف ہوجاؤں گی پھر بستی کی عورتیں بھی کام کرنے آجائیں گی۔ ذرا بھی فرصت نہیں ہوگی۔ میں اب آپ سے نہیں مل سکوں گی۔"

"پھر میں تم سے بات کیسے کروں گا......؟"

"صاحب رات کے پچھلے پہر میں اکثر اسی تنہائی میں درختوں کے پیچھے آتی ہوں سکون تلاش کرنے، آپ کو جب بھی مجھ سے ملنا ہو بات کرنی ہو۔ رات کے پچھلے پہر یہاں آجانا۔ میں یہیں ملوں گی آپ کو۔"

"ٹھیک ہے گل جیسے تمہاری مرضی ویسے ایک بات کہوں۔ تمہیں رات کے اس پہر یہاں یوں نہیں آنا چاہئے۔ مجھے غلط مت سمجھنا گل تم بہت خوب صورت اور پیاری لڑکی ہو۔ رات اس پہر درختوں کے جھنڈ میں ویرانے میں نہیں آنا چاہئے۔"

"تعریف کرنے کا شکریہ صاحب پر اب مجھے ڈر نہیں لگتا میں چلتی ہوں۔ آپ کو جب بھی ملنا ہو میں یہیں ملوں گی آپ سے۔"

خاور کی پلک جھپکتے ہی گل غائب ہوچکی تھی۔

خاور نے دل میں خود کلامی کی......"

"یہ لڑکی اچانک ایک لمحے میں غائب ہوگئی۔ کمال ہے ویسے ہے بہت بہادر لڑکی۔ ٹھیک ہے کل میں اس سے درد بھری آواز کے بارے میں ضرور معلوم کروں گا۔"

☆......☆......☆

"اگلے روز صبح سے ہی تقریباً لوگ اپنی اپنی فیملی کے ہمراہ ریسٹ ہاؤس میں آچکے تھے سب کے روم ریزرو ہوچکے تھے۔ بستی کے کافی لوگ کام کرنے آچکے تھے۔ تقریباً پورا ہفتہ ہی لوگوں کی آمد سے کام میں گزرا۔ اس دوران خاور تھک کر سوجاتا آواز سنائی بھی دیتی مگر آواز پر اٹھ نہیں پا رہا تھا۔ گل رعنا سے ملاقات ہوئے بھی ہفتہ گزر چکا تھا۔

لوگ اس مقام کی ٹھنڈ وادی بہتے آبشار چشموں اور مزے مزے کے کھانوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

خاور کا دل بے چین سا تھا کہ اتنے دن سے اس نے گل کی ایک جھلک تک نہ دیکھی تھی۔ بستی کی تمام عورتیں کچن میں کام کرتی نظر آتیں۔ ان کے مرد بھی کاموں میں مصروف نظر آتے۔ کریم بابا، رحیم، سائرہ خاتون سبھی تو وہاں کام میں مصروف تھے۔ اگر کوئی نہ تھا تو وہ صرف گل تھی۔ خاور نے گل کی کمی محسوس کرتے ہوئے سائرہ خاتون سے کہا۔

"آنٹی گل نظر نہیں آرہی۔ وہ ٹھیک تو ہے نا؟"

بستی کی ایک عورت جو سائرہ خاتون کے ساتھ ہی کھڑی تھی اس نے حیرت سے چونک کر پہلے خاور پھر سائرہ کی طرف دیکھا۔ سائرہ نے جھٹ سے عورت سے مخاطب ہوکر کہا۔

"تم باہر جاکر دوپہر کے کھانے کے انتظامات دیکھو کہ تمام ٹیبلوں پر سامان سجادیا گیا ہے ناں۔"

وہ عورت حیرت میں ڈوبی سائرہ کو دیکھتے ہوئے خاور کو ڈر اور خوف زدہ انداز میں دیکھ کر ہاں کہہ کر چلی گئی۔ خاور عورت کے اس انداز پر محو حیرت سے سائرہ کو دیکھنے لگا تو سائرہ خاتون نے کہا۔

منیجر صاحب گل رعنا کا ذکر آپ کسی کے سامنے مت کیا کریں۔

"میں کچھ سمجھا نہیں آنٹی......"

یہ بستی کے لوگ ہیں ذرا پرانے خیالات کے ہیں۔ گل رعنا سے ڈرتے ہیں۔"

"کیا......کیا مطلب گل رعنا سے ڈرتے ہیں، گل رعنا کوئی بھوت یا چڑیل ہے۔ آنٹی۔ کیسی باتیں کررہی ہیں آپ۔ میں نے تو بس یونہی پوچھ لیا کہ اتنے دن سے گل رعنا کو دیکھا نہیں کہیں وہ بیمار تو نہیں ہے؟ اس کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟؟"

ہاں اس کی طبیعت بالکل ٹھیک ہے بھلا گل کو کیا

ہوسکتا ہے اب۔ اسے کچھ نہیں ہوسکتا۔ بس آپ اس کا ذکر مت کیا کریں۔"

"بھلا کیوں آنٹی۔ کیا آپ کو مجھ پر بھروسہ نہیں ہے؟ کیا آپ مجھے غلط انسان سمجھتی ہیں......؟"

نہیں بیٹا ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ بس آپ اب کسی کے سامنے گل کا نام مت لینا۔ مجھے کھانا لگانے کی دیر ہورہی ہے۔ اب جاؤ آپ یہاں سے۔"

"یار عجیب لوگ ہیں یہ لوگ بھی۔ اپنی باتوں میں ایک کلو چھوڑ دیتے ہیں۔ اینی ویز آج رات میں گل سے مل کر ہی پوچھ لوں گا کہ آخر ماجرا کیا ہے۔"

☆......☆......☆

بستی کی عورت اپنے شوہر سے سرگوشی میں سائیڈ پر کھڑے ہوکر بات کرتی ہے جسے خاور خاموشی سے سن لیتا ہے۔"

"سنتے ہو آج کچن میں منیجر صاحب آئے تھے۔ سائرہ اماں سے پتا ہے کیا پوچھ رہے تھے۔"

"کیا پوچھ رہے تھے نیک بخت اب بتا بھی دے۔ منیجر صاحب نے گل کا پوچھا کہ گل کئی دن سے نظر نہیں آئی۔ تم جانتے ہو نا اس بات کا کیا مطلب ہے۔"

"اری نیک بخت خاموش ہوجا۔ اگر کسی نے سن لیا تو غضب ہوجائے گا۔ ابھی تو ہمیں یہاں کام ملا ہے۔ کہیں ایسی باتوں سے ہمارا کام نہ چھن جائے۔ پیسے جمع کرنے کا موقع ہمیں کیسے ملے گا۔ اب آج کے بعد میں گل کا نام تیرے منہ سے نہ سنوں۔ چل جاکر اپنا کام کر۔ اور ہاں بستی کی دوسری عورتوں سے اس بات کا ذکر مت کرنا تو ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔"

"تم تو شروع ہی ہوجاتے ہو صرف تم سے ہی تو ذکر کیا ہے۔ اچھا اچھا اب کبھی گل کا نام اپنے لبوں پر نہیں لاؤں گی۔"

"سائیڈ پر کھڑا خاور ان میاں بیوی' کی باتیں سن کر حیران اور پریشان ہوا کہ آخر یہ ماجرا کیا ہے۔ گل کے نام پر اتنا خوف زدہ ہونا بستی کی عورت کا اور سائرہ آنٹی کا پریشان ہوکر موضوع بدل لینا مجھے آج رات ان تمام سوالوں کے جوابات گل سے حاصل کرنے ہی ہوں گے۔"

☆......☆......☆

دن بھر کے کام سے فارغ ہوکر اپنے روم میں نائٹ ڈریس میں ٹہلتے ہوئے بے چینی سے بار بار گھڑی دیکھتے ہوئے خاور پچھلے پہر ہونے کا انتظار کررہا تھا۔ کبھی ٹہلنے لگتا، کبھی بیٹھ جاتا کبھی کتابیں پڑھنے لگتا، مگر حقیقت تو یہ تھی کہ خاور کا دل کسی طور نہیں لگ رہا تھا، وہ تو بس رات ڈھلنے کا انتظار کررہا تھا کہ جلدی سے وقت گزرے اور وہ اپنے سوالوں کے جوابات حاصل کرسکے۔ اللہ اللہ کرکے خاور کا انتظار ختم ہوا وہ جلدی سے اٹھا روم کا گیٹ کھول کر درختوں کے جھنڈ میں آگیا جہاں گل رعنا پیٹھ کرکے گھاس پر بیٹھی تھی۔ خاموشی سے خاور اس کے نزدیک آیا تو گل نے اس کی طرف دیکھے بغیر ہی کہا۔

"صاحب آپ کو اماں سے میرا ذکر نہیں کرنا چاہئے تھا۔"

خاور انتہائی حیران ہوا کہ اتنی رازداری سے وہ آیا تھا اور گل تو پیٹھ کیے بیٹھی ہے پھر اسے کیسے پتا چلا کہ میں ہی آیا ہوں۔ کوئی اور بھی تو ہوسکتا تھا۔ خاور ابھی انہی سوچوں میں ڈوبا تھا کہ گل نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا......

"صاحب میں نے منع کیا تھا نا آپ کو پھر آپ نے ایسا کیوں کیا وہ بھی بستی کی ایک عورت کے سامنے۔ آپ کو پتا ہے نا کہ یہاں کے لوگ ذرا پرانے خیالات کے ہیں کسی غیر مرد کے منہ سے کسی لڑکی کا ذکر کرنے پر برا مانتے ہیں۔"

"آئیم ریلی سوری گل۔ لیکن......"

خاور کی بات کاٹتے ہوئے گل نے کہا۔

"صاحب آئندہ احتیاط کرنا۔"

"اوکے میں آئندہ احتیاط کروں گا مگر آج تمہیں میرے چند سوالوں کے جوابات دینے ہی ہوں

گے گل۔ آج میں اپنے سوالوں کے جوابات لئے بغیر نہیں جاؤں گا اور نہ ہی تمہیں کہیں جانے دوں گا۔“

”پوچھئے آپ کیا جاننا چاہتے ہیں آپ۔“

”گل تمہاری اماں کا تمہارا نام سن کر پریشان ہو کر موضوع بدل لینا۔ مجھے سمجھ نہیں آیا؟ آخر تم اتنی رات گئے یہاں ویرانے میں درختوں کے جھنڈ میں چھپ کر ہی کیوں بیٹھتی ہو؟ اور بستی کی اس عورت کا تمہارا نام سن کر خوفزدہ ہونا اپنے شوہر سے تمہارا ذکر کرتے وقت انتہائی ڈرنا آخر یہ سب کیا ماجرا ہے؟

اور میں جب سے یہاں آیا ہوں ایک عورت کے درد بھرے رونے کی آواز اس کی سسکیاں، آہیں مجھے بے چین رکھتی ہیں، گل مجھے بہت Feel ہوتی ہے، اس کی تڑپ آخر وہ کون ہے اور اتنے درد میں کیوں ہے۔ اس کی سسکیاں آہیں، میں اس کی مدد کرنا چاہتا ہوں کیا تم مجھے اس سے ملوا سکتی ہو؟“

”ہاں صاحب آج میں آپ کو اس سے ملوادوں گی تاکہ آپ اس کی مدد کرسکیں کیونکہ ایک آپ ہی ہیں جو اس کی اور میری مدد کرسکتے ہیں ہم دونوں نے ہی بڑی مدت سے آپ کی مدد کا انتظار کیا ہے۔ جب آپ یہاں آئے تھے مجھے پتہ چل گیا تھا کہ اللہ نے میرا اور مائی نصرت کا انتظار ختم کردیا ہے۔“

”مائی نصرت......؟ کون مائی نصرت......؟“

”جس عورت کے رونے کی آواز سسکیاں آپ کو بے چین کرتی ہیں وہی مائی نصرت ہے۔“

”گل کیوں روتی ہے۔ آخر وہ اتنے درد بھرے انداز میں آخر اسے کیا پریشانی ہے؟ اور کون اسے ایسا درد دیتا ہے کہ وہ آہیں اور سسکیاں بھرتی ہیں۔“

”میں آج آپ کو سب کچھ بتاتی ہوں آپ پہلے یہاں گھاس پر بیٹھیں میرے قریب۔“

خاور کے بیٹھنے پر گل اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے گویا ہوئی۔

”صاحب آج سے 20 سال پہلے جب میں قریب 2 سال کی تھی یہ بات اس وقت کی ہے میں نے اپنے بڑوں سے ہی یہ واقعہ سنا ہے۔ مائی نصرت جہاں ہماری بستی کی بہت خوب صورت اور حسین و جمیل لڑکی تھی۔

انور صاحب نے یہ ریسٹ ہاؤس بہت محنت اور پیار سے بنوایا تھا۔ جب یہ ریسٹ ہاؤس بنا تو ابا اماں جو کہ پہلے ہی انور صاحب کے گھر میں ملازم تھے۔ ابا اور اماں کی وفاداری سے متاثر ہوکر انور صاحب نے اس ریسٹ ہاؤس کی تمام تر ذمہ داری ابا پر ڈال دی، ابا اماں ریسٹ ہاؤس کے سرونٹ کوارٹر میں میں بھائی کو لے کر شفٹ ہوگئے۔

ہم دونوں بہن بھائی یہاں کھیلتے بستی میں جاتے بستی کے لوگ یہاں کام کرنے آجاتے۔

ایک دن انور صاحب کے ایک دوست یہاں آئے تھے۔ یہاں کے ماحول سے متاثر ہوکر یہیں ٹھہر گئے ان کی نظر مائی نصرت پر پڑی، مائی نصرت کی خوبصورتی ان کے دل میں اتر گئی۔ اس دوست نے پہلے اپنے پیسے سے مائی نصرت کو خریدنا چاہا پر جب مائی نصرت نے اپنا سودا کرنے سے منع کردیا تو اس آدمی نے مائی نصرت کے ساتھ زبردستی کرنا چاہی۔

انور صاحب اور ابا نے آکر مائی نصرت کو بچالیا۔ مگر اس آدمی نے اس بات کو اپنی انا کا مسئلہ بنالیا اس وقت تو سب کے سامنے معافی مانگ لی۔ لیکن رات گئے بستی میں جاکر مائی نصرت کے ماں باپ کو مارڈالا اور مائی نصرت کو زبردستی اٹھا کر اس ریسٹ ہاؤس میں لے آیا اور ان کے ساتھ زبردستی کرکے ان کا گلا دبا کر مار ڈالا۔

معاملے کو دبانے کے لئے پولیس کے ساتھ مل کر اس معاملے کو یہ رخ دیا گیا کہ مائی نصرت کسی آشنا کے ساتھ بھاگ گئی اور اس غم میں اس کے ماں باپ نے خودکشی کرلی اور مائی نصرت کی لاش بہتے آبشار میں ایسے پھینکی کہ ان کی لاش کا پتا تک نہیں چلا۔

لیکن جس کمرے میں مائی نصرت کو اس آدمی نے اپنی درندگی کا نشانہ بنایا۔ اس کمرے سے مائی

نصرت کے رونے اور سسکیوں کی آواز آتی ہے۔ انہیں رات میں کئی بار اس ریسٹ ہاؤس میں رونے اور مدد کے لئے پکارتے دیکھا گیا لوگ ڈرتے تھے یہاں آنے سے بھی۔

پھر انور صاحب اور ابا نے کسی بزرگ کی مدد سے اس کمرے کو علم کے ذریعے حصار کردیا، اس کے بعد مائی نصرت تو کبھی نظر نہیں آئی مگر ان کے رونے کی سسکیوں کی آوازیں اب بھی اسی کمرے سے آتی ہیں۔ اور یہ آوازیں اس وقت تک آتی رہیں گی جب تک وہ آدمی اپنے انجام تک نہ پہنچ جائے۔“

”گل کون ہے وہ آدمی؟ اور تم یہ کیسے کہہ سکتی ہو کہ میں اس عورت آئی مین (I mean) مائی نصرت کی مدد کرسکتا ہوں۔ جبکہ میں تو اس آدمی کو جانتا تک نہیں میں تو اپنی لائف میں فرسٹ ٹائم اس ایریا میں آیا ہوں آج سے پہلے میں کبھی یہاں نہیں آیا۔“

خاور کی حیرانی اور پریشانی کو بھانپتے ہوئے گل اس کے قریب ہوکر بولی۔

”صاحب جب اللہ کسی مظلوم کی مدد کرتا ہے تو کوئی نہ کوئی راستہ بنادیتا ہے۔ مظلوم کی مدد کرتا ہے پتا ہے آپ کو......؟ صاحب یعنی اللہ اپنے بندوں میں سے ہی کسی ایک بندے کو چنتا ہے، کسی خاص کام کو انجام دینے کے لئے۔ مائی نصرت اور میری مدد کے لئے اللہ نے آپ کو چنا ہے۔ آپ کا یہاں آنا یونہی نہیں ہے صاحب......“

”گل تم بہت عقل مند ہو۔ اور میں اللہ کا نیک بندہ نہیں ہوں۔ تم بھی نا گل کیسی باتیں کرتی ہو۔ دیکھو مجھے تہہ دل سے افسوس ہے جو کچھ بھی مائی نصرت کے ساتھ ہوا۔ میں دعا کرتا ہوں اللہ ان کی آہیں اور سسکیوں کو سکون میں بدل دے اور ان کے مجرم کو سزا دے۔ جس شخص کو میں جانتا تک نہیں بھلا اسے کیسے سزا دلوا سکتا ہوں اور جب کہ تمہارے کہنے کے مطابق مائی نصرت کی لاش ملی تک نہیں تو، بھلا کیسے پھر پولیس کوئی مدد کرسکتی ہے۔ اور اس واقعے کو پورے بیس سال گزر چکے ہیں۔

محض کسی عورت کے رونے کی آواز پر ہم پولیس کمپلین کیسے کرسکتے ہیں۔ یہ بچوں جیسی باتیں ہیں۔“

”صاحب میں بچوں جیسی باتیں نہیں کررہی آپ کو میری باتوں پر یقین نہیں ہے نا۔ چلئے میرے ساتھ میں آپ کو کچھ دکھانا چاہتی ہوں۔“

گل کے پیچھے پیچھے خاور چلتا گیا، درختوں کے جھنڈ سے نکل کر ہی سامنے قبرستان تھا۔ قبرستان میں گل کو جاتا دیکھ کر خاور بھی پیچھے چل رہا تھا۔ حیران پریشان خاور کبھی گل کو دیکھتا تو کبھی رات کے اندھیرے میں ویران قبرستان میں گل کو اسے چلتا دیکھ کر پریشان ہونا جائز تھا جیسے کہ یہ کوئی قبرستان نہیں، کوئی پارک ہو۔ کوئی نوجوان لڑکی جو کہ خوب صورت بھی ہو۔ پیاری بھی ہو اور اندھیری رات کے پچھلے پہر قبرستان میں ایسے راستوں سے مانوس ہوکر چل رہی ہو جیسے یہی اس کا اصل ٹھکانہ ہو۔ جب ایک قبر کے قریب جاکر گل رک گئی تو خاور نے گل کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھا اور ہنس کر کہا......“

”حقیقت میں تم تو بہت بہادر لڑکی ہو گل، رات کے اس پہر یقین کرو مجھے تھوڑا خوف سا محسوس ہورہا ہے۔ قبرستان میں اور تم ایسے چل رہی ہو جیسے کسی گارڈن میں واک کررہی ہو۔ تمہیں ڈر نہیں لگتا قبرستان میں اس ٹائم آنے سے۔“

”خاور کی بات پر گل نے سنجیدگی سے خاور کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”صاحب میرے چہرے سے نظر ہٹا کر ذرا اس قبر کی تختی پر نظر تو ڈالیں۔ پھر آپ کو آپ کے تمام سوالوں کے جوابات مل جائیں گے۔“

خاور کے چہرے پر تمسخرانہ سی مسکراہٹ تھی جیسے ہی خاور نے قبر کی تختی پر نظر ڈالی تو دو قدم پیچھے ہٹتے ہوئے لڑکھڑا گیا۔ گھبراہٹ اور پسینے سے شرابور ہوگیا۔ تو گل نے کہا۔

”صاحب مجھ سے ڈریں مت میں آپ کو کچھ نہیں کہوں گی۔ گھبرائیں مت صاحب۔“

”گل یہ سب کیا ہے؟ اس قبر کی تختی پر تو تمہارا

نام کریم بابا کی ولدیت کے ساتھ لکھا ہے۔ یہ یہ...... یہ کیا ہو رہا ہے......؟"

"صاحب یہ قبر ایک حقیقت ہے اور یہ میری قبر ہے۔ میں اب اس دنیا میں نہیں بلکہ مرچکی ہوں۔ آپ جانتے ہیں کہ میں مرنے کے بعد بھی آپ کو اور اپنے اماں ابا کو کیسے دکھائی دے رہی ہوں کیوں کہ میں خود سے نہیں مری تھی مجھے مارا گیا تھا۔ جب تک میں اس انسان کو نہ ماردوں جس نے مجھے مارا ہے، میں سکون سے اپنی قبر میں نہیں سوسکتی۔ ابدی نیند۔"

خاور کی حالت عجیب ہو رہی تھی پسینے اس طرح بہہ رہے تھے جیسے کسی نے اسے شاور کے نیچے کھڑا کردیا ہو۔ دل تھا کہ سنبھلنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ بڑی مشکل سے اپنی بے چین دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے اس نے اپنی تمام تر ہمت کو یکجا کرکے کہا۔

"مجھے اب تک یقین نہیں آرہا گل کہ میں اتنے دن تک ایک روح سے دوستوں کی طرح مل رہا تھا۔ باتیں کررہا تھا، تم دوسال پہلے ہی مرچکی ہو۔ مجھے تمہاری قبر دیکھ کر بھی یقین نہیں آرہا۔"

"یقین کرلیں صاحب یہی حقیقت ہے۔ کیونکہ میں اب اس دنیا میں نہیں ہوں۔ صاحب اتنے دن جو دوست بن کر آپ نے وقت میرے ساتھ گزارا ہے۔ آپ کو اس کا واسطہ اس آدمی کو یہاں کچھ بھی کرکے بلالیں۔ جس نے میرے اور مائی نصرت کے ساتھ ایسا کیا۔"

"گل بات کو سمجھو بھلا میں کیسے ان لوگوں کو یہاں بلاسکتا ہوں جبکہ میں تو ان کو جانتا تک نہیں مجھے کیسے پتا کہ کن لوگوں نے تمہارے اور مائی نصرت کے ساتھ ایسا کیا......"

"صاحب کیونکہ مائی نصرت اور میرا مجرم وہی دو انسان ہیں جو آپ کے مجرم ہیں۔ جنھوں نے آپ کے ساتھ برا کیا۔ آپ سے آپ کی محبت کو چھینا اور دوسرے انسان نے آپ کو جھوٹے الزام لگا کر تھانے میں بند کروادیا تھا۔"

خاور نے انتہائی حیرت سے گل کو دیکھا تو گل مزید گویا ہوئی۔

"جی ہاں صاحب میں راشد اور امتیاز کی بات کررہی ہوں۔ آج سے بیس سال پہلے مائی نصرت کو اپنی درندگی کا نشانہ بنانے والا وہی امیر آدمی راشد ہے۔ اور اتنا ہی نہیں صاحب دوسال پہلے امتیاز ریسٹ ہاؤس خریدنے کے لئے یہاں آیا تھا۔ وہ یہ ریسٹ ہاؤس خریدنا چاہتا تھا۔ میں ابا، اماں اور بھائی کے ساتھ یہیں کام کرتی تھی، اسی امتیاز نے رات کے پچھلے پہر مجھے انہی درختوں کے جھنڈ میں لے جاکر ناپاک کردیا اور مجھے مار کر تڑپنے کے لئے وہیں چھوڑ دیا۔

خود پولیس اسٹیشن چلا گیا رات میں ہی تاکہ یہ ثبوت رہے کہ وہ تو رات بھر پولیس اسٹیشن میں بیٹھا تھا، اپنی قیمتی گھڑی اور ہیرے کی انگوٹھی کی رپورٹ درج کروانے۔

جانتے ہیں صاحب جب میری لاش صبح بستی والوں اور میرے اماں ابا کو ملی تو اس وقت وہ پولیس کو لے کر ریسٹ ہاؤس آیا تھا۔ کسی کو یہ پتا ہی نہیں چلا کہ اس رات میرے ساتھ زبردستی کرنے والا کون تھا اور مجھے مارنے والا کون تھا۔

امتیاز تو وہاں سے واپس اپنے گھر چلا گیا مگر میں آج تک تڑپ رہی ہوں۔ صاحب آپ کی محبت عائمہ بھی اس کے ساتھ خوش نہیں ہوگی۔ اسے بھی آپ ہی اس درندے کی قید سے آزادی دلاسکتے ہیں۔"

"کیا راشد اور امتیاز تمہارے اور مائی نصرت کے مجرم ہیں۔ اوہ میرے خدا! یہ کیسا اتفاق ہے...... میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آرہا۔ یاخدا یہ سب......"

خاور کی بات کاٹتے ہوئے گل بولی۔

"صاحب بس کچھ بھی کرکے ان دونوں کو یہاں بلوالیں۔ اور ہاں اب صبح ہونے والی ہے۔ آپ جائیں یہاں سے۔" اور خاور بوجھل قدموں سے کمرے میں آگیا۔

☆......☆......☆

اگلے روز خاور چپ چپ تھا۔ اور خاصا پریشان بھی جلدی جلدی اپنے کام نمٹانے کے بعد کمرے میں آکر سوچنے لگا۔ بہت سوچنے کے بعد اس نے انور صاحب کو کال کرکے کچھ بات کی تو اگلے ہی روز انور صاحب ریسٹ ہاؤس آگئے۔ انور صاحب نے خاور سے مخاطب ہوکر کہا۔

"بیٹا خاور تمہارے ابا بہت شریف انسان ہیں انہی کے کہنے پر میں نے تمہیں یہاں بھیجا تھا لیکن اللہ کے ہر کام میں حکمت ہوتی ہے۔ تمہارا یہاں آنا کسی مقصد کے تحت تھا، اب مجھے بھی سمجھ آگیا۔ تم فکر مت کرو، جیسا تم نے کہا ہے نا میں بالکل ایسا ہی کروں گا۔ کیونکہ برسوں سے میرے دل پر ایک بوجھ سا ہے۔ مجرم کو جانتے ہوئے بھی میں نے مجرم کو سزا دلوانے کی کوشش نہیں کی۔ پر بیٹا میں کیا کرتا۔ راشد نے کوئی ثبوت ہی نہیں چھوڑے تھے اور پیسے کے زور پر سب کو خرید لیا تھا۔ پھر بھی میں نے اسے کہا تھا کہ وہ اپنے جرم کو قبول کرلے۔

جانتے ہو اس نے کیا کہا۔ اس نے مجھے بھی جان سے مارنے اور میری بیوی بچوں کو نقصان پہنچانے کی دھمکی دی۔ میں خاموش ہوگیا۔ چاہ کر بھی کچھ نہ کرسکا۔ کیونکہ راشد اور اس کا بیٹا بہت سی برائیوں میں ملوث ہیں۔ غلط لوگوں سے ان کے مراسم ہیں، کچھ بھی کرسکتے ہیں۔"

"انکل اب ان باپ بیٹے کے گناہوں کا گھڑا بھر چکا ہے۔ بس میں نے جو کہا ہے نا آپ سے آپ وہی کریں۔"

"بیٹا خاور جب تم نے بات کی تھی میں نے اسی دن راشد کو ریسٹ ہاؤس خریدنے کی آفر کی تھی وہ بھی ریسٹ ہاؤس کی مالیت سے بہت کم میں وہ اور امتیاز راضی ہوگئے ہیں۔ اور خوشی خوشی کل وہ یہاں آجائیں گے۔ باقی جو تم نے کرنا ہے وہ کرلینا۔"

"انکل سب سے پہلے تو آپ مجھے اس کمرے کی چابی دیں جہاں نصرت نامی عورت کا قتل ہوا تھا۔"

"سوچ لو بیٹا کہیں اس کمرے کا کھولنا تمہیں نقصان نہ دے جائے۔ کیوں کہ وہاں ایک روح قید ہے۔"

"انکل اب مجھے اپنی کوئی پرواہ نہیں۔ میرے دل کی نیت سے اللہ واقف ہے میں مائی نصرت کو انصاف دلانا چاہتا ہوں۔ مجھے کچھ نہیں ہوگا۔ آپ فکر نہ کریں...... سب کچھ ہمارے پلان کے مطابق ہوگا۔"

خاور نے وہ کمرہ کھلوایا جہاں مائی نصرت کا قتل ہوا تھا۔ بستی کے لوگوں سے کمرے کی صاف صفائی کروائی لوگوں نے ڈرتے ڈرتے صفائی کی، کمرے کو چمکا دیا گیا تو کمرہ بند کرکے خاور کل ہونے کا انتظار کررہا تھا۔ رات ہوتے ہی خاور درختوں کے جھنڈ میں گیا وہاں گل بیٹھی تھی۔ گل کے قریب ہوکر خاور نے کہا۔

"اب صرف کل تک کا انتظار ہے گل۔ انشاء اللہ کل ہی تمہارا اور مائی نصرت کا انتقام پورا ہوجائے گا۔"

"صاحب کل انشاء اللہ سب ٹھیک ہوجائے گا۔ ایک بات پوچھوں صاحب؟"

"ہاں پوچھو گل۔" خاور بولا۔

"کیا آپ امتیاز کے مرنے کے بعد عائمہ کو اپنائیں گے؟"

"اگر عائمہ بخوشی مجھ سے شادی کرنے کو تیار ہوگی تو میں بھی بخوشی اسے اپنالوں گا۔ میں تو آج تک اسے بھول ہی نہیں سکا۔ آج بھی اس سے اتنی ہی محبت کرتا ہوں جتنی یونیورسٹی لائف میں کیا کرتا تھا۔"

"صاحب اللہ آپ کو آپ کی محبت سے ضرور ملوائے گا۔"

"ایک بات کہوں گل۔" خاور نے کہا۔

"کہیے صاحب کیا بات ہے؟"

"مجھے تم سے اس وقت خوف محسوس ہوا تھا جب میں نے تمہاری قبر دیکھی اور اپنے سامنے تمہیں کھڑا دیکھا۔ مگر اب نہیں، اب تو بہت انسیت محسوس ہوتی ہے

تم سے۔ تم بہت معصوم اور سیدھی سادھی لڑکی ہو۔ کاش تم اس دنیا میں حیات ہوتیں۔ میں تم سے کبھی بھی اپنی دوستی ختم نہ ہونے دیتا۔"

"صاحب آپ دوستی نبھا تو رہے ہیں نا مجھ سے، میری مدد کرکے۔ صاحب اب جا کر آرام کریں کل آپ کو بہت کام کرنے ہیں۔ یہاں آئی ہوئی فیملیز کو صبح ہی صبح اس علاقے کی سیر کو بھیجنا ہے۔ بستی کے لوگوں کے ساتھ، جایئے اب۔"

اور خاور اثبات میں سر ہلاتا ہوا اپنے کمرے میں آ گیا......

☆......☆......☆

اگلے روز صبح سے ہی کریم الدین، رحیم اور بستی کے کچھ آدمیوں اور عورتوں کے ہمراہ ریسٹ ہاؤس میں آئی فیملیز کو خاور نے علاقے کی سیر کے لئے بھیج دیا اور انہیں تاکید کہ...... دیر سے ریسٹ ہاؤس میں آنا کیونکہ زیادہ سے زیادہ علاقے کی سیر کرنا۔

سب کے جانے کے بعد خاور انور صاحب کے ساتھ لان میں بڑی بے چینی سے راشد اور امتیاز کے آنے کا ویٹ کرنے لگا۔ چند ہی لمحوں کے بعد دو کاریں آ کر ریسٹ ہاؤس کے پارکنگ ایریا میں رکیں ایک سے ڈرائیور کے گیٹ کھولنے پر راشد کار سے باہر نکلا۔ دوسری کار سے ڈرائیونگ سیٹ سے امتیاز اترا۔

امتیاز کے ساتھ ہی عائمہ بھی کار سے نیچے اتری، خاور اسے دیکھ کر ایکدم ٹھہر سا گیا۔ عائمہ کی نظر سامنے کھڑے خاور پر پڑی تو اس کی آنکھیں نم سی ہو گئیں۔ اس نے فوراً ہی چشمہ پہن لیا۔ انور صاحب نے آگے بڑھ کر راشد کو گلے لگا کر کہا۔

"خوش آمدید راشد بہت انتظار کروایا تم نے بس اب جلدی اندر چلو ساتھ چائے پیتے ہیں پھر کچھ دیر تم آرام کرنا اور ہم ڈیل فائنل کریں گے۔"

راشد نے خاور پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

"یہ لڑکا ریسٹ ہاؤس میں کیا کر رہا ہے؟"

خاور نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

"ویلکم سر، میں اس ریسٹ ہاؤس کا منیجر ہوں، آپ سب اندر چلئے میں آپ کا سامان آپ کے رومز میں شفٹ کرواتا ہوں۔"

امتیاز نے مسکرا کر پہلے عائمہ کو دیکھا پھر خاور کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

"ہیلو خاور ہاؤ آر یو؟"

"آیم گڈ۔ تم بتاؤ امتیاز ٹھیک ہو؟ اور سب خیریت ہے نا......"

"امتیاز نے عائمہ کو بازو سے پکڑتے ہوئے اپنے قریب کیا اور بولا۔

"میں بہت خوش ہوں اپنی بیوی کے ساتھ اور بالکل ٹھیک۔"

"اچھی بات ہے۔ تم سب تھک گئے ہو گے۔ اندر چل کر پہلے کافی پیتے ہیں پھر ریسٹ کر لینا۔"

عائمہ نے چشمہ ہٹا کر نگاہ بھر کر خاور کی طرف دیکھا اور کہا۔

"خاور تم بالکل پہلے کی طرح ہی دکھتے ہو اب بھی۔ ذرا نہیں بدلے۔"

"عائمہ بدلنا میری فطرت نہ کل تھی اور نہ آج ہے۔" ہاں لیکن یہاں تو لوگ بہت جلدی بدل جاتے ہیں۔

امتیاز نے غصے سے عائمہ کو دیکھا اور کہا۔ "منیجر صاحب ہمارا سامان کار سے نکلوا کر روم میں رکھوا دیں۔ ذرا جلدی۔"

خاور نے مسکراتے ہوئے انہیں جاتا دیکھ کر سامان کمرہ میں رکھوا دیا۔ راشد، امتیاز اور عائمہ نے کافی پینے کے بعد روم میں جانے کا کہا تو انور صاحب فوراً بولے۔

"خاور راشد صاحب کو ان کے روم میں تم لے کر جاؤ اور دیکھنا انہیں کوئی پریشانی نہ ہو۔ اور ہاں امتیاز بیٹا چلو میں تمہیں تمہارا روم دکھاتا ہوں۔"

امتیاز بولا۔

"انکل آپ کیوں زحمت کرتے ہیں۔ خاور ہی

ہمیں ہمارے روم تک لے جائے گا۔ ہم ویٹ کرتے ہیں اس کا۔"

خاور نے راشد کو روم میں لے جانے سے پہلے ہی روم کا نمبر تبدیل کر دیا تھا۔ راشد کو روم میں چھوڑتے ہی خاور بولا۔

"راشد صاحب آپ یہاں آرام کریں۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا لڑکے۔"

"مطلب بھی سمجھ ہی جائیں گے آپ اچھا میں چلتا ہوں۔ آپ آرام کریں۔"

خاور کمرے کا دروازہ بند کرکے باہر آ گیا۔

امتیاز نے کہا۔

"اوئے منیجر ادھر آؤ۔ ہمیں ہمارا روم تم دکھاؤ گے ہمیں آرام کرنا ہے میری بیوی بہت تھک گئی ہے۔ سفر کرکے ہمیں ہمارا روم بتاؤ کہاں ہے۔"

"عائمہ بہت شرمندہ شرمندہ سی خاور کو دیکھ رہی تھی۔ خاور امتیاز کے رویے پر مسکرا کر بولا۔

"چلئے سر میں آپ کو آپ کے روم تک لے چلتا ہوں۔"

جیسے ہی راشد اپنے روم میں دروازہ لاک کرکے فریش ہونے باتھ روم گیا تو اسے رونے کی آواز سنائی دی۔ اس نے چاروں طرف دیکھا کوئی نظر نہ آیا، رونے کی مسلسل آواز سے گھبرا کر وہ کمرے میں آیا تو سامنے نصرت کھڑی تھی۔ اسے دیکھ کر گھبراتے اور پریشان ہوتے ہوئے بولا۔

"ت...... تو...... تم ...... تم یہاں کیسے تم تو مر چکی تھیں اور تمہیں تو میں نے ہی مارا تھا۔ اپنے ان ہاتھوں سے پھر تم یہاں کیسے آ گئیں...... ک...... کو......کون ہو تم؟"

"میں وہی ہوں جسے تو نے اپنی ہوس کا نشانہ بنایا تھا۔ اور بہت بے رحمی سے مار ڈالا تھا۔ میرے ماں باپ کو بھی مار ڈالا تھا نا تو نے آج میں تجھے مار ڈالوں گی۔ آج تیری موت تجھے یہاں لے کر آئی ہے۔

راشد گھبرا کر بھاگنے کی کوشش میں فرش پر ڈھے گیا۔ ڈر کے مارے پسینے چھوٹ رہے تھے، پسینے میں نہا گیا تھا۔ دروازہ کھولنے کی کوشش کرنے لگا لیکن لاکھ کوشش کے بعد بھی ناکام تھا۔ نصرت آگے بڑھ کر اس کا گلا دبانے لگی تو راشد گڑگڑانے لگا۔

"پلیز نصرت رحم کرو مجھ پر، مجھے معاف کر دو۔ مجھے بخش دو۔"

"تو نے رحم کیا تھا مجھ پر۔ تیرے آگے کتنا ہاتھ جوڑے تھے، کس قدر گڑگڑائی تھی۔ جانوروں کی طرح نوچا تھا مجھے۔ مجھے داغ دار کر دیا۔ برسوں انتظار کیا ہے میں نے اس دن کا، تجھے کیا لگتا ہے کہ تو یہاں خود آیا ہے۔ تجھے یہاں میں نے بلایا ہے اپنا انتقام لینے کے لئے آج تجھے مرنا ہی ہو گا۔"

"مجھے معاف کر دو نصرت۔ مجھے معاف کر دو۔"

راشد گڑگڑانے لگا۔

اس نے بھاگنے کی مسلسل کوشش کی، اب کی بار دروازہ کھولا تو دروازہ کھل گیا اور باہر کو بھاگا۔ بھاگتے بھاگتے ہال میں گیا تو انور صاحب سے کہنے لگا۔

"انور مجھے بچا لو وہ مجھے مار ڈالے گی۔ دیکھو وہ میرے پیچھے آ رہی ہے۔ وہ مار ڈالے گی مجھے۔"

انور صاحب بولے۔

"آج تمہارے گناہوں کا صلہ تمہیں مل رہی

رہے گا۔ میں تمہارے لئے کچھ نہیں کرسکتا۔"

راشد مدد کے لئے خاور کے پاس جا کر گڑگڑانے لگا تو خاور نے کہا۔

"کسی معصوم کی عزت داغ دار کرتے وقت رحم نہیں آیا آپ کو، آج اس معصوم کے انتقام سے آپ کو کوئی نہیں بچا سکتا۔"

راشد کے چیخنے چلانے پر امتیاز اور عائمہ اپنے کمرے سے نکلے تو راشد نے ان سے مدد کے لئے کہا۔ امتیاز کچھ کہتا کہ اس سے پہلے ہی گل وہاں آ گئی اور بولی۔

"یہ تیری کیا مدد کرے گا، یہ تو خود تیرے ہی جیسا ہے۔ بدکردار بے رحم، ظالم انسان آج تیرے ساتھ ساتھ اس کی زندگی کا بھی آخری دن ہے۔"

"تم...... تم تو مر چکی تھیں پھر زندہ کیسے ہوئی؟"

"ہاں تو نے تو مجھے مار دیا تھا لیکن آج بھی میں انتظار کررہی تھی تیرا۔ کیونکہ مجھے پتا تھا تو یہاں ضرور آئے گا۔"

"گل اور نصرت کو دیکھ کر عائمہ گھبرا رہی تھی۔

راشد اور امتیاز مسلسل مدد کے لئے چیخ رہے تھے۔ وہ ڈر کر بھاگنے لگے اور پھر گرتے پڑتے قبرستان میں پہنچے، نصرت اور گل نے ہوا میں اچھالتے ہوئے انہیں زمین پر پھینکا پھر سے ہوا میں اچھال کر زمین پر پھینکا جس سے دونوں باپ بیٹے کی ہڈیاں چکنا چور ہوگئیں۔ آخر کار تڑپ تڑپ کر ان دونوں نے دم توڑ دیا۔

خاور نے عائمہ کو تمام حقیقت سے آگاہ کیا۔

عائمہ رونے لگی اور خاور سے بولی۔

"خاور میں بہت شرمندہ ہوں تم سے۔ میں نے تم کو ہی غلط سمجھ لیا۔ اور پولیس سے تمہیں......"

خاور نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"تمہاری کوئی غلطی نہیں عائمہ، سب کچھ امتیاز کا کیا دھرا تھا۔"

"ہاں خاور بعد میں مجھے پتا چلا کہ وہ تمام لیٹرز تمہارے تھے۔ امتیاز کے ساتھ میں کبھی خوش نہیں رہ سکی جب سے مجھے یہ پتہ چلا کہ تم مجھ سے محبت کرتے تھے اور میری محبت تو تم تھے۔ کیونکہ مجھے محبت ان لیٹرز ان احساسات ان جذبات سے ہوئی تھی۔ جو تم نے لکھ کر بھیجے تھے۔ کاش تم اپنی محبت کا اظہار خود کردیتے تو آج یہ سب نہ ہوتا۔ نہ تمہیں درد سہنا پڑتا نہ مجھے پل پل مرنا پڑتا۔ میں پل پل مری ہوں، امتیاز کے ساتھ وہ بہت برا انسان تھا۔"

"میں تم سے آج بھی محبت کرتا ہوں اور پہلے کی طرح ہی کرتا ہوں۔ کیا تم مجھ سے شادی کرو گی؟"

انور صاحب نے ان دونوں کے قریب آ کر کہا۔

"راشد اور امتیاز اپنے انجام کو پہنچ گئے ہیں۔

"مجھے لگتا ہے کہ اب ہمیں پولیس کو بتا دینا چاہیے

"جی انکل۔" آپ ٹھیک کہتے ہیں۔

گل اور نصرت کو اپنے قریب آتے دیکھ کر عائمہ نے خاور کا ہاتھ ڈر کر پکڑ لیا۔ گل مخاطب ہوئی۔

"صاحب آپ کا بہت شکریہ آج ان گناہ گاروں کو ان کے کیئے کی سزا مل گئی ہے۔ اب مجھے اور مائی نصرت کو اس دنیا سے جانا ہوگا۔"

اس بار نصرت نے کہا۔

"برسوں تک اس دن کا انتظار کیا جو صرف تمہاری وجہ سے ممکن ہوا۔ آج میں ابدی نیند سو سکوں گی۔ خدا تمہیں خوش رکھے۔"

خاور نے نصرت اور گل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اللہ نے مجھے تو بس ذریعہ بنایا ہے۔ گناہ گاروں کو اللہ نے ان کے انجام تک پہنچایا ہے۔ بس اللہ ہمیں کسی ناحق اور مظلوم کے ساتھ برا کرنے سے محفوظ رکھے۔

میری دعا ہے کہ اللہ آپ دونوں کو سکون عطا فرمائے۔

اور پھر نصرت اور گل دیکھتے ہی دیکھتے دھوئیں میں تحلیل ہو کر آنکھوں سے اوجھل ہوگئیں۔







طلسم کدہ

عائشہ افضل۔ کبیر والا

رات گھری تھی اور اندھیرے نے پورے جنگل کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا، قدم قدم پر موت رقص کررھی تھی، ایسے میں دل پر لرزہ طاری تھا اور پورے جسم پر کپکپی اپنا زور جمائے تھی کہ پھر......

خراماں خراماں خوف کی پگڈنڈی پر آگے بڑھتی اور رگوں میں لہو منجمد کرتی لرزیدہ کہانی

"**گاڑی** کو بھی ابھی خراب ہونا تھا۔" ایلن نے اپنے آپ سے سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔

"کیا ہوا گاڑی کو۔" سوزی نے ایلن سے پوچھا؟

وہ دونوں اپنے ہوسٹل جارہی تھیں کیونکہ وہ اپنے کالج کے ہوسٹل میں ہی رہتی تھیں۔ انہیں کالج سے چھٹیاں ہوئی تھیں تو وہ چھٹیاں منانے گھر آئی تھیں، آج ان کی آخری چھٹی تھی تو اپنے ہوسٹل واپس جارہی تھیں کہ اچانک ان کی گاڑی خراب ہوگئی اور اوپر سے موسم بھی اتنا خراب تھا۔

"میں نے تم سے کہا تھا ناں کہ صبح ڈیڈی کے ساتھ کالج جاتے ہیں لیکن تم پر تو پتہ نہیں کون سا بھوت سوار تھا کہ رات میں ہی جانا ہے اب لے لو مزارات کو کالج جانے کا۔"

ایلن کی چھوٹی بہن سوزی نے کہا۔

''تم نصیحتیں کرنا بند کرو اور کوئی آئیڈیا سوچو کہ کرنا کیا ہے۔ میں باہر جا کر دیکھتی ہوں گاڑی کو کیا ہوا ہے۔''

''تم باہر نہیں جاؤ گی باہر دیکھو کتنا موسم خراب ہے اوپر سے یہاں چاروں طرف ڈراؤنا جنگل پھیلا ہوا ہے۔ مجھے تو بہت ڈر لگ رہا ہے۔''

''تمہیں ڈر لگ رہا ہے مجھے نہیں۔'' ایلن یہ کہتی ہوئی گاڑی کا دروازہ کھول کر گاڑی سے باہر نکل گئی۔ اس نے جلدی سے گاڑی کا بونٹ اٹھایا اور چیک کرنے لگی کہ گاڑی کے کس حصے میں خرابی ہے۔

''یہ کیا؟ گاڑی کا انجن تو بہت گرم ہو چکا ہے اور انجن کا پانی بھی ختم ہوگیا ہے۔'' ابھی وہ اپنے آپ سے سرگوشی کر ہی رہی تھی کہ اچانک بادل زور سے گرجنے لگے۔

بادلوں کی گرج سنتے ہی اس نے گاڑی کا بونٹ بند کیا اور گاڑی کا دروازہ کھول کر گاڑی کے اندر چلی گئی۔

کیا ہوا ہے گاڑی کو؟

گاڑی کا انجن بہت گرم ہوگیا ہے اور انجن کا پانی بھی ختم ہوگیا ہے۔ گاڑی میں پانی ڈالیں گے تو ہی وہ اسٹارٹ ہوگی، یہاں تو کہیں سے پانی بھی نہیں ملے گا ہمیں گاڑی سے اتر کر کہیں سے پانی تلاش کرنا چاہئے، شاید ہمیں یہاں کہیں سے پانی مل جائے۔

تمہارا دماغ خراب تو نہیں ہوگیا، یہاں چاروں طرف جنگل ہی جنگل ہے یہاں ہمیں کہاں سے پانی ملے گا؟

''تمہیں جانا ہے تو جاؤ پانی تلاش کرنے میں تو نہیں آ رہی؟''

''ٹھیک ہے میں تو جا رہی ہوں تم بیٹھی رہو یہاں اکیلی آرام سے۔''

''میں تو یہاں اکیلے نہیں بیٹھ رہی مجھے اکیلے میں ڈر لگتا ہے۔''

''تم کتنی ڈرپوک ہو۔''

''جی میں ڈرپوک نہیں ہوں۔''

''اگر تم ڈرپوک نہیں ہو تو میرے ساتھ چلو پانی تلاش کرنے۔''

ان دونوں نے گاڑی سے ٹارچ لائٹ اٹھائی اور گاڑی سے اتر گئیں۔

گاڑی سے اترتے ہی وہ دونوں جنگل کی طرف چل دیں۔

''ہمیں جنگل میں نہیں جانا چاہئے۔''

''اگر تمہیں میرے ساتھ چلنا ہے تو چپ کر کے چلو۔''

رات کے ٹائم جنگل زیادہ ہی بھیانک لگ رہا تھا۔ اوپر سے لمبے لمبے درخت بھوتوں کی مانند لگ رہے تھے۔

''یہ دونوں ابھی جنگل میں داخل ہی ہوئی تھیں کہ انہیں کسی بچے کے رونے کی آواز سنائی دیں۔'' ایلن تمہیں کسی بچے کے رونے کی آواز سنائی دے رہی ہے؟''

''ہاں مجھے بھی کسی بچے کے رونے کی آواز سنائی دے رہی ہے۔''

''ہمیں چل کر دیکھنا چاہئے شاید کسی کو ہماری مدد کی ضرورت ہو۔'' ایلن نے کہا۔

''ہم یہاں جنگل میں پانی تلاش کرنے آئے ہیں نہ کہ کسی کی مدد کرنے۔''

''تم تو چپ ہی رہو ڈرپوک۔ اگر تم نے میرے ساتھ چلنا ہے تو چپ کر کے چلو۔''

ایلن اس سمت چلنے لگی جس سمت سے اس بچے کے رونے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ سوزی بھی ایلن کے پیچھے پیچھے اس آواز کے تعاقب میں چلنے لگی۔

پہلے تو انہیں وہ آوازیں سنائی دے رہی تھیں کہ اچانک انہیں وہ آوازیں سنائی دینا بند ہوگئیں۔ ان دونوں نے کافی دیر تک ادھر ادھر کان لگائے لیکن انہیں وہ آوازیں نہ سنائی دیں۔

''اگر تمہارا مدد کرنے کا شوق پورا ہوگیا ہو تو پانی تلاش کریں۔''

ابھی وہ یہ باتیں کر ہی رہی تھیں کہ انہیں وہ آواز پھر سے سنائی دینے لگی۔

ان دونوں نے اپنے اردگرد ٹارچ لائٹ گھما کر دیکھی۔ لیکن انہیں وہاں کچھ نظر نہ آیا۔

وہ دونوں دوبارہ اس آواز کی سمت چلنے لگیں۔

جیسے جیسے وہ اس آواز کی سمت بڑھ رہی تھیں انہیں وہ آواز اتنی ہی دور جاتی محسوس ہو رہی تھی۔

وہ دونوں آواز کے پیچھے پیچھے چلتی چلتی کافی دور تک آ چکی تھیں۔ ابھی وہ آوازوں کے پیچھے چل ہی رہی تھیں کہ ان دونوں کو ایک بہت بڑی حویلی نظر آئی جو کہ دیکھنے میں بہت ہی بھیانک تھی۔

''یہ حویلی کس کی ہے؟ کتنی ڈراؤنی ہے اس میں کون رہتا ہوگا۔'' ایلن نے کہا۔

''مجھے کیا پتا اس میں کون رہتا ہوگا میں بھی تمہارے ساتھ ہی یہاں آئی ہوں جو تم نے دیکھا وہ ہی میں نے دیکھا۔ سوال تو ایسے کر رہی ہو جیسے میں ہی اس حویلی میں رہتی ہوں۔ اس بچے کی آواز بھی اس حویلی سے آ رہی ہے چلو چل کر دیکھتے ہیں۔'' ایلن نے کہا۔

''مجھے لگتا ہے ہمیں حویلی کے اندر نہیں جانا چاہئے۔''

''تم سے میں نے کتنی بار کہا ہے کہ چپ کر کے چلا کرو۔''

''تم نے کون سا میری بات مان لینی ہے۔'' سوزی نے کہا۔

''چلو چلتے ہیں حویلی میں۔''

وہ دونوں جیسے ہی حویلی کے دروازے سے حویلی میں داخل ہوئیں تو حویلی کا دروازہ اپنے آپ بند ہوگیا جیسے ہی دروازہ زور سے بند ہوا تو ایلن کی چیخ نکل گئی۔ ''اب ہم واپس کیسے جائیں گے۔'' ابھی وہ یہ بات کر ہی رہی تھیں کہ دروازہ اپنے آپ کھلنے لگا اور اپنے آپ بند ہونے لگا۔ انہوں نے اپنے آپ کو تسلی [illegible] کہ ہوا کے تیز جھونکے دروازے کو کھول اور بند کر رہے ہیں۔ حویلی کے اندر کافی اندھیرا تھا کہ اچانک لائٹ آن ہوگئی تو وہ دونوں یہ دیکھ کر حیران رہ گئیں کہ حویلی میں ہر طرف قدآدم آئینے دیواروں کے ساتھ کھڑے تھے۔ وہ دونوں قدم آدم آئینوں کو دیکھ دیکھ کر آگے بڑھتی گئیں۔

ایلن اور سوزی جس جس آئینے کے سامنے سے گزر رہی تھیں تو ہر آئینے پر ان دونوں کی تصویریں بنتی جا رہی تھیں اور ہر آئینہ ان تصویروں کو جاندار بنا کر آئینوں سے باہر نکال رہا تھا۔

سوزی کو لگا جیسے اس کے پیچھے کوئی ہے اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو اس کی چیخ نکل گئی۔ سوزی کی چیخ سن کر ایلن نے بھی پیچھے دیکھا تو اس کی بھی چیخ نکل گئی کیونکہ ان کے پیچھے ان ہی جیسی بہت سی ایلن اور سوزی کھڑی تھیں جو کہ انہیں کی طرح لباس پہنے ہوئے تھیں۔

''ہم تو یہاں کھڑی ہیں پھر یہ سب کون ہیں۔'' سوزی نے کہا۔

''یہ وقت باتیں کرنے کا نہیں بلکہ ہمیں یہ سوچنا چاہئے کہ اس حویلی سے باہر کیسے نکلنا ہے۔''

وہ جاندار تصویریں ویسی ہی حرکت کر رہی تھیں جیسے ایلن اور سوزی کر رہی تھیں۔

وہ دونوں ان جاندار تصویروں سے بچ کر جانے کے لئے ترکیب سوچنے لگیں۔ وہ بہت خوفزدہ ہو چکی

تھیں۔ ہر طرف آئینے ہی آئینے تھے۔ جس دروازے سے حویلی میں داخل ہوئی تھیں، اس پر بھی دوسری طرف آئینہ ہی تھا۔ اب وہ باہر جانے کا راستہ کھو چکی تھیں، اب انہیں ہر قدم سوچ سمجھ کر اٹھانا تھا۔ وہ آگے بڑھیں کہ کسی طرح ان روحوں یا تصویروں یا وہ جو بھی تھیں ان سے پیچھا چھڑایا جاسکے لیکن جیسے ہی انہوں نے قدم آگے بڑھائے تو وہ سب کی سب ان کے پیچھے چل پڑیں۔

یہ دیکھ کر وہ ان کا پیچھا کررہی تھیں وہ ہراساں ہوگئیں ان کے دل اچھل کر حلق میں آچکے تھے وہ بھاگیں...... وہ سب بھاگنے لگیں یہ ایک بہت بڑا ہال کمرہ تھا۔

ہر طرف آئینے ہونے کی وجہ سے انہیں کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ کہاں جائیں۔

"یہ سب تمہاری وجہ سے ہورہا ہے جو ہم ایسی آسیبی حالات میں پھنس چکے ہیں۔" سوزی نے کہا۔

"یہ وقت لڑنے کا نہیں ہے باہر نکلنے کا ہے۔ خداوند یہ کیسی صورت حال ہے آج تک نہ دیکھی نہ سنی......" ایلن بڑبڑائی۔

"کسی کی مدد کے چکر میں ہم خود ہی یہاں پھنس چکے ہیں۔" سوزی نے کہا۔

وہ دونوں اب جم کر کھڑی ہوگئیں تو وہ حرکت کرتی تصویریں اپنی اپنی جگہ جم کر کھڑی ہوگئیں۔

"اف خدا ان نقل کرنے والی تصویروں سے کیسے پیچھا چھڑائیں......؟"

"ایلن میرا ہاتھ پکڑلو ایسا نہ ہو کہ ہم ان سب میں گم ہوجائیں اور ایک دوسرے کو پہچان نہ پائیں۔"

"یہ ٹھیک ہے۔" ایلن نے سوزی کا ہاتھ پکڑلیا۔ لیکن وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئیں کہ ساری ایلن نے ساری سوزی کے ہاتھ پکڑلئے، اب وہ ایلن اور سوزی کے جوڑے میں وہاں کھڑی تھیں۔ "جو بھی ہوجائے تم میرا ہاتھ مت چھوڑنا۔" ایلن نے کہا۔

"ایلن ذرا غور سے پلٹ کر دیکھو تو ہم کس دروازے سے اندر داخل ہوئی تھیں۔ شاید ہمیں اصل دروازہ مل جائے یعنی واپس جانے کا راستہ مل جائے وہ دونوں پلٹیں تو وہ سب کی سب بھی پلٹ گئیں۔ وہ دونوں غور سے دیکھنے لگیں آخر انہیں لگا کہ ایک آئینے کے پیچھے شاید دروازہ ہے کیونکہ اس کی ساخت باقی آئینوں سے مختلف تھی جو غور سے دیکھنے پر محسوس ہورہی تھی۔

"اب ہمیں رسک لینا ہی پڑے گا۔ شاید اس جگہ پر دروازہ ہے۔" سوزی نے کہا۔

"لیکن اگر یہ سب بھی ہمارے ساتھ ہی باہر نکل پڑیں گی تو ان سے نجات کیسے ممکن ہوگی؟" ایلن بولی۔

"چلو تو سہی رسک تو لینا ہی پڑے گا اور اب جلدی سے بھاگتے ہوئے دروازے کی جانب بڑھو ورنہ ان آئینوں کے سامنے سے جتنی بار گزریں گے اتنی ہی تصویریں مزید بنتی جائیں گی اور ہم اس طلسم کدے میں گم ہوکر رہ جائیں گی۔" سوزی نے کہا۔

وہ دونوں بھاگتی ہوئی دروازے کی جانب بڑھیں تو وہ سب بھی بھاگنے لگیں۔ وہ بھاگتے ہوئے دروازے سے باہر نکل گئیں۔ ان کی قسمت نے ساتھ دیا تھا۔ وہ واقعی اصل دروازہ تھا۔ دروازے سے باہر بھاگتے ہوئے وہ کافی دور آنکلیں۔ انہوں نے سہمے ہوئے مڑ کر دیکھا تو وہ جیسے وہیں دروازے کے اندر ہی رہ گئے تھے۔ وہاں یہ دونوں اکیلی تھیں۔ انہوں نے اب بھاگنا شروع کردیا تھا جب وہ بھاگتی بھاگتی جنگل سے نکل کر سڑک پر آئیں تو وہ دونوں بیہوش ہوگئیں۔

جب ان کی آنکھ کھلی تو وہ ایک اسپتال میں تھیں اور ان کے پاس ان کے ممی ڈیڈی بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ دونوں انہیں پاس دیکھ کر سمجھ گئیں کہ انہیں وہاں جنگل سے ان کے ممی پاپا ہی لے کر آئے ہیں۔

ایلن اور سوزی نے ایک مرتبہ ایک دوسرے کو دیکھا اور آنکھیں بند کرلیں اور اس واقعے کو ایک خواب سمجھ کر بھلادیا کیونکہ وہ اس واقعہ کو یاد رکھنا نہیں چاہتی تھیں۔





ماسی جیئونی

محمد حنیف شاکر۔ننکانہ صاحب

اچانک شور اٹھا اور چشم زدن میں انسان گاجر اور مولی کی طرح کٹتے ہوئے زمین پر گرنے لگے، منظر بہت ہی ہولناک، خوفناک، دہشت ناک اور دل دہلادینے والا تھا کہ پھر اچانک......

دل ودماغ کواچنبھے میں ڈالتی عجیب وغریب اور سوچ کے افق پر آگے بڑھتی روداد

2018ء کا سال آج پھر چودہ اگست کا دن، آزادی کا دن، یہ آزادی ہمیں لاکھوں جانیں دے کر نصیب ہوئی آج سے اکہتر سال قبل ہمارے بزرگوں نے بہت ساری قربانیاں دیں، ان قربانیوں کی وجہ سے بزرگوں کی بے گوروکفن لاشیں پڑی تھیں۔ خواتین کی عصمت دری ہوئی، بچوں کو ظالموں نے نیزوں پر اٹھا اٹھا کر شہید کیا، جوانوں کو برچھیوں اور تلواروں کے وار سہنے پڑے۔

لیکن آج ہم جب ہر سال چودہ اگست کو آزادی کا دن مناتے ہیں تو اپنے ان شہداء کو یکسر بھول جاتے ہیں کہیں ڈھول کی تھاپ پر رقص ہورہا ہوتا ہے تو کہیں آتش بازی کا مظاہرہ کہیں موٹر سائیکلوں پر پرچم لگا کر ریلیاں نکل رہی ہوتی ہیں تو کہیں تقریبات، اسکولوں، کالجوں میں ملی نغمے پڑھے جارہے ہوتے ہیں تو گلیوں، بازاروں کو دلہن کی طرح سجایا ہوتا ہے۔

لیکن ہم ہر سال اپنے ان قربانی دینے والے عزیزوں کو مسلسل بھول جاتے ہیں نہ ان کے لئے دعا نہ ہی کوئی ایصال ثواب، آج مجھے ایسے ہی ایک ایسی ہستی یاد آگئی جو پورے شہر ننکانہ صاحب میں ماسی جیونی کے نام سے مشہور تھی۔

میں نے اپنے ملک پاکستان کے صوبہ پنجاب اور سندھ کے تمام شہروں اور دیہاتوں میں خیبر پختون خواہ اور بلوچستان کے اکثر علاقوں آزاد و جموں کشمیر کے پانچ اضلاع میں سیر سپاٹے کرنے کے ساتھ ہندوستان اور عرب کے ملک بحرین کے ساتھ دبئی کا وزٹ بھی کر رکھا ہے، کافی پیروں، فقیروں کے مزاروں پر حاضری دی، نیک لوگوں یعنی اللہ والوں کی مجلسیں اٹینڈ کیں، رئیسوں اور وڈیروں کے ساتھ ساتھ سیاسی لوگوں سے ملاقاتیں ہوئیں، عسکری ونگ کے بڑے بڑے سپوتوں سے میل ملاپ ہوا، مختلف محکموں کے افسران بالا کے ساتھ ساتھ کافی بلکہ بہت ہی زیادہ ملازمین سے رابطہ ہوا، پھر امیر لوگوں کی محفلوں کے ساتھ ساتھ غریب لوگوں کی دنیا میں تو بہت ہی زیادہ لوگوں سے گٹھ جوڑ رہا، اپنی برادری یعنی اپنے ہم پیشہ لوگوں ٹیچر حضرات، خطیبوں، مفتیوں، محدثوں، مفکروں اور مبلغوں کے ساتھ بیٹھک بھی ہوئی، مگر اتنی دنیا پھرنے پھرانے پر بھی ننکانہ صاحب کی ماسی جیونی کے سوا کوئی ایسا نہیں ملا جو ٹھوک بجا کر کہتا ہو کہ ''اس نے اللہ کو دیکھا ہے۔'' لیکن زیادہ تر لوگوں کا کہنا ہے کہ مائی جیونی مجذوب تھی۔

مجھے یہ معلوم نہیں کہ ماسی جیونی کون تھی پاگل، جاہل یا پھر مجذوب، لیکن میں نے اسے بڑے محکم یقین کے ساتھ بار بار یہی کہتے سنا ہے۔

وہ پرانا وقت تھا لوگوں کے پاس علم کم، پر لوگ سچے اور کھرے تھے۔ لوگ کھلے ذہن کے مالک تھے اور دل گردے والے تھے، دل بہت بڑا۔

کیا خبر ان دلوں میں واقعی اللہ پاک رہتا بھی ہو، کچھ لوگ ماسی جیونی کو خبطی اور ... سمجھتے تو کچھ اسے پاگل اور دیوانی بھی کہتے مگر اس کے محلے کے لوگ ماسی جیونی کو قبول کئے ہوئے تھے۔ حالانکہ ان لوگوں میں بھی کچھ لوگ یہ سمجھتے ہوں گے کہ ماسی شاید سٹھیا گئی ہے چند ایک کو شک بھی گزرتا ہوگا کہ ماسی کے یہ جملے کفر کی زد میں تو نہیں آجاتے مگر پھر بھی ان کا دل نہیں مانتا تھا کہ اللہ پاک کا نام اتنے پیار و محبت سے لینے والی کو دل میں بھی برا جان لیں یہی وجہ ہے کہ ننکانہ صاحب میں گردوارہ مالجی کے قریب ون کا ایک درخت تھا جس کے قریب کافی ساری جھاڑیاں بھی تھیں۔

ماسی جیونی صبح الصبح تڑکے ہی اس ون کے درخت کے سائے میں آکر بیٹھ جاتی کیونکہ وہاں اس کے بیٹے کا گندم پیسنے کی چکی تھی۔

ماسی سارا دن سرگوشیوں میں بیل سے باتیں کرتی رہتی ہم نے کئی بار کان لگا کر سننے کی کوشش بھی کہ وہ کیا بولتی ہے لیکن کبھی کوئی لفظ ہمارے پلے نہیں پڑا اگر ماسی سے پوچھتے تو کہتی۔ ''میں تو بیل کو سمجھاتی ہوں، اس کو حوصلہ دیتی ہوں اس کا مان بڑھاتی ہوں بیچارا بڑا اکیلا ہے میں باتیں کرتی رہتی ہوں تو یہ تیز چلتا ہے۔ گھبراتا نہیں ہے۔'' ہمارے پاس اس کی بات کو جانچنے کا کوئی آلہ نہیں تھا۔ ہم نے تو اسے ہمیشہ وہیں پر بیٹھے ہوئے بیل سے باتیں کرتے ہی سنا۔ وہ ہر روز اپنے اس کام کو بڑی لگن اور بڑی ذمہ داری سے کرتی تھی۔ کئی بار تو وہ بخار میں تپتی، سردی سے ٹھٹھرتی، کانپتی رہتی مگر اپنی اس پیڑھی سے اٹھنے کا نام نہیں لیتی تھی۔

اس کے بیٹے بہو نے کتنی بار محبت اور پیار سے پھر تنگ آکر کئی بار غصے سے بھی سمجھانے کی کوشش کی کہ ''اماں جی اس جگہ کو چھوڑ دو گھر میں بیٹھ کر آرام کیا کرو۔'' پر اس پر تو کسی کا کوئی اثر نہ ہوتا یعنی اس کے کان پر جوں تک نہ رینگتی۔

وہ تو ہر صبح بڑے کروفر سے وہاں دھندے کی جگہ پر پہنچ جاتی۔

جہاں وہ بیلوں کے ساتھ باتیں کرتی وہاں ہر آنے والے گاہک سے بات کرنا بھی نہ بھولتی وہ ہر ایک سے کچھ نہ کچھ ضرور کہتی، کسی کو دعا دیتی کسی سے کوئی

سوال پوچھتی کسی کو کوئی جواب دیتی غرض کہ بیلوں کی طرح گاہکوں سے بھی بات کرنا ضروری سمجھتی جیسے وہ گاہکوں کا حوصلہ بڑھانے کے لئے شاید وہ یہ سمجھتی ہو کہ وہ گاہکوں سے باتیں کرتی رہے گی تو اس کے بیٹے کا کاروبار زیادہ چلے گا۔

ادھر اس کے بیٹے اور بہو نے اب اس کے ساتھ سر کھپانا چھوڑ دیا تھا۔ وہ دونوں میاں بیوی محنتی لوگ تھے ون کے درخت کے نیچے خراس میں سارا دن بیل گھومتا اور وہ اپنے اس دھندے میں ہی الجھے رہتے، انہیں تو ہر وقت گاہکوں کی آس امید لگی رہتی انہیں آنے والے مستقبل کی فکر تھی، جس میں بچوں کی شادیاں بھی شامل تھیں، گو بچے ابھی بہت چھوٹے تھے پھر بھی والدین کو یہ فکر لاحق تھی۔ رات کو روٹی کھاتے تو دن کو ناشتے کی فکر میں، انہیں فکر نہیں تھی تو صرف اپنے اس بیل کی فکر نہیں تھی، ہم نے اسے کبھی بھی بیل کو مارتے نہیں دیکھا وہ تو ماسی جیونی کی آواز سے یعنی سرگوشیوں پر تیز چلتا تھا۔

نانی کہتی تھیں کہ وہ ایک پہنچی ہوئی ہستی ہیں۔ نانی اماں گھر میں اگر کوئی اچھی چیز پکاتی تو بڑے التفات سے پلیٹ میں رکھ کر اسے صاف کپڑے سے ڈھانپ کر مجھے دیتی تاکہ میں انہیں دے آؤں۔ ماسی جیونی بھی جیسے اس کی عادی ہوگئی تھی میرے ہاتھ میں پلیٹ دور سے دیکھ کر بلند آواز میں کہتی دیکھ آج میرے اللہ پاک نے میرے لئے کیا بھیجا ہے۔

شروع شروع میں، میں چڑ سی جاتی اور تلملا کر کہتی کہ یہ نانی نے بھیجا ہے۔ اقرا بتول جو سامنے چوبارے والے گھر میں رہتی ہیں اور ماسی جیونی مسکراتے ہوئے کہتی ہاں۔ ہاں۔ کیوں نہیں۔ پھر بھلا یہ تو بتا اقرا بتول کو کس نے بھیجا ہے تو میں اس کی یہ بات سن کر جھنجھلا جاتی۔ بھلا یہ کیسا سوال تھا۔ تب مجھے لگتا تھا جیسے ماسی جیونی مجھے بچی سمجھ کر میرا مذاق اڑانے کی کوشش کرتی تھی۔ مگر پھر میں نے دیکھا کہ ماسی کی تو ہر بات ہی اللہ کے نام سے شروع ہوتی تھی۔ اگر ہوا چلتی تو شکر کرتی کہ ''میرے اللہ نے کیا ٹھنڈی ہوا چلائی ہے۔'' اس کی بہو غصے میں آکر اگر کچھ کہتی تو کہنے لگتی۔ ''اللہ پاک آج مجھ سے ناراض ہے اگر بیمار ہو جاتی تو کہتی اللہ تعالیٰ مجھ سے ناراض ہے۔ چڑیا چہکتی تو کہتی۔ ''سبحان اللہ۔''

ماسی جیونی اتنا اللہ اللہ کرتی کہ الجھن ہونے لگتی، میں تو اس گھر سے تھی جس میں قرآن پاک کو زریں غلاف میں لپیٹ کر الماری کے سب سے اونچے خانے میں رکھا گیا تھا۔

ماسی کے پاس ہر سوال کا جواب موجود ہوتا تھا۔ لیکن کبھی کبھی اس طرح بھی ہوتا کہ ماسی اتنا کہہ کر خاموش ہو جاتی کہتی۔ ''یہ بات بس میں جانوں یا پھر میرا خدا جانے'' اور کہتی بھی بڑے انوکھے انداز سے جب وہ ''میں جانوں'' کہتی تو انگلی سے آسمان کی طرف اشارہ کرتی اور جب میرا اللہ جانے کہتی تو انگلی اپنے دل پر رکھ لیتی اور ایسا کرتے وقت اس کی آنکھیں یوں جمی ہوتیں جیسے کسی غیر مرئی شے کو تکتی ہوں۔

شروع شروع میں تو لوگوں نے اسے ایک اتفاق ہی سمجھا۔ اور کچھ نے شاید اس طرف انگلی والے معاملے میں توجہ دلانے کی کوشش بھی کی مگر وہ ہمیشہ ایسے ہی کرتی رہی اور اگر میں اسے سوچنے کی طرف جاؤں تو دل میں ایک پھانس سی پڑ جاتی ہے کہ نہ جانے کیوں وہ جانتے بوجھتے ایسا کرتی تھی میں تو ہمیشہ ماسی سے چڑتی ہی رہتی اور کوشش کرتی کہ میں اس کی بے سروپا باتوں پر زیادہ نہ سوچوں۔

مگر ایک دن میرے کان اس وقت کھڑے ہوگئے جب ماسی میری خالہ جی سے بات کر رہی تھی خالہ نئی نئی یونیورسٹی میں داخل ہوئی تھیں اور فلسفہ کی اسٹوڈنٹ تھیں۔ اس لئے سارا دن ہمہ وقت علمی بحثوں میں الجھنا ان کا شوق تھا۔ اس دن انہوں نے بڑی تحقیر کے انداز میں ماسی جیونی سے پوچھا۔ ''ماسی تم میں اور تمہارے بیل میں بھلا کیا فرق ہے۔''

''فرق تو ہے بیٹا۔ ہیں تو ہم دونوں اللہ کی مخلوق لیکن فرق تو صاف ظاہر ہے فرق ہمارے جسم دماغ یا پھر بول چال کا نہیں بلکہ کسی اور چیز کا ہے۔ دنیا دیکھنے کے لئے جانوروں کو شیشے کا ٹکڑا ملا ہے۔ اور ہمیں دیکھنے کے

لئے عدسہ ملا ہے تو بھی سوچتی ہوگی کہ ماسی یہ کیا کہہ رہی ہے اب تو یہ بھی پوچھے گی کہ شیشے کے ٹکڑے اور عدسے میں کیا فرق ہے۔

ماسی نے کہاں کا ٹکڑا کہاں لگا دیا ہے لیکن ہم میں فرق اتنا ہی ہے شیشے کے ٹکڑے سے دنیا دیکھو تو کیا ہوگا کچھ بھی نہیں ہوگا پس منظر تھوڑا سا دھندلا ہو جاتا ہے شیشہ اگر رنگ دار ہو تو عجیب سے رنگ بھر جاتے ہیں اور اگر دنیا کا سب سے شفاف شیشہ بھی مل جائے تو پس منظر کو ہو بہو ویسا ہی دکھا دیتا ہے جیسے کہ وہ ہے۔

پھر میرے اللہ سوہنے نے تو کہہ دیا ہے کہ دنیا کو کھلی آنکھوں سے دیکھو تو کیا ملے گا، جانور شیشے کے اس ٹکڑے سے دنیا دیکھتے ہیں اور مٹی میں مل کر مٹی ہو جاتے ہیں، دھوکے میں مل کر خود بھی دھوکہ ہو جاتے ہیں لیکن انسان کی بات دوسری ہے انسان کو دیکھنے کے واسطے شیشہ نہیں طرح طرح کے عدسے ملے ہیں اور ہر عدسہ مختلف ہے کوئی چیزوں کو چھوٹا کر کے دکھاتا ہے کوئی دور کر کے دکھاتا ہے کوئی الٹا کر کے دکھاتا ہے کوئی مچھر کو اتنا بڑا دکھاتا ہے کہ وہ ہاتھی محسوس ہو، عدسہ ہمیں دنیا نہیں دکھاتا بلکہ عکس دکھاتا ہے۔ عکس ہمیں رلاتے ہیں، دنیا دھوکا ہے لیکن عکس سچا ہے کیونکہ یہ ہمارے ذہن میں بنتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہم انسانوں پر اپنا بہت بڑا کرم کیا ہے کہ ہمیں یہ نظر دی ہے۔

اور ایک ہم ہیں جو عکس کو چھوڑ کر شیشے کے ٹکڑوں کے پیچھے بھاگنے کی کوشش کرتے ہیں، حقیقت ڈھونڈتے ہیں جو کہیں ہے ہی نہیں حقیقت کوئی نہیں اگر ہے بھی تو اس کے اتنے رنگ ہیں کہ جتنے اللہ کے بندے ہیں ہر بندے کی شکل وصورت ایک دوسرے سے نہیں ملتی۔ یہ اللہ تعالیٰ کی کاریگری ہے۔ قدرت کاملہ کا کرشمہ ہے ہم دو جمع دو، چار بتا کر بڑے خوش ہوتے ہیں کہ ہم نے سچ تلاش کر لیا، دو تیری آنکھیں اور دو ہی میری آنکھیں مل کر چار تو نہیں ہوتیں، انہیں جتنا بھی جمع کر لو سچ تو یہی ہے کہ دو آنکھیں تمہاری رہیں گی اور دو ہی میری رہیں گی۔ تیری یہ دو آنکھیں بھی اس پیار و محبت سے میرے پاس بیل کو دیکھ سکیں گی۔ جس طرح میری آنکھیں اس کو الفت ومحبت، انس و پیار سے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر اپنائیت سے دیکھتی ہیں۔

دیکھو جانور کے سامنے اس کا بچہ مر جاتا ہے تو اسے غم اور دکھ ضرور ہوتا ہے مگر وہ روتا نہیں کسی بھی درندے کے سامنے اس کی رہائش گاہ کو پورے جنگل میں آگ لگا کر جلا دو اسے سمجھ نہیں آتی کہ اس کا کیا چھین لیا گیا ہے یہ صرف ہماری ہی نظر ہے جس سے ہم چیزوں کو دیکھتے ہیں ان کو سمجھتے ہیں خداوند قدوس کی حکمت کو جانتے ہیں اس سے باتیں کرتے ہیں۔

شیشے کے ٹکڑے سے دیکھو گے تو آر پار نظر آئے گا اور اگر عدسے سے دیکھیں تو عکس نظر آئے گا دنیا اصل نہیں ہے دنیا عکس ہے۔

میں نے خالہ کو اتنا خاموش کبھی نہیں دیکھا تھا۔ خالہ کی یہ خاموشی دیکھ کر اور ماسی کی مدلل دلیل کو سن کر مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے کیا معلوم ماسی جیونی کی سوچ ہماری سوچ سے بہت اوپر کی ہو گئی ہو۔

ایک دن دوپہر کو جب ماسی ستانے کو تھوڑی دیر کے لئے زمین پر لیٹی ہوئی تھی تو میں نے بڑی آہستگی سے قریب بیٹھ کر پوچھا۔ "ماسی جی کیا تم نے واقعی اللہ کو دیکھا ہے۔"

"بچے تجھے یقین کیوں نہیں آتا۔ اللہ تو ہر شے میں ہے اب جو ہر شے میں اسے دیکھ لینے پر بھی ہم سب اتنے حیران کیوں ہوتے ہیں۔ ہاں اگر کوئی اللہ کو نہیں دیکھ سکتا تو ہمیں اس غریب پر افسوس ہی کرنا چاہئے۔ ہر شے کے دو روپ ہیں ایک ظاہر اور ایک باطن، ظاہر کا روپ دنیا ہے اور باطن کا روپ اللہ تعالیٰ ہے جب کوئی نظر باطن کا روپ دیکھ لیتی ہے تو اس کے لئے ظاہری روپ مسلسل چھپ جاتا ہے اس کے لئے پھر واپسی کا کوئی راستہ نہیں رہتا۔"

"ماسی جی اللہ تعالیٰ کیسا ہے۔" ماسی میرے یہ الفاظ سن کر ہنس پڑی اور بولی۔ "پگلی یہ بات میں جانوں یا میرا رب جانے۔" ماسی نے تو جیسے مسکرا کر میرا سوال ہی

ٹال دیا ہو لیکن میں بھی اسے ٹال مٹول سے چھوڑنے والی نہیں تھی محلے کی ہر بوڑھی عورت سے میرا یہی ایک ہی سوال ہوتا تھا کہ "ماسی جیونی نے اللہ کو کہاں دیکھا ہے۔" لیکن میں پھر خاموش ہو جاتی کہ "ماسی جیونی مجذوب ہے۔"

ایک دن میں ماسی جیونی کے لئے نانی کے ہاں سے ملنے والی سویاں دینے آئی تھی کہ میرے سامنے ہی ایک تانگہ آ کر رکا اس میں سے ایک بوڑھی عورت اپنے بیٹے کے ساتھ تانگے سے اتری اور ماسی جیونی سے بغل گیر ہو گئی اور پھر ماسی جیونی کے ہاتھ اٹھے کہ میرا بیٹا کیسا ہے کہتے ہوئے اس نوجوان کے سر پر پیار بھرے انداز میں ہاتھ پھیرنے لگی ساتھ ہی کہنے لگی۔ "بیٹا یہ میری بچپن کی سہیلی ہے۔ سیالکوٹ سے مجھے ملنے کے لئے آئی ہے۔" میں نے بڑے سلیقے سے آنے والی خاتون کو سلام کیا اس نے مجھے پیار کرتے ہوئے کہا۔ جیتی رہو بیٹی اللہ تعالیٰ تمہیں سلامت رکھے۔

تھوڑی دیر میں ان کے پاس بیٹھی پھر میں گھر آ گئی۔ آتے ہی میں نے اپنی نانو کو ماسی جیونی کے ہاں آئے ہوئے مہمانوں کے بارے میں بتایا تو نانی اماں نے کہا۔ "بیٹا جا کر ماسی جیونی کو اور ان مہمانوں کو بتا آؤ کہ مہمانوں کا کھانا پینا ہمارے ہاں ہوگا اور رات کا بندوبست بھی ہمارے ہاں ہی ہوگا۔" نانو کی بات سن کر میرا چہرہ خوشی سے دمک اٹھا۔ خوشی کیوں نہ ہوتی کہ میری نانو نے میرے دل کی بات جو خود ہی کر دی لہٰذا میں دوڑتی ہوئی گئی۔ ماسی جیونی کے آئے ہوئے مہمانوں کو کھانے اور رات کو ادھر ہی سونے کی دعوت دے آئی۔

رات کو جب آنٹی غلام زہرا اپنے بیٹے کے ساتھ ہمارے گھر میں وارد ہوئیں تو میرے ہونٹوں سے اس شعر کے الفاظ بے ساختہ ہی نکل پڑے۔

وہ آئے ہمارے گھر میں خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

رات کے کھانے کے بعد میں ماسی کی سہیلی غلام زہرا کے پاس بیٹھ کر ادھر ادھر کی باتیں کرتے ہوئے میں اپنے اصل مدعا کی طرف آ گئی۔ میں نے کہا۔

”آنٹی جی آپ کو تو معلوم ہوگا کہ ماسی جیونی شروع دن سے ایسی ہیں یا پھر یہ اس وقت سے ایسی ہوئی ہیں جس قت باطن میں انہیں کچھ نظر آیا ہو۔

میری یہ بات سن کر آنٹی مسکرا پڑیں اور بولیں۔

”نہیں بیٹا یہ شروع سے ایسی نہیں بس پاکستان آنے کے بعد ایسی ہوئی ہیں، میں میرے امی ابو میرے بہن بھائی اور ماسی جیونی اور اس کے ماں باپ بہن بھائی ہم سب انڈیا کے صوبہ پنجاب کے شہر جالندھر سے تھوڑی دور ایک چھوٹے سے گاؤں جے پور میں رہتے تھے۔ ہمارے گھر ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ تھے۔ یعنی ہم ایک دوسرے کے ہمسائے یعنی پڑوسی تھے ہم سب ہنسی خوشی رہا کرتے تھے۔ وہاں ہمیں کوئی دکھ تکلیف نہیں تھی۔ جے پور میں ہم دونوں شیطان کی نانیاں گردانی جاتی تھیں۔ ہماری دوستی بہت اٹل تھی جو آج تک بھی قائم ودائم ہے۔ ہاں بیٹا میں آپ کو بتا رہی تھی ہماری شرارتوں کی وجہ سے پورا گاؤں پریشان تھا۔

پھر ایک دن ایسا بھی آیا کہ ہم دونوں چند روز کے لئے ایک دوسرے سے الگ ہو گئیں۔

”وہ کیسے آنٹی کہیں دونوں میں سے کسی ایک کی شادی تو نہیں ہوگئی تھی۔“

”نہیں بیٹا ایسی تو کوئی بات نہیں ہوئی، بس ایک ایسی افتاد پڑی جس سے بہت کچھ تہس نہس ہوگیا ہمارا سب کچھ تباہ و برباد ہوگیا۔ 14 اگست 1947ء کو پاکستان بننے کا اعلان ہوا تو یہی ہماری چند روزہ جدائی کا سبب بنا بلکہ ہمارے دونوں گھروں کی بربادی کا بھی موجب ہوا۔

ہمارے گاؤں کے ایک ہندو گنیش اور میرے ابو دونوں بچپن کے دوست تھے۔ دونوں نے اکٹھے میٹرک کا امتحان پاس کیا اور دونوں ہی انگریز فوج میں بھرتی ہوگئے۔ دونوں کو فوراً ہی تعلیم کی وجہ سے صوبیدار کا رینک ملا۔ گنیش میرے ابو سے زیادہ بلکہ کافی زیادہ ہوشیار، چالاک تھا۔ وہ فوج کے اونچے عہدے پر پہنچ گیا۔ جبکہ میرے ابو اس سے نیچے عہدے پر تھے۔

دن ہفتوں میں ہفتے مہینوں میں اور مہینے سالوں میں بدلتے گئے اور پھر دونوں دوست ہی ریٹائرڈ ہو کر گھر واپس آ گئے۔

ادھر پاکستان بننے کا اعلان ہوگیا۔ سب کے سب مسلمان جوق در جوق ہجرت کر کے پاکستان آنے لگے۔ اس موقع پر شر پسند سکھوں اور ہندوؤں نے خوب قتل وغارت مچائی جو بھی مسلمانوں کا قافلہ ان کے ہاتھ آتا وہ اسے لوٹ لیتے اور پھر ان کو قتل کر دیتے۔

حالات اتنے خراب تھے کہ میرے ابو نے حالات کی سنگینی کو دیکھتے ہوئے اپنے دوست گنیش سے مدد لینے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ ابو جی گنیش کے گھر گئے اور ان سے دوستی کا واسطہ دے کر کہا کہ وہ ہمیں بارڈر تک صحیح و سلامت پہنچا دے، ہم تمہارے اس احسان کو کبھی بھی فراموش نہیں کریں گے۔

پہلے تو وہ خاموش ہوگیا پھر اس نے کہا کہ ”کل رات کو تم لوگ تیار رہنا، میرے آدمی ٹرک لے کر آئیں گے تو تمہیں محفوظ طریقے سے بارڈر تک چھوڑ آئیں گے۔“

اگلی رات میرے ابو نے اپنے تمام رشتہ داروں کو اور اس گاؤں کے تمام مسلمانوں کو جو گاؤں میں اس وقت موجود تھے ٹرک پر سوار کرا لیا لیکن ماسی جیونی کے گھر سے معلوم کیا تو ان کے گھر کے دروازے پر تالا لگا ہوا تھا۔ وہاں میری سہیلی کملا کھڑی تھی۔ کہنے لگی۔ ”غلام زہرا تم اپنی سہیلی جیونی کے بارے میں جاننا چاہتی ہوگی، میں یہاں اسی لئے کھڑی تھی تاکہ تم ادھر آؤ تو میں تمہیں تمہاری سہیلی کا پیغام دے سکوں وہ تو کسی اور قافلے کے ساتھ ٹرین پر سوار ہو کر پاکستان کی طرف روانہ ہوگئے ہیں۔“

میں یہ سن کر بہت پریشان ہوئی، بوجھل قدموں سے گھر آئی ٹرک بالکل تیار کھڑا تھا میرے ابو، میں کر ماں ماری کو ساتھ لے کر آگے ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گئے۔

گنیش نے تین آدمی جن کے پاس چمکتی تیز تلواریں تھیں ہماری حفاظت کے لئے ساتھ بھیجے وہ پیچھے بیٹھ گئے تو ٹرک چل پڑا۔ رات کے کوئی تین بجے کا وقت تھا۔ تقریباً تین چار گھنٹے کے سفر کے بعد اچانک ٹرک رک گیا۔ ڈرائیور نے [illegible]

دیر تک وہ ہارن بجاتا رہا۔ پھر نیچے اتر گیا میرے ابو کو بھی کسی گڑبڑ کا احساس ہوگیا۔ انہوں نے مجھے کہا بیٹا تم نیچے مت اترنا میں دیکھتا ہوں کیا معاملہ ہے۔

ابو نے ریوالور نکال کر اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا اور جیسے ہی ابو نیچے اترنے لگے چاندنی رات میں کیا دیکھتے ہیں کہ تینوں محافظ تلواریں لے کر ہماری طرف بڑھتے نظر آئے، میرے ابو جو پہلے ہی بہت چوکنا ہو چکے تھے، وہ فوراً ہی معاملے کی تہہ تک پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے فوراً ہی پوزیشن سنبھال کر ایک سیکنڈ کی تاخیر بھی نہ ہونے دی اور ان پر فائر کھول دیا تینوں ہی جہاں پر تھے وہیں پر ڈھیر ہوگئے۔

دوسری طرف ڈرائیور دوڑ کر آیا تو ابو نے اسے بھی سنبھلنے کی مہلت نہ دی ٹھاہ کی آواز آئی تو اس کا کام بھی تمام ہو چکا تھا۔ میں بھی نیچے اتر آئی ہم دونوں باپ بیٹی نے جب پیچھے جا کر دیکھا تو ہماری تو دنیا ہی تباہ ہوگئی تھی، میری امی میرے بھائی میرے سب رشتہ دار خون کے دریا میں ڈوبے ہوئے تھے، ہمارے سارے خاندان کی لاشیں ٹرک میں خون سے اٹی پڑی تھیں، پورا ٹرک لاشوں سے بھرا پڑا تھا۔

ابو غمگین لہجے میں بولے۔ ”میرے دل میں پہلے ہی چور تھا کہ کہیں گنیش میرا دوست، یار مار نہ بن جائے وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا کاش میں آگے نہ بیٹھا ہوتا پہلے ہی اپنے پیاروں کے ساتھ بیٹھ جاتا۔

میرا اور میرے ابو کا اپنوں کی لاشیں خون میں تربتر دیکھ کر رو رو کر برا حال ہوگیا۔ پھر ابو نے نہ صرف اپنے آپ کو سنبھالا بلکہ مجھے بھی دلاسا دیا اور پھر ٹرک کو اسٹارٹ کر کے چل پڑے، راستے میں نہر آئی تو ابو نے کہا۔ ”بیٹا اتنے لوگوں کو ہم کہاں دفنائیں گے۔ کیوں نہ اپنے پیاروں کی لاشوں کو حضرت خضر علیہ السلام کے سپرد کر دیں۔“ پھر ہم دونوں باپ بیٹی نے ہمت کر کے لاشوں کو پانی یعنی نہر میں بہا دیا اور پھر آگے ٹرک لے کر چل پڑے۔

ادھر صبح کے سورج نے کرنیں نکالیں۔ ادھر ہمارے سامنے ایک اور ہی خونی منظر سامنے آ گیا۔ پاکستان کی سرزمین پاک دھرتی پر قدم رکھتے ہی جو منظر دیکھا وہ خون رو دینے کے لئے ہی کافی تھا۔ پٹڑی پر ریل گاڑی رکی ہوئی تھی ہم پاک سرزمین پر قدم رکھ رہے تھے تو ہم دونوں باپ بیٹی کے قدم من من بھر کے وزنی ہو رہے، ریل کے ڈبوں پر نظر پڑی تو ڈبے لاشوں سے اٹے پڑے تھے، خون ڈبوں سے نیچے ایسے گر رہا تھا۔ جیسے ریل گاڑی کو خون سے غسل دیا جا رہا ہو، چند لوگ جو اگلے ڈبے سے بچے کھچے نکل کر یہ خونی منظر دیکھ کر زار و قطار دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے ہر ایک آنکھ اشکبار تھی پھر یکایک میں اور میرے ابو نے وہ منظر دیکھا کہ ایک نوجوان پتلی لمبی نوجوان لڑکی خون میں تربتر اپنے ہاتھوں میں اپنی جیسی دبلی پتلی لڑکی کی لاش اٹھائے ریل کے ڈبے سے نمودار ہوئی، غور سے دیکھنے پر پہلی ہی نظر میں، میں نے اسے پہچان لیا۔ یہ تو میری اپنی تھی میری بہن۔

میری دوست، میری سہیلی، میری ہمسائی میری اپنی جیونی آگے بڑھ کر میں نے اسے لاش کو نیچے رکھنے کے لئے کہا یہ کیا میں نے سوچا کہ شاید یہ لاش اس کی والدہ کی ہوگی مگر یہ اس کی والدہ کی نہیں تھی اور نہ ہی اس کی بہن کی تھی بلکہ یہ تو کسی اور کی تھی کس کی تھی کون تھی یہ میرے لئے ایک معمہ تھی۔

میری پیاری سہیلی جب پاک سرزمین پر اتری تو یہ بھی میری طرح سب کچھ لٹا پٹا کر اس کا اثاثہ صرف ایک لاش تھی اور کچھ بھی نہ تھا۔ میرے ساتھ ابو نے بھی اس کے بازو کو دیکھ لیا جس پر بہت بڑا زخم تھا اور اس سے خون رس رہا تھا۔ ہم نے اس سے لاش کو پکڑ کر نیچے رکھا اس کے بازو پر اپنے دوپٹے سے کس کر پٹی باندھ دی جس کی وجہ سے خون رسنا بند ہوگیا ابو نے ہم دونوں کو مخاطب کر کے کہا۔ ”چلیں کیمپ میں چلتے ہیں۔“

لیکن جیونی نے کہا۔ ”انکل میں اس لاش کو دفنائے بغیر کہیں نہیں جاؤں گی۔“ اس نے لاش کو پھر اپنے ہاتھوں پر اٹھا لیا۔ میرے ابو نے دوسرے کچھ ساتھیوں کے ساتھ مل کر قبر کھودی پھر نماز جنازہ پڑھا کر اس لاش کو دفنا دیا جس سے میری سہیلی کے دل کو کچھ سکون ملا پھر وہ ہمارے ساتھ کیمپ میں آ گئی۔ کیمپ میں بھی وہ

آ کر بیٹھی نہیں بلکہ پہلے دن سے ہی کام کرنے لگی۔ ہر وہ کام جو کوئی دوسرا نہ کرتا وہ میری دوست کرتی۔

ایک دن ہم دونوں خیمے میں سونے کے لئے لیٹے تو اس نے بجھے بجھے سے لہجے میں مجھے بتایا۔ ''غلام زہرا میں نے ایک نورانی ہستی کو دیکھا ہے اور اس نورانی ہستی نے مجھے دیکھا تو وہ مسکرا پڑا۔''

''مجھے تو یوں لگا جیسے وہ دیوانی ہوگئی ہو لیکن اس نے میری بات کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی۔ ''انسان بھی کیا جھلی سی مخلوق ہے ہاتھ سے تلوار اور نیزے روکنے کی کوشش کرتا ہے۔ ہمارے ڈبے میں اچانک شور اٹھا مرد دروازے کی طرف بڑھے تو کیا مولی گاجر کی طرح کٹ کٹ کر ایک دوسرے کے اوپر گرتے گئے۔ خالی ہاتھ بھلا تیز تلواروں اور بھالوں کے سامنے کیسے ڈھال بن سکتے تھے مجھے بھی برچھی لگی میں بھی نیچے گر گئی، میرے اوپر زخمی ہو کر دوسری لڑکی گر گئی اور بھی کافی ساری لاشیں میرے اوپر گریں میں تو سب کے نیچے رہ گئی۔ میرے اوپر گرنے والی کی بڑی بڑی آنکھیں مجھے دیکھتی ہی جارہی تھیں۔ آنکھیں جن میں دکھ بھی تھا۔ تکلیف بھی تھی۔ خوف بھی تھا اور پھر یہ بہت سہمی ہوئی بلی کے بچے کی طرح اپنے ہی جسم میں سمٹ جانا چاہتی تھیں۔ چیخیں اب کم ہوتی جارہی تھیں۔ تلواریں اب لاشوں کے نیچے سانس لیتے ہوئے جسم ڈھونڈ ڈھونڈ کر اپنا کام دکھا رہی تھیں۔

قیامت برپا تھی جہاں بھی زندگی کی ہلکی سی رمق نظر آتی تو تلوار کی نوک سینے سے آر پار ہوجاتی، کسی نے اس لڑکی کو برچھی ماری جو میرے اوپر گری ہوئی تھی میں نے اسے اتنی سخت اذیت میں دیکھا کہ جس کے سامنے پوری دنیا کی تکلیفیں ہیچ نظر آئیں گی اتنی تکلیف کے بعد زندہ رہنے کا دعویٰ نہیں رہتا...... دعویٰ رہتا ہے تو بس ایک اذیت بھری چیخ نکلنے کا جو ایسی دکھ بھری تکلیف کے بعد تو آپ کا حق بن جاتا ہے۔ جسے آپ سے یہ حق کوئی بھی نہیں چھین سکتا۔ کوئی ظالم سے ظالم انسان بھی اس حق سے آپ کو محروم نہیں کرسکتا۔ اس کی آنکھیں اتنا پھیل گئیں کہ ان کے کونے سے خون کی لکیر نکلنے لگی لیکن نہ ہی برچھی لگنے پر اس نے سی کی اور نہ یہ کہا کہ اوے میں مرگئی وہ چیخی بھی نہیں۔

وہ جانتی تھی کہ میں نے چیخ ماری تو سب میری طرف متوجہ ہوجائیں گے وہ اب اپنے آپ کو تو نہیں بچا سکتی تھی لیکن اگر وہ اپنا آخری حق چھوڑ دیتی تو شاید قاتل مجھے بھول جاتے اس نے چپ سادھ لی اور اس نے ایسا دم سادھا کہ مجھے خوف آنے لگا اور پھر میں نے ایک نورانی شخص کو دیکھا جو اس لڑکی کو لینے خود آیا تھا، اس نورانی شخص نے بڑے پیار اور بڑی شفقت سے لڑکی کو اپنے ہاتھوں میں تھام لیا اور ایک لمحے میں میری نظر اس سے ملی، میں نے اس کو دیکھا تو اس نے مجھے دیکھا پھر وہ مسکرا پڑا، اس نے میری سوچ پڑھ لی تھی کہ بھلا میں اتنی اہم کب سے ہوگئی کہ مجھ پر مہربانی کرنے والی میری زندگی کو جاوداں دینے والی یعنی میری زندگی کو بچانے والی لڑکی کو لینے اللہ کا برگزیدہ بندہ آیا تھا۔ وہ مسکرا پڑا۔

جیسے میرا پروردگار کہہ رہا ہو کہ میں تو ہمیشہ سے تیرے پاس ہی تھا لیکن تو نے کبھی مجھے پکارا ہی نہیں۔

'' باتیں کرتے ہوئے آنٹی زہرا کی آنکھوں میں اشک رواں دواں تھے۔

ساتھ ہی اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی۔ ''میری سہیلی جیونی کہتی تھی کہ ہر شے کے دو روپ ہیں ایک ظاہر اور ایک باطن، ظاہر کا روپ دنیا جبکہ باطن کا روپ اللہ ہے، جب کوئی نظر، باطن کا روپ دیکھ لیتی ہے تو پھر واپسی کا کوئی راستہ نہیں رہتا۔ اس نے بھی باطن کا روپ دیکھ لیا ہے اور پھر اس نے کبھی بھی نظر نہیں جھپکی۔

''آنٹی آگے کیا ہوا۔''

بیٹا میں نے اپنے ابو کو کہا کہ ''میری دوست جیونی کا کوئی نہیں۔'' ہم اسے ساتھ لے کر سیالکوٹ چلے آئے اور پھر مناسب وقت اور مناسب رشتہ دیکھ کر اس کی شادی کردی لیکن جتنا وقت یہ ہمارے گھر میں رہی اس نے کبھی بھی اپنے کھوئے ہوئے پیاروں کو یاد نہیں کیا بلکہ ہر لمحہ اللہ کو یاد کرنے میں ہی لگی رہتی تھی۔





سزائے عبرت

محسن عزیز حلیم۔ کوٹھا کلاں

چاند کی روپہلی چاندنی پورے علاقے پر مسلط تھی بہت ہی دلکش اور دلفریب سماں تھا کہ اتنے میں نوجوان کو نظر آیا کہ کوئی وجود سامنے درخت کے پاس کسمسا رہا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے......

رات کے گھٹا ٹوپ اور ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دینے والے اندھیرے میں جنم لیتی ڈراؤنی کہانی

میں اور آپ سب نے آج تک صرف فلموں میں اور ڈراموں میں ناگن کو عورت اور عورت کو ناگن بنتے دیکھا ہے۔ میرے خیال میں ہم سب میں ایسا کوئی نہیں ہے جس نے اس مصنوعی دنیا سے نکل کر حقیقت کی دنیا میں ایسا کچھ دیکھا ہو؟ یقیناً قارئین کرام آپ میری بات سے متفق ہوں گے تو چلیے میں آپ کو ایک ایسے حقیقی واقعے کے بارے میں بتانے جارہا ہوں جو بالکل سچا ہے، اور میرے سگے نانا جی کے ساتھ پیش آیا، آیئے میرے نانا جی کی زبانی سنیے۔

یہ واقعہ میرے ساتھ تب پیش آیا جب میری عمر تقریباً بیس، بائیس کے لگ بھگ تھی، آج باغ میں پہرے کی باری میری تھی۔ میں نے اپنا ڈنڈا سنبھالا اور پہرا دینے کے لئے باغ میں داخل ہوگیا، آج چاند کی تیرہ یا چودہ تاریخ تھی، تبھی تو باغ میں ہر طرف چاندنی کی رو

پہلی کرنیں تھیں جون کا مہینہ چل رہا تھا لیکن آج گرمی کسی قدر کم تھی شاید چاند کی ٹھنڈک کی وجہ سے تھا۔ چاند کی چاندنی میں ہر شے دور دور تک دکھائی دے رہی تھی، میں چلتا ہوا آم کے درخت کے نیچے آ کر بیٹھ گیا۔ اور میں نے درخت کے تنے کے ساتھ ٹیک لگا دلی۔ دھیمی، دھیمی ہوا چل رہی تھی کچھ ہی پل میں مجھ پر نیند کا غلبہ چھانے لگا کہ معاً میرے نتھنوں میں تیز خوشبو داخل ہونا شروع ہوگئی، میں نے ہڑبڑا کر اپنی آنکھیں کھول دیں، میں نے کھڑے ہوکر ادھر ادھر دیکھنا شروع کردیا۔

اچانک میری نظریں ایک طرف ٹھہر گئیں امرود کے پیڑ کے پیچھے کوئی چیز حرکت کررہی تھی میں دبے پاؤں اسی طرف بڑھنے لگا کچھ آگے جا کر میں رک گیا کیونکہ چاند کی روشنی کی وجہ سے مجھے صاف دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے جو کچھ بھی دیکھا وہ میرے لیے بہت حیران کن تھا۔

کیا دیکھتا ہوں کہ ایک لمبا سانپ زمین پر لوٹ پوٹ رہا تھا اور وہ تیز خوشبو ادھر سے ہی آ رہی تھی، پہلے تو میں سمجھا کہ شاید سانپ زمین پر تڑپ رہا ہے لیکن پھر اچانک میری نظریں اس کے سر کی طرف پڑیں تو میں ڈر گیا کیونکہ وہاں ہلکے ہلکے انسانی نقوش ابھر رہے تھے اور دیکھتے ہی دیکھتے اس سانپ میں سے انسانی اعضاء نکلنا شروع ہوگئے۔ اور کچھ ہی دیر میں میرے سامنے زمین پر آڑی ترچھی ایک عورت لیٹی ہوئی تھی اس کا سر نیچے کی طرف جھکا ہوا تھا پھر اس نے اپنا سر اوپر اٹھایا اور اپنے چہرے سے بال ہٹائے۔

لوگ کہتے ہیں کہ ناگن کی آنکھیں بھوری یا نیلی ہوتی ہیں لیکن اس ناگن کی آنکھیں ہماری آنکھوں جیسی ہی تھیں فرق بس یہ تھا کہ اس کی آنکھیں کچھ بڑی تھیں اور اس میں بلا کی چمک تھی پھر اس نے ایک توبہ شکن انگڑائی لی اور کھڑی ہوگئی اس کے لمبے بال گھٹنوں کو چھو رہے تھے۔

مگر اچانک وہ اپنے ناک کو سکیڑنے لگی اور بے تابی سے ارد گرد دیکھنے لگی اس کے منہ سے شوں شوں جیسی آوازیں نکل رہی تھیں۔ پھر وہ بولی۔

''تم جو کوئی بھی ہو یہاں آؤ۔''

میری تو جیسے جان ہی نکل گئی۔ پورا جسم جیسے سن ہوگیا میری حالت ایسے تھی جیسے کسی نے میرا گلہ دبا دیا ہو۔ ''ارے میں نے کہا ادھر آؤ میرے پاس۔'' اور میں مرتا کیا نہ کرتا مصداق ہولے سے چلتا ہوا اس کے سامنے چلا آیا اور اس کے قریب جا کر تو میں اور بھی ڈر رہا تھا۔

ذرا سوچئے آپ کا پالا حقیقت میں کسی ناگن سے پڑے تو آپ پر کیا بیتے گی۔ میرے پاؤں بری طرح کانپ رہے تھے۔ اور میں بار بار دل میں خدا کو یاد کررہا تھا۔ ''میں نے تمہیں کتنی آوازیں دیں؟ یہ تمہارے ہاتھ کیسے کانپ رہے ہیں کیا تمہیں مجھ سے ڈر لگ رہا ہے۔ اگر ہم اتنے خطرناک ہوتے تو تم لوگوں کو نقصان نہ پہنچاتے جب سے یہ باغ لگا ہے ہم تب سے اسی جگہ رہتے ہیں مگر آج تم نے ہمیں دیکھ لیا خیر کوئی بات نہیں تم نے کونسا جان بوجھ کر ایسا کیا ہے ادھر درخت زیادہ گھنے اور بڑے ہیں اس لیے ہم ادھر ہی رہتے ہیں اور یہی ہمارا گھر ہے تم نے مجھے دیکھا ہے اس بات کا ذکر کسی اور سے مت کرنا ورنہ سب لوگ ہراساں ہو جائیں گے اور ہاں ایک اور بات ......کوشش کرنا کہ چاند کی بارہ تیرہ اور چودہ تاریخ کو یہاں کا رخ نہ کرنا اور دوسرے لوگوں سے بھی کہہ دینا، اچھا اب میں چلتی ہوں کافی وقت گزر گیا۔'' اور یہ کہہ کر وہ زمین پر لوٹ پوٹ ہونے لگی اور کچھ ہی دیر میں وہاں زمین پر ایک سانپ تھا اور پھر وہ رینگتے ہوئے قریب درختوں کے جھنڈ میں غائب ہوگئی اور میں نے فوراً واپس اپنے جھونپڑے کی طرف دوڑ لگا دی۔

☆......☆......☆

چاندنی کی چیخیں آسمان کو چھو رہی تھیں وہ بار بار اپنے بالوں کو نوچ رہی تھی، اس کی ایسی حالت کو ایک ماہ سے زائد کا عرصہ بیت چکا تھا۔ چاندنی میرے چاچو کی سب سے بڑی بیٹی ہے میرے سارے ددھیال والے (لدھا سنگھ موکل) میں رہتے ہیں جبکہ میرے ننھیال والے کوٹھا کلاں میں رہتے ہیں شادی کے بعد میری امی کی میرے ددھیال والوں سے نہ بنی تو وہ میرے ابو کو

لے کر اپنے میکے کوٹھا کلاں میں آ کر بس گئیں۔

تو میں بات کررہا تھا چاندنی کی تو چاندنی کی حالت بہت دگرگوں تھی یہ بات تو سب کو پتا چل گئی تھی کہ اس پر کسی جن کا سایہ ہوگیا ہے لیکن جن سے چاندنی کو کیسے آزاد کروایا جائے یہ سب کے لئے سوالیہ نشان بنا ہوا تھا۔

محلے کے کچھ لوگوں نے میرے چاچو کو ایک مولوی کے متعلق بتایا کہ فلاں مولوی اس کا توڑ کرسکتا ہے تو میرے چاچو نے جلدی سے اس کا پتا نوٹ کیا اور اگلے دن ہی وہ مولوی کو لینے ان کے گاؤں پہنچ گئے۔

مولوی نے آتے ہی ایک طائرانہ نظر چاندنی پر ڈالی اور چاندنی کے ہاتھوں کی چھوٹی انگلی پکڑ کر کچھ پوچھنے لگا کہ اچانک چاندنی کا ہاتھ اوپر اٹھا اور چٹاخ کی آواز کے ساتھ ایک تھپڑ مولوی کے گال پر پڑا تو مولوی بیچارا تکلیف سے دوہرا ہوگیا یہی نہیں چاندنی نے مزید تھپڑوں کی برسات مولوی کے چہرے پر کردی تو مولوی کا چہرہ تھپڑوں سے سرخ ہوگیا۔ ''تو ہم سے سوالات کرتا ہے......؟'' چاندنی کے منہ سے مرد اور عورت کی ملی جلی آوازیں نکل رہی تھیں۔ ''اپنی خیریت چاہتا ہے تو یہاں سے چلا جا ورنہ ہم تیری حالت بہت بری کریں گے۔''

یہ سنتے ہی مولوی نے میرے چاچو سے معذرت کی اور گھر سے چلتا بنا۔

قریب کھڑی چندا جو کہ میری بہن ہے اور اس کی شادی میرے پھوپھو زاد سے ہوئی ہے چندا سے چاندنی کی حالت دیکھی نہ گئی، چندا حافظ قرآن ہے، وہ اپنے کمرے میں آئی، ایک گلاس میں صاف پانی لیا اور اس پر سورۃ جن پڑھ کر دم کیا۔ اور پانی کا گلاس لیے گھر کے صحن میں آ گئی، جہاں چاندنی بیٹھی ہانپ رہی تھی۔

چندا نے جاتے ہی وہ پانی چاندنی کے منہ پر چھڑک دیا، پانی کا منہ پر پڑنا تھا کہ چاندنی کے چہرے سے شوں شوں کے ساتھ دھواں نکلنا شروع ہوگیا اور ساتھ ہی چاندنی کے منہ سے دردناک چیخیں نکلنے لگیں۔

صحن میں اچانک جیسے طوفان آ گیا اور پھر اسی دوران چندا اور چاندنی دونوں بے ہوش ہوگئیں۔

کچھ دیر بعد دونوں کو ہوش آ گیا لیکن پہلے کی نسبت چاندنی بالکل ٹھیک تھی لیکن چندا کی حالت بہت خراب ہورہی تھی، چندا کی آنکھیں سرخ ہورہی تھیں، سارے گھر والے چندا کی یہ حالت دیکھ کر بہت پریشان تھے۔ چندا نے جو پانی چاندنی پر پھینکا تھا اس کی وجہ سے چاندنی کے اندر جو جن تھا اس کا چہرہ جل گیا تھا اس لیے اس نے چاندنی کو چھوڑ دیا تھا اور اب چندا کی باری تھی لیکن جب وہ چندا کے جسم پر قابض ہوا تو اسے پتا چلا کہ یہ حافظ قرآن ہے لہٰذا اب وہ چندا کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا اس لیے اس نے چندا سے کہا۔ ''تم نے جیسے ہمارا چہرہ جلایا ہے، اسی طرح اسے ٹھیک کردو۔'' چندا نے حامی بھر لی اور پھر روز چندا سورۃ رحمٰن کا پانی اس جن کے چہرے پر چھڑکتی تھی اور پھر رفتہ رفتہ وہ جن ٹھیک ہوگیا اور اسی دوران اس کی چندا سے دوستی ہوگئی وہ اب بھی چندا کے پاس آتا ہے، چندا چاہے تو اس سے کئی طرح کے کام لے سکتی ہے لیکن وہ اس کی فطرت سے اچھی طرح واقف ہے وہ جانتی ہے کہ اگر اس نے جنات سے کوئی کام لیا تو نہ جانے اس کام کے بدلے وہ کتنے کام نکلوائیں گے۔

☆......☆......☆

رات ڈیڑھ بجے کا عمل رہا ہوگا جب ناصر کھیتوں کو پانی دے کر واپس آ رہا تھا جس راستے سے گزر کر اس نے گھر آنا تھا اس راستے میں ایک اللہ والے بزرگ کا دربار پڑتا تھا اور اس دربار کے بارے میں مشہور تھا کہ یہاں ہر جمعرات کو شیر اور سانپ دربار والے بزرگ کو سلام کرنے آتے ہیں جن پاؤں پر وہ آتے ہیں انہی پاؤں پر واپس جاتے ہیں یعنی الٹے قدموں واپس جاتے ہیں۔

چاند نے اپنی چاندنی ہر سو پھیلائی ہوئی تھی جس سے ہر چیز واضح نظر آ رہی تھی گیدڑوں اور جھینگروں کی آوازیں ماحول کو اور بھی ہیبت ناک بنا رہی تھیں ناصر کو پتا تھا کہ آج جمعرات ہے کہیں لوگوں کی باتیں سچ نہ ہوں اگر سچ میں شیر اور سانپ سے سامنا ہوگیا تو......

اسی طرح کئی باتیں اس کے دل میں جنم لے رہی تھیں لیکن پھر بھی وہ اپنے دل کو مضبوط کیے آگے بڑھ رہا تھا۔

اچانک اس کی آنکھوں میں دور سے لشکارے پڑنے لگے، وہ لشکارے زمین پر رینگتی ہوئی کسی چیز سے نکل رہے تھے جب اس نے غور سے دیکھا تو اس کے پاؤں تلے سے زمین کھسک گئی اس نے تو کبھی بھی نہ سوچا تھا کہ لوگوں کی باتیں وہ اپنی آنکھوں سے سچ ہوتا دیکھے گا خوف سے اس کے پاؤں کانپ رہے تھے۔ اس سے بیس تیس قدم کی دوری پر سانپ اور شیر اپنی تمام تر خوفناکی کے ساتھ آگے دربار شریف کی طرف بڑھ رہے تھے اسے آج یقین ہوا تھا کہ لوگوں کی باتیں دقیانوسی نہیں بلکہ حقیقی ہیں..

وہ لشکارے اس چمکدار سانپ کی کھال سے نکل رہے تھے۔

خیر دونوں وہاں دربار شریف پر پہنچ کر سلام کیا کچھ دیر وہ وہیں کھڑے رہے اس کے بعد شیر اپنے پاؤں پر الٹا پیچھے کی طرف کھسکنے لگا اور سانپ اپنی دم کی مدد سے پیچھے کی طرف رینگنے لگا...... ''ارے یہ تو سچ میں دربار کی طرف پیٹھ نہیں کر رہے جیسے گئے تھے۔'' ویسے آرہے ہیں اور یہ کہتے ہوئے ناصر درخت کے عقب میں چھپ گیا۔

کچھ دیر بعد سانپ اور شیر وہاں سے گزر گئے اور ناصر نے اپنے گھر کی طرف دوڑ لگا دی، اگلے دو روز تک ناصر کو بخار رہا، جب ہلکی ہوش میں آیا تو اس نے سارا واقعہ اپنی ماں کو سنا دیا جسے سن کر اس کی ماں نے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کیونکہ اس کا بیٹا صحیح سلامت گھر واپس آ گیا تھا۔

☆......☆......☆

خواجہ سراؤں کے بارے میں آپ سب نے سنا ہی ہوگا اور یقیناً دیکھا بھی ہوگا یہ ہماری طرح ہی ہوتے ہیں یہ خود کو مونث بولتے ہیں اور لوگ انہیں مذکر گردانتے ہیں۔

اگر میں آپ سے کہوں کہ جن بھی خواجہ سرا ہیں تو کتنی دلچسپ بات ہوگی...... ہے نا اچنبھے کی بات......؟

جو جن خواجہ سرا ہوتے ہیں اپنی خواہش کی تکمیل کے لیے کچھ بھی کر سکتے ہیں کیونکہ ان کے پاس ان کی جادوئی طاقتیں ہوتی ہیں اور انہی طاقتوں کی مدد سے وہ ہر ناممکن کو ممکن بنا سکتے ہیں یہ بہت ہی شریر ہوتے ہیں۔ خیر میں یہاں پر انہیں مونث لکھ رہا ہوں۔

نھو، کجری اور بندیا ان تینوں خواجہ سراؤں کی ٹولی ہندوستان سے پاکستان میں داخل ہوگئی کیونکہ انہیں ہندوستان میں کسی جن سے پتا چلا کہ پاکستان کے فلاں گاؤں میں ایک عورت بہت عقلمند اور بہادر رہتی ہے، لہٰذا انہوں نے اس بچاری عورت کو دبوچنے کی ٹھانی اور اسی مقصد کی تکمیل کے لئے وہ تینوں ہندوستان سے پاکستان میں داخل ہو چکی تھیں۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد انہیں ان کا مطلوبہ گاؤں مل گیا اور وہ عورت بھی...... لہٰذا وہ تینوں غیبی حالت میں ان کے گھر میں داخل ہو گئیں اور اس عورت کا جائزہ لینے لگیں۔ ''اری او کجری دیکھ تو کیسے ٹھمک ٹھمک کر چلتی ہے۔'' بندیا نے کجری کی توجہ اس عورت کی چال کی طرف دلاتے ہوئے کہا۔

''ہاں ہاں اس کی چال تو کافی مستانی ہے۔'' کجری نے اپنے پاؤں میں پہنی ہوئی پازیب کو ہلاتے ہوئے کہا۔ اور جب یہ ہماری دہلی میں جا کر ناچے گی تب تو اور بھی مزہ آئے گا میرے خیال میں ممبئی لے کر چلیں......؟'' نھو نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

''یاد ہے نا پچھلی دفعہ ممبئی میں کافی دھوم مچی ہوئی تھی۔''

''نہیں یہ دہلی میں جا کر دہلی لوٹے گی۔'' بندیا نے کہا تو اس کے ساتھ کجری نے بھی ہاں میں سر ہلا دیا۔

'' اچھا بابا ٹھیک ہے جیسا تم دونوں کہو ویسے ممبئی میں ناچے یا دہلی میں ہم نے تو اسے وہاں لے جا کر نچوانا ہی ہے کونسی اس سے پوجا کراونی ہے۔'' اور پھر تینوں قہقہے لگا کر ہنس پڑیں۔

اس عورت کا نام سیراں تھا اور اس کے چار بچے تھے سیراں اتنے بچوں کی ماں ہونے کے باوجود نوجوان عورت دکھتی تھی، سیراں کا شوہر گاؤں میں ہی محنت مزدوری کرتا تھا۔ شام کا دھندلکا ہر طرف پھیل رہا تھا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے رات نے سارے ماحول کو اپنی

لپیٹ میں لے لیا۔ آسمان پر سے چاند بالکل غائب تھا بادلوں کے چھوٹے چھوٹے آوارہ ٹکڑے آسمان پر محو رقص تھے سیراں کے گھر والے اپنے اپنے بستروں میں دبکے پڑے تھے۔

ایسے پر ہول سناٹے میں تین سائے اچانک سیراں کے گھر کے صحن میں ظاہر ہوئے اور چپکے سے سیراں کی چارپائی کی طرف بڑھنے لگے چارپائی کے پاس پہنچ کر ایک سائے نے پائے کی طرف کھڑے ہو کر اپنے ہاتھ کی انگلی سیراں کی طرف کی تو اس میں سے شعاعیں نکل کر سیراں کے جسم میں داخل ہونے لگیں۔

سیراں چند لمحے کسمسائی اور پھر آرام سے سو گئی تو تینوں سائے ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائے اور اگلے ہی لمحے وہ تینوں سیراں سمیت وہاں سے غائب تھے۔

سیراں کو جب ہوش آیا تو وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی کیونکہ وہ کسی انجانی جگہ پر تھی سیراں کے ساتھ کوئی اور عورت بھی لیٹی ہوئی تھی وہ عورت سیراں کے لئے بالکل انجان تھی سیراں نے اسے جھنجھوڑ کر اٹھایا۔ تو وہ عورت ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی پہلے تو وہ سیراں کو تکتی رہی پھر سہمے ہوئے بولی۔ ''بہن میں کہاں ہوں؟ اور تم کون ہو؟''

''ارے یہ تو میں تم سے پوچھنا چاہتی ہوں کہ تم کون ہو اور میں یہاں کیسے؟''

ابھی وہ دونوں آپس میں باتیں کر رہی تھیں کہ ان کے قریب دھواں پھیلنا شروع ہوگیا اور جب دھواں ختم ہوا تو وہاں وہی تینوں خواجہ سرا تھیں وہ دونوں ڈر کر ایک دوسرے سے چمٹ گئیں ڈر کے مارے ان کے منہ سے کوئی الفاظ نہیں نکل رہے تھے۔

''ارے...... ارے تم دونوں کو ہم سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہم تم دونوں کو کچھ نہیں کہیں گے۔''

''تم کو خدا کا واسطہ ہمیں گھر جانے دو میرے بچے رو رہے ہوں گے۔'' سیراں نے روتے ہوئے کہا جبکہ اس کے ساتھ والی عورت کا بھی یہی حال تھا وہ بھی اپنے گھر جانے کے لئے تڑپ رہی تھی۔

''جانے دیں گے بلکہ ہم خود تمہیں تمہارے گھر چھوڑ کر آئیں گے لیکن اس سے پہلے تم دونوں کو ہماری ایک شرط پوری کرنا ہوگی؟''

''شرط...... کیسی شرط......؟'' نوراں، سیراں کے ساتھ والی عورت نے پوچھا۔

پہلے تو ان تینوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر کجری نے ان دونوں سے کہا۔ ''تم دونوں کو ناچنا ہوگا۔''

''کیا......؟'' ان دونوں کے چہرے کا رنگ ہی بدل گیا۔ سیراں بچاری پانچ وقت کی پکی نمازی اور ایسے کاموں سے دور رہنے والی آج کس چکر ویو میں پھنس گئی تھی۔ دیکھو ہم دونوں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہیں ہمیں معاف کر دو اور ہمیں ہمارے گھر جانے دو۔''

''پہلی بات کہ تم دونوں اس وقت پاکستان میں نہیں ہو بلکہ ہندوستان میں ہو اگر ہم تم دونوں کو چھوڑ بھی دیں تو تم دونوں اپنے گھر کبھی بھی نہیں پہنچ سکو گی اور دوسری بات ہم کونسی مخلوق ہیں یہ بھی تم دونوں جان گئیں ہو لہٰذا بہتری یہی ہے کہ ہماری شرط مانو، اگر تم دونوں ہماری شرط مان جاؤ گی تو ہم تمہیں پلک جھپکتے میں تمہارے گھر پہنچا دیں گے۔''

''لیکن ہمیں تو ناچنا نہیں آتا۔'' نوراں بچاری نے پلو سے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

''کوئی بات نہیں تھوڑا بہت تو آتا ہی ہوگا۔'' نوراں نے ایک نظر سیراں کی طرف دیکھا جیسے اس کی رضامندی جاننا چاہتی ہو۔ اور سیراں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ مطلب وہ دونوں تیار تھیں اور اگلے ہی لمحے وہ پانچوں وہاں سے غائب تھیں۔

وہاں ہر جگہ لوگوں کا ہجوم تھا عورتوں اور مردوں کے ماتھوں پر لگے ہوئے تلک اس بات کے غماز تھے کہ وہ اس وقت سچ میں ہندوستان میں ہیں۔ بندیا نے گھنگرو ان دونوں کی طرف اچھالے جو آگے بڑھتے ہوئے ان کے پاؤں سے آ ٹکرائے۔ ان دونوں نے دل پر پتھر رکھ کر وہ گھنگھرو پہن لیے۔ ''چلو شروع ہو جاؤ۔'' نھو نے کہا۔

کجری نے طلبہ اٹھایا اور اسے بجانے لگی جبکہ بندیا کے ہاتھ میں ڈھولکی تھی۔ سیراں اور نوراں نے ناچنا شروع کر دیا ارد گرد کافی سارا ہجوم اکٹھا ہو گیا دونوں بچاریاں شرم سے پانی پانی ہوئے جا رہی تھیں ان دونوں کے لئے یہی غنیمت تھا کہ اس وقت پاکستان میں نہیں بلکہ ہندوستان میں ہیں انہیں اپنے بچوں اور گھر کی فکر کھائے جا رہی تھی۔ نہ جانے ان کے شوہروں نے انہیں گھر میں نہ پا کر کیا کیا قیاس آرائیاں کی ہوں گی۔

وہاں کھڑے لوگوں نے ان دونوں پر پیسوں کی اچھی خاصی برسات کر دی مگر پیسوں کو پکڑنا تو درکنار ان تینوں خواجہ سراجنوں نے دیکھنا تک گوارہ نہ کیا خیر ان دونوں کو جیسا ناچنا آتا تھا وہ ناچتی رہیں ان کا ناچ کافی دیر تک جاری رہا اور پھر ان کو کجری نے اپنے ہاتھ کا اشارہ کر کے روک دیا، بندیا نے آگے بڑھ کر انہیں پانی پلایا اور پھر کچھ دیر بعد وہ ایک خالی میدان میں تھیں۔

"دیکھو ہم نے تم لوگوں کی شرط پوری کر دی اب تو ہمیں ہمارے گھر چھوڑ آؤ۔" سیراں نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ ان تینوں نے ایک دوسرے کیطرف دیکھا جیسے ایک دوسرے کی رائے جاننا چاہتی ہوں اور پھر تینوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ "ٹھیک ہے تم دونوں اپنے ہاتھ ہمیں پکڑاؤ اور آنکھیں بند کر لو۔"

ان دونوں نے اپنے ہاتھ انہیں پکڑائے اور اپنی آنکھیں بند کر لیں "اب اپنی آنکھیں کھولو۔" یہ سن کر سیراں نے اپنی آنکھیں کھول دیں تو وہ۔ اپنے گھر کے آنگن میں کھڑی تھی مگر نھتو، بندیا اور نوراں نہیں تھیں۔"

وہ تینوں کہاں سیراں نے کجری سے پوچھا۔

"نھتو اور بندیا دونوں نوراں کو چھوڑنے پاکپتن گئی ہیں۔ یہ رہا تمہارا انعام۔" کجری نے اپنے ہاتھ کا اشارہ ایک طرف کیا تو اچانک وہاں پیسوں کا ڈھیر لگ گیا۔ سیراں بہت عقلمند تھی اس نے بڑی شائستگی سے کہا۔

"میرے لیے سب کچھ میرے بچے اور میرا شوہر ہے۔ آپ نے ہمیں صحیح سلامت ہمارے گھر پہنچا دیا ہمارے لیے یہی کافی ہے آپ مہربانی کر کے اپنے پیسے لے جائیں۔"

ان کی باتیں جاری تھیں کہ اتنے میں سیراں کے بچے دوڑتے ہوئے آئے اور سیراں سے لپٹ گئے۔

"کہاں چلی گئیں تھی آپ؟"

"وہ بیٹا تم لوگوں کی نانی کی طبیعت اچانک بہت خراب ہو گئی تھی منہ اندھیرے ہی تمہارا ماموں مجھے لینے آ گیا، میں نے تمہیں تنگ کرنا مناسب نہیں سمجھا۔" حیرت کی بات یہ تھی کہ وہاں کھڑی کجری کو اس کے بچے نہیں دیکھ پا رہے تھے۔

وہ صرف سیراں کو ہی دکھائی دے رہی تھی اور پھر سیراں نے اسے جانے کا کہا تو کجری پیسوں سمیت وہاں سے غائب تھی، سیراں نے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا۔

سیراں کوئی اور عورت نہیں بلکہ میری سگی دادی ہیں جو کہ اب بھی زندہ ہیں میں محسن عزیز جب بھی موکل جاتا ہوں تو اپنی دادی سے ان کے بارے میں ضرور پوچھتا ہوں کیونکہ وہ اب بھی میری دادی کے پاس آتی ہیں، یہی نہیں وہ میری دادی کے گھر کا کام کر کے بھی جاتی ہیں مثلاً جھاڑو لگانا برتن صاف کرنا مرچیں پیسنا وغیرہ، اب وہ میری دادی کی سہیلیاں بن گئی ہیں لیکن پھر ان لوگوں نے میری دادی کو کبھی بھی مجبور نہیں کیا کہ ہمیں ناچ کر دکھاؤ، بس جب وہ آتی ہیں تو میری دادی اونچی آواز میں پنجابی گانے لگا لیتی ہے لہٰذا اب وہ لوگ میری دادی کے پاس آ کر صرف گانے ہی سنتی ہیں اور یہ سلسلہ تب تک جاری رہے گا جب تک میری دادی زندہ ہیں۔

☆......☆......☆

وہ ایک جون کی گرم دوپہر تھی اس دوپہر کی گرمی میں ہر کوئی گرم لو سے بچنے کے لئے آرام کر رہا تھا۔ چرند پرند اپنے اپنے گھونسلوں میں دبکے پڑے تھے۔ پورے ماحول پر ایک گہرا سکوت طاری تھا سارے لوگ اپنے اپنے گھروں میں قیلولے کے لیے لیٹے ہوئے تھے۔ رانو کے گھر والے باغ ٹھیکے پر لیتے اور پھل فروخت کرتے، ابھی کچھ دیر پہلے ہی رانو کا شوہر منڈی

میں پھل فروخت کر کے آیا تھا رانو کی زندگی بہت خوشگوار گزر رہی تھی۔ پر رانو بچاری کو کیا پتہ تھا کہ اس کی بہار جیسی زندگی میں خزاں کا موسم اپنی ویرانی پھیلانے والا ہے رانو نے اپنے تھکے ہوئے شوہر کو روٹی دی اور خود چہل قدمی کی غرض سے باغ کے اندرونی حصے کی طرف بڑھ گئی۔

چلتے چلتے وہ کافی دور آگے نکل آئی، اب وہ ایک بہت بڑے آم کے درخت کے نیچے کھڑی تھی اس کی توجہ اس پر لگے پکے ہوئے آموں کی طرف ہو گئی۔ "ارے واہ کتنے پیارے آم ہیں یہ بہت رسیلے لگتے ہیں۔" اور یہ کہتے ہی رانو نے نیچے پڑا ہوا پتھر اٹھایا اور آموں کی طرف اچھال دیا۔ اور پھر اچانک ایک ہلکی سی چیخ ابھری جو شاید رانو کو سنائی نہیں دی تھی۔ رانو نے ایک اور پتھر اٹھایا اور آموں کی طرف اچھال دیا لیکن آم کوئی نہیں گرا مگر رانوں کے چہرے پر کوئی چیز آ کر گری تھی جیسے پانی۔

جب رانو نے اسے دیکھا تو اس کی چیخ نکل گئی کیونکہ پانی نہیں بلکہ وہ خون تھا۔

لیکن آم کے درخت سے یہ خون کیسا؟ رانو کے پاؤں خوف کی وجہ سے ہل نہیں رہے تھے۔ ابھی وہ بھاگنے کا سوچ ہی رہی تھی کہ اچانک زبردست پھنکار کے ساتھ ایک بہت موٹا اور لمبا سانپ زمین پر گرا۔

رانو کے رہے سہے اوسان بھی خطا ہو گئے۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ سانپ ایک خوبصورت مرد کا روپ دھار گیا۔ "یہ کیا طریقہ ہے کسی کو تنگ کرنے کا......؟" اس مرد کے ماتھے سے خون بہہ رہا تھا۔ "چپ کیوں ہو جواب دو۔ سب لوگ اس وقت آرام کر رہے ہیں اور تم......!" وہ باتیں کیے جا رہا تھا مگر اس کی آنکھیں رانو کے سراپے پر ٹکی ہوئی تھیں۔

"وہ میرے......" ابھی وہ اتنا ہی کہہ پائی تھی کہ اچانک اس کے شوہر کی آواز اس کے کانوں میں پڑی جو اسے ڈھونڈتا ہوا ادھر ہی آ رہا تھا اس آدمی نے اپنی للچائی ہوئی نظر رانو پر ڈالی جیسے اسے کوئی نایاب چیز مل گئی ہو اور ایک شیطانی مسکراہٹ کے ساتھ غائب ہو گیا۔

"تم یہاں ہو اور میں نے آدھا باغ چھان مارا۔" رانو کے شوہر نے اس کے پاس آ کر کہا تو وہ چونک گئی۔ "کیا ہوا......؟"

"مم......میں بس چلتے چلتے اتنی دور آ گئی۔"

"ارے تم اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہو؟"

"وہ اس قدر حبس ہے نا شاید اس لیے۔" مگر رانو نے سانپ والی بات اپنے شوہر کو نہ بتائی کیونکہ وہ اپنے شوہر کو بتا کر پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی لہٰذا وہ خاموشی سے اپنے شوہر کے ساتھ واپس لوٹ گئی۔

رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا، رانو کو اپنے سینے پر بوجھ سا محسوس اس نے کسمساتے ہوئے اپنی آنکھیں کھولیں تو دھک سے رہ گئی اس کی تو جیسے جان ہی نکل گئی ایک سیاہ رنگ کا سانپ رانو کے سینے پر بیٹھا ہوا تھا، ڈر اور خوف سے رانو کی آواز جیسے سینے میں گھٹ کر رہ گئی، سانپ کی ساحرانہ آنکھیں رانو پر ہی مرکوز تھیں رانو بت بنی لیٹی ہوئی تھی اور پھر اس نے اپنی تمام تر ہمت جمع کی اور ایک زوردار چیخ ماری۔ رانو کی چیخ سن کر ساتھ میں لیٹے ہوئے تمام لوگ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے رانو مسلسل چیخے جا رہی تھی۔

"کیا ہوا......" رانو کی ساس نے اسے شانے سے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا۔ "و...... وہ ...... س...... سانپ......!"

"سانپ کہاں ہے سانپ......؟" رانو کے شوہر نوید نے آگے بڑھ کر کہا۔

"دیکھو تو یہاں پر کوئی بھی سانپ نہیں۔ تم نے ضرور کوئی برا خواب دیکھا ہے۔"

"نن......نہیں میں نے کوئی خواب نہیں دیکھا۔ سانپ سچ میں تھا۔"

"نوید رانو کو پانی پلاؤ۔" اس کی ساس نے آگے بڑھ کر اس کے ماتھے پر آئے پسینے کو اپنے پلو سے صاف کرتے ہوئے کہا۔ رانو نے پانی پیا اور اپنی چارپائی پر لیٹ گئی مگر اب اسے نیند کہاں آنے والی تھی

اس کے ذہن میں گزشتہ دن والا واقعہ گردش کرنے لگا۔ ''یہ کون ہے اور میرے پیچھے کیوں پڑ گیا ہے۔'' اس طرح کے کئی سوالات اس کے دل میں اٹھ رہے تھے وہ جتنا سوچتی اتنا ہی الجھتی جارہی تھی۔

''کاش میں ادھر نہ جاتی۔'' انہیں سوچوں کے بھنور میں پھنسی کب اسے نیند آئی اسے پتا بھی نہ چلا۔

اگلی صبح حسب معمول تھی سب لوگ اٹھ کر اپنے اپنے کاموں میں جت گئے رانو بھی اپنے کام میں لگ گئی رات والا واقعہ اس کے ذہن میں بدستور چپکا ہوا تھا، یہ واقعہ اسے اندر سے دہلا گیا تھا اور پھر سارا دن گزر گیا۔

رات نے اپنی کالی دبیز چادر پھیلانا شروع کردی، باغ میں ہر طرف سناٹا چھا چکا تھا، ایک عجیب سی ویرانی تھی، آج باغ میں سب لوگوں نے رات کا کھانا کھایا اور اپنی اپنی چارپائیوں پر لیٹ گئے اور پھر نیند کی دیوی نے ان سب کو اپنی آغوش میں لے لیا۔

رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا کہ اچانک رانو کو اپنے جسم پر سرسراہٹ سی محسوس ہوئی تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی اور یہ دیکھ کر وہ دہل گئی کیونکہ گزشتہ رات والا سانپ اس کے ساتھ لیٹا ہوا تھا اور اپنی چمکیلی آنکھوں سے اسے ہی گھور رہا تھا۔ رانو کی بے اختیار چیخ نکل گئی۔

رانو کی چیخ سن کر سب لوگ نیند سے جاگ گئے مگر جیسے ہی ان کی نظریں رانو کی چارپائی پر پڑیں تو وہ سب ہکے بکے رہ گئے۔ سب پر تو جیسے سکتہ طاری ہوچکا تھا، خوف اور حیرت کی ملی جلی کیفیت لیے سب لوگوں کی نظریں سانپ پر ہی مرکوز تھیں۔

رانو بیچاری ایک طرف سکڑی سمٹی کھڑی تھی۔

اور پھر جو کچھ ان لوگوں نے دیکھا وہ ان کی حیرت کو دوچند کردینے کے لئے کافی تھا، چارپائی پر جس جگہ سانپ تھا وہاں ہلکا ہلکا سا دھواں پھیلنا شروع ہوگیا اور پھر کچھ ہی پل میں ان کے سامنے ایک عجیب قسم کا آدمی کھڑا تھا سب لوگ حیرت کے بت بنے اس کو دیکھ رہے تھے وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا رانو کے قریب آیا اور اس کا بازو پکڑ کر مخاطب ہوا۔

''یہ میری ہے اور میں اسے کسی بھی صورت میں حاصل کرکے رہوں گا اگر تم لوگوں نے کچھ الٹا سیدھا کیا تو......؟'' اس نے ہاتھ کے اشارے سے ان سب کو تنبیہ کی اور پھر دوسرے ہی لمحے وہاں سے غائب تھا۔

''مطلب تمہاری باتیں سچ تھیں۔'' رانو کی ساس نے آگے بڑھ کر اسے گلے لگالیا اور پھر رانو زاروقطار رونے لگی، رات کے اس پرہول سناٹے میں رانو کی آہوں کے ساتھ اس کی ساس کی بھی سسکیاں شامل ہوگئیں اور یہ رات بھی اپنی تمام تر خوفناکیوں کے ساتھ گزر گئی۔

صبح کا سورج ان سب کے لئے اداسی اور پریشانی لیے طلوع ہوا کیونکہ رانو کی حالت بہت ابتر ہو رہی تھی وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں سانپ سانپ کہہ رہی تھی۔ رانو کا شوہر نوید جلدی سے قریبی ایک حکیم کو بلا لایا، اس نے آکر جب رانو کو دیکھا۔ ''اس کی یہ حالت کیسے ہوئے؟'' حکیم نے رانو کے شوہر سے پوچھا۔ جواباً نوید نے سب کچھ حکیم کے گوش گزار کردیا۔

''ہونہہ...... ارے تو میاں یہ کام ڈاکٹروں حکیموں والا نہیں بلکہ کسی اللہ والے سے کراؤ۔''

''مگر حکیم صاحب ہم تو ساہیوال میں نئے ہیں ہمیں تو کسی اللہ والے کے بارے میں نہیں معلوم۔''

''مگر مجھے معلوم ہے۔'' اور یہ کہتے ہوئے حکیم نے اپنے تھیلے سے ایک ڈائری نکالی اور اسکی ورق گردانی کرنے لگا۔ ''یہ رہا۔ یہ لو پتا ان کا نام حافظ عبداللطیف ہے اور یہ پاس کے گاؤں میں رہتے ہیں تم جلدی سے جاؤ اور انہیں یہاں لے آؤ۔ اچھا میں اب چلتا ہوں مجھے اجازت دیجئے۔''

''جاؤ بیٹا جلدی سے انہیں لے آؤ مجھ سے تو رانو کی یہ حالت نہیں دیکھی جارہی۔'' رانو کی ساس نے رانو کو ہاتھ کے پنکھے سے ہوا دیتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے اماں میں جارہا ہوں بابا جی کو لینے۔'' اور یہ کہہ کر نوید جلدی جلدی سے وہاں سے نکل

گیا اور رانو کی ساس ایک ٹھنڈی آہ بھر کر پھر سے رانو کو پنکھا جھلنے میں مصروف ہوگئی۔

جوں جوں وقت گزرتا جارہا تھا گھر والوں کی بے چینی اور اضطراب میں اضافہ ہوتا جارہا تھا اور رانو کی حالت پہلے سے بھی زیادہ بگڑتی جارہی تھی، سب لوگ پریشانی کی حالت میں ادھر ادھر ٹہل رہے تھے اور یونہی دو گھنٹے بیت گئے۔

اور پھر لوگوں کو دور سے نوید آتا دکھائی دیا، نوید کے ساتھ کوئی اور بھی تھا جو غالباً بابا ہی تھے، انہوں نے پاس آکر سب گھر والوں کو سلام کیا اور جلدی سے رانو کی چارپائی کی طرف بڑھ گئے۔

''بابا جی دیکھئے ذرا میری بچی کو۔'' رانو کی ساس نے روتے ہوئے آگے بڑھ کر رانو کے چہرے سے کپڑا ہٹایا۔

''اطمینان رکھیئے خدا نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ تھوڑی سی آگ جلادیں۔''

اور نوید نے جھٹ سے قریب آگ جلادی، بابا جی نے آگے بڑھ کر رانو کے سر سے ایک بال توڑا اور اس پر کچھ پڑھنے لگے اور پھر انہوں نے بال کو جلتی ہوئی آگ میں ڈال دیا تو آگ یکلخت بھڑکی اور ماحول تھوڑا سا اور گرم ہوگیا اور پھر اچانک رانو کے منہ سے آہ کی آواز نکلی۔

بابا جی نے آگے بڑھ کر رانو کا دوپٹہ بھی آگ میں جھونک دیا، آگ اور مزید بلند ہوگئی۔

''جن ہو، بدروح ہو، آسیب ہو یا کوئی ہمزاد ہو، اپنے آپ یہاں حاضر ہو جاؤ نہیں تو ہم تمہیں زبردستی یہاں بلوائیں گے۔'' بابا جی نے اپنی گردن کو چاروں طرف گھماتے ہوئے کہا۔

کافی دیر گزر جانے کے بعد کوئی ردعمل نہیں ہوا تو بابا جی نے پھر یہی الفاظ دہرائے مگر جواب ندارد......!

''تم ہمیں انتہائی قدم اٹھانے پر مجبور کر رہے ہو، میں چاہوں تو تمہیں ایک پل میں حاضر کرلوں مگر میرے کچھ اصول ہیں جنہیں میں توڑنا نہیں چاہتا میں تمہیں آخری موقع دے رہا ہوں، تمہارے پاس کچھ دیر کی مہلت ہے حاضر ہوجاؤ۔''

رانو کے گھر والے گھبرائے ہوئے ایک طرف کھڑے تھے کہ نہ جانے اب کیا ہونے والا ہے۔

''بہت ہی ڈھیٹ اور شریر معلوم ہوتے ہو خیر ہم نے تمہارے ساتھ بہت رعایت کرلی۔ اب دیکھو ہم کیا کرتے ہیں۔'' اور یہ کہتے ہوئے بابا جی نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور جب انہوں نے ہاتھ باہر نکالا تو ان کے ہاتھ میں روشنائی کی دوات کے سائز کی کوئی ڈبیہ تھی تو بابا جی نے ایک مسکراتی ہوئی نظر اس ڈبیہ پر ڈالی اور کچھ پڑھنے لگے، پھر انہوں نے آہستہ آہستہ اس ڈبیہ کا ڈھکن کھول دیا تو ڈبیہ میں سے ہلکے سبز رنگ کا دھواں نکلنا شروع ہوگیا۔

بابا جی نے کچھ مخصوص اشاروں سے دھویں کو نہ جانے کیا کہا کہ دھواں باغ میں چاروں طرف پھیل گیا۔

کچھ دیر گزری ہوگی کہ انہیں کسی کے چیخنے کی آواز سنائی دی، وہ آواز باغ کے اندرونی حصے سے آرہی تھی سب لوگ گھبرا کر بابا جی کی طرف دیکھنے لگے۔

''گھبرائیں نہیں آپ لوگوں کو کچھ نہیں ہوگا۔''

باغ کے اندرونی حصے میں ایسا لگ رہا تھا جیسے وہاں کوئی جنگ ہو رہی ہو، کچھ دیر یہ سب جاری رہا پھر ایک دم خاموشی چھا گئی، بابا جی کے چہرے پر اطمینان کی مسکان پھیل گئی۔ اور پھر اچانک بابا جی سے تین چار قدم کی دوری پر ایک سانپ نمودار ہوا اس سانپ نے جلدی ہی انسانی شکل اختیار کر لی اس کے چہرے اور بدن پر سے بہتا ہوا خون اس بات کی نشاندہی کر رہا تھا کہ ابھی ابھی کسی کے ہاتھوں سے پٹ کر آیا ہے۔

"اوہ تو تم ہو جس کی وجہ سے یہ سب لوگ پریشان ہیں۔ یقیناً تمہاری وجہ سے اس لڑکی کی یہ حالت ہوئی ہے۔" بابا جی نے ہاتھ کی انگلی سے رانو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "آخر اس نے تمہارا کیا بگاڑا ہے جو تم اس کے پیچھے پڑ گئے ہو؟"

"میں اسے نہیں چھوڑوں گا چاہے کچھ بھی ہو جائے، یہ لڑکی مجھے پسند ہے اور جو چیز مجھے پسند آ جاتی ہے میں اسے زبردستی حاصل کر لیتا ہوں۔" سامنے کھڑے وجود نے کہا۔ غصے سے اس کی آنکھیں انگارہ ہو رہی تھیں اور چہرے پر کرب واذیت نمایاں تھا۔

"دیکھو تم آتشی مخلوق ہو اور یہ انسان تم دونوں کا میل ہرگز نہیں ہو سکتا اور دوسری بات کہ یہ شادی شدہ ہے، تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ اسے بھول جاؤ اور اپنی دنیا میں واپس چلے جاؤ۔"

"نہیں جاؤں گا، تم نے جو کرنا ہے کر لو۔" اب وہ ہٹ دھرمی پر اتر آیا تھا۔

"ٹھیک ہے نہیں تو ناں سہی۔ میں نے تمہیں بہت سمجھایا مگر تم نہیں سمجھے، میں تمہیں ماروں گا نہیں بلکہ ایسی سزا دوں گا کہ رہتی دنیا تک نشان عبرت بن جاؤ گے۔"

جس تسبیح پر بابا جی ورد کر رہے تھے انہوں نے اس تسبیح کا رخ اس جن کی طرف کر دیا تو تسبیح سے سفید رنگ کی شعاعیں نکلنا شروع ہو گئیں پھر ان شعاعوں نے دیکھتے ہی دیکھتے اس جن کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

اب جن کی کربناک چیخیں ماحول کو لرزا رہی تھیں کچھ دیر یہ عمل جاری رہا پھر وہ شعاعیں غائب ہو گئیں۔

مگر یہ کیا جس جگہ وہ جن کھڑا ہوا تھا وہاں اب ایک مینڈک بیٹھا ہوا تھا جو اپنی ٹرٹر کی آواز سے اپنی بے بسی سنا رہا تھا۔

"تم جیسوں کا یہی حال ہونا چاہیے، تم اسی کے مستحق ہو، اب ٹرٹر کرتے رہنا۔ آپ لوگ گھبرائیں نہیں یہ اب بالکل بے ضرر ہے، میں نے اس کی ساری غیبی طاقت چھین لی ہے، اب یہ کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔"

بابا جی نے کچھ پڑھ کر رانو پر پھونکا تو کچھ ہی دیر میں رانو کسمسا کر اٹھ بیٹھی، رانو حیرانگی سے بابا جی کی طرف دیکھ رہی تھی، بابا جی نے آگے بڑھ کر دست شفقت اس کے سر پر پھیرا تو رانو نے اپنے اندر سکون وراحت کو محسوس کیا، رانو کی ساس نے آگے بڑھ کر اسے گلے لگا لیا، نوید نے آگے بڑھ کر بابا جی کا شکریہ ادا کیا۔

"ارے شکریہ ادا کرنا ہے تو اس پروردگار کا کرو جس نے مجھے یہ سب عطا کیا، میں تو اس کا ایک عام سا بندہ ہوں، اب مجھے اجازت دیجیے میں چلتا ہوں۔"

"ارے ایسے کیسے جا رہے ہیں آپ خدمت کا تو موقع دیجیے ہمیں۔" نوید آگے بڑھ کر بولا۔

"نہیں...... نہیں اس کی کوئی ضرورت نہیں۔"

نوید کے بے حد اصرار پر نوید بابا جی کو ان کے گھر چھوڑ کر آیا۔

اگلے دن رانو کے گھر والوں نے باغ کے مالکوں سے حساب کتاب کیا اور ٹھیک دو دن بعد وہ سب اس باغ کو چھوڑ کر اپنے گاؤں واپس چلے گئے کیونکہ اب وہ باغ میں رہ کر مزید کوئی اذیت نہیں اٹھانا چاہتے تھے۔





سنگین سزا

عامر شہزاد۔ننکانہ صاحب

شاہ صاحب کی بارعب آواز گونجی، تم نے جو گناہ کیا ھے اس کی سزا تمھیں ضرور ملے گی تم نے ایک بے قصو لڑکی اور وہ وجود جو دنیا مین نھیں آیا اسے قتل کر ڈالا، اس کی سزا آخرت ھی نھیں بلکہ یھاں بھی عبرت ناک ملے گی، کیونکہ خون کا بدلہ خون ھے۔

دل دیاں گلیاں جانے نا، پیار میرا پہچانے ناں، اس کے مصداق دلکش دل فریب کہانی

ارم آفس میں بیٹھی اسد کو غور سے دیکھ رہی تھی، اور اسد اپنے کام میں مگن تھا اس کی نظریں کمپیوٹر کی اسکرین پر جمی ہوئی تھیں وہ ہر حال میں ٹینڈر حاصل کرنا چاہتا تھا اس کے والد کمال صاحب جو بہت بڑے بزنس مین تھے، حال ہی میں ایک کار حادثہ میں انتقال کر گئے اور مہران انڈسٹریز کا سارا بوجھ اسد کے نازک اور ناتجربہ کار کندھوں پر آن پڑا اس کی امی تین سال پہلے ہی دنیا چھوڑ چکی تھیں اب اسد بھری دنیا میں اکیلا رہ گیا تھا، اس نازک صورتحال میں جب سب لوگ پرائے ہو گئے اور بہت سے سینئر ملازمین بھی دھوکہ دینے لگے تو کمال صاحب کی پرسنل سیکریٹری ارم نے اسد کا مکمل ساتھ دیا اگر وہ ایسا نہ کرتی تو یقیناً مہران انڈسٹریز تباہی کے دہانے پہنچ جاتی۔

ارم اسد کی ہم عمر تھی، وہ شروع سے ہی اسد کو پسند کرتی تھی اور اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ بزنس کے

اسرار ورموز سے بخوبی واقف تھی اس نے مخلصانہ کوششوں سے نہ صرف انڈسٹری کے معیار کو قائم رکھا بلکہ کمال صاحب کی وفات کے بعد پیدا ہونے والی بعض کالی بھیڑوں سے بھی اسد کو بچایا، اس نے اسد کو بزنس کے تمام گر سکھائے تاکہ وہ دوسروں سے مقابلہ کرسکے، اسی وجہ سے اسد بھی اس کی دل وجان سے عزت کرتا تھا۔

کافی عرصہ سے ارم اپنے دل کی بات اسد سے کہنا چاہ رہی تھی ارم اسد سے پاکیزہ، سچی اور بغیر کسی طمع کے محبت کرتی تھی آج اس نے پکا ارادہ کرلیا کہ میں اس سے اپنا حال دل کہہ دوں۔

اسد نے جب ارم کی جوانی کے نشے سے بھرپور نظروں کی تپش محسوس کی تو بولا۔ ”مس ارم خیریت تو ہے؟“

ارم قدرے شرمائی اور بولی۔ ”اسد صاحب میں کافی عرصہ سے آپ سے ایک بات کہنا چاہتی ہوں مگر......“

اسد بولا۔ ”مس ارم آپ بولیں بات کیا ہے؟“

ارم بڑے پیار سے بولی! ”اسد میں شروع سے ہی آپ سے بہت محبت کرتی ہوں، میں آپ کے بغیر ایک پل بھی جینے کا تصور نہیں کرسکتی، خدا گواہ ہے کہ میری محبت بالکل سچی اور ہر قسم کی لالچ سے پاک ہے۔ براہ مہربانی مجھے اپنی زندگی میں شامل کرکے خدمت کا موقع دیں تن من سب کچھ آپ پر وار دوں گی۔“

اسد حیرت سے ارم کی باتیں سن کر بولا! ”مس ارم آپ میرے لئے بہت قابل احترام ہیں آپ بہت اچھی، خوب سیرت اور خوب صورت ہیں جس سے بھی آپ کی شادی ہوگی وہ دنیا کا خوش قسمت انسان ہوگا مگر مجھے نہایت افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ میں ایک ایسی لڑکی سے پیار کرتا ہوں جو بہت غریب، یتیم اور بے آسرا ہے اس پوری دنیا میں اس کا کوئی نہیں ہے وہ میری ہم جماعت رہی ہے اور اپنے ماموں کے گھر رہتی ہے اس کا نام نور ہے۔“

اسد کی باتیں سن کر ارم مصنوعی مسکراہٹ اپنے حسین لبوں پر لاکر بولی۔ ”اسد کیا نور بھی آپ سے بہت محبت کرتی ہے۔“ اسد نے ہاں میں سر ہلادیا۔

☆......☆......☆

ارم کی خصوصی محنت اور مہارتوں سے ٹینڈر مہران انڈسٹریز کو مل گیا جس سے اسد کو کروڑوں کا فائدہ ہوا اسی وجہ سے اسد کا شمار بہترین بزنس مینوں میں ہونے لگا۔ جلد ہی مہران انڈسٹریز ترقی کی بلندیوں پر پہنچ گئی۔

جب ارم کو یقین ہوگیا کہ اسد بزنس کو سنبھالنے اور اس کے اسرار ورموز سے اچھی طرح واقف ہوگیا ہے تو ارم نے ملازمت چھوڑ دی اسد کی لاکھ کوششوں کے باوجود بھی وہ اپنے فیصلے پر ڈٹی رہی اسد نے اسے بہت بڑی رقم دینے کی آفر کی مگر اس نے لینے سے صاف انکار کردیا۔

اچانک ارم کا مہران انڈسٹریز سے الگ ہونا یقیناً اسد کے لئے کسی سانحہ سے کم نہ تھا۔

وقت گزرتا رہا ارم نے اسد اور اس کے بزنس سے مکمل قطع تعلق کرلیا اور ایک پرائیویٹ یونیورسٹی میں بطور لیکچرار ملازمت اختیار کرلی۔

اسد اور نور آپس میں بہت محبت کرتے تھے۔ حوادث زمانہ نے نور سے اس کا سب کچھ چھین لیا تھا اس کے ماموں نے اسے پناہ ضرور دی مگر ممانی نے اس کی زندگی اجیرن بنانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی، انتہائی خوددار ہونے کے باوجود نور تعلیمی اخراجات اسد سے لینے پر مجبور تھی۔

اسد نے نور کا رشتہ مانگا تو اس کے ماموں نے فوراً ہاں کردی چند دنوں بعد ہی دونوں کی شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی جس میں شہر کے نامور بزنس مین اور بااثر شخصیات نے شرکت کی دعوت نامہ ملنے کے باوجود ارم نے شادی میں شرکت سے معذرت کرلی۔

اسد حجلہ عروسی میں داخل ہوا تو نور کا سراپا حسن دیکھ کر حیران رہ گیا۔ پھولوں کی سیج پر بیٹھی حسن کی دیوی نہایت دلکش اور خوب صورت لگ رہی تھی اسد نور کا گھونگھٹ اٹھا کر بولا! ”واقعی تم دنیا کی سب سے خوب صورت لڑکی ہو، بالکل مثل حور، مجھے تو ایسے لگتا ہے جیسے

میں نے دنیا کا سب سے بڑا خزانہ پالیا ہے۔“ اور پھر اس کے نرم و نازک بدن کو پیار کرنے لگا اس کے زیورات وغیرہ اتار کر اسے گلے لگالیا اور اس کے حسن و شباب میں گم ہوگیا۔

دنیا کے ہر انسان کی خواہش ہوتی ہے کہ ایسا وقت اس کی زندگی میں ضرور آئے، ابھی دونوں وصال حسن کا مزہ لوٹنے ہی والے تھے کہ فون کی گھنٹی بجی، بجھے دل سے اسد نے کال اٹینڈ کی۔ یہ سن کر حیرت سے تقریباً اچھل پڑا کہ ارم نے خودکشی کرلی ہے اور خط لکھ دیا ہے کہ وہ اپنی موت کی خود ذمہ دار ہے، ارم کی خودکشی سب کے لئے معمہ تھی مگر صرف اسد جانتا تھا کہ ارم نے خودکشی کیوں کی ہے؟

کوئی مرے یا جئے دنیا کو اس سے کیا، اسد نے نور کے ہمراہ یورپ کی سیر کا پروگرام بنایا اور وہ روانہ ہوگئے، انہوں نے یورپ میں ایک بہت مہنگے اور پرسکون ہوٹل کا انتخاب کیا۔ سمندر میں ایک جزیرے پر موجود ہوٹل بہت خوب صورت نظاروں کا حامل تھا۔ بہت مہنگا ہونے کی وجہ سے لوگ کم ہی یہاں رکتے تھے۔ اگر رکتے تو بھی ایک آدھ دن کے لئے مگر اسد نے کمرہ پورے ایک ہفتہ کے لئے بک کروایا تھا۔ وہ نور کے حسن وشباب سے دل کھول کر فیض یاب ہونا چاہتا تھا۔ جہاں انہیں کوئی ڈسٹرب نہ کرسکے۔

اسد کو خوش کرکے نور رات کے تیسرے پہر واش روم گئی، ہاتھ دھوتے وقت اس کی نظر آئینے پر پڑی تو حیران و ششدر رہ گئی کیونکہ آئینے میں اسے اپنا چہرہ جلا ہوا اور جگہ جگہ سے کٹا ہوا محسوس ہوا، وہ چیختی ہوئی باہر کو بھاگی اسد بھی پریشانی سے اٹھ بیٹھا، وہ مسلسل چلا رہی تھی اسد نے پریشانی کے عالم میں پوچھا نور آخر ہوا کیا ہے؟“

حواس بحال ہونے پر نور نے پیش آنے والا سارا واقعہ اسد کو بتایا۔ اسد نے غور سے سننے کے بعد پیار سے کہا۔ ”میری جان دراصل لمبے سفر کی وجہ سے ہم تھکان کا شکار ہیں اور دوسرا تم نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ لیا ہوگا لہٰذا اب آرام سے سوجاؤ۔ اور بچوں کی طرح اس کے نرم و ملائم بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔

دو دن بعد پھر واش روم میں نور کے ساتھ ایک پراسرار اور دلخراش واقعہ پیش آیا۔ وہ بیسن پر ہاتھ منہ دھونے میں مصروف تھی کہ اچانک اس میں سے ایک باریک سانپ نکل آیا اس اچانک حملے سے وہ بری طرح بدحواس ہوگئی بھاگنا چاہا۔ مگر دروازہ بند ہونے کی وجہ سے فرش پر گرگئی ابھی وہ درد سے چور اٹھنے کی کوشش ہی کررہی تھی کہ پورے فرش سے خوفناک اور نوکیلے ہاتھ نکل کر اسے پکڑنے لگے دیواروں اور چھت سے خوفناک کیڑے اس پر گرنے لگے وہ چیخنا چاہتی تھی مگر اس کی آواز حلق میں دب کر رہ گئی پراسرار اور جلے ہوئے بدبودار ہاتھوں اور کیڑوں نے اسے شدید زخمی کردیا، درد کی شدت نے اسے ادھ موا کردیا۔

اچانک ایک بڑا اژدھا اس کے سر پر آن گرا اور اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔

نور کی آنکھیں کھلیں تو ڈاکٹر علاج کررہا تھا۔ اور اسد بھی پریشان اسے تک رہا تھا نور نے اسد سے پوچھا جان یہ سب کیا ہے؟ ڈاکٹر نے اسے انجکشن لگایا کچھ ادویات لکھ کر دیں اور کہا۔ ”صرف ڈپریشن کا مسئلہ ہے لہٰذا پریشانی کی کوئی بات نہیں۔“ طبیعت کچھ سنبھلنے کے بعد نور نے سارا واقعہ اسد کو سنایا۔

اسد ہنسی ضبط کرکے بولا۔ ”اوہ میری جان تم کیسی باتیں کررہی ہو؟ اگر تم پر حملے ہوئے اور بقول تم زخمی بھی ہوئی تو کہاں ہے زخموں کے نشانات؟“

مگر نور تو بالکل ٹھیک اور زخموں سے پاک لیٹی ہوئی تھی خود کو دیکھ کر وہ بھی گہری سوچ میں گم ہوگئی اسد نے اسے بتایا کہ تم واش روم گئی اور کافی دیر تک باہر نہ آئی تو مجھے فکر ہوئی دروازہ بہت پیٹا مگر جواب نہ ملا تو میں نے دروازہ توڑ کر بے ہوشی کی حالت میں تمہیں باہر نکالا، میری جان! ڈاکٹر نے کہا ہے کہ تمہیں صرف ڈپریشن ہے مگر تم پریشان کیوں ہوتی ہو اگر کوئی مسئلہ ہے تو مجھ سے شیئر کرو۔“ نور نے اس بات کا سختی سے انکار کردیا کہ اسے کوئی پریشانی ہے بلکہ جو واقعات اس

کے ساتھ پیش آ رہے وہ حقیقت پر مبنی ہیں۔ مگر اسد ایسی باتوں پر بالکل یقین نہیں رکھتا تھا۔

ایک ہفتہ بعد وہ لوگ وطن واپس آ گئے دھیرے دھیرے وقت گزرتا رہا۔ پھر ڈاکٹر نے دونوں کو خوشخبری سنائی کہ اب آپ کے گھر ایک ننھا مہمان آنے والا ہے یہ بات دونوں کے لئے خوشی کا باعث تھی۔ دونوں کی آپس میں مثالی محبت تھی۔ شادی کے ایک سال بعد بھی ان کا ہر دن عید اور ہر رات شب برات تھی لوگ ان کی محبت کی مثالیں دیتے تھے۔

ایک دن نور کی طبیعت کچھ خراب ہو گئی۔ ملازمہ نے چائے میں نمک زیادہ ڈال دیا جو نور کے غصے کا سبب بنا۔ نور نے غصے سے اس کی طرف دیکھا تو اس کی سرخ آنکھوں سے نکلنے والی شعاعوں نے ملازمہ کو جھلسا ڈالا۔ جسے فوری اسپتال داخل کروانا پڑا۔

جب صورتحال سے اسد کو آگاہ کیا تو اس نے یہ بات ماننے سے قطعی انکار کر دیا، الٹا ملازمہ پر الزام دھر دیا کہ وہ خود جل کر الزام میری نور پر لگا رہی ہے اور قانونی پیچیدگیوں سے بچنے کی خاطر روپے کی مدد سے بات ٹال مٹول کر دی گئی۔ البتہ ملازمہ کا مکمل علاج کروا دیا۔ اسی طرح ایک باورچی نے کھانا تیار کرنے میں دیر کر دی تو نور نے ہاتھ کے اشارے سے اسے دیوار پر دے مارا۔ جس سے وہ زخمی ہو گیا اس بار بھی اسد نے یقین نہ کیا۔

اتفاق سے ایک دن اسد گھر پر ہی موجود تھا کہ کسی بات پر نور ناراض ہو گئی اور زمین پر گر کر تڑپنے لگی جیسے اسے مرگی کا دورہ پڑا ہو اسد نے اسے اٹھانا چاہا تو نور کے منہ سے گرم سیاہ مادہ نکل کر اسد کے ہاتھ پر پڑا جس سے اسے شدید جلن کا احساس ہوا اور اسی دوران نور کے منہ سے عجیب سی آوازیں نکل رہی تھیں۔ جیسے کوئی بھیڑیا غرا رہا ہو۔

اسد نور کی محبت میں بالکل پاگل ہو چکا تھا۔ اسے اب بھی یہی لگتا تھا کہ اسے کوئی اعصابی یا خطرناک مرض لگ چکا ہے۔ تھوڑی دیر بعد نور کی حالت نارمل ہو گئی اور اسد کی پریشانی بھی کم ہو گئی وہ مسلسل اس کا علاج بہترین ڈاکٹر سے کرواتا رہا۔

☆......☆......☆

ایک دن جب زچگی کے دن قریب تھے۔ نور کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی۔ دورے کی وجہ سے وہ بیڈ سے تقریباً ایک فٹ اوپر تک اچھل رہی تھی اسے فوراً اسپتال لے جایا گیا۔ ڈاکٹر کے بورڈ نے ہر ممکن علاج کرنے کی بھرپور تدابیر اور کوششیں کیں مگر وہ بیماری کی تشخیص کرنے میں ناکام رہے اس حالت میں جبکہ وہ ماں بننے کے بالکل قریب تھی۔ یہ دورے انتہائی خطرناک ثابت ہو سکتے تھے۔ مجبوراً اسے بیڈ سے باندھ دیا گیا۔

میڈیکل ٹریٹمنٹ ہونے کے بعد شہر کے بہت مشہور اور تجربہ کار ڈاکٹر کو بلایا گیا۔ ایک گھنٹہ اس نے نور کو بچانے کے لئے ہر ممکن کوشش کی مگر ناکام رہا۔

مزید تھوڑی دیر بعد کمرے سے باہر آ کر ڈاکٹر اسد سے مخاطب ہوا۔ ”سوری نوجوان میں تمہاری بیوی بچے کو نہ بچا سکا۔“ یہ جملہ سن کر اسد غم سے پتھر بن گیا اس کی دنیا اجڑ چکی تھی وہ برباد ہو گیا وہ شدت غم سے گرنے ہی والا تھا کہ ڈاکٹر نے اسے سہارا دیا، اسی دوران کمرے سے ایک نرس باہر آئی اور بولی۔ ”ڈاکٹر صاحب مس نور کو ہوش آ گیا ہے اور وہ بیڈ پر بیٹھی ہوئی ہیں۔“

سب بھاگ کر اندر گئے دیکھا تو واقعی نور بیڈ پر خون میں لت پت بیٹھی ہوئی تھی اس کی آنکھیں انتہائی سرخ تھیں رنگ پیلا اور بال بکھرے ہوئے تھے۔

ڈاکٹر نور کو زندہ دیکھ کر دم بخود اور حیران کھڑا تھا، اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ابھی کچھ دیر پہلے جس کو مردہ حالت میں چھوڑ کر گیا تھا وہ زندہ کیسے ہو گئی۔ ہزاروں لوگوں کو اس نے مرتے دیکھا تھا۔ مگر جو واقعہ آج پیش آیا پہلے کبھی ایسا نہ ہوا۔

اسد کو جہاں بچہ نہ بچنے کا دکھ تھا وہی نور کے زندہ بچنے کی بے حد خوشی بھی تھی اگر نور ہے تو سب کچھ ہے۔

ڈاکٹر نے اسد کو سختی سے تاکید کی کہ چھ ماہ تک وہ نور سے جسمانی تعلقات نہ رکھے ورنہ نقصان کا وہ خود ذمہ دار ہو گا۔

اب نور پہلے والی نہیں رہی غصہ، ضد اور ہٹ دھرمی اس کا شیوہ بن چکا تھا وہ بات بات پر اسد اور ملازمین سے لڑنے لگتی بہت زیادہ اذیت سہہ کر بھی ملازمین نور سے پیار کرتے تھے کیونکہ ان کے بقول بیماری سے پہلے نور بی بی ان کا بہت خیال رکھتی تھیں۔

انہی دنوں اسد نے محسوس کیا کہ نور جنسی تسکین کے لئے حد سے زیادہ اس کے قریب آ رہی تھی۔ حالانکہ ہمیشہ سے وہ باصبر واقع ہوئی تھی، وہ مسلسل اسے ٹالتا رہا۔

اسد کے اس رویے سے نور بہت دلبرداشتہ ہوتی اور کھری کھری سنانے لگتی کہ ”اب تمہیں مجھ سے پیار نہیں رہا اب تمہیں میرا شباب نظر نہیں آتا سیدھی طرح کہو کہ تمہارا دل اب مجھ سے بھر گیا ہے یا کوئی اور اس میں بس گئی ہے۔“ مگر اسد بے چارہ کیسے اسے بتاتا کہ میں تو خود تمہارے ملاپ کے لئے تڑپ رہا ہوں۔ ڈاکٹر نے منع کر دیا ہے وہ نہیں چاہتا تھا کہ نور کو اس بات کا علم ہو اور اسے دکھ ہو۔

پھر اکثر نور کو دورے پڑنے لگے اسی وجہ سے وہ گھر کا بہت نقصان کرتی اس کی پراسرار بیماری سے سب پریشان تھے علاج متواتر جاری رہا مگر مرض بڑھتا رہا جوں جوں دوا کی۔ ایک روز جب نور کی طبیعت بگڑی تو اس نے آنکھ کے اشارے سے گھر کے سارے قیمتی برتن توڑ ڈالے۔ حالات بہت خراب ہونے لگے۔ اسد کے علاوہ باقی سب اس بات سے متفق تھے کہ نور کے جسم میں کوئی غیر مرئی طاقت موجود ہے۔

☆......☆......☆

اسد بہت پریشان رہنے لگا اس نے اپنے ایک پرخلوص اور مخلص دوست طیب سے بات کی۔ غور سے اسد کی بات سن کر وہ بولا۔ ”اسد بھائی مجھے تو یہ کسی آسیب کا معاملہ لگتا ہے میں تمہیں آج ہی ایک اللہ والے کے پاس لے کر چلتا ہوں وہ بہت سے علوم پر عبور رکھتے ہیں بالخصوص ”علم جنات“ پر۔

”بھابی کی ایک تصویر چاہئے سمجھو تمہارا مسئلہ حل ہو گیا۔“

اسد ایسی باتوں پر یقین نہیں رکھتا تھا لیکن طیب کے اصرار پر وہ جانے کے لئے راضی ہوگیا۔ ایک گھنٹہ بعد وہ شاہ صاحب کے آستانے پر موجود تھے۔ جو شہر سے بالکل ہٹ کر بنا ہوا تھا۔

طیب نے ساری تفصیل سے شاہ صاحب کو آگاہ کیا اور نور کی تصویر دکھائی۔

تصویر غور سے دیکھنے اور منہ میں کچھ پڑھ کر شاہ صاحب بولے۔ ”آپ میرے ساتھ کیسا مذاق کررہے ہیں؟ ایک ایسی لڑکی کا مسئلہ میرے پاس لے کر آئے ہیں جو مرچکی ہے۔“

اسد یہ بات سن کر تلملا اٹھا اور طیب سے مخاطب ہوا۔ ”میں نے تمہیں کہا تھا ناکہ یہ سب ڈھونگ ہے۔ ارے میری نور تو گھر میں بالکل زندہ موجود ہے۔“ اور وہاں سے نکل آیا۔

روز بروز نور کی حرکتیں پراسرار ہورہی تھیں وہ جنسی خواہش کی تکمیل کے لئے حد سے گزر رہی تھی۔

ایک دن بلی کا بچہ صحن میں گھوم رہا تھا کہ اس نے جھپٹ کر اسے پکڑا اور اس کی گردن پر اپنے دانت گاڑ دیئے۔ اس کے لبوں پر خون واضح دکھائی دے رہا تھا۔ ملازمہ نے سارا منظر دیکھا۔ شام کو اسد کو بتایا تو اس نے نا صرف اس بات کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا بلکہ الٹا ملازمہ کو پاگل کا لقب دے کر خاموش رہنے کی تاکید کی۔

کبھی کبھار نور کو اتنے شدید دورے پڑتے کہ سب پریشان ہوجاتے اس کے منہ سے دلخراش آوازیں نکلتیں، اور کبھی دھواں نکلتا اسد آج گھر میں تھا۔ دورے کی وجہ سے نور بیڈ سے کافی اوپر اچھل رہی تھی اسے سنبھالنا ناممکن ہورہا تھا ڈاکٹر کو بلایا گیا طیب بھی پہنچ گیا نور کی خطرناک حالت سے ڈاکٹر بھی مایوس ہوگیا کیونکہ اس پر کوئی دوا اثر نہیں کررہی تھی۔

اس نازک صورت حال کو دیکھ کر طیب نے نرمی سے اسد کو سمجھایا کہ ”قدرت کے کھیل نرالے ہیں۔ جنات کی موجودگی کا ذکر قرآن مجید میں بھی واضح ہے۔ لہٰذا میرے ساتھ چلو شاہ صاحب انشاء اللہ ہمارا مسئلہ ضرور حل کردیں گے۔“

اسد اپنی ہٹ دھرمی پر قائم رہتے ہوئے بولا۔ ”یار میں کیسے اس ڈھونگی پر یقین کرلوں دیکھو تمہارے سامنے میری نور پڑی ہوئی ہے مگر وہ اسے مردہ قرار دے رہا ہے۔“

طیب زبردستی اسے شاہ صاحب کے پاس لے جانے میں کامیاب ہوگیا۔ شاہ صاحب کسی کتاب کا بغور مطالعہ کرنے میں مصروف تھے، وہ بغیر دیکھے دونوں کو مخاطب کرتے ہوئے بولے۔ ”مجھے یقین تھا کہ تم آؤ گے اور ضرور آؤ گے۔“

طیب نے عاجزانہ لہجے میں ان سے کہا۔ ”براہ مہربانی شاہ صاحب، اسد کے لئے کچھ کریں یہ بہت پریشان ہیں۔“ اور شاہ صاحب کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔

یہ دیکھ کر شاہ صاحب نے زمین پر قدرے بڑا حصار کھینچا ایک تازہ لیموں حصار میں رکھا اور تینوں حصار میں بیٹھ گئے۔ شاہ صاحب نے دونوں کو خبردار کیا کہ ”کسی بھی صورت حصار سے باہر نہیں نکلنا۔“

شاہ صاحب نے اسد سے کہا۔ ”بیٹے دراصل تمہاری بیوی واقعی مرچکی ہے اور جو لڑکی تمہارے گھر میں ہے وہ کون ہے؟ میں آج معمہ کو حل کروں گا اور اس کو ابھی اسی وقت یہاں حاضر کرتا ہوں اگر وہ کوئی غیر مرئی مخلوق ہوئی تو یہ لیموں سرخ ہوجائے گا اگر نہیں تو معاملہ کوئی اور ہے؟“

پھر شاہ صاحب منہ میں کچھ پڑھنے لگے۔ تھوڑی ہی دیر میں وہاں زلزلے اور طوفان کی سی کیفیت پیدا ہوگئی مگر شاہ صاحب پڑھنے میں مصروف رہے، ہر چیز ادھر ادھر بکھرنے لگی اور پڑھا ہوا لیموں سرخ ہوگیا جسے دیکھ کر طیب اور اسد حیران رہ گئے۔

اسی دوران کمرے میں سرخ روشنی پھیل گئی اور روشنی میں سے نور نکل کر سامنے آگئی، آتے ہی غصے سے بولی۔ ”او بڈھے تم نے مجھے یہاں بلا کر اچھا نہیں کیا تم تو کیا تمہارے جیسے سینکڑوں ڈھونگی بھی میرا کچھ

نہیں بگاڑ سکتے۔“

شاہ صاحب سخت لہجے میں بولے۔ ”اب تم یہاں آتو گئی ہو مگر واپس ہرگز نہ جاسکوگی اور کیوں تنگ کر رکھا ہے ان بے گناہ لوگوں کو انہوں نے آخر تمہارا کیا بگاڑا ہے؟“

اس نے جواب دینے کے بجائے منہ سے آگ کے شعلے ان کی طرف پھینکنے شروع کردیئے جو حصار تک پہنچنے سے پہلے ہی ٹھنڈے ہوگئے پھر اس نے بہت سے سانپ پھینکے مگر وہ بھی حصار عبور نہ کرسکے، اس ناکامی سے وہ اور بھپر گئی اور عجیب و غریب منتر پڑھ کر ان کی طرف پھونکنے لگی، مگر شاہ صاحب نے اس کی ساری تدابیر ناکام بناتے ہوئے اس پر کچھ پھونکا تو اس کے جسم پر آگ لگنے لگی تبھی وہ رام ہوگئی اور معافی کی طلبگار ہوگئی کہ ”مجھے چھوڑ دو میں ہمیشہ کے لئے یہاں سے دور چلی جاؤں گی۔“

تو شاہ صاحب غصے سے بولے! ”پہلے ہمیں سچ سچ اپنی حقیقت بتاؤ۔“

تب وہ بولی۔ ”سچ یہ ہے کہ میں نور نہیں ہوں میرا نام ارم ہے۔“

یہ بات سن کر اسد کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔

”میں نے اسد سے سچا پیار کیا تھا اس کا ہر حال میں ساتھ دیا مگر اس نے میرے پیار کا صلہ نہ دیا اور کسی عام سی لڑکی سے شادی رچالی، اسی غم سے نڈھال ہوکر میں نے خودکشی کرلی، میرا ابھی یہ ارادہ نہ تھا کہ میں ان دونوں کو کوئی نقصان پہنچاؤں مگر بدقسمتی سے جس رات میں نے خودکشی کی وہ اماوس کی رات تھی اس رات کسی کالے جادو کے ماہر شیطان نے میری روح پر قبضہ کرلیا اور زبردستی میرے دماغ میں انتقام کا مادہ بھر دیا پھر میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی اپنا انتقام لینا شروع کردیا۔

میں ہر حال میں اسد کو پانا چاہتی تھی مگر نور میرے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ تھی پہلے تو میں نے اپنی طاقت کے زور پر نور سے ایسی حرکات کروائیں کہ اسد کو اس سے نفرت ہوجائے مگر جب یہ تدبیر بھی ناکام ہوگئی تو میں نے اس کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا تاکہ اسد میرے پیار کا دم بھرنے لگے۔ پھر ایک رات جب نور کو زچگی کے سلسلے میں اسپتال لایا گیا تو مجھے سنہری موقع مل گیا، میں نے اس کو بچے سمیت ختم کر ڈالا اور اس کے جسم پر قبضہ کرکے نور بن گئی۔

مجھے ایسے لگا جیسے صدیوں کی محنت کا پھل مل گیا ہو۔ مگر اسد نے پھر بھی میری قدر نہیں کی میں اپنی جنسی پیاس بجھانا چاہتی تھی مگر اس نے میری پیاس نہ بجھائی میں نے کئی تراکیب آزمائیں مگر اسد میرا نہ ہوسکا۔“

شاہ صاحب غصے سے بولے! ”تم نے جو گناہ کیا ہے اس کی سنگین سزا ضرور ملے گی، تم نے ایک بے قصور لڑکی اور معصوم جان جو کہ ابھی اس دنیا میں بھی نہیں آپائی قتل کر ڈالا، آخرت میں تو تمہاری سزا آگ ہے مگر یہاں بھی عبرتناک سزا ملے گی۔“

وہ گڑگڑانے لگی، منتیں کرنے اور معافیاں مانگنے لگی مگر شاہ صاحب نے کرخت اور رعب دار آواز میں کہا۔ ”چھوڑ دو نور کا جسم تاکہ پاک سے پلید الگ ہوجائے۔“

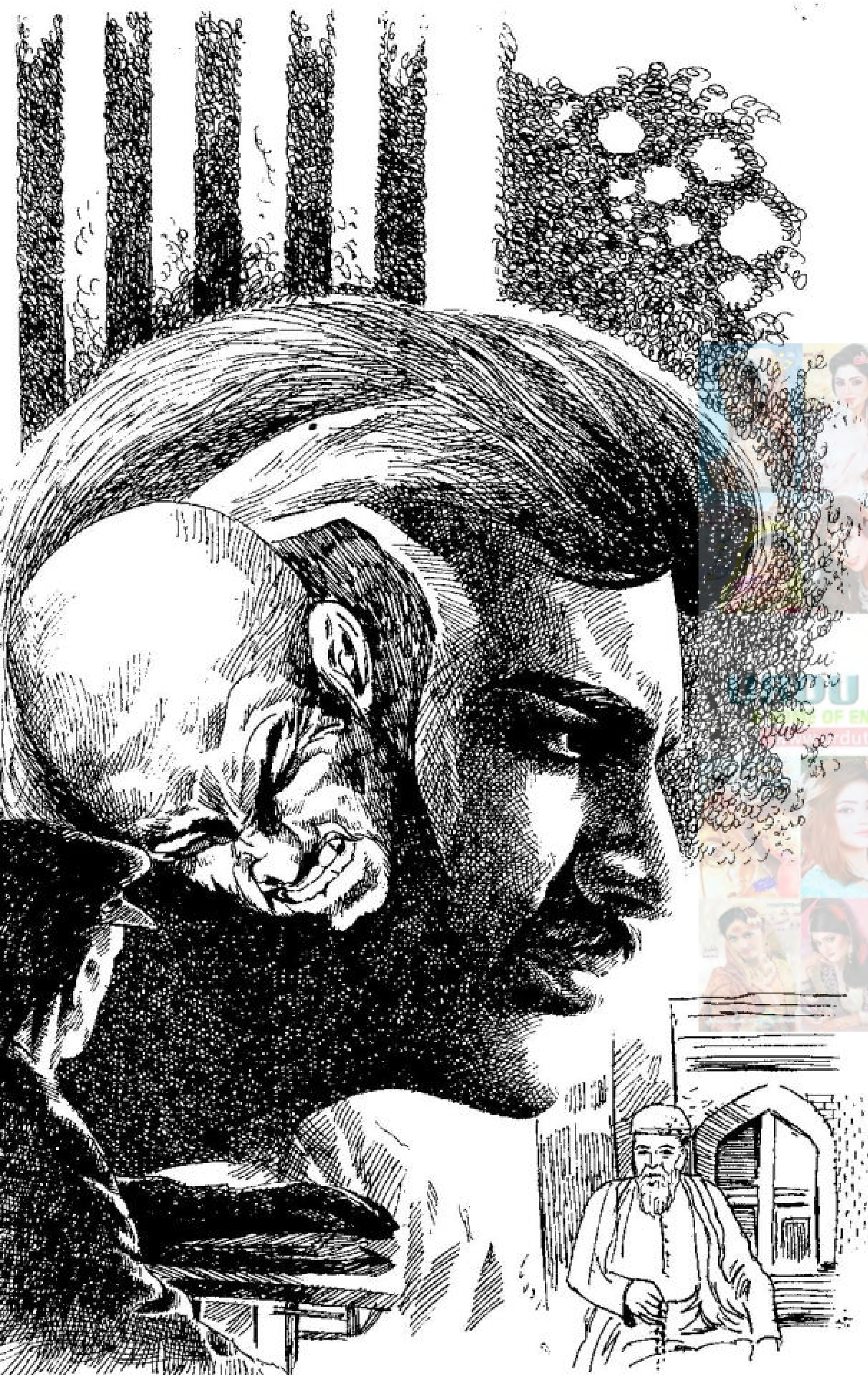
وہ فوراً نور کے جسم سے نکل گئی اور نور کا مردہ دھڑ زمین پر آن گرا۔

اسد نے دیکھا کہ نور کے جسم سے نکلنے والی روح واقعی ارم کی تھی جو کہ اب بھی اسے پیار بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی مگر اسد کے دل میں اس کے لئے صرف نفرت تھی۔

وہ نور کے مردہ وجود سے لپٹ کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگا، اس کا سب کچھ لٹ چکا تھا اس کی حالت دیکھ کر طیب اور شاہ صاحب بھی رنجیدہ ہوگئے۔

پھر شاہ صاحب نے ارم کی روح کو ایک چھوٹی سی شیشی میں قید کرکے اپنے پاس رکھ لیا اور اسد کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”جو ہونا تھا وہ ہوگیا اب نور بیٹی کی پاک روح کو سکون دینے کے لئے باقاعدہ اس کا نماز جنازہ پڑھانے اور دفن کرنے کا انتظام کرو...... اللہ تعالیٰ تمہیں صبر جمیل اور نور کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔“





جان لیوا

راشد نذیر طاہر

قسط نمبر:9

برس ہا برس سے پراسرار قوتوں کو مسخر کرنے کے لئے سرگرداں انسانوں کی پراسرار ہولناک داستان حیرت، قدم قدم پر سحر جادو اور عملیات کی حیرت انگیز مناظر پڑھنے والوں کو انگشت بدنداں کرکے اچنبھے میں ڈال دیں گے، ایک بالکل نئے طرز کی حیرت ناک دلوں پر دہشت طاری کرتی کہانی۔

ایک نادیدہ اور پراسرار ہستی کی ہولناک روداد دلوں کی دھڑکنیں تیز کرنے والا سلسلہ

میں کسی پتھر کے بنے ہوئے بت کی طرح رحیم بابا کو دیکھ رہا تھا۔

پھر میں نے بمشکل اتنا کہا۔

''میں آپ کی بات سمجھ نہیں پا رہا......!!''

''بات دراصل یہ ہے کہ جان لیوا کی تمہارے خاندان سے جو بھی دشمنی رہی ہے، لیکن وہ تمہارا ہمدرد ہے......اور وہ تمہاری مدد کرنا چاہتا ہے......!!''

''یہ کس طرح ممکن ہے رحیم بابا؟'' میں نے حیرت سے کہا۔ ''اس نے ہمیشہ اور ہر موڑ پر مجھے دھوکا ہی دیا ہے......میرے لئے اس کے پاس سوائے دھوکہ بازی کے اور کچھ بھی نہیں ہے۔''

''میرا خیال ہے کہ......'' رحیم بابا کہتے کہتے رکے اور پھر مسکرا کے بولے۔ ''تمہارا یہ خیال غلط ہے......!!''

''آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں؟''

''وہ خود تمہارے ساتھ نہیں ہے، لیکن اس کے موکل مسلسل تمہارے ساتھ لگے رہتے ہیں......اور ان کا کام صرف تمہاری خدمت گزاری کرنا ہے...... انہیں جان لیوا نے ہی تمہارے لئے مختص کیا ہے......!!''

''اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ میں آج بھی جان لیوا کے رحم و کرم پر ہوں۔'' میرا لہجہ عجیب سا ہو گیا: ''اور اب تک جن معاملات کو میں نے نمٹایا ہے، اس میں میری کوئی بھی کارکردگی شامل نہیں ہے......؟''

رحیم بابا خاموش تھے...... شاید اس سوال کا جواب ان کے پاس بھی نہیں تھا۔

میں انہیں غور سے دیکھ رہا تھا اور وہ ننگے فرش پر جیسے کوئی کھوئی ہوئی سوئی تلاش کر رہے تھے۔

''رحیم بابا......!!'' دفعتاً میں نے انہیں پکارا۔

''آں......!!'' چوہ چونکے: ''ہاں...... بولو؟''

''میں جان لیوا سے نجات حاصل کرنا چاہتا ہوں......!! کیا آپ اس سلسلے میں میری مدد کریں گے؟''

''ہاں...... ضرور...... جہاں تک ممکن ہوا......!!''

''ٹھیک ہے......!!'' میں نے سر ہلایا۔ ''اب یہ بتائیں کہ کیا آپ یہ بات ثابت کر سکتے ہیں کہ جان لیوا مسلسل میری مدد کر رہا ہے؟''

''نہیں......!!'' ان کے منہ سے نکلا۔

''ٹھیک ہے......تو پھر میں اس بات کو نہیں مانتا......!!'' میں اطمینان سے بولا۔ ''کیونکہ اگر یہ بات

سچ ہے، تو خود جان لیوا کو سامنے آنا پڑے گا اور وہ خود یہ ثابت کرے گا کہ میں اصل میں خود کچھ بھی نہیں ہوں......!!"

"یہ تو خود اسی کی مرضی پر منحصر ہے۔" وہ طویل سانس لے کر بولے: "میں تو اس سلسلے میں کچھ نہیں کرسکتا......!!"

"ٹھیک ہے......!!" میں کچھ سوچ کر بولا۔ "یہ حقیقت ہے یا پھر دروغ گوئی...... میں جان لیوا سے مقابلے کے لئے دن بدن خود کو مضبوط کرتا رہوں گا......!!! اور مجھے بھروسہ ہے کہ ایک دن اس کی وادیٔ طلسم میرے قدموں کے نیچے ہوگی......!!!"

☆......☆......☆

شاموراور اس کے کرتوتوں کا معمہ اس کی موت کی صورت میں عقدۂ لاینحل ثابت ہوچکا تھا......!!! وہ کون تھا......؟ کیا تھا......؟ کیا واقعی شیطان کا پجاری تھا......؟

اس نے حیرت انگیز طور پر پلک جھپکتے میں زہر کھا کر میرے خیالوں میں خود کو امر کرلیا تھا......!!

میں اسے کیسے بھول سکتا تھا......؟ ایک اچھا خاصا انسان بے وجہ ہی خود کو موت کے حوالے کردے تو اسے بھول جانا محض ذہنی فعل ثابت ہوسکتا ہے......اسے خود سے بھول جانا تو ممکن نہیں ہوسکتا تھا...... وہ نہ صرف خود پر منوں مٹی ڈال گیا تھا، بلکہ ان کو بھی اس نے ہمیشہ کے لئے صفحۂ ہستی سے مٹا دیا تھا کہ جنہیں وہ قتل کیا کرتا تھا......!!

جبران نے اسی سلسلے کا ایک اور کیس میرے حوالے کیا تھا، یعنی کنور شہریار نامی کسی شخص کے بارے میں اسے شک تھا کہ وہ خالص شیطان کا پیروکار ہے......اور اب مجھے یہ بات منظر عام پر لانی تھی، یعنی یہ ذمہ داری جبران نے مجھے سونپ دی تھی......!!

کنور شہریار کون تھا......؟ کہاں رہتا تھا اور کس ٹائپ کا بندہ تھا......!! یہ تمام معلومات تو جبران سے حاصل ہوسکتی تھیں......!! لیکن یہ معاملہ غور طلب تھا کہ اس تک شک رسائی کس طرح حاصل ہو......؟؟

میں نے جبران سے ایک بار پھر رابطہ کیا تھا:

"ہاں بھئی......!! سناؤ کیا حال ہے......؟"

جبران اپنے مخصوص انداز میں بولا تھا۔

اس نے ٹرانس میٹر مستقل طور پر مجھے ہی دے دیا تھا۔

"میں تو بالکل ٹھیک ہوں...... بس یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ ان کنور صاحب تک کیسے رسائی حاصل ہوگی......؟"

"کیا تمہارے لئے یہ کام مشکل ہوگا......؟"

جبران نے پوچھا تھا۔

"میں کچھ کہہ نہیں سکتا......!!"

"ٹھیک ہے......!!" جبران نے ذرا توقف کیا اور پھر بولا۔ "میرے ذہن میں ایک خیال آرہا ہے......!!"

"اچھا...... بتائیں......!!"

"سنو......!! شہر کے ایک پرسکون علاقے میں ایک کلب ہے...... اس کلب کا نام بلیک آئرن ہے......!! کنور اس کلب کا مستقل ممبر ہے......!! اگر تم براہ راست اس سے نہ ملنا چاہو تو اس کلب کے ذریعے کنور تک رسائی حاصل کرسکتے ہو......!!"

"وہ کس طرح؟" میرے منہ سے نکلا۔

"یہ تمہارا کام ہے......" جبران نے جواب دیا: "کیا تم بستی کی انٹری بھول گئے۔"

"وہ میرا کمال نہیں تھا......!!" میں نے بتایا: "یہ سب کچھ میرے ایک دوست سدو کا کمال تھا......!! جو اس مہم میں آخری دن تک میرے ساتھ رہا تھا۔"

"ہاں......!! میں جانتا ہوں۔" جبران کی آواز آئی: "چاہو تو اسے بھی ساتھ رکھ سکتے ہو...... ہوسکتا ہے کہ اس کی شوخ طبیعت کوئی رنگ دکھادے......!!!"

"یہ ٹھیک رہے گا......!!!"

"اوکے......!!! اوور اینڈ آل......!!"

☆......☆......☆

سدو نے اپنی آنکھوں کو چندھیالیا، ہونٹ سکیڑ لئے اور پھر ٹھوڑی کو کھجاتے ہوئے بولا۔

"پروگرام بھی کافی زبردست لگ رہا ہے......!!! لیکن......!"

"لیکن کیا......؟" میں نے اسے گھورا۔

"اس بار گھر سے نکال دیئے جانے کا خطرہ لاحق ہے......!!"

"کیا مطلب......؟"

"جب بستی سے ہماری واپسی ہوئی تھی، تو میں بڑی مشکل سے گھر میں گھس سکا تھا۔" اس نے عجیب صورت بنائی: "والدہ محترمہ نے تو آرڈیننس جاری کردیا تھا کہ اب اس گھر میں قدم مت رکھنا۔"

"پھر......؟"

"سوچ تو میں نے بھی لیا تھا......!!"

"تم نے کیا سوچا تھا؟"

"میں نے سوچا کہ بستی واپس چلا جاؤں۔" وہ سنجیدگی کے عالم میں بولا۔ "کیا برا تھا؟ فری فنڈ میں گھر ہی مل جاتا......!!"

"تو چلے جاؤ......" میں مسکرایا: "بولو...... بات کروں؟"

"میں خود بھی یہ کام کرسکتا ہوں۔" اس نے مجھے گھورا: "جبران صاحب کے اب تم ہی سگے نہیں ہو......!!"

"اوہو......!! بڑے اونچے اڑ رہے ہو......!!"

"ہاں تو......!!" وہ میرا جملہ نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ "میں صرف یہ سوچ کر رک گیا کہ کیا وہاں اکیلے میں ٹکریں ماروں گا......؟ تنہائی تو مار ڈالے گی مجھے......!!"

"یہ کوئی مسئلہ نہیں تھا۔" میں نے جواب دیا: "بالے سے کہہ کر میں تمہاری کسی بستی کی لڑکی سے بیاہ کروادوں گا......!!"

"تم میرے دوست ہو یا دشمن؟" اس نے مجھے گھورا۔

میں ہنس پڑا اور بولا:

"کیوں......؟ کیا ہوا؟"

"والدہ صاحبہ مجھے زندہ درگور کردیں گی......"

اس نے بتایا: "میں تو خود اپنا پرانا والا رومانس اتنی مشکل سے چلا رہا ہوں کہ بس پوچھو مت......!!"

"کیوں؟ کیا ہوا؟

"ابھی تک والدہ کو پتا نہیں ہے کہ میں پچھلی گلی میں رہنے والی مہک سے پیار کرتا ہوں اور وہ بھی مجھ پر مرتی ہے......البتہ اگر انہیں اس لواسٹوری کا پتا چل گیا تو وہ مجھے اتنا پیٹیں گی کہ میری موت واقع ہوسکتی ہے......مہک تو صرف مجھ پر مر کے رہ جاتی ہے، لیکن میرا تو پورے کا پورا جنازہ ہی اٹھ جائے گا......!!"

میں ہنس پڑا، وہ میری طرف غصے سے دیکھتا ہوا بولا:

"میرا مذاق اڑا رہے ہو؟"

"بالکل نہیں یار......!!" میں نے فوراً کہا: "یہ تو غم کی ہنسی ہے......!!"

"غم کی ہنسی؟" سدو نے آنکھیں نکالیں: "تم نے خوشی کے آنسوؤں کے مقابلے پر اس کا الٹ ایجاد کردیا......؟ بے چارے آنسو کیا سوچیں گے!!"

"بس میرے منہ سے نکل گیا......!!" میں مسکرایا: "کبھی کبھی خود بہ خود ہی کچھ خاص ہوجاتا ہے......خیر چھوڑو...... یہ بتاؤ کہ خالہ کو مہک میں کیا برائی نظر آتی ہے؟"

"کچھ بھی نہیں...... مہک تو بے چاری بہت سیدھی ہے......اصل مسئلہ اس کی ماں یعنی میری ساس کا ہے، جن سے والدہ کی بنتی ہی نہیں ہے اور یہ میری پریمی کہانی کا سب سے دردناک کلائمکس ہے......"

"میں بات کروں گا خالہ سے......!!"

"سچ......؟؟" سدو کی باچھیں کھل اٹھیں۔

"ہاں......!!"

"اچھا...... تو پھر سنو......!!" وہ جوش میں بھر گیا: "اب یہ بتاؤ کہ اس نئے پروگرام کی ابتداء کب سے ہو رہی ہے......؟"

’’کلب والے پروگرام کی؟‘‘

’’ہاں......!!‘‘

’’جلد سے جلد......!!‘‘

’’ٹھیک ہے......تو پھر کل شام دونوں ساتھ ہی کلب چلیں گے......!! کیا آپ کو اس آدمی کی کوئی تصویر وغیرہ دی ہے جبران صاحب نے؟‘‘

☆......☆......☆

شہر کے ایک پرسکون علاقے میں یہ کلب بنیادی طور پر ان لوگوں کے لئے تھا، جو شہر کی بھیڑ بھاڑ سے تنگ آ کر کچھ دیر ذہنی سکون حاصل کرنا چاہتے ہیں......!!

یہی وجہ تھی کہ جوانوں کے مقابلے میں یہاں اکثریت ادھیڑ عمر لوگوں کی دکھائی دے رہی تھی، گو کہ جواں سال وجود بھی اس کلب کا حصہ تھے، لیکن ان کی تعداد کم تھی......!!

وسیع احاطے میں پھیلا ہوا یہ کلب مجھے بھی بہت پسند آیا، اور میرا خیال تھا کہ یہاں ادب سے لگاؤ رکھنے والے لوگوں کا رجحان زیادہ تھا۔

یہاں خوب صورت سالان تھا، کیفے ٹیریا تھا اور ایک بڑے سے ہال میں دنیا بھر سے منتخب شدہ ادبی کتابوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے......!!!

کلب کے لان میں کچھ جوڑے بھی ’’رومانس زدہ‘‘ دکھائی دیئے......ان کے ہاتھوں میں کافی کے کپ تھے اور بات بات پر فضاء میں نقرئی قہقہے گونجتے ہوئے سنائی دے رہے تھے......!!

میں سدو کے ساتھ کیفے ٹیریا سے چائے کے کپ لیتے ہوئے لان میں ہی آ کر بیٹھ گیا......!!

درختوں کی چھاؤں میں کیاریوں سے اٹھنے والی پھولوں کی مہکار سے فضاء میں واقعی عشق و محبت کی بیلیں منڈھے چڑھتے ہوئے محسوس ہو رہی تھیں......!!

نہ جانے کیوں اس وقت مجھے شالا یاد آ گئی...... وہ میری پہلی محبت تھی اور تھی بھی کتنی عجیب کہ دنیا میں اس کا وجود ہی نہیں تھا۔

جان لیوا نے اس کا روپ دھار کر میری محبت کا مذاق اڑایا تھا......کاش......کاش شالا زندہ ہوتی......!!!

اسی اثناء میں مجھے سدو نے ٹوکا:

’’کہاں کھوئے ہوئے ہو؟‘‘

’’کہیں نہیں......!!‘‘ میں نے طویل سانس لی۔

’’تمہارے چاروں طرف اتنے حسین نظارے بکھرے ہوئے ہیں اور تم یادوں کے دشت میں ٹھوکریں کھا رہے ہو......!!‘‘

’’کیا مطلب......؟‘‘ میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے چاروں طرف دیکھا اور پھر اس کی بات میری سمجھ میں آ گئی......!!

یہ شاید کالج کی لڑکیوں کا گروپ تھا، ان کی تعداد چار تھی اور ان کے ہاتھوں میں رجسٹرڈ وغیرہ دکھائی دے رہے تھے......!!!

میں نے دیکھا، ان میں سے ایک لڑکی بے حد حسین تھی، مجھے ایسا بھی گمان ہوا جیسے وہ مجھے بار بار دیکھ رہی ہو......!!!

دوسری طرف سدو کسی کو بھی معاف کر دینے کے لئے تیار نہیں تھا، اس کی آنکھیں چاروں طرف گردش کر رہی تھیں۔

پھر اس نے میری نگاہوں کا تعاقب کیا اور بولا۔

’’زبردست......!! یہ تو پارٹی آئٹم ہے استاد......!! واہ...... کیا نظریں ہیں میرے دوست کی......!!!‘‘

’’فالتو بکواس مت کرو......!!‘‘ میں نے اسے ڈانٹا اور سنبھل کر بیٹھ گیا۔

لیکن میں محسوس کر رہا تھا کہ وہ لڑکی اب بھی میری طرف ہی متوجہ تھی......!!!

’’یار...... کسی کو تو دل میں بسانا ہے نا......؟‘‘ سدو نے کہنی ماری: ’’اسی کو ہماری بھابھی بنا ڈالو...... بہت حسین ہے، یوں لگ رہا ہے جیسے یہ ماڈلنگ کرتی

ہوگی......بولو......بات کروں......؟‘‘

’’تم سے کچھ بعید بھی نہیں ہے۔‘‘ میں نے منہ بنایا: ’’ویسے ہی رال ٹپکاتے پھرتے ہو......!!!‘‘

’’یہی زندگی ہے میری جان......!!‘‘ اس نے سرد آہ بھری: ’’مر کے مٹی ہو جانا ہے، تو پھر کیوں نا دنیا کے حسن کو اپنی آنکھوں میں بسا کر مریں......!!‘‘

عین اسی وقت صدر دروازے پر میری نظر پڑی اور میں نے سدو کے کان میں سرگوشی کی:

’’وہ آ رہا ہے...... جس کی وجہ سے ہم یہاں دکھائی دے رہے ہیں......!!‘‘

’’کون؟ کنور شہریار......؟‘‘

’’ہاں......!!‘‘ میں نے مختصر جواب دیا اور آنے والے پر نگاہیں جما دیں۔

جبران مجھے اس کی تصویر فراہم کر چکا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے اسے پہچان لیا تھا۔

یہ حقیقت تھی کہ وہ بے حد پروقار شخصیت کا مالک تھا، اپنی تصویر کے مقابلے میں اور بھی وجیہہ نظر آ رہا تھا......ادھیڑ عمر ہونے کے باوجود اس کا جسم مضبوط اور توانا دکھائی دے رہا تھا۔

اس کی آنکھوں پر نظر کا چشمہ لگا ہوا تھا...... وہ نپے تلے انداز میں قدم اٹھاتا ہوا کلب کے اندرونی حصے کی جا رہا تھا......!!!

میں نے الوداعی انداز میں اسی لڑکی کی طرف دیکھا اور اٹھ کھڑا ہوا: ’’چلو سدو......!!‘‘

’’کہاں......!!‘‘

’’بھول گئے کہ ہم یہاں کیوں آئے تھے؟‘‘

’’نہیں......!!‘‘ سدو بولا: ’’لیکن اٹھنے کو دل نہیں چاہ رہا......!!‘‘

’’ٹھیک ہے......!!‘‘ میں نے سر ہلایا: ’’تم یہاں رکو......!! میں ذرا ان صاحب کا جائزہ لے کر آتا ہوں......!!‘‘

اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر میں نے قدم آگے بڑھا دیئے......!! لان کی روش سے گزرنے کے بعد میں ریسٹ روم کی طرف آ گیا......!!

یہاں لوگ مختلف قسم کے مشغلوں میں مصروف تھے......!! کرسیوں اور میزوں کے درمیان کہیں تاش کے پتے بٹ رہے تھے، تو کہیں شطرنج کی بازی بچھی ہوئی تھی......!!

اسی کمرے کے ایک کونے میں اسنوکر بھی موجود تھا، جہاں مجھے کنور شہریار ایک طرف کھڑا ہوا دکھائی دیا......!!!

کھیل جاری تھا اور وہ بڑی دلچسپی سے اسے دیکھنے میں مصروف تھا، اس کی آنکھوں میں دلچسپی کا عنصر چمکتا ہوا دکھائی دیا......!!!

میں قریب ہی ایک میز کے گرد کرسی سنبھال کر بیٹھ گیا...... جلد ہی بازی ختم ہوئی، تو کنور شہریار نے ہارنے والے کی جگہ سنبھال لی اور خود میدان میں اتر گیا......!!!

شاید وہ اس کھیل میں کافی مشاق تھا......!! کیونکہ اردگرد کھڑے ہوئے تماش بین صاف ستھرے انداز میں اسے داد دے رہے تھے......!!

وہ بہت جم کر کھڑا تھا، جلد ہی مقابل اپنے ہتھے سے اکھڑتا نظر آیا اور کنور شہریار نے اسے چاروں خانے چت کر دیا......!!!

اسی وقت ایک اور شخص آگے بڑھا اور بولا:

’’کنور صاحب......!! ایک بازی ہم سے بھی ہو جائے؟‘‘

’’اب نہیں بھئی......‘‘ کنور دلآویزانہ انداز میں مسکرایا: ’’ہاں اگر تاش سے شغف ہے تو...... خوش آمدید......!!‘‘

وہ شخص مسکرا کر پیچھے ہو گیا......!! کنور شہریار اب ایک میز کی طرف بڑھا، جو کہ خالی تھی اور اس پر تاش کے پتے رکھے ہوئے تھے......!!!

جلد ہی وہاں بھی کنور شہریار کے گرد جمگھٹا لگا ہوا دکھائی دیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ اپنی شخصیت کے اعتبار سے بھی شاید لوگوں کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔

یہ حقیقت تھی کہ اس شخص میں کافی کشش تھی، اور اس میں اضافہ اس مسکراہٹ سے ہوجاتا تھا، جو تقریباً ہمہ وقت اس کے ہونٹوں سے کھیلتی رہتی تھی......!!

اب میں سوچ میں ڈوبا ہوا تھا کہ کس طرح کنور سے شناسائی پیدا کروں......!!! کیونکہ مجھے جن کھیلوں کا تجربہ تھا، ان سے تو کنور کو قطعی کوئی دلچسپی نہیں ہوسکتی تھی......!!!

بہرحال میں بے وقوفوں کی طرح نہ جانے کتنی دیر وہاں بیٹھا رہا، اسی اثناء میں سدو بھی وہاں نازل ہوگیا:

''ابے یار......!!'' اس نے ماحول کو دیکھتے ہوئے دھیمے لہجے میں کہا؟ ''تم تو چپک کر ہی رہ گئے......!!''

''تو پھر کیا کروں......؟'' میں نے طویل سانس لی: ''اب وہ حضرت تاش سے شغل کررہے ہیں......!!''

''غرق کرواسے......!!'' سدو منہ بنا کر بولا:

''یہ لو کارڈ......تمہاری تو لاٹری کھل گئی ہے......!!''

یہ کہہ کر اس نے سفید رنگ کا ایک سادہ سا کارڈ میری طرف بڑھادیا۔

میں نے دیکھا، یہ کسی لینگویج انسٹی ٹیوٹ کا کارڈ تھا......!!

''یہ کیا ہے......؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''یہ وہی خوب صورت والی لڑکی گرا کر گئی ہے......!! سدو مسکرایا: ''خود بار بار تمہاری طرف دیکھ رہی تھی اور تم بھی اس میں کافی ظم دکھائی دے رہے تھے......!!''

''گرا کے گئی ہے؟'' میں نے سدو کو گھورا: ''کیا اس نے بولا تھا کہ میں یہ کارڈ گرا کر جارہی ہوں......!!''

''میرے قریب سے گزرتے وقت ہی کیوں گرایا پھر......؟'' سدو نے جرح کی۔

''اوہ......'' میرے منہ سے نکلا۔

''جی جناب......!!'' سدو نے سر ہلایا:

''تمہارے اٹھ کر چلے جانے کے بعد ہی میں نے اسے بے چین دیکھا، وہ بار بار اسی طرف دیکھے جارہی تھی، شاید تمہاری واپسی کی منتظر تھی، لیکن تم تو یہاں کنور صاحب کی پورٹریٹ بنارہے تھے شاید......!!!''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ کنور شہریار اب بھی تاش کے پتوں میں مست تھا......!!!

پھر سدو خود ہی بولا:

''کیا تم یہاں کنور کے گھنٹے گن رہے ہو......؟''

''پھر......کیا کروں......؟''

''باہر تو نکلو......!!'' سدو نے منہ بنایا:

''چلو......چائے پیتے ہیں......!!'' ایک بار پھر ہم کیفے ٹیریا کی طرف نکل آئے۔

''کنور صاحب کو فی الحال غرق کرو......!!'' سدو نے کہا۔ ''اور اس لڑکی سے کسی طرح رابطہ کرو......!! مجھے بھی وہ پہلی نظر میں ہی بھاگئی ہے......!!''

''مطلب......؟''

''تمہارے لئے یار......!!'' سدو نے جلدی سے بات پوری کی۔

''وہ واقعی اچھی تھی......!! لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں اس کے پیچھے دم ہلانے لگوں......!!''

''تو کیا تم نے آج تک مجھ سے اپنی دم چھپا کر رکھی تھی......؟'' سدو کے لہجے میں حیرت تھی: ''مجھے تمہاری یہ خوبی معلوم ہی نہ ہوسکی......!!''

میں نے اس کی کمر پر ایک ہلکی سی دھپ رسید کردی۔

☆......☆......☆

دوسرے دن صبح ہی صبح اچانک جبران کی کال آگئی۔

وہ آج کافی خوش گوار موڈ میں دکھائی دیا:

''ہیلو بھئی......!! کیا حال ہیں؟''

''میں ٹھیک ہوں......!! آپ سنائیں......!!''

''فرسٹ کلاس......!! اور سناؤ کنور شہریار کا

معاملہ کچھ بنا......؟''

''نہیں جناب......!!'' میں نے بتایا: ''کل میں شام سے کلب میں ہی تھا، لیکن وقت کے ضیاع کے علاوہ اور کچھ نہ ہوسکا......!!''

''چلو......! اس میں بھی کوئی حکمت رہی ہوگی......!!'' اس کی آواز آئی: ''اور آج تمہارے لئے ایک نئی اور دلچسپ خبر ہے......!!''

''کون سی خبر......؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''خبر کہاں ہوتی ہے......؟'' اس نے الٹا سوال کیا۔

''اخبار میں......!!''

''بس......تو پھر فوراً ہی روزنامہ شب روز منگواؤ اور اس میں وہ خبر ڈھونڈ کر نکالو......!!''

''لیکن مجھے کیسے معلوم ہوگا؟ اخبار میں تو ہزاروں خبریں ہوتی ہیں۔''

''اب اتنا امتحان تو تمہارا لینا ہی پڑے گا......!!'' جبران ہنس کر بولا۔ ''تھوڑی سی محنت کروگے اور دماغ لڑاؤ گے تو وہ چیز خود ہی تمہارے سامنے آجائے گی۔''

''اچھا......میں دیکھ لیتا ہوں۔''

''میں ایک آسانی کرسکتا ہوں۔'' جبران کی آواز آئی۔

''جی......بولیں......!!!''

''تم اس سلسلے میں اپنے دوست کی مدد لے سکتے ہو......!!''

''سدو کی؟''

''ہاں......!!''

''یہ ٹھیک ہے۔'' میں جلدی سے بولا۔ ''میں اخبار بھی اسی سے منگوالیتا ہوں......!!''

اور پھر جلد ہی میں نے سدو سے رابطہ کیا تھا، گو کہ قاسم ماموں کے گھر میں آنے کے بعد فاصلہ بڑھ گیا تھا، لیکن اب حویلی کی طرف اپنے پرانے محلے میں اس کے سوا اور تھا بھی کون میرا......؟''

میں نے رحیم بابا کو مختصراً آگاہ کیا تھا اور پھر آدھے گھنٹے بعد ہی میں اور سدو ایک چائے کے ہوٹل میں اخبار پھیلائے بیٹھے تھے......!! اس کوشش میں دونوں کے سر گویا آپس میں جڑ کے رہ گئے تھے۔

''اس میں ڈھونڈنا کیا ہے......؟'' سدو نے اخبار کھولتے ہوئے پوچھا۔

''اگر مجھے یہ بات معلوم ہوتی تو تمہیں کیوں تکلیف دیتا......؟'' میں نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

اسی وقت ویٹر نے چائے لا کر میز پر رکھ دی۔

تھوڑی دیر بعد سدو نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

''لگتا ہے جبران کو تم سے زیادہ میری صلاحیتوں پر بھروسہ ہے۔''

میری ہنسی نکل گئی، پھر میں نے سنجیدہ ہونے کی کوشش کرتے ہوئے سر ہلایا:

''بالکل......!!! اگر تم نہ ہوتے، تو بستی خالی نہ ہوتی......!!!''

''اس میں تو کوئی شک نہیں......ارے......''

دفعتاً وہ بولتے بولتے چونک اٹھا۔ اس کی نظریں اخبار کے ایک کونے پر جمی ہوئی تھیں۔

''کیا ہوا؟'' میں نے اسے دیکھا۔

''یہ لو......!!'' اس نے اخبار میری طرف بڑھایا۔

یہ ایک چھوٹا سا اشتہار تھا، میں نے سرخی پر نظر ڈالی اور سنبھل کر بیٹھ گیا۔ لکھا تھا:

''محنتی اور چاک و چوبند ملازمین کی ضرورت ہے، رہائش کا بھی معقول انتظام ہے۔

منجانب: کنور شہریار

مکان نمبر 318، پارک روڈ......ٹاور ٹاؤن

میں نے اشتہار پڑھنے کے بعد خالی خالی آنکھوں سے سدو کی طرف دیکھا:

''کیا ہوا؟ ایسے کیوں دیکھ رہے ہو؟'' وہ شرمانے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے بولا۔

"تم گدھے ضرور ہو......!! لیکن اس میں تھوڑی کسر ضرور ہے......!!"

"دیکھ لو......!!" اس نے فخریہ لہجے میں کہا: "اور اب کنور صاحب کے گھر میں گھسنے کا اس سے اچھا موقع نہیں ملے گا......!!!!"

"تو کیا یہ ضروری ہے کہ وہ ہمیں ہی نوکری پر رکھ لیں؟"

"نہیں......!!" سدو نے نفی میں سر ہلایا: "لیکن کچھ ایسا ضرور ثابت کرنا ہوگا کہ وہ ہمیں رکھنے پر مجبور ہو جائے......!!!"

"یہ کیسے ممکن ہے......؟" میں نے بے ساختہ پوچھا۔

"اب یہ سوچنا تمہارا کام ہے......!!" سدو نے طویل سانس لے کر کہا: "کل گیارہ بجے انٹرویو ہے......!!! کچھ ایسا کر کے دکھاؤ کہ کنور صاحب تمہارا انتخاب کر لیں۔"

☆......☆......☆

کنور صاحب کا عالی شان گھر دیکھ کر مجھے اپنی حویلی یاد آ گئی۔

یوں محسوس ہو رہا تھا، جیسے کنور صاحب نے کسی قدیم طرز کی عمارت کو خرید کر اس پر صرف رنگ و روغن کروایا ہو......!!!

البتہ اسے نئی طرز پر ڈھالنے کے بعد کنور صاحب کی امارت ضرور اس کی دیواروں سے چھلک رہی تھی......!!!

پائیں باغ اتنا خوب صورت تھا کہ اس پر نظریں پڑتے ہی آنکھیں گویا چکاچوند ہو جاتی تھیں......!!!

درمیان میں لگا ہوا فوارہ اس طرز پر لگا ہوا تھا کہ دن کے وقت بھی اس سے قوس و قزح پھوٹتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

انٹرویو کے لئے آنے والوں کی تعداد زیادہ نہیں تھی، آج میرے ساتھ سدو نہیں تھا......!! اسے رات میں ہی شہر سے جانا پڑا تھا کیونکہ ساتھ والے شہر میں اس کی سگی پھوپھی کا انتقال ہو گیا تھا......!!!

اب مجھے تنہا ہی اس معاملے کو دیکھنا تھا، جس کی صرف سن گن ہی مجھے مل سکتی تھی......!!!

میں محسوس کر رہا تھا کہ اپنی وجاہت اور نپے تلے انداز کی بنا پر میں باقی لوگوں میں نمایاں ہی دکھائی دے رہا تھا۔

ہمیں ایک کمرے کے سامنے بیٹھا دیا گیا تھا...... باری باری سب کو اندر بلایا جا رہا تھا اور پھر اسی کمرے کی دوسری طرف سے اسے خارجی راستے سے باہر نکال دیا جاتا تھا۔

یہ انٹرویو زیادہ طویل نہیں تھا، چنانچہ جلد ہی میری بھی باری آ گئی......!!

دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا، تو کمرہ جگ مگ ہوتا دکھائی دیا، یہ آفس نما قدرے کشادہ کمرہ تھا، جس میں چند کرسیاں اور سرے کے قریب ایک درمیانے سائز کی میز رکھی ہوئی تھی۔

اسی میز کے عقب میں آرام دہ کرسی پر جو شخص موجود تھا، وہ میرے لئے قطعی انجان تھا۔

میں تو سمجھا تھا کہ یہاں کنور صاحب سے ملاقات ہوگی۔ لیکن جو کچھ ہوا وہ میری سوچ کے برعکس تھا۔

گندمی رنگت کے مالک اس دبلے پتلے مگر لمبے قد کے آدمی نے بہ غور مجھے دیکھا، پھر اپنے سامنے موجود ڈائری پر مختصر سا کچھ لکھا اور پھر اس کی آواز گونجی:

"بیٹھو......!!"

"جی......!!" یہ کہہ کر میں اس کے سامنے کرسی پر براجمان ہو گیا۔

"نام کیا ہے تمہارا؟"

"شکیل......!!"

"ہوں......!! رہائش؟"

"بس...... جہاں سر چھپانے کو چھت مل جائے......!!" میں طویل سانس لے کر بولا۔

"مطلب......؟" وہ جیسے سنبھل کر بیٹھ گیا۔

"نہ ماں باپ رہے اور نہ ہی پرکھوں سے کچھ ملا...... یہی وجہ ہے کہ گاؤں کی زندگی کو خیرباد کہہ کر میں نے شہر کا رخ کیا......!! کچھ پڑھا لکھا بھی ہوں...... بس نوکری ایسی ڈھونڈتا ہوں کہ جس میں وہاں رہائش بھی کر سکوں۔"

"اگر ابھی تم فارغ ہو، تو پھر کہاں رہتے ہو؟"

اس نے غور سے مجھے دیکھا۔

"میں نے کب کہا کہ میں بیکار بیٹھا ہوں؟" میرے لہجے میں حیرت تھی: "میں تو بہتر سے بہتر کی تلاش میں رہتا ہوں......"

"خوب...... ابھی کہاں کام کر رہے ہو؟"

"ایک قاسم صاحب ہیں...... میں ان کے بنگلے پر ہوتا ہوں۔" میں نے برجستہ جواب دیا۔

"کیا کرتے ہو وہاں......؟"

"میں نے آپ کو بتایا کہ کچھ پڑھا لکھا ہوں...... چنانچہ اسی بنا پر مجھے تمام ملازموں کی نگرانی اور دیگر ضروری معاملات کو دیکھنا ہوتا ہے...... یوں سمجھ لیں کہ میں سپروائزر کی حیثیت رکھتا ہوں۔"

"اچھا......!!"

اب وہ کافی غور سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ نہ جانے کیوں اس موقع پر مجھے قصائی یاد آ گیا......!!!

میں اپنی اس سوچ کی وضاحت نہیں کر سکوں گا۔

بہرحال مجھے اس وقت یہی محسوس ہوا تھا۔

"ہوں......!!" اس نے پھر ایک طویل سانس لی: "اس کا مطلب یہ ہے کہ کافی قابلیت بھی رکھتے ہو...... شادی نہیں کی؟"

"اسی کی خاطر تو یہ سب کر رہا ہوں۔" میں درد بھرے لہجے میں بولا۔ "آہستہ آہستہ رقم جمع کر رہا ہوں......!!"

"خوب......" وہ مسکرایا: "اگر تمہیں یہاں نوکری مل گئی، تو پھر تمہیں شادی کی فکر نہیں رہے گی۔"

"جی...... کیا مطلب؟"

"اگر تم نے وفاداری کا ثبوت دیا، تو یہ کام خود کنور صاحب کروا دیں گے......" اس نے گویا خوش خبری سنائی: "اور تمہیں سرونٹ کوارٹرز میں باقاعدہ طور پر رکھا جائے گا۔"

"اوہ......!! اس کا مطلب یہ ہے کہ کنور صاحب بہت نیک انسان ہیں؟" میں نے جلدی سے کہا۔

میری بات سن کر نہ جانے کیوں اس کے چہرے کا ہلکا سا تاثر بدلا تھا۔ وہ کچھ کہنے ہی والا تھا، لیکن پھر خاموش ہی رہا۔

چند لمحوں کے توقف کے بعد وہ بولا۔

"اب تم جا سکتے ہو......!! دو دن بعد صدر دروازے پر لسٹ لگا دی جائے گی، اگر تم اپنا نام دیکھو تو اندر چلے آنا...... پھر کنور صاحب خود تمہارا انٹرویو لیں گے۔"

یہ سن کر میں اٹھ کھڑا ہوا۔

دو دن بعد جب میں ایک بار پھر کنور صاحب کے بنگلے پر پہنچا تو دور سے ہی مین گیٹ پر سفید رنگ کا بڑا سا کاغذ چسپاں دکھائی دیا۔

میں نے ازراہِ شوق اس لسٹ پر نگاہ دوڑائی اور پھر اس پر لکھے ہوئے پانچ ناموں میں مجھے اپنا بھی نام دکھائی دیا۔

میں فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ اس بات پر میں خوشی کا اظہار کروں یا نہیں......!!!

دروازے پر لگی ہوئی بیل بجائی تو جلد ہی قدموں کی آہٹ ہوئی اور ایک چھوٹا سا خانہ کھل گیا۔

دو جھانکتی ہوئی آنکھوں نے پوچھا۔

"کس سے ملنا ہے؟"

میں نے جواباً مدعا بیان کیا تو کلک کی آواز کے ساتھ دروازہ کھلتا چلا گیا۔

میں اندر داخل ہو گیا...... سامنے ہی پورچ میں آج دو کاریں کھڑی ہوئی دکھائی دیں۔ لان پر نظر ڈالی تو فوارہ حسبِ روایت اپنی دلکشی کا مظاہرہ کرتا ہوا دکھائی دیا...... وہاں ایک مالی بھی پیڑوں کو پانی دیتا ہوا دکھائی

دے رہا تھا...... لیکن ان سب سے ہٹ کر یہاں کچھ اور بھی تھا......

جو شاید خود میرے لئے حیرت انگیز ثابت ہوا تھا۔ لان کے آخری سرے پر جھولے میں ایک لڑکی بیٹھی ہوئی جھولا جھول رہی تھی۔ وہ خود ہی آہستہ آہستہ ہچکولے کھا رہی تھی......!! اور یہ لڑکی...... میری شناسا تھی۔

یہ اور بات تھی کہ یہ شناسائی زیادہ طویل نہ ہوسکی تھی، لیکن کلب کے احاطے میں لڑکیوں کے ساتھ بیٹھ کر مجھے بار بار دیکھنے والی اور حسین ترین نقوش رکھنے والی اس لڑکی کو میں کیسے بھول سکتا تھا، کہ جس نے دانستہ یا غیر دانستہ طور پر کسی انسٹی ٹیوٹ کا کارڈ سدو کے پاس گرا دیا تھا۔

ہاں...... یہ وہی خوبرو حسینہ تھی۔

وہ آہستہ آہستہ کچھ گنگنا رہی تھی، ابھی تک اس نے میری طرف نہیں دیکھا تھا...... اپنی ہی کسی دھن میں مگن تھی۔

پورچ کے اختتام پر ایک چوکیدار سے ملاقات ہوئی، اسے ابھی اپنی تفصیل گوش گزار کرنی پڑی۔

تھوڑی دیر بعد ہی مجھے ہال نما ایک کمرے میں پہنچا دیا گیا، جس میں کافی نفیس قسم کا فرنیچر موجود تھا...... کھڑکیوں پر پردے بھی کافی دلآویز لگے ہوئے تھے......!!

مجھے یہاں تک ایک نوکر لے کر آیا تھا:

’’آپ تشریف رکھیں......!!‘‘ اس نے کہا: ’’صاحب آپ سے جلد ہی ملاقات کریں گے۔‘‘

’’ٹھیک ہے......!!‘‘ میں نے کہا اور پھر ایک صوفے میں دھنستا چلا گیا۔ وہ واقعی اتنا ہی دبیز تھا۔

میں نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ اور ایک بار پھر میرے ذہن میں وہی لڑکی گھومنے لگی......!! وہ یہاں کیا کر رہی تھی......؟ کیا وہ اسی گھر کی مکین ہے؟ میرا سامنا ہونے پر کیا وہ مجھے پہچان سکے گی؟ یا اب تک اس نے مجھے بھلا دیا ہوگا......؟؟

اسی قسم کے سوالات کے دوران نوکر ایک بار پھر نمودار ہوا، اس کے ہاتھوں میں ٹرے موجود تھی، جس میں مشروب کا گلاس دکھائی دے رہا تھا، وہ گلاس رکھ کر دوبارہ باہر نکل گیا۔

پیاس بھی لگ رہی تھی، میں نے گلاس اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا جو ذائقے دار مشروب تھا......!!

اور پھر انتظار کی گھڑیاں بھی ختم ہوگئیں۔ میں نے خالی گلاس میز پر رکھا ہی تھا کہ کنور شہریار کمرے میں داخل ہوا۔

میں احتراماً اٹھ کھڑا ہوا۔

’’بیٹھو جوان......!! بیٹھو......!!‘‘ اس نے دور سے ہی ہاتھ ہلایا۔ اس کے ہونٹوں پر بے حد دوستانہ مسکراہٹ تھی۔

پھر وہ میرے سامنے صوفے پر براجمان ہوگیا اور اب تعریفی نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگا:

’’کیا نام ہے تمہارا...... غالباً شکیل...... ناں......؟‘‘ اس نے پوچھا۔

’’جی ہاں......!!‘‘ میں نے خود اعتمادی کا مظاہرہ کیا۔

’’تم تنہا ہو؟‘‘

’’جی ہاں......!! ماں باپ کا انتقال ہوچکا ہے، اور ان دونوں کی درمیانی مدت بھی زیادہ نہیں تھی۔

’’اوہ...... افسوس ہوا۔‘‘ اس کے منہ سے نکلا۔

پھر ایک طویل سانس لے کر بولا: ’’خیر...... جانا تو سب نے ہی ہے...... بس دنیا میں کچھ ایسے کام کر جاؤ کہ تم جس کے نام لیوا ہو، وہ تمہیں یاد رکھے......!!!‘‘

’’میں...... سمجھا نہیں......!!‘‘

یہ سن کر وہ عجیب سے انداز میں مسکرایا اور پھر بولا:

’’زندگی میں کوئی ایسا ضرور ملتا ہے، جس پر سب کچھ قربان کردینے کو جی چاہتا ہے...... بس اسی کے لئے کچھ کر گزرنا ہی زندگی ہے......!!!‘‘

’’یہ بات تو ہے......!!‘‘ میں نے خواہ مخواہ سر

ہلایا۔

’’کیا تمہیں ایسا کوئی ملا ہے اب تک؟‘‘

’’نہیں سر......!!‘‘ میں آہستہ سے بولا۔

’’ہوں...... فکر مت کرو...... ضرور ملے گا......!!‘‘ وہ سر ہلا کر بولا: ’’اور اب انٹرویو کا آغاز کرتے ہیں...... میں صرف چند باتیں پوچھنا چاہتا ہوں۔‘‘

’’جی سر......!! فرمائیں......!!‘‘

’’مجھے سر نہیں بلکہ کنور صاحب بولو......!!‘‘ اس نے مجھے ٹوکا: ’’میں اسی نام سے پکارا جانا پسند کرتا ہوں......!! ہاں...... تو اب یہ بتاؤ کہ تم کیا کرسکتے ہو؟‘‘

’’جو آپ حکم دیں کنور صاحب......!!‘‘

’’گڈ......!!‘‘ وہ مسکرایا۔ ’’مجھے تمہارا جواب پسند آیا......!!‘‘

’’شکریہ......!!‘‘

’’کیا تم جاسوسی کرسکتے ہو؟‘‘

’’جی...... جاسوسی؟‘‘ میں چونکا۔

’’ہاں......!!‘‘

’’نہیں کنور صاحب......!!‘‘ میں نفی میں سر ہلا کر بولا۔ ’’میں نے یہ کام کبھی نہیں کیا......!!‘‘

’’کوئی بات نہیں......!!‘‘ وہ آہستہ سے بولا۔ ’’زندگی میں انسان کو بہت کچھ سیکھنا پڑتا ہے...... خیر...... تم مجھے کافی پسند آئے ہو، اس لئے میں نے تمہیں نوکری پر رکھ لیا ہے......!!‘‘

’’شکریہ جناب......!!‘‘ میں گویا خوش ہوگیا: ’’مجھے کیا کام کرنا ہوگا؟‘‘

’’فی الحال کچھ دن یہاں کے معاملات کو سمجھو......!!‘‘ اس نے کہا: ’’تمہاری ریکوائرمنٹ کے مطابق میں تمہیں تمام نوکروں کا ہیڈ بنا رہا ہوں...... تنخواہ بھی معقول دوں گا...... میں دو دن بعد تم سے رابطہ کروں گا، اور پھر بیٹھ کر بات کریں گے......!!!‘‘

☆......☆......☆

اس حویلی نما بنگلے میں نوکروں کے علاوہ چھ افراد تھے...... اس حسینہ کا نام نازش تھا اور وہ کنور صاحب کی بہن کی بیٹی تھی......!!

کنور صاحب کے بڑے بھائی اپنی بیوی کے ساتھ اسی گھر میں رہائش پذیر تھے، لیکن ان دونوں کا ہونا یا نہ ہونا برابر ہی تھا...... اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے حصے سے بہت کم ہی باہر نکلتے تھے...... دونوں ریٹائرڈ اسکول ٹیچرز تھے اور ان کا محبوب مشغلہ صرف کتابوں کی خاک چھاننا تھا......!!! ابھی میں ان کے حصے میں نہیں گیا تھا، لیکن ایک نوکر کے ذریعے مجھے تھوڑی سی تفصیل معلوم ہوگئی تھی......!!

نازش کی ماں بھی یہیں رہتی تھی، وہ بیوہ تھی اور اسی بنا پر کنور صاحب نے اسے اپنے ساتھ رکھ لیا تھا......!!!

ان سب کے علاوہ کنور صاحب کے ایک چچا بھی اسی گھر سے منسلک تھے...... لیکن وہ بھی ذہنی طور پر کچھ بہتر حالت میں نہیں تھے......!! ویسے انہیں باغبانی کا بہت شوق تھا اور ان کا اکثر وقت لان میں ہی گزرتا تھا......!!!

یہ دو دن میں نے بڑی ٹھاٹ سے گزارے تھے، دوسرے دن شام کے وقت میں ٹہلنے کے لئے باہر نکلا، تو نازش سے میری مڈبھیڑ ہوگئی، لیکن وہ مجھ سے کنی کترا کر دوسری طرف نکل گئی۔

میں محسوس کرچکا تھا کہ اس کی آنکھوں میں شناسائی کی جھلک تھی......!! یہ اور بات تھی کہ وہ میرا سامنا کرنا سے گریز کر رہی تھی۔

لان میں آیا تو کنور صاحب کے چچا گھاس برابر کرنے والی مشین سے الجھے ہوئے تھے......!!

وہ گھٹنوں کے بل بیٹھے ہوئے تھے اور مشین کی کوئی خرابی ٹھیک کرنے میں مشغول تھے۔

انہوں نے مجھ پر ایک نظر ڈالی اور فوراً ہی پکارا:

’’ادھر آؤ...... میاں......!!!‘‘

’’جی......!!!‘‘ میں متوجہ ہوگیا۔

انہوں نے غور سے مجھے دیکھا اور پھر بولے:

”کیا تم مہمان ہو؟“

”جی...... نہیں......!!“

”پھر ٹھیک ہے......!!“ وہ سر ہلا کر بولے۔ ”کیوں کہ ہم لوگ مہمانوں سے کوئی کام نہیں کرواتے......!!“

میں خاموش ہی رہا، اور ان کے قریب بیٹھ گیا...... اب میں نے انہیں غور سے دیکھا...... معمولی سے کپڑوں میں ان کا منحنی سا جسم کافی میلا کچیلا!! دکھائی دے رہا تھا......!! سر کے بال کھچڑی تھے اور شیو اس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ چہرہ سفید ہو کر رہ گیا تھا...... خال خال ہی سیاہ بال رہ گئے تھے اب۔

وہ خود ہی گویا چونک کر گویا ہوئے:

”ارے...... تم مہمان نہیں ہو، تو پھر کون ہو؟ میں نے تمہیں پہلی بار دیکھا ہے......!!“

”میں نیا ملازم ہوں جناب......!!“ میں آہستہ سے بولا۔

”اوہ...... اچھا......!!“ وہ چونک کر بولے۔ پھر مجھ پر ایک ناقدانہ سی نظر ڈالتے ہوئے بولے: ”لگتے تو نہیں ہو ملازم......!! خیر...... مجھے کیا......!! کیا تم یہ مشین ٹھیک کر سکتے ہو......؟“

”جی...... بالکل نہیں......!!“ میں نے سعادت مندی سے سر ہلا دیا۔

”بیکار ہو پھر تو تم......!!“ وہ بھنا کر بولے۔

”جاؤ...... اپنا کام کرو...... میں خود ہی کچھ نہ کچھ کرلوں گا......!!“

”کام تو کوئی ہے ہی نہیں جناب......!!“ میں فوراً بولا: ”دو دنوں سے بیکار ہی پھر رہا ہوں......!!“

”ارے......!! وہ زور سے چونکا۔ ”کیا واقعی بیکار ہو؟“

”سولہ آنے......!!“

”اچھا...... تو پھر میرے ساتھ لان کی گھاس ٹھیک کرواؤ......!!! اور پھر پودوں کو پانی دو......!!“

”جی بہتر......!!“ میں آگے بڑھا: ”کیا گھاس ہاتھوں سے برابر کرنی ہوگی؟“ اس نے مجھے گھور کر دیکھا اور بولا:

”میں مشین ٹھیک تو کر رہا ہوں، کیا تمہیں نظر نہیں آرہا؟ زیادہ چالاک بننے کی کوشش مت کرو میاں......!! کیا نام بتایا تھا تم نے اپنا؟“

”آپ نے پوچھا ہی نہیں تھا......!!!“

”اچھا...... تو اب بتا دو......!!“

”شکیل......!!“

”خوب......!!“ وہ جیسے خوش ہوگیا: ”میرے اسکول کے ٹیچر کا نام بھی شکیل تھا...... لو بھئی...... مشین بھی ٹھیک ہوگئی......!!“

پھر وہ مشین سنبھال کر اٹھا ہی تھا کہ عقب سے ایک شیریں سی آواز میرے کانوں میں رس گھول گئی:

”دادا جان......!! آپ کو ماما بلا رہی ہیں......!!“

کنور صاحب کے چچا نے فوراً ہی پلٹ کر دیکھا۔ میں بھی اسی طرف گھوم گیا، یہ نازش تھی، جو اس وقت سبز رنگ کے سوٹ میں اور بھی غضب ڈھا رہی تھی......!!

اس نے مجھ پر سرسری سی نگاہ ڈالی اور دوبارہ بوڑھے کی طرف متوجہ ہوگئی:

”کیا آپ نے سنا نہیں؟“

”سن تو لیا......!!“ وہ کان کھجا کر بولے: ”لیکن میں یہ سوچ رہا ہوں کہ پہلے گھاس برابر کروں، یا پھر تمہاری ماں کی بات سنوں......؟“

”میرا خیال ہے کہ گھاس زیادہ اہم ہے۔“ نازش کا لہجہ شرارتی تھا: ”ماما تو کچھ نہ کچھ بولتی ہی رہتی ہیں......!! انہیں چھوڑیں......!!!“

”نہیں بیٹا......!!“ چچا نے فوراً کہا: ”گھاس میں تو میں سارا دن ہی لوٹتا رہتا ہوں......!! میں تمہاری ماں کی بات سن کر آتا ہوں......!!“

یہ کہہ کر اس نے مشین ایک طرف رکھی، پھر میری جانب شہادت کی انگلی اٹھا کر بولے۔

”اے لڑکے......!! تم کہیں جانا نہیں...... میں واپس آتا ہوں......!!

اور پھر میرے جواب کا انتظار کیے بغیر ہی وہ گھوم کر دوسری طرف نکل گئے، نازش انہیں جاتے ہوئے کافی دیر تک دیکھتی رہی۔

میں اسی کی طرف متوجہ تھا، پھر وہ میری جانب پلٹی:

”کیا تم میری خاطر یہاں آئے ہو؟“

اس اچانک اور غیر متوقع جملے نے مجھے بوکھلا دیا۔

وقتی طور پر تو مجھے سمجھ ہی نہیں آیا تھا کہ کیا جواب دوں، پھر میں آہستہ سے بولا:

”اگر میں یہ کہوں کہ یہ میرے لئے الزام ہے، تو پھر......؟“

”ثابت کرسکتے ہو؟“ اس نے سوالیہ انداز سے میری طرف دیکھا۔

”یہ محض اتفاق ہے میڈم......!!“ میں طویل سانس لے کر بولا: ”میں یہاں نوکری کی تلاش میں آیا تھا، اور آپ سے بھی ملاقات ہوگئی......!!“

”ایک اتفاق میں بھی بتا دوں؟“ وہ عجیب سے انداز میں مسکرائی۔

”جی...... ضرور......!!“

”جو چیز مجھے اچھی لگتی ہے، وہ خود بہ خود ہی مجھے مل جاتی ہے۔“ وہ بے باکی سے بولی: ”میں نے تمہارے ساتھی کے قریب اپنے انسٹی ٹیوٹ کا کارڈ گرادیا تھا، اور تم نے تو اتنی تیزی دکھائی کہ میرے گھر میں ہی چلے آئے......!!“

”میں نے تو آپ کو صاف صاف بتا دیا......!!“

”اچھا......!!“ وہ بولی: ”پھر......!! خوب گزرے گی......!! میں تم سے دوستی کرنا چاہتی ہوں......!!“

”لیکن...... میں تو آپ کا ملازم ہوں...... اب......!!“

”ہوگے......!!“ وہ منہ بنا کر بولی۔ ”لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کنور صاحب نے تمہیں خرید لیا ہے، نوکری تو ایک منٹ میں ہی ختم ہوسکتی ہے......!!!“

میں اس کی شکل ہی دیکھتا رہ گیا...... عجیب لڑکی تھی...... بلکہ مجھے تو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس گھر کا ہر فرد ہی عجیب و غریب ہو......

عین اسی وقت ایک نوکر ہماری طرف آیا اور مجھ سے مخاطب ہو کر بولا:

”آپ کو صاحب بلا رہے ہیں......!!“

میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ نازش منہ بنا کر بولی:

”آپ کو صاحب بلا رہے ہیں......!!“

میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ نازش منہ بنا کر بولی۔

”جاؤ تم......!! کنور صاحب سے کہنا کہ آرہا ہے وہ...... ویٹ کریں......!!“

”ٹھیک ہے بی بی جی......!!“ اس نے فوراً سر ہلایا اور وہاں سے چلا گیا۔

میں ہکا بکا ہو کر نازش کو دیکھ رہا تھا، پھر میرے منہ سے نکلا:

”یہ...... یہ آپ نے کیا کیا......؟“

”کیا کردیا میں نے......؟“ وہ حیرت سے بولی۔

”کنور صاحب ناراض ہوجائیں گے......!!“

”اوہو...... بڑا خیال ہے ان کی ناراضگی کا......!!“ اس نے مجھے گھورا: ”جاؤ پھر...... چلے جاؤ......!!

یہ کہہ کر وہ مڑی اور تیز تیز قدموں سے لان کی طرف بڑھتی چلی گئی، میں سر کھجا کر رہ گیا۔

☆......☆......☆

میں اجازت لے کر کمرے میں داخل ہوا...... کنور صاحب ایک صوفے پر براجمان تھے......!!!

انہوں نے اشارے سے مجھے اپنے سامنے بیٹھنے کو کہا۔

میں خاموشی سے کنور صاحب کے سامنے جا بیٹھا۔ اس وقت مجھے یوں لگا جیسے اس شخص کی آنکھیں میرے وجود میں پیوست ہورہی ہوں......!!!

دفعتاً وہ بھرپور انداز میں مسکراتے ہوئے بولا۔

”ہاں بھئی...... کیسے گزرے یہ دو دن......؟ کیا تم نے گھر کا جائزہ لیا......؟“

”جی نہیں......!!“ میں نفی میں سر ہلا کر بولا۔

”میں صرف سرونٹ کوارٹر اور لان کی حد تک محدود رہا ہوں کنور صاحب......!!“

”اوہ...... کیوں......؟“

”آپ نے ابھی تک مجھے میرے کام کی نوعیت نہیں بتائی......!!“ میں نے جواب دیا۔ ”اسی حساب سے میں قدم آگے بڑھاؤں گا۔“

”بہت خوب......!!“ وہ جانے کیوں خوش ہوگیا: ”تم واقعی میرے معیار پر پورے اترے ہو......!! اب میں تمہیں وہ کام سونپ سکتا ہوں......“

”جی...... حکم کریں کنور صاحب......!!!“ میں ہمہ تن گوش ہوگیا۔

”آؤ...... میرے ساتھ......!!“

یہ کہہ کر کنور اٹھ کر کھڑا ہوگیا......!! کمرے سے باہر نکلتے ہی چھوٹی سی راہداری تھی، جس سے گزرنے کے بعد ایک اور دروازہ دکھائی دیا۔

کنور نے اسے کھولا اور اندر داخل ہوگیا......!!! اس نے مجھے بھی اندر آنے کا اشارہ کیا تھا۔

اس کمرے کی شان شوکت بتا رہی تھی کہ یہ کنور کے ذاتی استعمال میں رہتا ہوگا......!!

ایک حصہ خواب گاہ کی طرز پر تھا، جبکہ دوسرے حصے میں صوفہ سیٹ بچھے ہوئے تھے......

”بیٹھو......!!“ کنور نے مجھے اشارہ کیا: ”میں تمہیں یہاں اس لئے لایا ہوں کہ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں......!!“

”جی بالکل......!!“

”اور میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ میری بات سنیں......!!“

”لیکن کنور صاحب......!! دیواریں تو یہاں بھی ہیں......؟“

”ہاں......!! لیکن یہ بہری ہیں۔“ وہ مسکرایا۔

”میں سمجھا نہیں......!!“

”اس حصے میں کوئی قدم نہیں رکھ سکتا......!!“ کنور نے بتایا: ”جب تک میری اجازت نہ ہو، یا پھر میں کسی کو نہ بلاؤں......!!“

”اچھا......!!“

”ہاں......!!“ اچھا سنو......!! یہ گھر میری محنت اور دن رات کی مشقت سے وجود میں آیا ہے...... میرا مختصر سا خاندان ہے، جسے میں نے اپنے ہی سائے میں جمع کیا ہے...... کیونکہ میں سب سے مل جل کر رہنے والا شخص ہوں، اور میں نے جب یہ گھر بنایا تھا، تب ہی سوچ لیا تھا کہ میں اپنے بچے کھچے عزیزوں کو اپنے ساتھ رکھوں گا......“

”جی...... اچھا......!!“

”کیسی سوچ ہے میری؟“ اس نے میری آنکھوں میں دیکھا۔

”بہترین......!!“ میں نے سر ہلا کر داد دی۔

”تم نے درست جواب دیا۔“ وہ طویل سانس لے کر بولا: ”لیکن معاملہ اس کے برعکس ہے...... اتنا کچھ کرنے کے باوجود بھی مجھے ایسا کچھ محسوس ہو رہا ہے کہ جو میں کسی سے بیان نہیں کر سکتا......!!“

”میں...... سمجھا نہیں صاحب......!!“

میں اس کی طرف پوری طرح متوجہ تھا، وہ چند لمحوں کے توقف کے بعد سرسراتی ہوئی آواز میں بولا:

”اس گھر میں کوئی میری جان لینا چاہتا ہے......!!“

☆......☆......☆

چند لمحے کمرے میں موت کا سا سناٹا طاری رہا...... ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے سوئی بھی گرے گی، تو اس کا وہی کہ سماعت کے لئے نقصان دہ ثابت ہوگا......!!“

یہ جملہ کہنے کے بعد کنور ایسے خاموش ہوگیا تھا، جیسے اب اس کی جگہ کسی تراشے ہوئے بت نے لے لی ہو......!!

پھر میں کھنکھارتے ہوئے گویا ہوا:

”لیکن...... میں اس سلسلے میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں......؟“

”مجھے صرف اس شخص کے بارے میں پتا لگانا ہے کہ آخر وہ کون ہے......!!“

کنور نے جواب دیا: ”تم کافی ذہین اور چابک دست معلوم ہوتے ہو......!! تم کسی فرد کی طرح میرے گھر میں شامل ہو جاؤ اور پھر ڈھکے چھپے انداز میں اس شخص کا پتا لگاؤ......!!“

”لیکن مجھے ان چیزوں کا تجربہ نہیں ہے کنور صاحب......!! میں نے اقرار کیا: ”میں یہ کام کیسے کر سکوں گا......؟“

”اس کی فکر مت کرو......!! میں خود تمہاری راہنمائی کروں گا......!!“

”جب آپ نے یہ بات محسوس کر لی ہے، تو پھر آپ نے حکومتی اداروں سے رابطہ کیوں نہیں کیا......!! آپ تو کافی مشہور شخصیت کے مالک ہیں۔“ میں نے اعتراض کیا۔

یہ سن کر وہ مسکرایا اور بولا:

”میں بہت کچھ کر سکتا ہوں...... لیکن مجھے اپنا خاندان بہت عزیز ہے، اگر میری جان لینے والا کوئی عزیز ہی نکلا، تو میں برداشت نہیں کروں گا کہ اس کی بدنامی ہو اور وہ سرعام مجرم کہلائے......!!“

”اوہ......!! میرے منہ سے نکلا: ”آپ ان سب سے اتنی محبت کرتے ہیں، تو پھر ایسا کون ہے، جو آپ کی جان لینے کے درپے ہے......؟“

”یہی بات تو میرے لئے دکھ کا باعث ہے۔“

اس کے لہجے میں اداسی عود کر آئی: ”مجھے اپنے کمرے سے دھمکی آمیز خطوط ملے ہیں......!! جو آج بھی میرے پاس محفوظ ہیں......!!“

”اوہ......!!“

”ہاں......!! کنور نے کہا: ”میں وہ خطوط تمہیں دکھاؤں گا...... اس کے علاوہ مجھے تین بار زہر بھی دینے کی کوشش کی گئی ہے...... بس یہ اتفاق ہی تھا کہ میں بال بال بچ گیا......!!“

”زہر کس طرح دیا گیا تھا آپ کو......؟“

”دودھ میں ملا کر......!!“ وہ پرسکون لہجے میں بولا۔ ”میں روزانہ رات میں دودھ پی کر سونے کا عادی ہوں......!! لیکن جس دودھ کے گلاس میں زہر شامل تھا، وہ میرے ہونٹوں تک نہیں پہنچ سکا......!!“

”کس طرح......؟“

”یہ کارنامہ میری پالتو بلی سوزی کا تھا......!!“ کنور نے طویل سانس لے کر جواب دیا۔ ”دو مرتبہ اس نے دودھ کا گلاس گرا کر توڑ دیا اور پھر تیسری دفعہ اس نے وہ دودھ خود پی کر مجھ پر اپنی جان نچھاور کردی۔“

”اوہ......!!“ میرے منہ سے نکلا۔

”ہاں جوان......!!“ کنور نے کہا: ”مجھے آج بھی سوزی بہت یاد آتی ہے......!! اس نے جب دودھ کا گلاس گرایا تو میں اس پر خوب غصہ ہوا، آخرکار اس نے وہی دودھ پی کر مجھے اس بات سے آگاہ کیا کہ اگر اس کی جگہ میں خود وہ گلاس پی کر خالی کر دیتا تو میرا کیا حشر ہوتا......!!!“

”تو آپ نے کسی کو ان باتوں سے آگاہ کیا تھا؟“

”کسے بتاتا......؟“ اس کا لہجہ غم زدہ سا تھا۔ ”مال و دولت کا لالچ تو کسی کی بھی آنکھوں پر پٹی باندھ سکتا ہے...... میں اب کس پر بھروسہ کروں......؟“

”کیا آپ کی صاحب زادی بھی اس سے واقف نہیں ہیں؟“

”بالکل نہیں......!!“ اس نے نفی میں سر ہلایا: ”یہ راز صرف تین جانوں تک محدود ہے...... میں، سوزی اور...... جس نے مجھے زہر دینے کی کوشش

کی......!!"

"اچھا......!!!"

"ہاں......!!اور اب میں یہ چاہتا ہوں کہ تم کسی طرح اس شخص کا پتا لگاؤ۔ میں تمہیں اس گھر کا فرد ہونے کا اختیار دے رہا ہوں......!!! ظاہری طور پر تم میرے نوکروں کے معاملات دیکھو گے، لیکن تمہاری حقیقت سے صرف میں واقف ہوؤں گا......!! یہ تم خود ہی فیصلہ کرو گے کہ تم نے اپنے کام کا آغاز کہاں سے کرنا ہے......!!! اب تم جا سکتے ہو......!!!"

☆......☆......☆

کنور صاحب نے مجھے عجیب قسم کی الجھن میں ڈالا تھا، میں تو خود اسی کی سن گن لینے یہاں آیا تھا اور الٹا اسی نے مجھے ایک کام سونپ دیا تھا۔

بہر حال اب یہاں رہنا تھا، تو مجھے کنور ہی کے اشاروں پر چلنا ضروری تھا......!!

ویسے سوچنے والی بات یہ تھی کہ کنور کے خلاف اس گھر میں اتنا بڑا قدم اٹھا لیا گیا، لیکن خود کنور نے اس سلسلے میں کوئی ایکشن نہیں لیا تھا...... کیا اس کی وجہ واقعی یہ تھی کہ وہ اپنے خاندان والوں سے مثالی محبت کرتا تھا؟ یا پھر اسے ڈرتا تھا کہ اس دشمنی کو اجاگر کرنے میں کوئی اور راز بھی افشاں ہو جائے گا......!!!

جبران نے مجھے یہاں بھیجا تھا، تو ضرور اس میں کوئی نہ کوئی مصلحت پوشیدہ تھی......!! جس کا ابھی مجھے کھوج لگانا تھا...... لیکن کنور سے ملاقات کے بعد اب ایک نئی صورت حال کا سامنا ہو گیا تھا......!! مجھے نہ صرف یہ کہ کنور کی کھوج میں رہنا تھا، بلکہ اب اس کا کوئی جانی دشمن بھی میرے گلے پڑ چکا تھا......!!!

میں ابھی تک کنور صاحب کے بڑے بھائی اور ان کی بیگم سے نہیں مل سکا تھا، اس کے علاوہ نازش کی ماں سے بھی ابھی تک میری آشنائی نہیں ہوئی تھی۔

میں اب نوکروں کے درمیان رہتے ہوئے، انہیں مختلف ہدایات جاری کرتا رہتا تھا......!!! کنور صاحب کی طرف سے مجھے ایک الگ کمرہ بھی دے دیا گیا تھا۔ جو کہ سرونٹ کوارٹر سے ہی منسلک تھا......!! لیکن درمیان میں موجود ایک دیوار کا احاطہ اسے سرونٹ کوارٹر سے الگ ظاہر کرتا تھا، اس کمرے میں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی......!!!

نوکر بھی اب مجھ سے کافی مانوس ہو گئے تھے، خاص طور پر قادر اور کرم دین تو مجھ سے بے تحاشا گھل مل گئے تھے......!!!

قادر یہاں کا سب سے پرانا ملازم تھا، اور اپنے بیوی بچوں سمیت ہی سرونٹ کوارٹر میں رہائش پذیر تھا......!!!

وہ بہت کم گو تھا، میں نے اکثر نوٹ کیا تھا کہ بات کرتے کرتے جیسے کہیں کھو جاتا۔ چنانچہ میں نے کوشش شروع کر دی کہ اس سے قریب رہ سکوں......!!

نازش مجھ سے اب تک ناراض تھی، دن بھر میں جب بھی اس سے میرا آمنا سامنا ہوتا، وہ منہ پھیر کر گردن اکڑاتی اور دوسری طرف نکل جاتی......!!

یہ خاندان ہی عجیب تھا......!! یوں لگتا تھا جیسے نفسیاتی ادارے سے چند لوگوں کو بلا کر یہاں اکٹھا کر دیا گیا ہے......!!!

کبھی کبھی مجھے شک ہونے لگتا تھا کہ جبران کو ضرور کنور صاحب کے متعلق غلط فہمی ہوئی ہے......!!!

اس گھر میں ایسا کچھ ہرگز نہیں تھا کہ جس کی بناء پر کنور کو شیطان کا پجاری ہونے پر غور کیا جائے......!!!

مجھے ابھی تک کنور صاحب کے لئے کوئی ایسا سراغ نہیں مل سکا تھا کہ جس کی بدولت یہ ظاہر ہوتا کہ انہیں کوئی قتل کرنے کے درپے ہے......!!! یہ قدم کون اٹھا سکتا تھا......؟ آخر ایسا کون شخص تھا، جو کنور صاحب جیسے شخص کو جان سے مار دینا چاہتا تھا......؟ یہاں کے رہنے والوں میں سے تو مجھے کوئی بھی ایسا نظر نہیں آ رہا تھا...... اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ میں یہاں آنے کے بعد کافی الجھن محسوس کر رہا تھا۔

اور پھر میری ملاقات کنور صاحب کے بھائی اور بھابھی سے بھی ہو گئی۔

وہ لوگ لان میں بیٹھے شام کی چائے پی رہے تھے...... اور ایک بوڑھی عورت بھی ساتھ میں تھی...... مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ یہی کنور صاحب کی بیوہ بہن ہیں......!!

یہ تینوں مجھے کچھ سلیقے کے لوگ دکھائی دیئے، خاص طور پر کنور صاحب کی بہن آسیہ کے بولنے کا انداز بہت دھیما اور نرماہٹ لئے ہوئے تھا......!!!

کافی دیر تک میں ان لوگوں کے درمیان بیٹھا رہا، پھر چائے پینے کے بعد میں اٹھ کر اندرونی حصے کی طرف چلا آیا۔

راہداری میں داخل ہوا ہی تھا کہ نازش نہ جانے کہاں سے آ نکلی اور دیوار درخت کی طرح سامنے کھڑی ہو گئی۔

وہ آج بھی کافی تیکھے انداز میں مجھے گھور رہی تھی، پھر وہ بڑی ادا سے خفگی کا اظہار کرتے ہوئے بولی:

"میں تم سے بہت زیادہ ناراض ہوں......!!"

"اچھا......!!"

"کیا اچھا......؟" وہ آنکھیں نکال کر بولی۔

"ہیں......؟"

"اور کیا بولوں میم صاحب؟" میں گڑبڑا گیا۔

"میرا نام نازش ہے......!!" وہ تنک کر بولی۔ "اور میرا خیال ہے کہ تمہیں میرا نام بھی یاد ہوگا......!!"

"بالکل......!! میں فوراً بولا۔ "لیکن میں اس گھر کا ملازم ہوں......!!"

"میرے تو نہیں ہو......!!" وہ مجھے گھورتے ہوئے بولی: "کیونکہ تمہیں میں نے نہیں بلکہ کنور صاحب نے ملازمت پر رکھا ہے......!!"

"جی اچھا......!!"

پھر وہی سعادت مندی۔" نازش جھلا اٹھی:

"مجھے چڑ ہے ایسے کاروباری لہجوں سے......!!"

"تو پھر کس طرح بات کروں......؟" میں بے چارگی سے بولا۔

یہ بات سن کر اس کے چہرے کے نقوش ہی بدل گئے، ایک مخموری مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیلی اور وہ بڑے دلکش انداز میں بولی:

"دوستوں کی طرح...... کیونکہ میں تمہیں اپنا دوست بنا چکی ہوں......!!"

"اگر آپ کے ڈیڈی کو معلوم ہو گیا تو......؟"

"ان کی فکر مت کرو......" وہ لاپروائی سے بولی: "وہ کچھ نہیں بولیں گے۔"

"ٹھیک ہے...... اگر بولا تو میں آپ کو سامنے کر دوں گا......!!"

"بہت ڈرپوک ہو۔" وہ منہ بنا کر بولی۔ "خیر کر دینا...... کیا یاد کرو گے......!!

"اچھا...... اب آؤ میرے ساتھ......!!"

"کہاں......؟" میں چونکا۔

"میرے کمرے میں......؟"

"کیوں؟"

"بھئی بیٹھیں...... باتیں کریں گے ڈھیر ساری......!!" اس کی آنکھیں چمک اٹھیں......!!!

"اچھا...... چلیں پھر......!!" میں آہستہ سے بولا۔

اس نے فوری طور پر میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے تقریباً کھینچتی ہوئی راہداری کے اندرونی حصے کی طرف لے گئی۔

جلد ہی میں اس کے کمرے میں موجود تھا......!! میں نے دیکھا کہ اس کمرے میں جا بجا فن آرٹ کے شہ پارے موجود تھے......!!

ایک طرف کینوس بھی دکھائی دیا، جسے کالے رنگ کے کپڑے سے ڈھانک دیا گیا تھا......!!!

میں نے دیواروں پر لگی ہوئی تصویروں کا جائزہ لیا، زیادہ تر ان میں قدرتی مناظر دکھائی دے رہے تھے......!!

نازش میری اس توجہ کو کافی دلچسپی سے دیکھ رہی تھی:

"کیسی لگیں یہ تصویریں......؟"

"بہت ہی اعلیٰ......!!"

"واقعی......؟" وہ خوش ہوگئی۔

"اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ان سب سے فن کا اعلیٰ نمونہ جھلک رہا ہے۔ اور جس نے بھی بنائی ہیں، وہ اپنے فن میں بے حد مشاق ہے......!!"

"دیکھ لو......!!"

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں......!!"

"اچھا تو سنو......!!" وہ مسکرائی: "یہ تصویریں میں نے بنائی ہیں۔"

"کیا واقعی؟" میں حیرانی سے بولا۔

"ہاں...... میں نے اس فن میں مہارت حاصل کی ہے......!! اس کے علاوہ میں فن خطاطی پر بھی عبور رکھتی ہوں......!!"

"بہت خوب......!!" میرے منہ سے نکلا: "یہ میری خوش نصیبی ہے کہ میں ایک مصور سے ملاقات کر رہا ہوں......!!"

"اب مجھے جھاڑ پر مت چڑھاؤ......!!" وہ ٹھنکی: "بنا لیتی ہوں بس کچھ بہتر......!!"

"کچھ نہیں...... حد سے زیادہ بہتر......!! کیا آپ نے آرٹ کونسل جوائن کیا ہے......؟"

"نہیں......!!"

"ضرور کریں......!! وہاں تو آپ کو ڈھیروں داد بھی ملے گی اور پرشاد بھی ملیں گے......!!"

"مجھے ان چیزوں کا شوق نہیں ہے......!!" وہ لاپروائی سے بولی: "بس اپنے ڈیڈی کی وجہ سے کلب جوائن کیا ہوا ہے...... ورنہ تو بھیڑ بھاڑ سے میں دور ہی بھاگتی ہوں......!!"

"اب یہ ادب اور آداب ختم کرو......!!" وہ یک دم ہی جھلاگئی: "بہت ہوگیا آپ اور جناب......!!"

"ٹھیک ہے نازش......!!" میں نے اپنا انداز بولا: "اب بتاؤ کہ کیا بنا رہی ہو آج کل......؟"

"ایک بہت ہی خاص تصویر......!!" وہ کچھ سوچ کر مسکرائی: "اور میں سوچ رہی ہوں کہ اسے بہت ہی خوب صورت بناؤں......!!"

"اس کی وجہ......!!"

"اس کا تعلق کنور صاحب یعنی میرے ڈیڈی سے ہے......!!" وہ بولی: "اور میں انہیں سالگرہ پر یہ گفٹ کے طور پر دینا چاہتی ہوں......!!"

"خوب......!! کب ہے ان کی سالگرہ؟" میں نے پوچھا۔

"اگلے ہفتے......!!" اس نے بتایا: "مجھے یقین ہے کہ میں جلد ہی تصویر مکمل کرلوں گی اور اسے پیک کروا کر کنور صاحب کو تحفے کے طور پر دوں گی۔"

"زبردست...... کیا میں اسے دیکھ سکتا ہوں؟"

"ضرور...... لیکن یہ ابھی ادھوری ہے......!!"

"کوئی بات نہیں......!!" میں مسکرایا: "پوری ہونے کے بعد تو دیدار ہو ہی جائے گا......!! میں ادھوری تصویر بھی دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"لو پھر...... دیکھو......!!" یہ کہہ کر نازش آگے بڑھی اور اس نے کینوس پر ڈھکا ہوا کپڑا کھینچ دیا......!!

ادھوری تصویر سامنے آگئی، جیسے ہی اس پر میری نظر پڑی، میں بے ساختہ دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔

اس تصویر کو میں اس سے قبل بھی دیکھ چکا تھا، یہ وہی تصویر تھی، جس نے شامور کی موت کے بعد اس کے خالی پلنگ پر میرا استقبال کیا تھا......!! یعنی شیطان کی خیالی تصویر......!!

کینوس پر وہی سیاہ رنگ کا ادھورا چمگادڑ دکھائی دے رہا تھا۔

میں ہکا بکا ہو کر اس تصویر میں گم تھا۔ نازش کے بازو ہلانے پر مجھے کسی قدر ہوش آیا تھا:

"کیا ہوا؟ تم کہاں گم ہوگئے؟"

"اس تصویر میں......!!" میرے منہ سے نکلا۔

"کیا بہت اچھی بنی ہے؟"

"بہت زیادہ اچھی......!!" میں آہستہ سے بولا۔

پھر نازش کی طرف گھوم گیا۔

"تم بتا رہی تھیں کہ اس کا تعلق کنور صاحب سے ہے......؟"

"ہاں بالکل......!!" وہ فوراً بولی: "اسی وجہ سے تو میں نے بنائی ہے۔"

"کیا تعلق ہے؟" میں نے سرسری انداز میں پوچھا۔

مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میرا دل کچھ غیر معمولی انداز میں دھڑک رہا ہے...... واقعی یہ تصویر میرے لئے کافی اچانک اور غیر متوقع ثابت ہوئی تھی۔

"میں بتا دوں گی......!!" وہ سرگوشی کے انداز میں بولی: "لیکن پہلے تم وعدہ کرو کہ کسی کو نہیں بتاؤ گے......!!"

"وعدہ......!!" میں فوراً بولا تھا۔

"گڈ......!! اب سنو......!! اس گھر کے نیچے ایک قید خانہ بھی ہے......!!" اس نے بتایا: "اس تہہ خانے میں اس تصویر کا باقاعدہ قد آدم بت موجود ہے......!!"

"بت موجود ہے......؟" میں نے اپنی حیرت کو دبانے کی کوشش کی۔

"ہاں......!!! اور میں نے ڈیڈی کو بارہا اس تہہ خانے میں جاتے ہوئے دیکھا ہے......!!"

"اچھا......!!"

"بالکل......!!" اس کا انداز بچوں کا سا تھا: "اسی لئے میں انہیں اس دفعہ یہ تصویر بنا کر غصے میں دینا چاہتی ہوں......!!!"

"کیا وہ تمہیں تہہ خانے میں لے کر گئے تھے؟"

"نہیں......!!"

"پھر تم نے وہ بت کیسے دیکھا؟"

"میں نے تہہ خانے کا راستہ دیکھ لیا تھا...... اور پھر ان کی غیر موجودگی میں وہاں کا جائزہ بھی لے لیا......!!"

"اوہ......!!"

"ہاں......!! اور اب میں انہیں سرپرائز دینا چاہتی ہوں......!!"

"سنو......!! ایسا ہرگز مت کرنا......!!"

"کیوں؟"

"انہوں نے کبھی خود سے اس بات کا ذکر کیا؟"

"نہیں......!!"

"بس تو پھر جب تم انہیں یہ تصویر بنا کر دو گی، تو وہ تم سے سوال ضرور کریں گے اور تم پھنس جاؤ گی۔"

"یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔" وہ بولی: "واقعی اس طرح تو بھانڈا پھوٹ جائے گا۔"

"اور پھوٹے گا بھی تمہارے سر پہ......!!" میں نے جواب دیا: "کیونکہ جس چیز کو وہ تم سے چھپا رہے ہیں، تم اسے ان پر عیاں کرنا چاہتی ہو۔"

"یہ بات تو ہے......!!" وہ قائل ہوگئی۔

"کیا تم جانتی ہو کہ یہ کس کی تصویر ہے؟"

"ہاں...... میں جانتی ہوں۔" اس کا لہجہ پر یقین تھا۔

"تو پھر بتاؤ......!!"

"چمگادڑ کی!!"

یہ سن کر میں ہنس پڑا اور بولا:

"واقعی تم نے ٹھیک کہا......!!! اب تم مجھے ایک بات بتاؤ......!!!"

"کیا تم مجھے وہ تہہ خانہ دکھا سکتی ہو؟"

"ہاں ضرور......!!" وہ فوراً بولی: "لیکن اس سلسلے میں تمہیں تھوڑا سا انتظار کرنا پڑے گا......!!!"

"کیا مطلب......؟" میں قدرے بے چین ہوگیا۔

اس نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر سرگوشیانہ انداز میں بولی: "اگلے ہفتے ڈیڈی کی سالگرہ ہے نا......!!"

"ہاں...... تو پھر......؟" میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔

"اس دن ڈیڈی پوری طرح اپنے عزیز دوستوں میں مست ہوتے ہیں۔" اس نے بتایا؟" انہیں سوائے دوستوں کے...... دنیا جہان کی بالکل خبر نہیں ہوتی، بس میں اسی دن تمہیں تہہ خانے میں لے چلوں گی......!!!"

"اچھا......!!" میں اپنی بے تابی چھپا رہا تھا:

''کیا اس سے پہلے یہ بات ممکن نہیں ہے؟''

''ناممکن تو نہیں، لیکن اس میں خطرہ ہے۔'' وہ بولی۔ ''تم ڈیڈی کو نہیں جانتے...... ان کا دماغ بجلی کی طرح چلتا ہے...... اگر انہیں خیال آ گیا، تو پھر ہم بری طرح پھنس جائیں گے......!!''

''بجلی سے تمہاری کیا مراد ہے؟''

''میرا مطلب ہے کہ ان کے پل کا بھی کچھ پتا نہیں ہوتا...... اگر ان کی پسلی پھڑک گئی تو وہ بھی تہہ خانے کا ہی رخ کریں گے......!!''

''اور رات میں؟''

''رات میں بھی یہ کام رسک ثابت ہوگا......!!'' نازش نے کہا: ''اس کی وجہ یہ ہے کہ ڈیڈی کو نیند بہت کم آتی ہے، وہ اکثر جاگتے ہی رہتے ہیں۔ رات میں بھی یہ کام خطرے سے خالی ثابت نہیں ہوگا۔''

''اوہ......!!'' میرے منہ سے نکلا۔

وہ غور سے میری طرف دیکھ رہی تھی، پھر آہستہ سے ہنس کر بولی: ''تم فکر مت کرو...... بس صبر سے کام لو...... میں جلد ہی تمہیں چمگادڑ کا وہ بڑا سا مجسمہ ضرور دکھاؤں گی...... یہ میرا وعدہ ہے......!!!''

☆......☆......☆

دوسرے دن دوپہر کے کھانے کے بعد میں قادر کے پاس چلا آیا...... وہ اس وقت بازار سے کھانے پینے کا سامان لے کر آیا تھا...... اور اب اسے کچن میں ترتیب سے رکھ رہا تھا۔

مجھے دیکھتے ہی اس نے آواز لگائی۔

''آؤ شکیل بابو...... کہو...... کیسے راستہ بھول پڑے؟''

میں ہنس دیا اور بولا:

''آپ تو ایسے کہہ رہے ہیں جیسے میں کسی اور گھر میں رہتا ہوں......!!''

''بھئی یہ گھر ہی اتنا بڑا ہے......!!'' وہ بھی مسکرائے: ''اس لئے ایسا گمان ہوتا ہے......!!''

''یہ بھی ٹھیک ہے......!!'' میں نے سر ہلایا۔

''ویسے تو میں خود ہی آپ کے پاس حاضر ہوتا......!!'' اس نے کہا اور پھر جیب میں سے کچھ پرچیاں نکال کر میری طرف بڑھا دیں:

''میں یہ سامان لے کر آیا ہوں......!! اگر آپ چیک کرنا چاہیں، تو ضرور کر سکتے ہیں......!!''

''اس کی ضرورت تو نہیں ہے......!!'' میں نے جواب دیا۔ ''لیکن یہ میری ڈیوٹی میں شامل ہے...... اس لئے چیک ضرور کروں گا......!!''

اور پھر میں نے سامان کی پوری لسٹ چھان ماری...... قادر چاچا مجھے ہر چیز سے آگاہ کر رہے تھے۔

پندرہ منٹ بعد ہی میں اس کام سے فارغ ہو چکا تھا...... پھر قادر چاچا نے میری طرف دیکھ کر کہا:

''ایک بات کہوں شکیل بابو......!!''

''جی...... ضرور......!!''

''پہلے یہ بتاؤ کہ ناراض تو نہیں ہو گے......؟''

''بالکل نہیں......!!'' میں نے نفی میں سر ہلایا۔

''نازش بی بی سے دور ہی رہو تو اچھا ہے......!!''

''کیا مطلب؟'' میں چونکا۔

قادر چاچا نے چاروں طرف کا اچھی طرح جائزہ لیا اور پھر آہستہ سے بولے:

''میں آپ کو بالکل ٹھیک مشورہ دے رہا ہوں......!! کیونکہ نازش صاحبہ اکثر اس گھر میں آنے والے نئے اور جوان ملازموں سے میل جول بڑھاتی ہیں۔ لیکن جب کنور صاحب کو اس کا علم ہوتا ہے، تو نازش صاحبہ کا تو کچھ نہیں بگڑتا، البتہ نوکر اپنی نوکری سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے......!!''

''اوہ......!!'' میرے منہ سے نکلا۔

یہ ایک نئی بات سامنے آئی تھی......!! اور اس بات سے نازش کا کردار بھی میرے سامنے اجاگر ہو گیا......!! لیکن بہر حال اپنی اسی عادت کی بنا پر اس نے مجھے جو راز بتایا تھا...... اس نے موجودہ صورت حال کی کایا ہی پلٹ دی تھی......!!

اس گھر میں کسی تہہ خانے کی موجودگی اور پھر شیطان کی خیالی تصویر کا وجود اس بات کی گواہی تھی کہ کنور یقیناً کالے شیطان کا پجاری تھا......!!

میں جبران کو فی الحال ان باتوں سے آگاہ نہیں کرنا چاہتا تھا...... کیونکہ میں پہلے اس تہہ خانے کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا پسند کرتا...... اور اب اس کے لئے بھی انتظار کرنا تھا......!!!

''کیا میری بات بری لگی؟'' قادر چاچا کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی تو میں چونک اٹھا:

''نن...... نہیں......!!'' میں فوراً بولا: ''ایسی کوئی بات نہیں ہے قادر چاچا؟''

''تمہارے خون میں ابھی جوانی دوڑ رہی ہے۔'' وہ بولا۔ ''اور میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ یہ ایسی عمر ہوتی ہے کہ ذرا ذرا سی بات کھلتی ہے......!!''

''ایسا کچھ نہیں ہے قادر چاچا......!!'' میں نے جواب دیا: ''میں تو آپ کی بات سن کر سوچ میں ڈوب گیا......!!''

''ضرور سوچو......!! لیکن ایسا سوچنا، جو تمہارے حق میں بہتر ہو...... جو لوگ یہاں کام کرتے ہیں اور اپنے کام سے کام رکھتے ہیں، کنور صاحب اسے کبھی نوکری سے نہیں نکالتے......!! مجھے ہی دیکھ لو......!!''

''اگر ایسا ہے، تو وہ اپنی بیٹی کی روک ٹوک کیوں نہیں کرتے؟'' میں نے کچھ سوچ کر سوال کیا۔

''یہ ان کے بس کی بات نہیں ہے بیٹا......!!''

''میں سمجھا نہیں......!!''

''دراصل نازش بٹیا کو وہ صرف پیار دے سکتے ہیں، کیونکہ نازش کی ماں اب دنیا میں نہیں ہے اور مرتے وقت کنور صاحب نے اپنی بیوی سے وعدہ کیا تھا کہ وہ نازش کو ہمیشہ پیار دیں گے......!!!''

''اوہ......!! لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ جوان لڑکوں کو کھلونا بنا لیا جائے......!! اور جب چاہا ان کی بے عزتی کر دی جائے......!!''

''ہوں......!!'' قادر چاچا نے سر ہلایا: ''میں تمہاری بات سے اتفاق کرتا ہوں، کنور صاحب میں اس کے علاوہ اور کوئی برائی نہیں ہے......!! کہ وہ نازش کی ہر جائز اور ناجائز خواہش کو پورا کر دیتے ہو......!!!''

''خیر......!! میں اب احتیاط کروں گا......!! کیا میں آپ سے ایک بات پوچھ سکتا ہوں......؟''

''ضرور پوچھو......!!''

''کیا اس گھر میں کوئی ایسا فرد ہے، جو کنور صاحب کی جان لینا چاہتا ہو؟''

میری بات سن کر قادر چاچا نے حیرت سے میری طرف دیکھا تھا۔

کافی دیر اسی طرح خاموش رہے، پھر میں نے ہی کہا تھا:

''کیا ہوا قادر چاچا......؟ آپ خاموش کیوں ہو گئے؟''

''تم نے بات ہی ایسی کی ہے۔'' وہ طویل سانس لے کر بولے: ''کم از کم اس گھر کے افراد کے بارے میں تو میں کوئی ایسی بات سوچ بھی نہیں سکتا......!!''

''اچھا......!!''

''ہاں...... اور تمہیں یہ خیال کیسے آیا؟''

''بس یونہی......!!'' میں نے بات اڑا دی:

''ھدیہ''

حدیث شریف میں ہے کہ اگر کوئی تمہاری خاطر داری کو خوشبو، تیل، دودھ یا تکیہ پیش کرے کہ خوشبو سونگھ لو یا تیل لگا لو۔ دودھ پی لو یہ تکیہ کمر سے لگا لو تو قبول کر لو۔ انکار و عذر مت کرو کیونکہ ان چیزوں میں کوئی لمبا چوڑا احسان نہیں ہوتا جس کا بار تم سے نہیں اٹھ سکتا ہو اور دوسرے کا دل خوش ہو جاتا ہے۔

(بحوالہ ترمذی، اسوۂ رسول اکرم ﷺ)

(ایس حبیب خان۔ کراچی)

"بڑے گھروں کی اکثر یہ کہانی ہوتی ہے، کیونکہ جائیداد کا معاملہ ہوتا ہے......!!"

"یہاں ایسا کچھ نہیں ہے......!! کیا تم ان کے بھائی اور چچا وغیرہ سے نہیں ملے؟"

"ہو چکی ہے سب سے میری ملاقات......!!"

"وہ سب بے چارے بہت سیدھے اور اپنی مستی میں مست ہیں...... وہ کنور صاحب کے دشمن نہیں ہو سکتے...... میرا خیال ہے کہ تمہیں خود بھی اندازہ ہوگا۔"

"جی ہاں...... بالکل......!!"

"بس پھر بات ختم......!!"

"اب ایک بات اور......!!"

"وہ بھی پوچھ ڈالو......!!"

"کیا یہاں کوئی تہہ خانہ ہے؟"

قادر چاچا بری طرح چونکے تھے اور پھر فوراً ہی سنبھل کر بولے: "تہہ خانہ کیا مطلب؟"

"میرا مطلب ہے کہ کوئی ایسی جگہ، جو سب کی نگاہوں سے اوجھل ہو......!!"

"نہیں......!!" انہوں نے نفی میں سر ہلایا: "میں نے اتنے سالوں سے یہاں ایسا کچھ نہیں دیکھا......!!"

ان کا لہجہ چغلی کھاتا ہوا صاف محسوس ہو رہا تھا، یوں بھی وہ تہہ خانے کے نام پر جس طرح چونکے تھے، اسی سے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ انہیں ضرور اس بارے میں معلوم ہے، لیکن اب ان پر یہ بات ظاہر کرنا بھی کافی ٹیڑھا مسئلہ تھا...... چنانچہ مجھے انجان بنے رہنے میں ہی اپنی عافیت دکھائی دی۔

ان سے چند اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد میں وہاں سے کھسک لیا تھا......!!!

☆......☆......☆

میں رات کا کھانا کھانے کے بعد اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا حالات و واقعات پر غور کر ہی رہا تھا کہ اچانک ہی کسی نے دروازے پر دستک دی۔

"کون ہے......؟ اندر آ جاؤ......!!" میں نے وہیں سے پکارا۔

دروازہ کھلا اور میں سنبھل کر بیٹھ گیا، آنے والی نازش تھی اور اس کے تیور کافی بگڑے ہوئے دکھائی دے رہے تھے......!!

وہ مجھے گھورتی رہی اور پھر دھم سے آ کر میرے بیڈ پر ہی ڈھیر ہو گئی۔

میں بوکھلا کر اٹھ کھڑا ہوا:

"کیوں......؟ کیا میں چھوت کی کوئی بیماری ہوں؟" وہ مزید بھڑک اٹھی۔

"ہرگز نہیں......!!!"

"تو پھر...... تم دور کیوں بھاگے؟"

"میں نے سوچا کہ آپ کو آرام کرنے کے لئے پورا بیڈ ہی دے دوں؟"

"عجیب بے وقوف انسان ہو۔" وہ تلملا اٹھی: "میں پاگل ہوں، جو اپنا کمرہ چھوڑ کر یہاں آرام کرنے آؤں گی......!!"

"تو پھر......؟"

"میں تو تمہاری خبر لینے آئی ہوں......!! تم دو دنوں سے کہاں غائب ہو؟"

"اسی گھر میں تو ہوں......!!"

"ہو گے......!! لیکن تم مجھ سے کترا رہے ہو......!!"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے نازش......!!" میں نے فوراً ہی بے تکلفی کا مظاہرہ کیا: "میں آج کل مصروف ہوں......!! کنور صاحب نے میری ڈیوٹی کافی سخت کر دی ہے۔"

"تم بکواس کر رہے ہو......!!" وہ دھاڑی: "ضرور کسی نے تمہارے کان بھرے ہیں......!!"

"بالکل نہیں......!!" میں نے اپنا دایاں کان آگے کر دیا: "دیکھ لو...... خالی تو پڑا ہے......!!"

"میں اچھی طرح سمجھتی ہوں...... تمہیں ڈیڈی کے لاڈلے قادر نے ہی میرے خلاف بھڑکایا ہوگا...... !! میں خوب سمجھتی ہوں......!!"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے نازش......!!!"

"تم جھوٹ بول رہے ہو...... اچھا چلو مت بتاؤ...... میں بھی تمہیں وہ تہہ خانہ ہرگز نہیں دکھاؤں گی!!"

یہ سن کر میری سٹی گم ہو گئی۔ نازش اگر اپنی بات پر اڑ جاتی تو میں اس اہم راز سے محروم ہی رہ جاتا، چنانچہ میں جلدی سے بولا:

"اچھا چھوڑو سب کچھ...... یہ بتاؤ کہ تم سے کل کس وقت ملاقات ہو سکتی ہے...... جلدی بتاؤ......!!"

"کل رات میں......!!"

"رات میں...... کہاں؟" میں حیرت بولا۔

"کل ڈیڈی شہر سے باہر جا رہے ہیں۔ تم کل رات کو میرے کمرے میں آ جاؤ گے...... ہم بیٹھ کر خوب باتیں کریں گے...... محبت بھری باتیں......!!"

"اچھا...... ان کی واپسی کب ہوگی؟"

"رات میں تو ہرگز نہیں آئیں گے۔" وہ مسکرائی: "تمہارا دم کیوں نکلا جا رہا ہے؟"

"میں تو یونہی پوچھ رہا تھا۔" میں جلدی سے بولا۔

"میں سب سمجھتی ہوں...... خیر...... ان کی واپسی دو دن بعد ہوگی، اس لئے کل رات تم بے فکری سے مجھے کمپنی دے سکتے ہو......!!"

"ٹھیک ہے...... میں آ جاؤں گا......!!"

"گڈ...... یہ ہوئی نا بات......!!" وہ خوش ہو کر بولی۔

پھر وہ یک دم ہی اٹھ کھڑی ہوئی اور دروازے کی طرف لپکی، پھر اس نے دروازہ کھولا اور الوداعی انداز میں ہاتھ ہلا کر بولی:

"میں کل تمہارا انتظار کروں گی......!!"

پھر وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔ میرے گلے سے ایک طویل قسم کی سانس برآمد ہوئی تھی۔

ابھی نازش کو گئے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ ایک ملازم نے پیغام دیا:

"آپ کو کنور صاحب بلا رہے ہیں۔"

"ابھی......؟" میں چونک کر بولا۔

"جی ہاں...... وہ اپنے کمرے میں موجود ہیں۔"

"یا اللہ رحم!!" میں آہستہ سے بڑبڑایا۔ پھر نوکر کی طرف دیکھ کر بولا: "ٹھیک ہے...... تم جاؤ میں آتا ہوں......!!"

ملازم چلا گیا اور میرے ذہن میں کئی طرح کے وسوسے گردش کرنے لگے، سب سے زیادہ ڈر اس بات کا تھا کہ کہیں انہیں نازش کی یہاں آمد کے بارے میں معلوم نہ ہو گیا ہو......!! اس صورت میں کافی سبکی ہوتی...... میں یہاں ملازم کا روپ دھار کر مکمل طور پر ڈرامے بازی کر رہا تھا...... لیکن کنور صاحب اگر بے عزت کر کے مجھے یہاں سے نکالتے تو یہ حادثہ مکمل طور پر حقیقت پر مبنی ہوتا......!!!

بہر حال میں جل تو جلال تو کا ورد کرتا ہوا کنور صاحب کی طرف روانہ ہو گیا۔

وہ اپنے کمرے میں موجود تھے، اور پہلی بار میں نے ان کا موڈ قدرے بگڑا ہوا دیکھا تھا۔

لیکن ہلکی سی مسکراہٹ ہر وقت ان کے ہونٹوں کا محاصرہ کئے رہتی تھی، لیکن آج وہ مسکراہٹ یکسر غائب تھی اور ماتھے پر شکنوں کا جال بچھا ہوا تھا......!!

"تم نے میرے دشمن کے سلسلے میں کوئی قدم اٹھایا؟" کنور صاحب نے مجھے دیکھتے ہی سوال کیا۔

"جی نہیں......!! لیکن میں نے کام شروع کر دیا ہے۔ مگر ابھی تک کوئی سراغ نہیں مل سکا......!!"

"ہوں......!! کیا میرے قتل سے پہلے کوئی سراغ ملنے کا امکان ہے؟"

"میں...... سمجھا نہیں......!!"

کنور صاحب نے کوئی جواب دیئے بغیر سائیڈ میں رکھی ہوئی میز کی دراز کھولی اور پھر کوئی چیز نکال کر میرے سامنے رکھ دی۔

میں نے دیکھا یہ ایک چمکدار خنجر تھا، جس کا دستہ سفید رنگ کا تھا اور یقیناً وہ کسی دھات سے بنا ہوا تھا۔

خنجر کی نوک سے ایک کاغذ کا پرزہ لٹک رہا تھا...... میں نے ہاتھ بڑھا کر کاغذ کو کھولا تو اس پر جلی حروف میں لکھا ہوا تھا۔

''کنور شہریار......!! جس طرح آج یہ تیز دھار کا خنجر تمہارے کمرے کی دیوار میں گھونپا گیا ہے، کل بالکل اسی انداز میں تمہارے دل میں بھی اتر سکتا ہے...... اس لئے تمہاری خیریت اسی میں ہے کہ تم جتنی جلد ہو سکے، اس گھر سے چلے جاؤ......!!! ورنہ تمہاری جانی نقصان کی ذمہ داری صرف تم پر ہی عائد ہوگی......!!

فقط...... تمہارا دشمن۔''

یہ تحریر کافی خوب صورت تھی، لکھنے والے کی خوش خطی کی داد دینے کو جی چاہ رہا تھا۔

تحریر پڑھ کر میں نے حیرت زدہ انداز میں کنور صاحب کی طرف دیکھا:

''یہ دونوں چیزیں آپ کو کہاں سے ملیں؟''

''دروازے سے......!!'' کنور صاحب نے جواب دیا: ''میں تھوڑی دیر پہلے ہی باہر سے ہوا خوری کر کے واپس پلٹا، تو یہ خنجر دروازے میں اس طرح گڑا ہوا تھا کہ یہ کاغذ اس کے ساتھ لٹک رہا تھا......!!''

''اوہ...... اس کا مطلب یہ ہے کہ صورت حال کافی سنگین ہے۔'' میں بڑبڑایا۔ ''مجھے سب سے زیادہ خوف اس بات سے ہے کہ میں اپنے ہی گھر میں غیر محفوظ ہوں۔'' اس کے لہجے میں تشویش تھی۔ ''اگر یہ معاملہ باہر کا ہوتا۔ تو پھر بھی غنیمت تھا، کیونکہ میرے سینکڑوں دوست ہیں۔ تو ان کے درمیان میں ایک آدھ دشمن بھی ضرور موجود ہوگا......!! لیکن دشمن تو میرے گھر میں موجود ہے، گویا میں نے کسی سانپ کو اپنی آستین میں پال لیا ہے۔''

''یہ تو سامنے کی بات ہے......'' میں آہستہ سے بولا۔ ''کیا آپ اس سلسلے میں کسی ماہر شخص سے رابطہ نہیں کر سکتے......؟''

''نہیں......!!'' وہ فوراً بولا۔

''کیا میں اس کی وجہ پوچھ سکتا ہوں۔''

''وجہ صرف یہ ہے کہ مجھے اپنے گھر کے ہر فرد سے پیار ہے......!!'' اس کے لہجے میں افسردگی تھی: ''اور میں نہیں چاہتا کہ میرے دشمن کا راز منظر عام پر آ جائے...... کیونکہ اس کی بدولت بدمزگی پھیل سکتی ہے اور دلوں میں شک کی بنا پر سب کچھ بیکار ہو جائے گا...... میری برسوں کی محنت تباہ اور برباد ہو جائے گی......!!!''

''اوہ...... اچھا......!!''

''ہاں شکیل......!!'' اس نے آہستہ سے کہا: ''میں نے کچھ سوچ کر ہی اس سلسلے میں تمہارا انتخاب کیا ہے...... تم مجھے ایک باصلاحیت نوجوان دکھائی دیتے ہو، جو سب میں گھل مل کر اس راز کا کھوج لگا سکتے ہو...... اور میرے دشمن کی نشان دہی کی صورت میں چپ چاپ مجھے خبر دے سکتے ہو......!! اس کے بعد میں جانوں اور میرا کام جانے......!!''

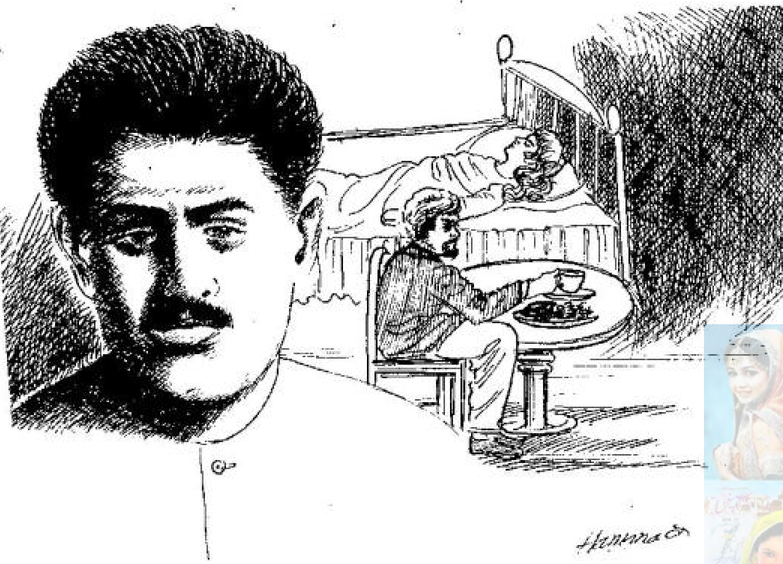
''کیا میں یہ تحریر اپنے پاس رکھ سکتا ہوں؟'' میں نے کچھ سوچ کر کہا۔

''بالکل......!! وہ فوراً بولا: ''اور اب میں تم سے ایک بات کہہ دینا چاہتا ہوں......!!''

''جی...... بولیں......!!'' میں کنور صاحب کی طرف متوجہ ہو گیا۔

اس نے کچھ دیر توقف کیا اور پھر سرسراتی ہوئی آواز میں بولا: ''میں کچھ دنوں کے لئے شہر سے باہر جا رہا ہوں...... لیکن جلد ہی میری واپسی ہوگی، کیونکہ اگلے ہفتے میری سالگرہ ہے جو کہ میں ہمیشہ اپنے دوستوں کے ساتھ مناتا ہوں......!! اب تمہارے پاس اس تقریب تک کی مہلت ہے......!! تم میرے دشمن کا پتہ لگاؤ...... میں تمہیں ایسا انعام دوں گا کہ شاید تم نے کبھی سوچا بھی نہ ہوگا......!! لیکن اگر تم اپنی کوشش میں ناکام رہے، تو پھر میں تمہیں نوکری سے بے دخل کرنے کا حق رکھتا ہوں......!! تمہیں اسی دن یہاں سے رخصت ہونا پڑے گا...... بولو منظور ہے......؟''

(جاری ہے)



ھارون پاشا

ناصر محمود فرہاد۔ فیصل آباد

سامنے بیٹھے بارعب شخص نے نوجوان سے کہا، اب تمہیں اس شرط پر اجازت ملے گی کہ تم نے اس چار دیواری کے اندر جو کچھ بھی دیکھا وہ تم نہ کسی کو بتاؤ گے اور نہ کسی سے اس کا ذکر کرو گے کیونکہ......

اچھی کہانیوں کے متلاشی لوگوں کے لئے عجیب و غریب ذہن پر سکتہ طاری کرتی کہانی

میں یہ کہانی آپ کو سناتے وقت صرف یہ بتاؤں گا کہ میں نے اپنی آنکھوں سے کیا دیکھا اور کانوں سے کیا سنا۔ میں کوئی وضاحت نہیں دوں گا، صرف کہانی سناؤں گا۔ کسی نتیجے پر پہنچنا آپ کا اپنا کام ہے کیونکہ میں جو خود ان واقعات سے گزرا آج تک ان کو کوئی منطقی انجام نہیں دے سکا بہرحال یہ کہانی اس وقت شروع ہوتی ہے جب میرا ہندوستانی نژاد انگریز دوست ''داؤد الفرید'' قاہرہ آیا۔ داؤد کی ماں اسکاٹش جب کہ باپ ہندوستانی تھا۔

موسم بہار شروع ہو چکا تھا اور ہم سارے دوست ایک کلب میں جمع تھے۔ وہ اتوار کی رات تھی اور کھانے پینے سے فارغ ہو کر اب بے تکی گفتگو ہو رہی تھی۔ ہر کوئی اپنی بات سنا رہا تھا کہ آج کل وہ کیا کر رہا اور کیوں کر رہا ہے، کیا کرنا چاہ رہا تھا اور قسمت نے کیا بنا دیا۔ کوئی انجینئر بننا چاہتا تھا اور قسمت نے اس کو ملاح بنا دیا جو ڈاکٹر

کچھ سوچتا دروازے کے باہر تالے میں چابی گھومنے کی آواز ابھری اور پھر ایک ہلکی سی چرچراہٹ کے ساتھ دروازہ کھل گیا۔

دروازہ کھلتے ہی طوطے جیسی ناک والا ایک کبڑا شخص لالٹین اٹھائے اندر داخل ہوا۔ اس کے پیچھے چمکتی تلواریں سونتے دو محافظ اندر آ کر دروازے کے دائیں بائیں پوری طرح چوکنے کھڑے ہوگئے۔ ان کے پیچھے ایک چوتھا شخص بھی تھا جو سیاہ لبادے اور سفید پگڑی میں ملبوس بہت معزز نظر آرہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بڑی بڑی چابیوں کا ایک گچھا تھا۔ اس شخص نے مجھے عربی زبان میں اٹھنے اور اپنے پیچھے آنے کو کہا۔ مجھے احساس تھا کہ اس وقت کسی قسم کی مہم جوئی مناسب نہ ہوگی لہٰذا میں نے چپ چاپ ان کی ہر بات پر عمل کیا۔ باہر آتے ہی میرے پیچھے چوبی دروازہ دوبارہ مقفل ہوگیا۔ دونوں تلوار بردار میرے دائیں بائیں چل رہے تھے۔ پہلے سیڑھیاں اوپر اور پھر نیچے گئیں۔ کچھ دیر خالی راہ داریوں میں چلنے کے بعد ہم ایک برآمدے میں پہنچے جس کا فرش قیمتی قالین سے ڈھکا ہوا تھا اور وہاں مناسب روشنی کا انتظام بھی تھا۔ بڑی پگڑی والا ایک بھاری دروازے کے سامنے رک گیا۔ اس کی ہلکی سی دستک دینے پر یہ بھاری دروازہ بے آواز کھل گیا۔ طوطے کی ناک والا کبڑا باہر ہی رہ گیا مگر دونوں تلوار بردار محافظ اور پگڑی والا مجھے لے کر اندر داخل ہوگئے۔ یہ ایک سجا سجایا بہت بڑا ہال تھا۔ فرش پر قیمتی پتھر لگا ہوا تھا اور بیش قیمت غالیچے بڑے فنکارانہ انداز میں جابجا پڑے ہوئے تھے۔ سر کے اوپر چھت میں ایک بہت بڑا گنبد تھا جس میں لگے رنگین شیشوں سے روشنی چھن چھن کر اندر آرہی تھی۔ اس گنبد کے عین نیچے سنہری زنجیروں سے بندھا روشنی کا فانوس لٹکا ہوا تھا جس میں معطر تیل جل رہا تھا۔ پورے کمرے میں ہلکی نیلی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ کمرے میں منقش فرنیچر پڑا تھا۔ دیواروں میں بنے طاقچوں میں چینی مٹی کے پتلے پتلے خوبصورت نیلے گلدان بڑی نفاست سے پڑے ہوئے تھے۔ دیواروں پر خوب صورت خوش نما سنگ مرمر کی ٹائلیں تھیں۔ جابجا چھت کو سہارا دینے کے لیے کمرے میں سنگ مرمر کے باریک باریک ستون کھڑے تھے۔ اس کمرے میں چلتے ہوئے میرے جوتوں کی آہٹ گونج رہی تھی۔ ہم اسی ہال میں بنے ایک ایسے دروازے کے سامنے رکے جس پر دبیز پردہ پڑا ہوا تھا۔ پگڑی والے نے دروازے پر مخصوص انداز میں دستک دی تو اندر سے تالی کی آواز سنائی دی جسے سنتے ہی پگڑی والے نے پردہ اٹھایا اور ہم ایک چھوٹے سے کمرے میں داخل ہوئے۔

کمرے میں روشنی بہت ہلکی تھی اور پورے کمرے میں اگربتی کی خوش بو پھیلی ہوئی تھی۔ کمرے کی تزئین و آرائش میرے تخیل سے زیادہ خوب صورت اور دل کش تھی۔ کمرے میں موجود ہر چیز ہلکے کہربا رنگ کی تھی۔ میرے سامنے ایک بہت بڑا دیوان پڑا تھا جس پر مشرقی انداز کے نقش و نگار بنے ہوئے تھے اور اس دیوان پر ایک عظیم الجثہ بوڑھا تقریباً دھنسا ہوا نیم دراز تھا۔ اس کی لمبی گھنی داڑھی تھی اور اس کے سر پر ایک بڑی سی سفید پگڑی تھی۔ دیوان کے قریب ہی حقہ دھرا تھا جس کی سنہری نے سے جب اس نے گہرا کش کھینچا تو پورے کمرے میں خوش بودار تمباکو کی مہک پھیل گئی۔ دیوان کے پیچھے ایک جوان عورت کھڑی تھی جس کا چہرہ اور سراپا جاذب نظر اور ہیجان انگیز تھا۔ اس کا لباس چھپاتا کم اور دکھاتا زیادہ تھا جس کی وجہ سے وہ کوئی فلمی ہیروئن نظر آرہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں مور کے پروں سے بنا ایک پنکھا تھا جس سے وہ اس بوڑھے شیخ کو ہوا دے رہی تھی۔ ایک اور حور شمائل بوڑھے شیخ کے حقے کی نے کو اپنے ہاتھ میں تھامے ہوئے تھی اور وقتاً فوقتاً اسے شیخ کے ہونٹوں سے لگاتی تو وہ کش لینے لگتا پھر اشارہ پاتے ہی وہ کنیز حقے کی نے کو ہٹا لیتی۔ ایک تیسری قیامت بربط بجا رہی تھی اور خود ہی اس کے لے پر مدہوش انداز میں رقص کر رہی تھی۔ جب میں شمشیر برداروں کے ساتھ اس کمرے میں داخل ہوا مجھے یوں لگا جیسے میں کسی الف لیلوی ماحول میں آ گیا ہوں۔ پگڑی والا آگے بڑھا اور دیوان کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور سر جھکاتے ہوئے کہنے لگا۔ ”ہم ایک بد بخت کو آپ کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے لائے ہیں۔“

اس کی بات سنتے ہی مجھے یقین ہوگیا کہ بلاشبہ میں ہارون پاشا کے سامنے کھڑا تھا۔ اس نے نگاہ اٹھا کر مجھے دیکھا اور کافی دیر تک مجھے گھورتا رہا پھر اس کے چہرے کے تاثرات میں تبدیلی آنے لگی اور اس نے اپنے قدموں میں پڑے پگڑی والے شخص کو مخاطب کیا۔ ”کیا میرے غلام اس خبیث چڑیل اور اس کے شیطان ساتھی کو پکڑ کر لے آئے؟۔“

”عالی جاہ۔۔۔اب زیادہ دیر نہیں لگے گی وہ آنے ہی والے ہوں گے۔“ پگڑی والے نے جواب دیا۔

”نہیں فوراً میرے سامنے پیش کرو۔“ پاشا نے حکم دیا۔ ”اور کیا اس دوسرے شیطان نے اپنے جرم کا اعتراف کرلیا؟۔“

”وہ بے ہوش پڑا ہے عالی جاہ لیکن اس نے اعتراف کیا ہے کہ ان دونوں حرام خوروں کے فرار میں اس کا ہاتھ تھا۔“

”دفع ہو جاؤ۔۔۔۔“ پاشا چیخا۔ پھر دھیمی آواز میں بولا۔ ”لیکن پہلے اس قیدی کی بیڑیاں کھول دو۔“ ایک تلوار بردار نے اپنی تلوار کی دھار سے میری رسیاں کاٹ ڈالیں۔ پاشا نے اپنے دونوں بازو ایک مخصوص انداز میں پھیلائے تو وہ سب کمرے سے باہر نکل گئے۔ اب کمرے میں صرف میں، ہارون پاشا اور پنکھا جھلنے والی آفت موجود تھی۔

☆........☆........☆

ہارون پاشا نے خلاف توقع مجھے اپنے قریب آنے اور دیوان کے قریب پڑی ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں نے حیران ہوتے ہوئے اس کے حکم کی مشینی انداز میں تعمیل کی۔ اس وقت میرا ذہن بہت پریشان تھا اور میں کوئی فوری فیصلہ کرنے کی صلاحیت سے عاری تھا۔ پاشا نے میری طرف دیکھا اور کہنے لگا۔ ”تم یہاں کیسے آئے ہو۔۔۔یہ تو میں بعد میں پوچھوں گا مگر میرے حرم میں ہونے والی ایک کارروائی سے میں بہت پریشان ہوں۔ کچھ دن پہلے میرا بہت نقصان ہوا۔

ایک دوشیزہ جسے میں نے سونے میں تول کر خریدا تھا اس نے مجھے اپنے پیار کے پھندے میں پھنسا لیا اور میں نے اسے حرم کی رانی کا درجہ دے دیا مگر وہ نیچ ایک ایسے شخص پر مرمٹی جس کے حسب نسب کا بھی علم نہیں اور اب چند دن سے دونوں غائب ہیں، مگر کوئی بات نہیں وہ بچ کر جائیں گے کہاں۔ میرے غلام انہیں پاتال کی تہ سے بھی نکال لائیں گے۔ تمہارا جرم تو اس کے مقابلے میں بہت چھوٹا ہے مگر اب چھوٹی سی حرکت کو بھی معاف نہیں کیا جاسکتا۔“

کمرے کے ماحول اور اگربتی کی خوشبو کی وجہ سے میرا سر چکرا رہا تھا اور میں کچھ سوچ بھی نہیں پا رہا تھا۔ صرف دیکھ رہا تھا، سن رہا تھا، سونگھ رہا تھا مگر میرا ذہن پوری طرح کام نہیں کر پا رہا تھا۔ پاشا نے تین بار تالی بجائی تو پگڑی والا آنکھیں جھکائے دوبارہ اندر داخل ہوا۔ اسے دیکھتے ہی پاشا ایک دم دھاڑا۔ ”تم لوگ ابھی تک ان بدبختوں کو پکڑنے میں کامیاب کیوں نہیں ہوئے؟۔“

پگڑی والا اپنا سر قالین پر رکھے پوری طرح لرز رہا تھا۔ ”عالی جاہ آپ کا یہ کم ترین غلام خود اس کام کی نگرانی کر رہا ہے۔“

”دفع ہو جاؤ۔۔۔۔“ پاشا چیخا اور پھر اس نے قریب پڑا ایک گلدان اٹھا کر ایک جھٹکے سے اس کے سر پر دے مارا جو اس کی سفید پگڑی سے ٹکرایا اور فرش پر گر کر ٹوٹ گیا۔ اس کے ٹکڑے فرش پر بکھر گئے۔ پگڑی والا بغیر کسی ردعمل کے اٹھا اور سر جھکائے باہر نکل گیا۔

اب پاشا نے دو دفعہ تالی بجائی تو طوطے کی ناک والا کبڑا دونوں تلوار برداروں کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ انہیں دیکھتے ہی پاشا اپنی جگہ پر کھڑا ہوگیا۔ اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے بھی اٹھنے کا اشارہ کیا اور بولا۔ ”آؤ میرے ساتھ۔۔۔ میں تمہیں نقلی پاشا کے قید خانے میں لے کر چلتا ہوں تاکہ تم دیکھ سکو کہ میں اپنے دشمنوں کے ساتھ اور ان لوگوں کے ساتھ جو مجھے دھوکہ دیتے ہیں کیا سلوک کرتا ہوں۔ یقیناً وہ میرے غضب

۔وہ علاقہ جو کبھی سوتا نہیں تھا یا پھر شاید کبھی جاگتا نہیں تھا کیونکہ وہاں کچھ بھی زندہ نہ تھا سوائے صدیوں کے اہرم اور مقابر کے۔شام کی ٹھنڈک آہستہ آہستہ چار سو اتر رہی تھی جب میں مرکزی جامع مسجد کے قریب پہنچ گیا۔ایک جگہ ٹیکسی رکوا کر میں نے ڈرائیور کو وہاں انتظار کرنے کو کہا اور خود ٹیکسی سے اتر کر پیدل ہی محل دیکھنے آگے بڑھ گیا۔آس پاس کا نظارہ شاندار تھا۔چاند ابھی ابھی نکلا تھا اور آسمان پر ستارے موتیوں کی مانند چمک رہے تھے۔دریائے نیل کا دھیما دھیما شور اترتی رات کی خاموشی کو نغمگیت بخش رہا تھا۔چودھویں کے چاند کی اس روشنی میں نہائی ہوئی عمارتیں موتیوں کی بنی نظر آرہی تھیں۔

میں قدیم شاندار عمارتوں کو دیکھتا ہوا تنگ گلیوں میں آگے بڑھتا رہا اور چلتے چلتے ایک بلند و بالا دیوار کے سائے میں پہنچ گیا جو اچھی حالت میں تھی اور کسی قلعے کی فصیل معلوم ہورہی تھی۔میں کچھ دور اس کے ساتھ چلتا رہا۔اس دیوار کی دوسری طرف درختوں کی اوپری شاخیں نظر آرہی تھیں۔ایک جگہ ارغوانی پھولوں کی ایک بیل دیوار کے اوپر باہر کی طرف لٹکی ہوئی تھی۔پوری گلی سنسان تھی اگرچہ آس پاس رہائشی عمارتیں تھیں مگر حیرت انگیز طور پر کوئی ذی روح نظر نہیں آرہا تھا۔مجھے یقین تھا کہ یہ ہارون پاشا کے محل کے باغ کی ہی دیوار ہے اس لیے میں دیوار کودنے کے لیے موزوں جگہ تلاش کرنے لگا۔جلد ہی مجھے ایک جگہ مل گئی۔دیوار کے باہر ایک تناور درخت اگا ہوا تھا اور قدرتی طور پر اس کے تنے کی ساخت ایسی تھی کہ اس پر چڑھ کر دیوار کے اوپر پہنچا جا سکتا تھا۔اس لیے چند ہی لمحوں بعد میں دیوار کے اوپر تھا۔دوسری طرف مجھے ایک شاندار باغ نظر آیا جو میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا۔

مجھے یہ سب کسی خواب کا حصہ محسوس رہا تھا بالکل کسی الف لیلوی داستان کی طرح جو کتاب کے صفحات سے نکل کر باہر آگئی ہو۔میں حلفیہ کہتا ہوں کہ میں نے اس قدر دل کش باغ پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ہر درخت ایک ترتیب میں تھا۔پھولوں کے تختے شاعرانہ تخیل کے عکاس تھے۔باغ کے بیچوں بیچ سنگ مرمر کا بنا ایک تالاب تھا اس میں اترنے والی سیڑھیوں کے ساتھ پیتل کی ریلنگ تھی اس پر بھی پھول لپٹے ہوئے تھے۔تالاب کے درمیان پانی کا فوارہ اچھل رہا تھا۔میں بدقت تمام دیوار سے لٹک کر نیچے کود گیا اور تالاب کے قریب جا کر پانی کے اندر جھانکا۔چاندنی روشنی میں ہلکورے لیتا پانی تاروں کی مانند چمک رہا تھا۔پریوں کی داستانوں کی مانند اس خوب صورت باغ کے پیچھے الہ دین کی کہانی جیسا ایک شاندار محل تھا جس کے گنبد اور بالکونیاں عمارت کی چاردیواری سے باہر بالکل نظر بھی نہیں آتی تھیں۔یہ ایک بالکل خفیہ عمارت تھی جو اپنے پورے فسوں کے ساتھ میرے سامنے کھڑی تھی۔اس کا سحر اور دلکشی میں الفاظ میں بیان نہیں کرسکتا۔اس کو میں آپ کے تخیل پر چھوڑتا ہوں کہ آپ خود اس میں رنگ بھر لیں۔

سینکڑوں کھڑکیوں کے رنگین شیشوں سے روشنی چھن کر آرہی تھی۔مجھے یوں محسوس ہورہا تھا کہ شاید میں پریوں کے محل میں گھس آیا ہوں۔میں جہاں کھڑا تھا وہاں چلتے فوارے سے اٹھنے والی پھوار مجھے گیلا کررہی تھی اور میں اس سے بے خبر اپنی آنکھیں مل مل کر اس محل کو دیکھ رہا تھا۔اگر یہ خواب بھی تھا تو مجھے اس پر کوئی حیرت نہ تھی۔مجھے باغ میں کوئی ذی روح نظر نہ آرہا تھا اس لیے میں نے محل میں جھانکنے کا فیصلہ کرلیا۔

مغرب کی جانب عمارت کا قدرے پست اور طویل سلسلہ تھا۔اس طرف درختوں کے سایوں کی وجہ سے قدرے تاریکی تھی جس سے میں نے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور پھر بغیر کسی وقت کے میں اس طرف بلند دیوار کے سائے میں پہنچ گیا۔میرے دائیں طرف دیوار نئی بنی ہوئی محسوس ہورہی تھی مگر بائیں طرف چاند کی روشنی میں دیوار دور تک ایک جیسی نظر آرہی تھی جو ریتلے بلاکوں سے بنی ہوئی تھی اور یقیناً کافی پرانی تھی۔محل کی اصل عمارت تقریباً چالیس گز دور مشرق میں تھی۔جو عمارت میرے سامنے تھی وہ توسیع شدہ تھی اور بظاہر اس کا اصل عمارت سے کوئی تعلق نظر نہیں آرہا تھا۔

میرے سر کے عین اوپر دیوار میں ایک چوکور کھڑکی



تھی جس پر لوہے کی جالی لگی ہوئی تھی۔ابھی میں اگلے قدم کے متعلق سوچ ہی رہا تھا کہ قدموں کی آہٹ نے مجھے چوکنا کردیا جسے سنتے ہی میں نے ایک سایہ میں کھسکنے میں عافیت جانی۔وہاں مجھے پرانی بوسیدہ کالی لکڑی کا ایک دروازہ نظر آیا جس پر لوہے کے موٹے موٹے کیل لگے ہوئے تھے۔اسی وقت ایک خوف ناک چیخ کی آواز نے مجھے بری طرح اچھلنے پر مجبور کردیا۔روح کو جھنجھوڑتی اور خوف کو منجمد کرتی یہ چیخ اسی بند دروازے کے پیچھے سے ابھری تھی پھر کوئی عربی زبان میں منتیں اور التجائیں کرنے لگا۔مجھے یقین ہوگیا کہ قرون وسطیٰ کے طریقے ابھی تک اس مہذب علاقے میں رائج تھے۔چیخ اور التجاؤں کے ساتھ ساتھ کوڑا لہرانے کی آواز بھی مسلسل آرہی تھی جو کچھ دیر بعد رک گئی مگر سسکیوں بھری دھیمی آوازیں ابھی تک آرہی تھیں۔

مجھے اتنا وقت مل گیا تھا کہ اپنے آپ کو جھاڑیوں کے ایک جھنڈ میں چھپا سکوں۔ایک جھٹکے سے یہ بوسیدہ چوبی دروازہ کھلا اور ایک خوف ناک شکل والا حبشی برآمد ہوا جس نے ایک ہاتھ سے ایک نیم بے ہوش مرد کو گردن سے دبوچ رکھا تھا۔وہ اسے کھینچتا ہوا باغ میں لے گیا اور وہاں اسے کسی سبزی کی بوری کی طرح زمین پر پھینک دیا۔

حبشی کا چمک دار سرمئی بدن مجھے ہرکولیس کے جسم کی یاد دلا رہا تھا۔وہ دونوں ہاتھ اپنے کولہوں پر جمائے چپ چاپ کھڑا اس بے ہوش زخمی کی طرف دیکھ رہا تھا۔میں نے بھی تھوڑا سا اوپر اٹھ کر اس کی طرف دیکھا تو مجھے ایک مخدوش شخص کا سفید پڑتا چہرہ نظر آیا جس کے کندھوں پر خراشیں اور لہو جما ہوا تھا۔

تنومند حبشی نے کمرے کی طرف دیکھ کر آہستہ آواز میں کچھ کہا جس کے جواب میں ایک دوسرا حبشی پانی کا جگ لے کر باہر آیا جو اس نے اس بے ہوش زخمی کے چہرے پر انڈیل دیا۔پانی پڑتے ہی قیدی ہڑبڑا کر ہوش میں آگیا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔وہ منہ کھول کر سانس لینے کی کوشش کررہا تھا۔جب اس کی حالت تھوڑی سنبھلی تو حبشی نے دوبارہ اس کی گردن دبوچی اور ایک بار پھر اس کو کمرے کے اندر گھسیٹ لیا۔دروازہ بند ہوتے ہی ایک دفعہ پھر مجھے کوڑا لہرانے کی شائیں شائیں سنائی دینے لگی۔اس کے ساتھ ہی قیدی کی اذیت بھری چیخیں بھی ابھرنے لگیں۔

دروازے کی درزوں سے آنے والی روشنی ظاہر کررہی تھی کہ اس عقوبت خانے کا دروازہ پوری طرح بند نہیں ہوا تھا لہٰذا میں بنا سوچے سمجھے اپنی جگہ سے اٹھا اور پاگلوں کی طرح بھاگتا ہوا اس کمرے کے اندر گھس گیا۔میں نے دیکھا کہ اس قیدی کو ایک ستون کے ساتھ ہاتھ پیچھے کرکے باندھا گیا تھا اور کالا حبشی پوری قوت سے اس پر کوڑے برسا رہا تھا۔ہر ضرب پر اس کے جسم سے خون رس رہا تھا۔میں ایک دم کوڑے مارنے والے پل پڑا اور ایک زوردار مکا اس کے جبڑے پر دے مارا جس سے اس کے دانت جھنجھنا اٹھے۔

ایک ہی وار میں وہ حبشی فرش پر گر گیا اور ٹوٹے ہوئے دانتوں کے ساتھ کھانسنے لگا۔ابھی مجھے اپنی کامیابی پر خوشی منانے کا زیادہ موقع نہیں ملا تھا کہ میری بھی باری آگئی۔دوسرا حبشی ایک جست لگا کر اڑتا ہوا میرے اوپر آن گرا تھا اور ہم دونوں ہی خون آلود فرش پر لڑھکنیاں کھاتے ہوئے ایک دوسرے کی خاطر تواضع، گھونسوں اور لاتوں سے کرنے لگے۔قریب تھا کہ وہ بھی اپنے ساتھی کے ساتھ جا لیٹتا مگر نہ جانے کہاں سے ایک موٹا ڈنڈا اس بدبخت کے ہاتھ لگ گیا جو اس نے بغیر کسی تکلف کے میرے سر میں جڑ دیا۔کچھ دیر تو میری آنکھوں کے سامنے تارے ناچتے رہے پھر اماوس کی گہری رات چھا گئی۔

جب میرے حواس دوبارہ بحال ہوئے تو میں نے اپنے آپ کو رسیوں سے بندھا ہوا پایا۔میرا جسم بری طرح دکھ رہا تھا اور سر گھوم رہا تھا۔میں نے سوچا شاید میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں مگر پھر مجھے اپنے آپ کو سمجھانے میں خاصی دقت ہوئی کہ یہ خواب نہیں ہے۔میں نے اِدھر اُدھر دیکھا تو احساس ہوا کہ میں ایک نیم تاریک چھوٹے سے پتھریلے کمرے میں قید تھا جس میں کوئی کھڑکی یا روشن دان بھی نہیں تھا۔صرف ایک چھوٹا سا لکڑی کا مضبوط دروازہ تھا جو یقیناً باہر سے بند تھا۔اس سے پہلے کہ مزید

دوسرے قیمتی جواہرات دستیاب تھے۔ کچھ ہی دیر میں میری سمجھ میں آگیا کہ اب یہاں میری موجودگی فضول اور اضافی ہے اور دوپہر کے کھانے سے پہلے ان کو اس دکان سے نکالنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔ معاملہ جوہری اور خواتین کے ہاتھ میں تھا اس لیے کچھ دیر بعد میں وہاں سے اٹھ گیا اور ان کے فارغ ہونے تک اپنے ایک واقف دکان دار سے ملنے چلا گیا جس کا نام حسن تھا اور اس کی دکان ''سوق العطارین'' یعنی عطر فروشوں کے بازار میں تھی جو وہاں سے بیس گز سے زیادہ دور نہ تھا۔

حسن ایک بے حد پراسرار شخصیت کا مالک ہے۔ وہ اپنی نیم تاریک دکان کے اندر نیم دراز، خوشبودار تمباکو کے کش لگاتا نیم وا آنکھوں سے باہر بازار میں ہر آتے جاتے کو مدہوش انداز میں دیکھتا رہتا۔ میں جب اس بازار میں داخل ہوا تو مجھے گلی کی نکڑ پر ایک بڑی سی لیموزین کھڑی نظر آئی۔ کار بالکل نئی نویلی اور چم چم کر رہی تھی۔ کار کے پاس ہی اپنی یونیفارم سے ڈرائیور نظر آنے والا شخص چوکنا کھڑا تھا۔ اس کا جسم فربہ تھا اور یونیفارم خاصی قیمتی نظر آرہی تھی۔ اس ڈرائیور سے کچھ دور ایک دکان کے سامنے مسلح گارڈ چوکنا کھڑا تھا۔ یہ دکان حسن کی تھی اس لیے میں سمجھ گیا کہ کسی مقامی پاشا کے حرم سے کوئی خاتون خریداری کرنے نکلی ہے۔

میں جب حسن کی دکان کے سامنے پہنچا تو ''وہ'' دکان سے باہر نکل رہی تھی۔ وہ ایک دراز قد کیم شحیم خاتون تھی جو اپنے بھاری جسم کے باوجود دلکش و پرکشش تھی۔ وہ روایتی عرب لبادے میں ملبوس تھی جو اس کی جوانی اور حسن کو چھپانے میں مکمل ناکامی کا شکوہ کرتا دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے چہرے پر یشمک تھا۔ جب وہ میرے قریب سے گزری تو ہوا کے ہلکے سے جھونکے سے اس کا یشمک اپنی جگہ سے سرکا تو اس نے نظر اٹھا کر اپنی غزال جیسی سیاہ آنکھوں سے مجھے دیکھا تو دل کے ساتھ ساتھ میرے قدم بھی اپنی جگہ جامد ہو کر رہ گئے۔ وہ ایک انداز دلربائی سے چلتی ہوئی میرے قریب سے گزری اور اپنی کار کی طرف چلی گئی۔ کار تک جانے کے لیے جب وہ میرے قریب سے گزری تو اس کا پورا سراپا میری نگاہ میں سما گیا۔

دودھیا یشمک کے نیچے یاقوتی لبوں کی ایک جھلک، بیضوی تراشیدہ چہرہ، دل کش مصری آنکھیں، اٹھتی ہوئی ناک۔ ریشمی لباس اور مدہوش کردینے والی عطر کی خوشبو کا جھونکا جو اس کے سراپے سے لپٹ لپٹ کر اٹھ رہا تھا۔ اس کے پیچھے اس کی خادمہ سامان اٹھائے تقریباً بھاگی چلی جارہی تھی۔ ڈرائیور نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا تو کار کے اندر بیٹھتے ہوئے اس نے کچھ اس طرح سے میری طرف دیکھا کہ میرا دل اچھل اچھل کر شور کرنے لگا۔ پھر مجھے آس پاس کے ماحول کا ادراک اس وقت ہوا جب کار گلی سے باہر نکل گئی۔ میں جانتا تھا کہ میرے وہ مہمان جو خریداری میں مصروف ہیں مزید ایک دو گھنٹوں سے پہلے فارغ نہیں ہوں گے اس لیے میں مطمئن ہو کر حسن کی دکان میں گھس گیا اور اسے دیکھتے ہی پوچھا۔ ''کیا یہ کوئی شاہی گاہک تھی؟''

حسب توقع، حسن نے میری بات کا کوئی جواب دینے کی بجائے میری طرف بے نیازی سے دیکھا اور ایک نشست کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''بیٹھ جاؤ۔۔۔ آج کافی دن بعد ادھر کا چکر لگا۔''

میں حسن کی عادت سے بخوبی واقف تھا اس سے کوئی بات اگلوانا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ اس نے اپنے ملازم کو کافی بنانے کا اشارہ کیا اور خود اپنی الماری سے قیمتی سگار نکال لایا۔ ایک خود سلگایا اور دوسرا میری طرف بڑھا دیا۔ سگار کے دھوئیں اور کافی کے مزے کے دوران میں ہم اِدھر اُدھر کی باتوں میں مصروف رہے۔ اس دوران میں وہاں کسی گاہک نے بھی مداخلت نہ کی اور میں تقریباً آدھ گھنٹہ تک حسن کی دکان میں رہا۔ اٹھنے سے پہلے جب میں نے اپنا سوال دہرایا تو اس نے اپنی موٹی انگلی اپنے لبوں پر رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور خوف بھری آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولا۔ ''وہ ہارون پاشا کے حرم سے تھی۔'' اس کا انداز رازدارانہ تھا۔

''پاشا کی بیوی۔۔۔؟'' میں نے دریافت کیا۔

''ہاں۔۔۔ یہ زہرہ خاتون تھی پاشا کی تیسری

بیوی۔'' وہ بولا۔

میں نے استفہامیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا تو وہ پوچھنے لگا۔ ''کیا تم پاشا کو نہیں جانتے؟''

''میں نے صرف اس کا نام سنا ہے مگر مجھے اس کی شہرت کا علم نہیں۔'' میں نے بتایا۔

حسن نے اپنا سر ہلایا اور بولا۔ ''ہارون پاشا اپنے خاندان کا آخری چشم و چراغ ہے۔ اس کی رگوں میں شاہی خون دوڑ رہا ہے اور وہ اپنے قدیمی محل میں رہتا ہے جس کا بیشتر حصہ نوتعمیر شدہ ہے۔ یہ محل پرانے قاہرہ میں مرکزی مسجد کے عین پیچھے ہے۔''

''میں نہیں جانتا کہ وہاں کوئی ایسا محل بھی ہے۔'' میں نے حیرت ظاہر کی۔

حسن انگلی کے اشارے سے مجھے چپ رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''ہارون پاشا کے گھر میں آج بھی ان تمام قدیم رسم و رواج کو دیکھا جاسکتا ہے جو اس کے جدِامجد ''ہارون الرشید'' کے عہد میں موجود تھیں۔''

''مگر یہ موٹر کار۔۔۔'' میں نے اس کی توجہ اس طرف دلائی تو وہ بولا۔

''وہ جدید آسائشات کو قبول کرنے سے انکاری نہیں ہے نہ ہی وہ قدامت پسند ہے مگر وہ اپنے رسم و رواج کی حفاظت کرنا خوب جانتا ہے۔ تم نے اس کے محافظ کو دیکھا۔ ہارون پاشا کے حرم کی حفاظت بہت اچھے طریقے سے کی جاتی ہے نہ صرف اس قسم کے محافظ بلکہ محل کے اندر حبشی خواجہ سرا اور غلام بھی موجود ہیں جو گونگے بھی ہیں۔''

''گونگے۔۔۔؟'' میں حیرت سے اچھل پڑا۔

''ہاں۔۔۔ اس کے پاس بے شمار غلام ہیں جو وہ دنیا بھر سے درآمد کرتا ہے۔''

''مگر آج کل تو غلامی کا رواج نہیں ہے۔ یہ سلسلہ تو کبھی کا ختم ہو چکا۔''

حسن مسکرایا اور کہنے لگا۔ ''تم ٹھیک کہتے ہو مگر اس بات کا اس کے غلاموں کو علم نہیں ہے۔ وہ محل کی چار دیواری سے باہر کبھی نہیں دیکھے گئے اور ان کی حفاظت اور نگرانی بھی گونگے ہی کرتے ہیں۔''

میں یہ سب سن کر بہت حیران ہو رہا تھا۔ ''مگر تمہیں یہ سب کیسے معلوم۔۔۔؟'' میں نے استفسار کیا۔

''ان باتوں کا علم مجھے بھی اس وقت ہوا جب ایک کالی رات میرے چچازاد بھائی علی نے ایک بے وقوفانہ قدم اٹھایا۔'' حسن ایک آہ بھرتے ہوئے بولا۔

''اس نے کیا کیا تھا؟''

''وہ پاشا کے باغ کی اونچی دیوار پر چڑھ گیا تھا۔ اس کے لیے اس نے ایک گھنے درخت کی مدد لی تھی جو دیوار کے ساتھ ہی اگا ہوا تھا۔ دوسری طرف اترنے میں اس کی کسی نے مدد کی تھی مگر اس کو دھوکہ دیا گیا اور حبشی گونگے غلام اس کو لے گئے اور وہ۔۔۔۔ پھر اس کے بعد اس کی کوئی خبر نہیں ملی۔''

میں اس کی بات سن کر دم بخود رہ گیا۔ پھر اس سے پہلے کہ اپنا کوئی ردعمل ظاہر کرتا وہ دوبارہ بولا۔

''صرف یہی نہیں۔۔۔ چند دن پہلے میرے چھوٹے بھائی نے میرے منع کرنے کے باوجود یہی غلطی دہرائی۔ وہ پاشا کی چوتھی اور سب سے چھوٹی بیوی کو دیکھ کر اپنے حواس گم کر بیٹھا تھا جو چند دن پہلے میری دکان پر کچھ خریداری کرنے آئی تھی۔ اس کی مدد بھی اسی درخت نے کی اور وہ بھی اب لاپتہ ہے۔'' حسن نے ایک آہ بھری اور نظر اٹھا کر آسمان سے باتیں کرتے جامع مسجد کے میناروں کو دیکھنے لگا۔

☆.........☆.........☆

چند دن بعد جب میرے مہمان واپس اپنے ملک روانہ ہو گئے اور مجھے کچھ فرصت ملی تو میں نے فوراً ہارون پاشا کی رہائش گاہ پر جانے اور اس کے متعلق جاننے کا فیصلہ کیا۔ یاد رکھیے مجھے قاہرہ میں رہتے ایک عرصہ گزر گیا تھا مگر حیرت ہے میں نے اس محل کے بارے میں پہلے بھی سنا نہیں تھا۔ میں نے ایک مقامی ٹیکسی ڈرائیور سے پرانے قاہرہ چلنے کو کہا تو پہلے تو اس نے مجھے حیرت سے دیکھا اور پھر میری توقع سے زیادہ کرایہ مانگ لیا۔ طوعاً کرہاً مجھے اس کی بات ماننا پڑی کیونکہ پرانے قاہرہ کے زیادہ تر راستوں کا مجھے علم نہیں تھا۔ ہم ایک خاص علاقہ سے گزر رہے تھے

بننا چاہتا تھا وہ ماہر مالیات کیسے بن گیا۔

سب سے زیادہ دل چسپ گفتگو داؤدالفرید کی ہی تھی۔ اس کی باتوں، لہجے اور انداز میں مایوسی تھی وہ انگلستان کا بادشاہ بننا چاہتا تھا مگر قسمت کے رگڑے نے کسان بنا دیا مگر اس نے چیلنج قبول کیا اور کسی نہ کسی طرح سیاست میں آ گیا، تھوڑی محنت کی اور ممبر اسمبلی منتخب ہو گیا۔ وہ پوری طرح ریاستی کاموں میں دل چسپی لینے لگا۔ کئی ایک ایسے کام سرانجام دیے کہ حکومتی مہروں میں ایک اہم کارندہ شمار ہونے لگا مگر اس کی یہ کامیابیاں ہی اس کے لیے ”بروٹس“ بن گئیں اور اسے سب چھوڑ چھاڑ کر مصر کے ریگ زاروں میں پناہ لینی پڑی۔ پارٹی ختم ہونے کے بعد جب سب رخصت ہو رہے تھے تو کلب کے باہر سیڑھیوں پر میں نے داؤدالفرید سے کہا۔ ”مجھے یوں لگتا ہے جیسے تم وہ نہیں ہو جو نظر آتے ہو۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا۔۔۔؟“ اس نے تیکھی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

”مطلب یہ کہ تمہاری شخصیت کو سمجھنا اور کچھ اندازہ لگانا واقعی دشوار کام ہے۔“ میں نے اپنی بات کی وضاحت کی تو وہ مسکرانے لگا اور بولا۔

”میری زندگی کا اصول ہی یہ ہے کہ کسی بھی کام کے لیے دوسری ضرب کبھی نہ لگاؤ ہمیشہ پہلی ضرب میں کام مکمل کرو۔“ جواب دیتے ہوئے اس کی آنکھوں میں خاص چمک نظر آ رہی تھی۔ وہ کچھ دیر میری طرف دیکھتا رہا پھر ہلکے سے طنزیہ انداز میں بولا۔ ”زندہ رہو۔۔۔ تو بادشاہوں کی طرح۔ غلاموں کی طرح جینا بھی کوئی جینا ہے۔“

پھر اس نے مجھ سے الوداعی مصافحہ کیا اور کلب کی سیڑھیاں اترنے لگا۔ اسے کل صبح قاہرہ سے واپس چلے جانا تھا اس لیے وہ جلدی میں تھا۔ اس کے بعد کافی عرصہ تک داؤدالفرید نظر نہ آیا تو میں نے یہی سمجھا کہ وہ اسوان کے علاقے میں اپنے زرعی فارم پر مصروف ہو گیا ہے یا پھر دریائے نیل کے آس پاس کہیں اپنے اسٹیمر پر ماہی گیری میں مشغول ہوگا۔ میں جانتا تھا کہ وہ جو بھی کام کرتا مکمل درستی کے ساتھ کرتا اس میں کوئی بھی خلاء نہیں چھوڑتا تھا۔

اس کا اندازہ مجھے کچھ عرصہ پہلے اس وقت ہوا جب قاہرہ کے بازار میں لین دین کے ایک مسئلے پر مقامی عربوں کے ایک ناراض ہجوم نے مجھے گھیر لیا۔ اتفاق سے اس وقت داؤدالفرید بھی میرے ہمراہ تھا میں نے فوراً اسے آگے کر دیا کہ وہ اس مشتعل ہجوم سے بات کرے کیونکہ عربی زبان پر اسے مجھ سے زیادہ دسترس حاصل تھی۔ اگرچہ اس ملک میں رہتے ہوئے مجھے داؤد سے دگنا وقت گزر چکا تھا مگر ابھی تک مجھے عربی زبان کی صرف شد بد تھی کیونکہ میں کوئی بھی غیر ملکی زبان سیکھنے کے معاملے میں زیادہ اچھا نہیں مگر جہاں تک مجھے یاد ہے داؤد انگریز ہونے کے باوجود اس معاملے میں تیز تھا۔ اس میں نقل کرنے کی موروثی صلاحیت تھی۔ ایک دعوت میں جہاں ہم دونوں موجود تھے اس نے ایک بااثر عربی حکومتی نمائندے کی آواز اور حرکات کی نقل اس مہارت سے مزاحیہ انداز میں اتاری کہ سب لوگ دنگ رہ گئے۔ اس کے بعد کئی ایک سال تک میری داؤدالفرید سے دوبارہ کوئی ملاقات نہ ہوئی نہ ہی کسی قسم کا کوئی رابطہ قائم رہا۔

☆........☆........☆

اس وقت موسم بہار اپنے پورے جوبن پر تھا جب امریکہ سے میرے کچھ دوست اپنے گھر والوں کے ہمراہ چھٹیاں گزارنے قاہرہ آئے۔ وہ ایک ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ چونکہ وہ عربی زبان سے نابلد تھے اور تمام لوگ بہت کم انگریزی جانتے تھے اس لیے انہوں نے سیر و تفریح اور شہر کے بازاروں میں خرید و فروخت کے لیے مجھے مترجم بنا لیا۔ میں نے بہتیرا انکار کیا کہ بھائیو اور بہنو میری عربی کچھ زیادہ قابل اعتبار نہیں مگر ان کے سامنے ہتھیار ڈالتے ہی بنی۔

ایک صبح جب ہم بازار گئے تو مجھے تجربہ ہوا کہ میرا کام محض ترجمان کا رہ گیا ہے۔ خرید و فروخت کے معاملے میں ان کا علم مجھ سے کہیں زیادہ تھا اور وہ گائیڈ بک کا مکمل مطالعہ کر کے آئے تھے۔ جلد ہی اس پارٹی کی خواتین نے ایک دکان دریافت کر لی جہاں قیمتی پتھر، نیلم، یاقوت اور

سے بچ نہیں سکتے۔“

ہم اس کمرے سے باہر نکل آئے اور طوطے کی ناک والے کی راہ نمائی میں ایک طرف چل پڑے اس کے ہاتھ میں چابیوں کا بہت بڑا گچھا تھا جس کی بے ہنگم کھڑکھڑاہٹ بےزار کر رہی تھی۔ اس کے پیچھے پاشا چل رہا تھا جس کے پیچھے میں تھا اور میرے پیچھے دونوں تلوار بردار۔ میرا ذہن اس وقت بھی منتشر تھا اور میں کسی ایک نکتے پر سوچنے سمجھنے سے قاصر تھا۔ ایک دروازے سے گزرنے کے بعد ہمیں کئی سیڑھیاں اترنا پڑیں۔ اس کے بعد کئی وزنی دروازے کھلے اور بند ہوئے اور ہم ایک ایسی سرنگ میں آئے جو باقیوں کی نسبت زیادہ تاریک تھی۔ اس سرنگ کے خاتمے پر ایک ہال نما کمرہ تھا۔ جس کی دائیں طرف ایک خالی پتھریلی دیوار تھی جب کہ بائیں طرف چوبی دروازوں کی ایک قطار تھی۔ امتدادِ زمانہ کے ہاتھوں جن کی لکڑی کا رنگ سیاہ پڑ چکا تھا ان پر لوہے کے موٹے موٹے کیل جڑے ہوئے تھے۔ اس کمرے میں روشنی صرف اس لالٹین سے آ رہی تھی جسے اس کبڑے نے اٹھا رکھا تھا۔ ان میں سے ایک دروازے کے سامنے پاشا رک گیا۔

”کیا مصرون اس کے اندر ہے؟“ اس نے استفسار کیا۔

”جی عالی جاہ۔۔۔“ کبڑے نے لالٹین کو اوپر اٹھاتے ہوئے جواب دیا اور زندان کا دروازہ کھول دیا۔ اس چوبی دروازے کے اندر سلاخوں والا دروازہ تھا۔ پتھریلے فرش پر وہ غریب لاغر قیدی پڑا ہوا تھا۔ اس نے آنکھ اٹھا کر روشنی کی طرف دیکھا اور منمنایا۔ ”پاشا۔۔۔ میں اپنے خوف ناک گناہ کا اقرار کر چکا ہوں اس غریب پر تقصیر پر رحم کھائیے۔“

”بولتے رہو۔ اچھا بولتے ہو۔“ پاشا نے بےرحم انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔ کبڑے نے ہاتھ بڑھا کر زندان کا دروازہ دوبارہ بند کر دیا اور پاشا آگے بڑھ گیا۔ ہم سب اس کے پیچھے تھے۔ چند دروازے آگے جا کر پاشا دوبارہ رک گیا۔ کبڑے نے لالٹین دوبارہ اوپر اٹھائی اور یہ دروازہ بھی کھول دیا۔

”اس قیدی کو غور سے دیکھو۔“ پاشا نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

میں نے سوچا کہ میں کتنا بےبس ہوں، اس بے رحم آدمی کے رحم و کرم پر ہوں اگر یہ چاہے تو مجھے بھی ان قید خانوں میں سے کسی ایک میں پھینک دے، جہاں سے رہائی ناممکن تھی اور کسی کو میری خبر بھی نہ ہوتی۔ میں نے دل ہی دل میں اپنی خوش قسمتی پر خدا کا شکر ادا کیا کہ میں ان کی جگہ قید خانے میں نہیں ہوں۔

لالٹین کی مدھم روشنی میں قید خانے کے گندے فرش پر دروازے کی سلاخوں کا سایہ پڑ رہا تھا۔ ایک شخص فرش پر لیٹا نظر آیا وہ کروٹ بدل کر آہستگی سے اٹھا اور ہماری طرف دیکھا۔ وہ گھنی لمبی داڑھی والا شخص تھا جو گندی اور الجھی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ سر کے بال تقریباً نہ ہونے کے برابر تھے۔ قیدی آہستہ آہستہ چلتا ہوا دروازے کے قریب آیا۔ وہ قیدی چال ڈھال، ڈیل ڈول اور شکل و صورت میں بالکل ہارون پاشا نظر آتا تھا۔ میں نے ایک نظر ہارون پاشا کی طرف دیکھا مگر وہ اپنی ہی رو میں بولے جا رہا تھا۔

”اس نقلی پاشا کو دیکھو۔۔۔ اس کے اپنے اعتراف کے مطابق اس نے مجھے ہٹانے کا منصوبہ کئی سال پہلے بنایا، یہ میرا ہم شکل ہونے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے میری جائیداد اور دولت پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ اس کام کے لیے یہ خفیہ طور پر میری نگرانی کرتا رہا۔ یہ میری جگہ لینا چاہتا تھا جس میں یہ کامیاب نہ ہو سکا۔“

میں نے دروازے کی سلاخوں کو مضبوطی سے تھام لیا۔ اس جگہ کی سڑاند اور بدبو ناقابل برداشت تھی مگر جس چیز نے میرے دماغ کو جکڑ لیا تھا وہ یہ بدبو نہ تھی بلکہ اچانک ہونے والا میری یادداشت کا جھٹکا تھا۔ میرے دماغ نے سوچنا شروع کر دیا تھا۔ جسمانی، رنگ و روپ، انداز، بول چال میں ہارون پاشا، داؤدالفرید کا جڑواں بھائی نظر آتا تھا۔ وہی داؤدالفرید جو کافی عرصہ سے کہیں غائب تھا

یہ مماثلت میرے ذہن پر ایک بم دھماکے کی

طرح بھٹی۔ میں نے قید خانے کی سلاخوں کو زیادہ مضبوطی سے تھام لیا اور قیدی کو ٹکٹکی باندھ گھورنے لگا۔ کیا یہ داؤد الفرید تھا۔ کیا اس نے پاشا بننے کی کوشش کی تھی۔ کیا یہی اس کا انجام تھا۔ میں نے دوبارہ ایک نظر ہارون پاشا کی طرف دیکھا اور نظروں ہی نظروں میں اس کا باریش چہرہ کھنگالا۔ کیا حیرت انگیز مماثلت تھی۔

میں نے داؤد الفرید کو کئی سال سے نہیں دیکھا تھا مگر وہ مجھے اچھی طرح یاد تھا اور اب ساری بات بھی سمجھ میں آرہی تھی۔ میں اس مشابہت کو نظر انداز نہیں کر پا رہا تھا۔ بھرپور داڑھی اور مونچھیں، مصنوعی طریقے سے سیاہ کی گئی بھنویں، گنجا سر اور سفید پگڑی۔ داؤد الفرید، ہارون پاشا کی نسبت خاصا منظم شخص تھا مگر اب وہ ایک گندا، بکھرا ہوا اور ناامید شخص تھا جو اس گندے بدبودار تہہ خانہ میں قید تھا۔

”تمہاری اتنی جرات کہ تم میرے دوست کو یوں اس گندے تہہ خانے میں قید رکھو۔“ میں کسی کی بھی پرواہ کیے بغیر ہارون پاشا پر پل پڑا۔ وہ چند قدم پیچھے ہٹا اور پھر محافظوں کو بلانے کے لیے تالی بجائی۔ اس اثناء میں دونوں محافظوں نے عقب سے مجھے جکڑ لیا تھا۔ میں بے بسی سے چیخنے لگا۔ میری چیخوں کی آواز نے باقی قیدیوں کو بھی جگا دیا اور جب مجھے راہ داری میں گھسیٹا جا رہا تھا تو میری سماعت سے نقلی پاشا کے عربی زبان کے الفاظ ٹکرا رہے تھے۔

”مدد۔۔۔۔۔ مدد۔۔۔۔۔ اے اجنبی دوست۔۔۔۔۔ مدد کرو۔۔۔۔۔ خدا تمہاری مدد کرے گا۔“

ایک جھٹکے سے راہ داری کا دروازہ بند ہو گیا اور میں پوری بات نہ سن سکا۔ مجھے یوں لگا جیسے میرا سب کچھ کھو چکا ہے۔ کچھ ہی دیر بعد وہ محافظ مجھے لے کر اسی کمرے میں واپس پہنچ گئے۔ ہارون پاشا اپنی مخملی گدیلی کرسی میں دھنس چکا تھا۔ مجھے اس کے سامنے کھڑا کر دیا گیا۔ ”اب تم میرے ساتھ کیا سلوک کرو گے۔“ میں نے دریافت کیا۔

”میرے فرزند۔۔۔“ پاشا نرم لہجے میں بولا۔ ”میں تمہیں تمہاری ہمت اور جرات پر تمہیں معافی دے سکتا ہوں۔ تمہاری مہم جوئی تمہیں اس بدقسمتی تک کھینچ لائی ہے۔ تمہیں سزا دینے میں مجھے خوشی نہیں ہوگی مگر آج رات وہ اندھیرے تہ خانے جو تم نے دیکھے ہیں وہ ان قابل رحم بدنصیبوں کی چیخوں سے گونجیں گے جنہوں نے میری روح کو دکھ دیا ہے۔ وہ فاحشہ اس گھٹیا کے ساتھ بھاگ گئی تھی مگر میں نے اپنے مزاج پر قابو رکھا اور نرم دلی سے کام لیا۔ اب تمہیں اس شرط پر جانے کی اجازت ملے گی کہ تم نے جو کچھ اس چار دیواری کے اندر دیکھا وہ تم نہ کسی کو بتاؤ گے اور نہ کسی سے اس کا ذکر کرو گے۔“

پھر میرے جواب کا انتظار کیے بغیر اس نے دو دفعہ تالی بجائی اور ایک خوب صورت نازنین اس کے پاس آن کھڑی ہوئی۔ ”شربت لاؤ۔“ پاشا نے حکم دیا۔ وہ دوشیزہ واپس چلی گئی۔ میں چپ چاپ کھڑا کسی فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جلد ہی وہ واپس آئی اس کے ہاتھ میں ایک طشتری تھی جس میں بلوریں جام اور سونے سے بنی ایک صراحی رکھی تھی۔ ہارون پاشا نے اپنے ہاتھ سے وہ شربت جام میں انڈیلا اور میری طرف بڑھا دیا۔

☆........☆........☆

جب پاشا نے سنہری صراحی پر سے اس کا ڈھکن ہٹایا تو میری آنکھ نے دیکھا کہ اس کے اندر جانی پہچانی سیاہ اور سفید لیبل والی ایک بوتل تھی جس کا ذائقہ بھی میں نے اپنے جام میں پہچان لیا۔ یہ مشروب میرے حلقہ احباب میں ایک ہی شخص کا پسندیدہ تھا مگر وہ شخص تو اس وقت قید خانے میں بند تھا۔ اس سے پہلے کہ میں اس کے متعلق کچھ بات کرتا ایک محافظ نے بازو سے پکڑ کر مجھے زبردستی اٹھایا اور کمرے سے باہر دھکیل دیا۔ میں نے باہر نکلنے سے پہلے مڑ کر پیچھے دیکھا تو پاشا سے آنکھیں ملیں۔ اس نے واضح طور پر مجھے آنکھ دبا کر کچھ اشارہ کیا جسے میں اس وقت سمجھ نہ پایا۔ مگر میں اتنا سمجھ گیا کہ میں صرف ایک ایسے آدمی کو جانتا تھا جو اپنی گفتگو کے دوران میں کسی خاص بات پر زور دینے کے لیے اس خاص طریقے سے آنکھ دبا کر اشارہ کیا کرتا تھا اور اس کا نام داؤد الفرید تھا۔

خون کی ہولی

عمرانہ سرور۔ گوجرانوالہ

اچانک نوجوان رات کے اندھیرے میں گھر سے نکلا اور پھر وہ بھول بھلیوں میں کھوگیا، ایک گھنٹہ کا سفر کئی مہینے پر محیط ہوگیا، اور جب وہ بھول بھلیوں سے نکلا تو اس کے بال کندھے تک بڑھ چکے تھے۔

خوف و ہراس کے لبادے میں لپٹی ہوئی عجیب و غریب خونچکاں...... بھونچکاں کہانی

میں روزانہ اس پرانے گھر کی عمارت کے سامنے کھڑے کھڑے اس عورت کو دیکھتا جو بیتی ہوئی یادوں کو یاد کرکے سسک پڑتی تھی۔ جیسے یہ یادیں ہر گزرتے وقت کے ساتھ اسے سانپ کی طرح ڈستی تھیں۔ سردی سے کپکپاتے ہوئے وہ جانے اور کتنی دیر اسی حالت میں جمود رہتی کہ اچانک اس کھنڈر نما گھر کے سامنے ایک شخص آن وارد ہوا اور گاڑی سے نکلتے ہی ایک حقارت کی نگاہ اس عورت پر ڈالتے ہوئے تالا کھول کر اندر گھس گیا۔ اور وہ بے چاری عورت دروازہ پیٹتی رہی مگر کوئی جواب ندارد تھا۔

میں ہمت کرکے اپنی پرچون کی دکان سے اٹھا اور لپک کر اس عورت کو جھنجھوڑ ڈالا مگر وہ سکتے میں تھی جیسے مرگئی ہو۔ خیر میری ہمدردی کے الفاظ پر وہ یکدم دھاڑیں مار کر رونے لگی۔ اس کی بے بسی پر میں بھی رنجیدہ ہوگیا

اور پھر میں نے پکا ارادہ کرلیا کہ آج پتا لگا کر ہی دم لوں گا کہ اصل ماجرا ہے کیا؟

میں اس عورت سے باز پرس کرنے لگا کہ ''بتاؤ کیا قصہ ہے اور یہ شخص کون ہے؟ اور تم کیوں یہاں لاوارثوں کی طرح پڑی ہو، کیا یہ گھر تمہارا ہے۔''

مگر افسوس کہ وہ حیرت سے مجھے تکتے ہوئے بس اتنا کہہ کر چلی گئی کہ ''تمہیں کیا تکلیف ہے۔ دفعہ ہوجاؤ میں کسی کے پیار کے قابل نہیں، دفع ہوجاؤ۔''

میرا تجسس اب اور بڑھ گیا۔ سو میں نے ذہن میں رکھ لیا کہ اب تو کچھ کرنا پڑے گا۔ وقت 10 بجے کا تھا۔ میں اب اس شخص کا انتظار کرنے لگا۔ مگر یہ کیا وہ شخص میری توجہ کے باوجود کب وہاں سے گیا مجھے کچھ پتہ نہ چلا۔ کل بھی ایسا ہی ہوا، میں اپنے تجسس کے سبب اس گھر میں داخل ہونے کا ارادہ کر بیٹھا اور بالآخر میں دیوار پھلانگ کر اندر کود گیا، وہاں سے عجیب کرب انگیز رونے کی آوازیں آرہی تھیں، گھر کا سارا فرش خون میں لت پت تھا۔ میں اس خوفناک منظر کے لئے پہلے ہی تیار تھا کہ اچانک ایسا لگا جیسے کسی نے ٹی وی آن کردیا اور کوئی فلم چلنے لگی۔

میں کمرے سے ہوتا ہوا اسٹور میں پہنچا تو حیران رہ گیا۔ منظر ہی کچھ ایسا تھا کہ وہاں ایک خوب صورت عورت دو جڑواں بچوں کو گود میں لئے بیٹھی تھی اور پاس ہی ایک شخص روپے گن رہا تھا۔

پھر جیسے وقت کا پہیہ گھومتا ہوا نظر آیا، بچے بچپن سے لڑکپن اور لڑکپن سے جوانی کی حدوں کو چھوتے دکھائی دیئے، اب وہ دونوں عمر رسیدہ تھے۔ ساری کہانی کی تفہیم دیکھنے پر میں دلی طور پر افسردہ تھا۔ میں جو ٹکٹکی باندھے سارے منظر کو دیکھ رہا تھا یکدم سکتے میں رہ گیا کیونکہ اب چاروں طرف گھپ اندھیرا چھا گیا۔

تسلسل کے ٹوٹنے پر میں رنجیدہ تھا۔ پھر میں چلتا ہوا صحن میں آیا تو دوبارہ روشنی کی کرن جگمگا اٹھی۔ پھر میں نے دیکھا کہ وہ عمر رسیدہ بوڑھا، بوڑھی افسردہ تھے مگر کیوں؟ میں حیرت میں گھر ادوبارہ متوجہ ہوا۔ گھر کا پراسرار ماحول عجیب وحشت لئے ہوئے تھا۔

خیر، یہ کیا سامنے چارپائی پر خون میں لت پت ایک آدمی بڑی آہ و پکار کررہا تھا۔ پاس ہی وہ بوڑھی عورت براجمان تھی کہ دروازہ کھٹاک سے کھلا اور ایک عمر رسیدہ بوڑھا گھر میں داخل ہوا۔ تو دیکھا کہ ایک وجود جو چارپائی پر کراہ رہا تھا یکلخت اس پر ایک شخص برس پڑا۔

''اے بڑھیا اس بڈھے کو سمجھادے میرے دوستوں کے سامنے ایسے پھٹے پرانے حلیے میں مت آیا کر میری سبکی ہوتی ہے۔ بس آج اس عقل کے اندھے کی وجہ سے میرے دوستوں کے بیچ ہاتھا پائی ہوگئی صرف اس کی وجہ سے۔'' انگلی کے اشارے پر بوڑھا دم بخود رہ گیا، ندامت اتنی کہ زمین پھٹے اور وہ اس میں سماجائے اور بڑھیا کے کانوں نے جو ایسی روداد سنی تو ہچکیاں لینے لگی کہ اچانک اندر کمرے سے ایک بجی سنوری بھدی سی عورت نکلی۔ آتے ہی ایک جھٹکے سے آناً فاناً بڑھیا کو اس کے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے ڈیوڑھی تک لے گئی۔

اس کا بوڑھا نحیف بدن خون سے شرابور تھا۔ میں بوکھلا چکا تھا۔ پل دو پل بدلتی سچویشن سے، میں اس بڑھیا کی طرف لپکا مگر پھر اس ظالم عورت نے اپنے دوسرے ہاتھ میں تھامی ہوئی قینچی سے اس بڑھیا کے بالوں کو بے دردی سے کاٹ ڈالا۔ بالوں کے کٹ جانے پر وہ بڑھیا یکدم بے ہوش ہوگئی، کیسا ستم تھا جو درد پر درد بڑھتا چلا گیا۔ میں اس مصیبت سے تنگ آچکا تھا کہ ''آخر یہ کیا ماجرا ہے؟ خیر بوڑھے نے چند قدموں کے فاصلوں کو منٹوں میں عبور کیا۔ اور اپنی ساتھی کو تھام لیا جو ستم ظریفی کا پیکر بنی تھی۔ ان بچھو صفت اپنوں نے آج ایسا ڈنک مارا تھا کہ شاید ہی اس کا زہر کبھی ختم ہو۔ میں لمحہ بہ لمحہ سے پاگل ہوتا جارہا تھا میرے جسم سے ڈر کے مارے پسینہ بہنے لگا۔ میں ناقابل اذیت تکلیف سے دوچار تھا۔ لیکن ابھی تو حقیقت کا اور پہلو میرے سامنے آنا تھا۔

ابھی سوچ کا سلسلہ بھی جاری تھا کہ ایک بار پھر منظر غائب تھا۔ میں ہڑبڑا کر صحن کے دائیں جانب لگے نلکے کے پاس گیا اور بلاوجہ منہ ہاتھ دھونے لگا کہ یکدم

میرے پیچھے کچھ آوازیں گونجیں۔ میرے پلٹنے پر منظر کے آغاز کی ابتدا ہوگئی۔ دو نوجوان بمعہ بیویوں کے عجیب حالت میں دکھائی دیئے اور ان کی باتیں سننے کے لئے ان کی بات چیت پر کان دھرنے لگا۔ ان کی باتیں سن کر معلوم ہوا کہ یہ کتنے ظالم صفت لوگ ہیں؟ میری التجائیں دعائیں تھیں اللہ کے حضور۔

خیر یہ سلسلہ جاری رہتا کہ اچانک وہ منظر روپوش ہوگیا تو میں ہیجانی کیفیت میں مبتلا اپنے بالوں کو نوچنے لگا۔ یہاں وہاں دیواریں ٹٹولنے لگا۔ لیکن سب کچھ بیکار تھا کیونکہ وہاں نہ وہ منظر تھا اور نہ ہی بیرونی دروازہ تھا میں ایک گرداب بلا میں پھنس چکا تھا۔

اچانک اس ساکت ماحول میں ایک عجیب آواز گونجتی چلی گئی۔ جو اسی ظالم بھدی عورت کی تھی۔ ''ہاں ہاں! وہ ہی ہوگا۔ آج کا تماشہ کوئی عام تماشا نہ ہوگا بلکہ خون کی ہولی کھیلی جائے گی۔'' میری حالت دیگر گوں تھی۔ اور واقعی خون کی ہولی کھیلی گئی۔

خوف کی لہر میرے پورے جسم میں پھیل گئی۔ میں حیرت سے گھرا وہاں سے نکل کر دوبارہ کمرے میں آگیا۔ جہاں دیوار کی پرت اکھڑ کر سوراخ میں ڈھل گئی تھی۔ وہاں ایک دھیمی سی روشنی جگمگائی، ہر طرف اب روشنی کا سماں تھا۔ مرد، عورتیں اور بچے شاندار ملبوسات پہنے تھے۔ وہیں دو عورتیں باورچی خانے میں براجمان نت نئے پکوان پکارہی تھیں کہ اچانک ایک عورت کے جانے پر دوسری ظالم عورت نے کھانے میں کچھ ملا دیا۔ میں اپنے حواس پر قابو پاکر اس باورچی خانے کا معائنہ کرنے لگا جہاں وہ تھوڑی دیر پہلے موجود تھی۔

مجھ پر ایک نہ رکنے والا خوف مسلط تھا کہ اب کیا واقعہ رونما ہونے والا اور وہ واقعہ رونما ہوا...... اچانک طوفان امڈ پڑا۔ دل دہلاتی گرج اور چمک پر میں چونک پڑا کیونکہ جب میں آیا تھا اس وقت کسی بھی طوفان کا امکان نہ تھا لیکن اب موسم بہت غضب ناک ہوچکا تھا۔ ہواؤں کا شور بہت تیز تر ہوتا جارہا تھا۔ یہ منظر رات کے پہر کو بہت ہولناک بنا رہا تھا۔ یہاں صبح کا کوئی اندیشہ نہ تھا۔ صرف رات...... گھور اندھیری رات......

''اوہ میرے خدایا۔ یہ گھر کس قدر وحشت ناک ہے؟'' میں سوچنے لگا۔

اچانک باورچی خانے سے ظالم عورت نکلی اور بوڑھی کو کوئی حکم صادر کرتی ڈیوڑھی سے ہوتی بیرونی دروازے سے باہر اپنے مقصد کو پایہ تکمیل کرنے روانہ ہوئی، اس کے جاتے ہی وہ بوڑھی عورت اپنے آپ کو کوستی، واشنگ مشین کی جانب بڑھتی چلی گئی اور جب مشین کا سوئچ آن کرنے کی غرض سے اس نے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ جیسے خود بخود اس سوئچ نے اسے اپنی جانب مقناطیسی کشش سے کھینچ لیا۔ اور اس کا ہاتھ لگتے ہی ایک ہی کرنٹ کے جھٹکے سے وہ نحیف اور کمزور سا وجود دور جاگرا اور آخر تڑپتے تڑپتے بالکل ساکت ہوگیا۔ بغیر کسی آواز کے وہ اس دار فانی سے کوچ کرگئی اور دوسری عورت باورچی خانے سے نکل کر کمرے میں گھس گئی اور حالت زار کو دیکھ کر میں بوکھلا گیا اور اسے متوجہ کرنے کے لئے زور زور سے چیخ و پکار کرنے لگا کہ بوڑھی مرگئی ہے۔

میری رندھی ہوئی آواز میں غم سما گیا۔ ''بچاؤ ظالمو...... اس بے چاری بوڑھی کو، یہ بہت معصوم ہے بچاؤ...... بچاؤ'' میں جیسے کسی سحر میں جکڑے بچاؤ بچاؤ کی تکرار کرتا رہا۔

بالآخر میں عورت کے پیچھے آوازیں دیتا ہوا ہولیا۔ مگر جواب ندارد تھا۔ میں نے جو کچھ وہاں دیکھا بہت ہی پراسرار تھا وہاں بچے، ایک مرد اور وہی عورت جو کھانا لئے موجود تھی، اب بیڈ پر بیٹھے سبھی کھانا کھانے میں مصروف نظر آئے۔ میں بول پڑا کیونکہ مجھے یاد آگیا اس ظالم عورت نے کھانے میں کچھ ملایا تھا۔ میں کسی انجانے خوف سے پسینے میں شرابور ہوگیا۔ پھر کیا تھا کھانے کے بعد چند لمحے ہی گزرے تھے کہ سب کے منہ سے خون کا فوارہ نکل پڑا۔ ''یا خدایا...... بچالے ان سب کو۔'' میرے منہ سے نکلا۔ میری کیفیت عجیب سے عجیب تر ہوتی گئی، بن پانی کے تڑپتی مچھلی کی ان سب کی

پر، میں اندر سے کٹتا جا رہا تھا۔ میں اپنی نرم صفت عادت سے مجبور انہیں بچانے کے لئے ان کی جانب لپکا مگر میرا لپکنا بے سود تھا۔ کیونکہ وہ سب تو ہوا کے ہیولا تھے۔ ٹھوس وجود نہیں رکھتے تھے اور پھر آہستہ آہستہ زہر کے اثر نے ان کا کام تمام کر دیا۔" میں اپنے گھٹنے پر سر رکھے خون کے آنسو رونے لگا۔ اب یکدم مجھ بھی نظروں سے اوجھل تھے نہ جانے اب کیا ہونے والا تھا ایک انجانا سا خوف تھا کہ اب بھی کچھ ہو کے رہے گا کیا؟

اندھیرے میں جہاں کچھ سجھائی نہ دے پائے۔ اسی حالت کے تحت میں خوف کی وجہ سے پسینے میں شرابور اگلے حالات کا بے چینی سے انتظار کرنے لگا اور پھر یکلخت میں ہڑبڑا کر فرش پر گرا اور گرتے ہی بے ہوش ہو گیا۔ دوبارہ جب میں ہوش میں آیا تو ایک بار پھر اندھیرے نے ہی میرا استقبال کیا۔

اچانک میرے ذہن میں خیال آیا کہ وہ آدمی جو روزانہ یہاں آتا تھا وہ میرے موجود ہونے پر یہاں نہیں آیا۔ مجھے تشویش ہونے لگی۔ سوچ کا تسلسل ٹوٹ گیا کہ اچانک اندھیرے کو چیرتی ہوئی بیرونی دروازے پر روشنی ہوئی اور میں ڈر گیا۔ اور پھر ایک بھی لمحہ ضائع کئے بغیر میں بیرونی دروازے کی جانب لپکا لیکن لڑکھڑا کر منہ کے بل گر پڑا، میری ناک سے خون کا فوارہ چھوٹ پڑا، اس حالت پر میں کبھی دائیں ہاتھ کو اور کبھی بائیں ہاتھ کو فرش پر رکھتا، مگر خون نہ رک رہا تھا، خون کی اتنی مقدار دیکھ کر میں ہوش سے بیگانہ ہو گیا اور پھر کافی دیر بعد جب ہوش آیا تو اٹھا، میرے کپڑے خون میں لت پت تھے، مجھے کافی کمزوری محسوس ہونے لگی لیکن یہ کیا؟

میں یکدم اٹھا اور اپنی پھولتی سانسوں کے ساتھ بھاگا اور ڈیوڑھی تک پہنچ گیا۔ "نہیں نہیں......" کی تکرار کرتے ہوئے میں بلند آواز میں چیخ و پکار کرنے لگا۔ میرے شور و غل پر وہاں دوسرے لوگ بھی اکٹھے ہونے لگے۔ مجھے غلط فہمی ہوئی کہ شاید میری چیخ پر اکٹھے ہوئے ہیں۔

میں دم بخود سا سامنے فرش پر پڑے بوڑھے کو خون میں لت پت تکے جا رہا تھا۔ میری آنکھیں خوف کی دہشت سے پھٹ رہی تھیں۔ میں سامنے پڑے بوڑھے پر نگاہ مرکوز کئے آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اس کے قریب گیا اور بے حس وجود کے اس حادثے پر میں شاک سے گر پڑا اور مدہوش ہو گیا۔

پھر ایسا لگا کہ میں خواب میں اسی لاچار بوڑھے کو دیکھ رہا ہوں۔ منظر بدلا بدلا سا لگ رہا تھا کیونکہ آج اور کوئی جگہ تھی۔ جہاں کہیں کوئی مکان کی تعمیرات کا کام چل رہا تھا۔ مگر میں کدھر تھا؟ نظر دوڑاتے ہوئے میں اس مکان کی چوتھی منزل پر پہنچ گیا۔ جہاں وہ بوڑھا نظر آ گیا۔ وہ اپنی حالت کے پیش نظر عجیب کشمکش میں لگ رہا تھا۔ یکلخت سے وہ چکرا کر ڈگمگایا اور اپنے جسم کا توازن برقرار نہ رکھنے کے سبب وہ چوتھی منزل سے گرا اور زمین بوس ہو گیا۔ اتنی اونچائی سے گرنے کی وجہ سے وہ کسی بے جان وجود کی طرح ساکت ہو گیا اور پھر خون کی ندی بہہ گئی۔ اس کا سر پاش پاش ہو گیا تھا۔

اتنا جان لیوا منظر دیکھنے پر جیسے مجھ پر سکتہ طاری ہو گیا۔ پھر پہلی منزل پر کسی کی چیخ سنائی دی تو میں کانپتے کانپتے پہلی منزل پر آیا اور ایک مرتبہ میں پھر ڈھیر ہو گیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میرا خواب جو کبھی رنگین تھا اب یکلخت بلیک اینڈ وائٹ ہو گیا۔ وہاں ہر طرف گھپ اندھیرا تھا۔ آنکھ کھلنے پر میں فرش پر لیٹے لیٹے گہرے گہرے سانس لینے لگا کہ پھر ہیبت ناک اور ڈراؤنی آوازیں اور شور و غل ہونے لگا تو میں پلک جھپکتے ہی اٹھ بیٹھا اور چاروں سمت نظر دوڑائی تو ایک سمت میری نظر ٹھہر گئی۔ جہاں بہت سے لوگوں کا جھرمٹ تھا، پھر میں لوگوں کو چیرتا ہوا سامنے کی سمت بڑھا...... اور آگے ہی آگے بڑھتا چلا گیا اور جب قریب پہنچا تو چارپائی پر اس وجود کو دیکھ کر...... چارپائی سے لگا زار و قطار رونے لگا جیسے میرا کوئی اپنا بچھڑ گیا ہو، میں افسوس میں گھرا رہتا تھا۔

اچانک ہجوم میں سے کچھ لوگوں نے کمروں سے لاشوں کو اٹھا کر صحن میں بچھی قطار میں چارپائیوں پر لا کر رکھ دیا اور اب باری اس بے جان بڑھیا کی لاش کی تھی خیر اسے بھی چارپائیوں میں سے ایک چارپائی پر لیٹا دیا۔

میں اس صورت حال کا چشم دید گواہ تھا۔ میں اس صدمے کو جھیل نہ پا رہا تھا۔ خون کے آنسو میری آنکھوں سے رواں دواں تھے۔ میں تھوڑی دیر شاید اور متوجہ رہتا کہ ہم سب کی توجہ ایک اور شخصیت نے کھینچ لی۔

وہ ظالم عورت جس کا کیا دھرا سارا کھیل تھا۔ اس عورت نے اس بڑھیا کو مجبور کیا کہ وہ کرنٹ والے سوئچ کو ہاتھ لگائے کیونکہ اس نے الیکٹرک تاروں میں گڑبڑ کی تھی۔ اس کا حشر نشر ہو گیا۔

میں نے اپنے جذبات پر قابو پایا ورنہ میرا دل چاہ رہا تھا کہ اس ظالم کا گلا دبا دوں مگر کچھ کر نہیں سکتا تھا۔ یہ عورت کوئی اور نہیں وہ ہی عورت تھی جو اس کھنڈر نما گھر کے باہر دن رات پہرہ دیتی تھی۔ میں اپنے آپ کو ملامت کرنے لگا کہ میں اسے کیا سمجھتا رہا اور یہ کیا نکلی؟ میری نظر ایک نقطے پر ٹھہر گئی یعنی وہ آدمی جو ہر روز اس مکان کے دیکھ بھال کے لئے آتا ہے۔ تو آج کہاں ہے؟

میں بے چینی کے عالم میں ادھر ادھر اسے ڈھونڈنے لگا۔

آخر وہ آ ہی گیا ارے یہ تو وہی چارپائی والا نوجوان تھا جو اس بوڑھے پر چلا رہا تھا۔ میں اسے دیکھتے ہی پہچان گیا۔

یہ کیا یہ تو آتے ہی اس عورت پر تابڑ توڑ حملہ کرنا شروع کر دیا۔ مار مار کے اسے ہولہان کر دیا۔ میں ڈر کر اسے بچانے کے لئے چلانے لگا کہ چھوڑ دو اسے...... پاگل آدمی اب تو سکون لے لو۔

لیکن کوئی اثر نہ ہوا اس پر میرے کہنے کا لیکن ہاں وہاں موجود لوگوں نے اسے تھام لیا اور اس بے ہوش پڑی عورت کو اٹھا کر کمرے میں لے گئے۔ میں شش و پنج میں تھا کہ یہ کیسے ٹھیک ہو سکتا ہے مگر پاس کھڑے لوگوں کے تبصرے پر میری حیرت میں اضافہ ہوا۔

"یہ آدمی زبان کا برا مگر دل کا بھلا انسان ہے۔ اور اس تمام قصے میں کہیں بھی نہیں۔" مگر ان تبصروں پر میں مطمئن نہ ہوا۔ میں اپنے ذہن میں اس تمام کہانی کو دہرانے لگا، یاد کرنے پر شاک لگا، ہاں اسی نے تو اس بوڑھے کو پیار میں پھسلا کر گھر کی رجسٹری پر انگوٹھا لگوایا تھا۔ "یا خدا کتنا مکار ہے۔"

گھر اپنے نام کروانے کے باوجود نہ اسے بیچ سکا اور نہ ہی رہائش کر سکا، کیونکہ یہاں ان دیکھا طلسم تھا جس کا سحر اسے جکڑ لیتا، اور ان کی روحیں اس کے ضمیر کو چین نہ لینے دیتیں۔ میں اتنی مکاری پر حیران تھا۔

منظر اب کچھ بدلا سبھی اپنی آخری آرام گاہ میں جانے کو تیار تھے اور پھر سبھی لوگ انہیں لئے چل دیئے مگر وہ نہ گیا ہاں وہ گھر میں موجود زور زور سے قہقہے لگاتا رہا۔ ان قہقہوں کی آوازیں اندر پڑی عورت جاگ کر باہر اس کے پاس آئی مگر یکدم اس کی ہنسی رک گئی۔ کیونکہ وہ ظالم فوراً اس کی طرف بڑھا اور اسے گھسیٹتا لے گیا اور دروازے سے باہر پھینک دیا کہ اب تم عجیب ظالم کی مجھے ضرورت نہیں اور دروازہ بند کر دیا، پھر زور کی ہوا چلی اور ہوا کے بگولے نے مجھے اس گھر سے باہر لا پٹخا۔ میں کراہ کر سوچنے لگا کہ کتنے دنوں سے میں گھر سے باہر جانے کا راستہ تلاش کر رہا تھا مگر وہ نہ مل پایا، آخر اس آسیب زدہ گھر سے مجھے نجات مل گئی میں جب گرا تو رات کے گیارہ کا وقت یعنی مجھے اندر گئے ابھی صرف ایک گھنٹہ ہوا تھا، میں کانپ کر رہ گیا، ایک گھنٹے میں گھر کے اندر سالوں کا شمار تھا۔ مجھے باہر گرتے ہی آس پاس کے تمام افراد بھاگے چلے آئے اور مجھے جھنجھوڑنے لگے۔

میں اب اس سارے بھید کو سمجھ گیا تھا، میرے لباس پر جگہ جگہ خون کے دھبے موجود تھے، میرے بال میرے کندھوں سے نیچے لٹک رہے تھے، اور حلیہ بگڑ گیا تھا جیسے میں نے کئی سالوں کا سفر طے کر لیا ہے۔ الغرض میں اٹھنے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔ مگر اٹھ نہ پایا۔ لیکن لوگوں نے میت کی طرح میرے وجود کو اٹھایا اور میرے گھر چل دیئے، جہاں میری دنیا آباد تھی۔



خونی مہم

گلاب خان سولنگی-لاہور

شیر سے مشابہ اور انسانی دھڑ لئے سامنے ایک بلا مردہ پڑی تھی کہ اچانک اس پر دم کیا ہوا پانی پڑا تو چشم زدن میں اس کے دھڑ سے دھواں اٹھنے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ بلا اچانک......

ایک روپ بدلتی بلا کی روداد جو کہ پڑھنے والوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دے گی

”**راجو** چاچا......راجو چاچا یہ چٹھی آئی ہے آپ کے نام کی۔“ چھوٹی بچی نے چٹھی راجو کو تھما دی۔ اور دوبارہ کھیل کود میں مصروف ہوگئی۔

یہ ان دنوں کی کہانی ہے جب موبائل فون ایجاد نہیں ہوئے تھے اور لوگ خط و کتابت سے کام چلاتے تھے۔ پھول نگر بھی اپنے نام کی طرح مشہور تھا۔ وسطی ہندوستان کے پہاڑی جنگلوں میں گھرا یہ قصبہ پھولوں کے باغات اور سرسبزی کی وجہ سے پہچانا جاتا تھا۔ وہاں کے لوگ بھی ملنسار اور ایماندار تھے۔ شہر وہاں سے کافی دور تھا۔ لیکن قصبے میں بنے واحد بازار میں ضروریات زندگی کی ہر چیز دستیاب تھی۔ زیادہ تر لوگ زراعت پیشہ اور لکڑی کے کاروباری تھے۔ وہاں ہندو مسلم مطلب ہر مذہب کے لوگ بستے تھے اور ان کی آپس کی بھائی چارگی مثالی تھی۔

گاؤں سے پرے محکمہ جنگلات کے دفاتر بھی تھے اور لکڑی کے کارخانے بھی وسیع تر علاقے گھنے جنگلوں پر محیط تھا۔ وہاں بارش کثرت سے ہوتی تھی۔ لیکن انگریز سرکار نے اپنے دور حکومت میں یہاں جو مرکزی سڑک بنائی تھی وہ آج بھی قائم دائم تھی۔ یہی وجہ ہے کہ گاؤں والوں کو شہر جانے میں کوئی وقت [illegible] آتی تھی۔ جبکہ دن کے وقت پبلک ٹرانسپورٹ بھی مل جاتی تھی اور ایک آدھ لوکل بس بھی شہر کی طرف جاتی تھی لیکن شام ہوتے ہی یہاں سڑک ویران اور پبلک ٹرانسپورٹ سے خالی ہوجاتی تھی۔ ایمرجنسی کی صورت میں تانگہ یا بیل گاڑی سے کام چلاتے تھے ورنہ رات کا اندھیرا چھاتے ہی وہ سڑک جنگل کی طرح خوفناک کا منظر پیش کرتی تھی۔

بازار تو شام کے وقت ہی بند ہوجاتا تھا۔ گاؤں والے جلدی سونے اور جلدی اُٹھنے کے عادی تھے، سادگی ہی سادگی تھی۔

ان جنگلوں میں شیر بھی پائے جاتے تھے لیکن آدم خور شیر کی وجہ سے پھول نگر اور قرب و جوار کے بھی گاؤں والے ڈرے اور سہمے رہتے تھے جبکہ رات میں باہر نکلنے سے گریزاں تھے۔ اس ڈر و خوف کی وجہ بھی تو جائز تھی۔

انگریز سرکار سے لے کر اب تک سیکڑوں لوگ یا تو آدم خور شیروں کا شکار ہوگئے تھے اور کافی لوگ گھائل لاپتہ ہوگئے تھے، ابھی پچھلے ماہ ہی ایک نوجوان جوڑا آدم خور شیر کا شکار ہوگیا اور ان کی لاشیں مسخ شدہ ان ہی جنگلوں سے ملی تھیں۔

پہلے پہل تو وہ آدم خور شیر گاؤں سے یا پھر کھیتوں سے مال مویشیوں کا شکار کرکے جنگل لے جاتا تھا لیکن کچھ عرصے سے شاید انسانی خون اس کے منہ کو لگا ہے جواب وہ صرف انسانوں کا دشمن ہوگیا ہے جو اس طرح تواتر سے گاؤں والوں کو اپنا نشانہ بنا رہا ہے۔ حالانکہ جنگل میں دوسرے درندے بھی پائے جاتے ہیں لیکن گاؤں والے تو صرف اور صرف آدم خور سے ہی ڈرتے ہیں۔ متعدد بار گاؤں والوں نے فاریسٹ آفیسر مسٹر انیل شرما سے اپیل کی لیکن وہ موصوف اپنی روایتی ہٹ دھرمی اور کاہلی کی بنا پر گاؤں والوں کو یہ کہہ کر خاموش کرادیتا تھا کہ ”آدم خور شیر کی تلاش سرکار کو بھی ہے۔ ہماری سرتوڑ کوشش جاری ہے اسے مارنے کی سو گاؤں والو صبر سے کام لو۔“

وقتی طور پر گاؤں والوں کا غم و غصہ تو ٹھنڈا ہوجاتا تھا لیکن کسی نئے سانحے کے پیش نظر وہ بہت محتاط ہوگئے تھے۔ غیر ضروری طور پر رات کو نکلنا اور خاص کر اکیلے نکلنے سے پرہیز کرتے تھے۔ باقی تو پھول نگر میں زندگی کی رونق بحال تھی، لوگ دن کے اوقات میں اپنے اپنے کام کاج میں مصروف رہتے اور رات سے پہلے ہی مکانوں میں گھس جاتے تھے۔

پھول نگر میں دیگر سہولیات کے ساتھ بجلی کی بھی سہولت تھی، گاؤں والے TV شوق سے دیکھتے تھے اور فلم بھی۔ ایک پیڑ کے سائے میں بیٹھا راجو چٹھی پڑھنے میں مصروف تھا۔ چٹھی میں لکھا تھا۔

”میرے پیارے راجو! نمستے، آشا کرتی ہوں کہ خوش ہوں گے۔ باپو کو ہماری پریم کہانی کا پتا چل گیا ہے۔ انہوں نے میرا باہر آنا جانا بند کردیا ہے۔ پہلے تو میں پھول اور لکڑیاں چننے کے بہانے چوری چھپے تم سے ملنے آیا کرتی تھی۔ اب وہ سلسلہ بند ہوگیا ہے۔ میں تمہارے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کرسکتی۔ یہ جدائی ہم بھلا کیسے برداشت کرسکیں گے......؟ اور تو اور باپو اب میری شادی کسی اور سے کرنے جارہے ہیں، اس سے پہلے کہ میں کسی اور کی ہوجاؤں، ہمیں اب رات کے اندھیرے میں ملنا پڑے گا تاکہ فرار کا راستہ اختیار کرسکیں اور اس کی ترکیب تیار کرسکیں۔

گاؤں کے دوسرے پریمیوں کی طرح اب ہم رات کو ملیں گے۔ سو کل رات تیار رہنا۔ میں ٹھیک رات کے دوسرے پہر گھر سے نکلوں گی اور ہمارے گاؤں سے پرے تالاب کے پاس لکڑی کے پل کے گرد جامن کے درخت کے نیچے پہنچوں گی۔ تم وہاں میرا انتظار کرنا......

”فقط تمہاری پریمیکا رادھا“

راجو جو کافی عرصے سے رادھا سے چھپ چھپ کے ملتا۔ رادھا کی طرف سے رات کے سمے یوں ملنے کا سندیسہ اسے بہت بھایا۔ وہ تو رادھا کے پریم میں پاگل سا ہوگیا تھا، اسے معلوم تھا کہ رادھا کسی اور ذات کی کنیا ہے۔ اس کے پریوار والے کبھی یہ رشتہ نہیں مانیں گے۔ اوپر سے رادھا کی جوانی جیسے پنکھڑی گلاب کی تھی۔ کشمیر کی کلی تھی یا حسن کی بہار......

راجو تو اس کے پریم میں پاگل تھا اور اب رادھا کے سندیسے کو لے کر وہ من ہی من میں اس کے ساتھ جیون بتانے کا سوچ رہا تھا...... ”ہے بھگوان! کل کی رات کب آئے گی؟“ وہ پل پل ٹھنڈی آہیں بھرنے لگا۔ گھر والوں کو شک نہ ہو اس لئے اس کے برتاؤ میں کوئی خاص فرق نہیں محسوس ہو رہا تھا۔

رات کی تاریکی خاصی گہری ہوگئی تھی، ہر طرف ہو کا عالم تھا، گاؤں والے تو جلدی سونے کے عادی تھے، دور گیدڑوں اور بھیڑیوں کی چیخوں سے محسوس ہو رہا تھا کہ آج نہ جانے کچھ ہونے والا......! الو کے ساتھ کچھ شب خور پرندوں کے چلانے سے جنگل کی فضا میں ایک ہولناکی سی چھا گئی تھی۔ پھول نگر سے نکلنے والی سڑک تو مکمل ویرانی کا منظر پیش کر رہی تھی۔ رات کے سناٹے میں اس کے اوپر بندر گھوم رہے تھے اور کہیں کوئی سانپ رینگتا دکھائی دے رہا تھا۔ ویسے دن کے وقت تو خون خوار اور بے ضرر جانور اور پرندے جنگل میں چھپ جاتے تھے، لیکن رات ہوتے ہی درندوں کا راج شروع ہوجاتا تھا اور رات کے سمے انسان ان سے چھپ جایا

کرتے تھے، گلی کے کتوں نے ایک سائے کا کافی دیر تک پیچھا کیا، جب وہ پھول نگر کی سڑک پر کافی دور نکل گیا، تبھی انہوں نے بھونکنا بند کردیا، اور واپس آکر گلیوں میں دبک گئے۔

گاؤں سے کافی دور آکر اب راجو نے ٹارچ کی روشنی آن کی۔ وہ سیاہ چادر میں لپٹا ہوا تھا۔ رادھا کی محبت نے اسے ہر ڈر سے بیگانہ کردیا تھا ورنہ عام حالات میں رات کے اس حصے میں کس کی موت پڑی ہے جو یوں ہنستا گھر سے نکلتا۔ یہ عشق بھی عجیب بیماری ہے۔

اب دیکھو راجو اپنی پریمیکا سے ملنے جا رہا تھا لیکن اس نے لاٹھی تک نہیں اٹھا رکھی تھی۔ اسے کیا کہنا چاہئے پیار یا خودکشی؟ یہ آج کل کے نوجوانوں کو کیا ہوگیا ہے؟ راجو ہر غم ہر خطرے سے بیگانہ آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ اب گھنے جنگل میں پہنچ گیا تھا۔ ایک سائے کو یوں جنگل میں چلتا دیکھ کر شب خور پرندے شور مچا رہے تھے جبکہ کچھ بھیڑیے تو اس کے آس پاس چکر بھی لگا رہے تھے اور غرا بھی رہے تھے۔ وہ دیکھو گیدڑ بھی بھاگ بھاگ کر دوسرے جانوروں کو جیسے نوید سنا رہے تھے کہ شاید کوئی شکاری ہے یا شکار، پرندوں کو خطرے کا احساس پہلے ہوجاتا ہے، وہ بھی شور کر رہے تھے۔

راجو ان ساری باتوں سے بے نیاز زیرلب مسکرایا۔ ”اب چاہے آدم خور شیر ہی کیوں نہ آجائے، پر مجھے رادھا سے ملنے سے کوئی بھی نہیں روک سکتا۔“

راجو کو بھی شاید خطرے کی بھنک ہوگئی تھی۔ اچانک ٹارچ کی روشنی میں بجلی کی سرعت سے ایک سایہ اس کے سامنے سے گزرا تو راجو رک گیا۔ ”کون ہے؟ کون ہے وہاں؟“ راجو نے آواز لگائی اور ٹارچ کی روشنی دائیں بائیں پھیلادی لیکن پراسراری خاموشی نے اس کا استقبال کیا۔ شاید کوئی جانور تھا، یہ سوچ کر دوبارہ اس نے پاؤں پر زور رکھا۔

رادھا کا گاؤں، پھول نگر سے کافی دور تھا، درمیان میں گھنا جنگل، پہاڑ اور تالاب تھا، جسے عبور کرکے آخرکار وہ رادھا کے بتائے ہوئے جامن کے درخت کے پاس پہنچنے میں کامیاب ہوگیا اس نے چادر اتار دی اور وہاں سستانے بیٹھ گیا۔ طویل توقف کے بعد دور کتوں کی آواز قریب ہوتی جا رہی تھی۔

نہ جانے وہ رادھا تھی یا کوئی اور بلا لیکن کتے بدستور بھونک رہے تھے۔ رات کا پچھلا پہر شروع ہوا چاہ رہا تھا اور اب تو اسے جامن کا وہ درخت بھی پراسرار سا لگ رہا تھا لیکن رادھا کی قربت حاصل کرنے کے لئے اس نے ڈر کو بھی مات دے رکھی تھی۔

ابھی وہ رادھا کے متعلق سوچ ہی رہا تھا کہ ایک سایہ تیزی سے اس کی طرف آتا دکھائی دیا اور تھوڑی دیر بعد رادھا اس کے سامنے کھڑی تھی۔ اس نے بھی لمبی سیاہ چادر اوڑھ رکھی تھی۔

راجو کو دیکھ کر اس نے چادر پھینک دی اور راجو سے ایسے چمٹی جیسے صدیوں سے کسی پیاسے کو پانی کا کنواں نظر آجائے۔ وہ کافی دیر بوس و کنار میں مصروف رہے اور ایک دوسرے سے چمٹے رہے۔ جذبات کا طوفان جب ٹھنڈا ہوا تبھی دونوں ایک سوکھی لکڑی کے تنے پر بیٹھ گئے اور باتوں میں مصروف ہوگئے۔

دونوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔

آگ دونوں طرف برابر تھی۔ وہ باتوں میں اتنے کھوئے ہوئے تھے کہ انہیں آس پاس شیر کی دھاڑ بھی سنائی نہیں دی۔

جنگلی جانور جو کب سے چیخ رہے تھے چلا رہے تھے، لیکن جنگل کے بادشاہ شیر کی دھاڑ سن کر وہ سارے خاموش ہوگئے اور خوف زدہ ہوکر ادھر ادھر چھپنے لگے۔ اب جنگل میں صرف شیر کی دھاڑ سنائی دے رہی تھی اور اب تو شیر کی دھاڑ راجو، رادھا کے قریب ہوتے جا رہی تھی۔ لیکن ان دونوں کو کسی بھی دھاڑ یا شور کا پتہ نہ تھا۔

☆......☆......☆

اگلی صبح راجو کو بستر پر نہ پاکر سبھی گھر والے پریشان ہوگئے، پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا تھا، جو یوں بغیر بتائے راجو باہر گیا ہو۔ صبح سے شام ہونے کو آئی تھی پر راجو کا کہیں نام و نشان نہیں تھا۔ راجو کی یوں اچانک

گمشدگی سے کئی شکوک شبہات جنم لے رہی تھی۔ راجو کے سبھی دوستوں سے پوچھا گیا، آس پاس کے گاؤں بازاروں میں تلاش کیا گیا، مندروں اور کھنڈروں میں بھی دیکھا مگر ناکام ہوئے۔

یہی حال دوسری طرف تھا یعنی رادھا کے گھر والے بھی اس کے یوں غائب ہونے پر شدید پریشان تھے۔ اوپر سے گاؤں والوں کی چہ میگوئیاں کہ رادھا کسی آشنا کے ساتھ بھاگ گئی ہے، لیکن رادھا کے باپ کو شک ضرور ہوا تھا لیکن وہ اپنی بیٹی پر اتنا اعتماد ر... یہ حرکت وہ کبھی نہیں کرے گی۔

پھول نگر والوں کی بے قراری بڑھتی جارہی تھی اور راجو کے گھر والے خصوصاً راجو کی ماں بار بار کہہ رہی تھی کہ ہوسکتا ہے آدم خور شیر کی یہ کارستانی ہو، اس لئے اندھیرا ہونے سے پہلے انہیں جنگل میں تلاش کیا جائے۔ اپنی تسلی کے لئے سب تیار ہوگئے۔

سارے گاؤں والوں نے لاٹھیاں، کلہاڑیاں اور ٹارچیں اٹھا رکھی تھیں وہ جنگل کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک راجو کو تلاش کرتے رہے۔

تلاش کرتے کرتے انہیں رادھا کے گھر والے بھی مل گئے وہ بھی اپنی بیٹی کو ڈھونڈ رہے تھے۔ اب رادھا کے باپ کو یقین ہو چلا تھا کہ رادھا راجو کے ساتھ کہیں بھاگ گئی ہے لیکن بدنامی کے خوف سے وہ خاموش تھا۔

ایک گاؤں والے نے باآواز بلند کہا۔ ”گاؤں والو! ایک ہی رات میں دو گاؤں سے دو منشوں (انسان) کا یوں غائب ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ جنگل میں ایک نہیں بلکہ دو آدم خور شیر رہتے ہیں جو اس طرح کھلے عام لوگوں کو اپنا شکار بنا رہے ہیں۔“

وہاں صرف رادھا کا باپ ہی مطمئن کھڑا تھا کیوں کہ وہ سمجھ رہا تھا کہ رادھا زندہ ہے اور راجو کے ساتھ بھاگ گئی ہے اور کسی بھی گاؤں والوں کو راجو اور رادھا کی پریم کہانی کا پتا نہیں تھا۔

رات کا اندھیرا پھیل گیا تھا چونکہ جنگل کافی وسیع تھا اس لئے گاؤں والوں نے فیصلہ کیا کہ باقی تلاش کل کی جائے گی کیوں کہ رات کو آدم خور شیر کا خطرہ ہوسکتا ہے۔ سارے گاؤں والے ناکام واپس لوٹے۔ ادھر رادھا کے باپ نے صرف اپنی بیوی سے اس بات کا خدشہ ظاہر کیا کہ رادھا اپنے آشنا راجو کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ لیکن یہ کہہ کر اسے خاموش کرادیا کہ ”رادھا ایسی نہیں تھی۔“

پھول نگر میں کافی بے چینی چھائی ہوئی تھی۔ ساری رات راجو کی گمشدگی موضوع بحث بنی رہی۔ صبح ہو... تے ہی راجو کے گھر والوں کے اسرار پر گاؤں والے دوبارہ جمع ہوئے اور آج ان کے بیچ گاؤں کا مشہور کھوجی رام دین بھی تھا جو اپنی کھوج میں کبھی ناکام نہیں ہوا۔ گاؤں اور آس پاس میں جتنی بھی چوریاں ہوتی تھیں، سب کی کھوج رام دین لگاتا تھا، وہ کافی عمر رسیدہ ہوچکا تھا اور اب آرام کی زندگی گزار رہا تھا۔

لیکن راجو کے خاندان کی پریشانی اس سے دیکھی نہیں جارہی تھی۔ ان کے ساتھ گاؤں کا مشہور مسلمان حکیم مرزا شجاعت بھی موجود تھا۔ جو چھوٹی چھوٹی جراحی بھی کرلیتا تھا اور حکمت تو اس کا پیشہ تھا۔

”ارے گاؤں والو کوئی شیر و یر نہیں ہے۔ جوان لونڈا تھا گیا ہوگا کہیں موج مستی کرنے، آپ لوگ یونہی اسے تلاش کرکے اپنا سمے برباد کررہے ہو۔“ فاریسٹ آفیسر انیل شرما اس موقع پر بھی اپنی چرب زبانی اور عیاری سے باز نہیں آیا۔

اس سے پہلے کہ گاؤں والوں کے عتاب کا شکار ہوتا وہ بھی ان کے ساتھ ہولیا۔ راجو اور رادھا کے گاؤں والے ایک جگہ جمع ہوگئے اور دن کے اجالے میں اپنی تلاش میں مصروف ہوگئے۔

آخر کار دوپہر میں جا کر ان کی تلاش ختم ہوئی۔ گھنے جنگل میں دور سے ہی دو لاشیں نظر آرہی تھیں۔ جب دوڑ کر سارے ان کے قریب آئے تو لاشوں کی حالت دیکھ کر سب سکتے میں آگئے۔

راجو کے گھر و... ے اس سے لپٹ کر رونے پیٹنے لگے جبکہ رادھا کا باپ بھی صدمے سے نڈھال تھا۔

حکیم مرزا شجاعت نے سب کو لاشوں سے دور رہنے کو کہا اور اپنے ساتھ لائے جراحی کے چند اوزاروں سے لاشوں کا معائنہ کرنے لگا۔ لاش کو جگہ جگہ سے نوچا گیا تھا لیکن دونوں کے چہرے سلامت تھے۔ وہ کافی دیر تک معائنہ کرتا رہا۔ اور آخر میں ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے گویا ہوئے۔ ”مارا تو انہیں آدم خور شیر ہی نے ہے لیکن......!“ وہ خاموش ہوگیا۔

”لیکن کیا؟“ گاؤں والوں نے حکیم سے اصرار کیا کہ کھل کر بتاؤ کیا مسئلہ ہے۔

تبھی حکیم نے بتایا۔ ”میرے تجربے کے مطابق یہ کسی شیر یا درندے کی کارستانی نہیں ہے۔ اب تک جتنے افراد آدم خور شیر کا شکار ہوئے ہیں، میں نے ان سب کا معائنہ کیا ہے۔ لیکن لاش پر دانتوں کی یہ گہرائی ثابت کرتی ہے کہ انہیں مارنے والا شیر نہیں ہے اور نہ ہی کوئی جنگلی جانور۔ لگتا ہے انہیں کسی انسان نے نوچا ہے۔“

حکیم کے نئے انکشاف نے تو سب کو سکتے میں کردیا۔ ”یہ...... یہ حکیم صاحب آپ کیا فرمارہے ہو، آپ کو پتا ہے کہ آپ کے اس بیان سے آپ کی ساکھ کتنی متاثر ہوسکتی ہے، پورا گاؤں آپ کی عزت و تعظیم کرتا ہے، اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ آپ کچھ بھی غیر ضروری بات کریں اور ہم یقین کرلیں۔“

گاؤں والے اب طیش میں آچکے تھے کہ رام دین کھوجی آگے بڑھ کر حکیم کی تائید میں بولنے لگا۔ ”گاؤں والو حکیم صاحب نے درست فرمایا اور میں بھی اپنے تجربے کی بنیاد پر بات کروں گا کہ یہ کام کسی شیر یا جنگلی جانور کا نہیں ہے۔ لاشوں کے آس پاس کہیں بھی شیر کے پنجوں کے نشان نہیں ہیں۔ آپ لوگ تو لاش ڈھونڈنے میں مصروف تھے، لیکن میں اپنا کام کرتا رہا، اور حیرت انگیز طور پر مجھے لاشوں کے پاس انسانی پاؤں کے نشان ملے ہیں، فرق صرف اتنا ہے کہ یہ نشان پاؤں کی سائز سے کچھ بڑے ہیں اور ایک خاص بات پاؤں کے نشان کے ساتھ ساتھ دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں کے نشان بھی واضح دیکھے جارہے ہیں۔ یہ دیکھو وہ نشان۔“ رام دین کھوجی سارے گاؤں والوں کو ایک طرف لے گیا جہاں سب نے وہ عجیب ہاتھ پاؤں کے نشان دیکھے۔

فاریسٹ آفیسر انیل شرما کب چپ رہنے والے تھے۔ ”حکیم صاحب اور کھوجی جی! کیوں گاؤں والوں کو ڈرا رہے ہو۔ وہ تو بیچارے پہلے ہی آدم خور شیر سے سہمے ہوئے ہیں۔ پہلے تو میں بھی نہیں مانتا تھا کہ آدم خور شیر کا وجود ہے، لیکن یہ لاشیں دیکھ کر مجھے بھی یقین ہوگیا ہے کہ یہ کام آدم خور شیر کا ہے۔ آپ اب بہت بوڑھے ہوچکے ہو آرام کرو، یہ غیر ضروری افواہیں پھیلانے والے لوگ مجھے بالکل پسند نہیں ہیں۔ کیوں ہاتھ دھو کر میری نوکری کے پیچھے پڑے ہو۔ گاؤں والو ڈرنے کی بات نہیں ہے۔ دن رات ایک کرکے ہمارا محکمہ آدم خور شیر کو پکڑے گا اور یقین کرو میری تو راتوں کی نیند اڑ گئی ہے۔ اس شیر کو لے کر، مگر فکر مت کرو میں ہوں ناں۔“

”یہ آفیسر گاؤں والوں کو ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا لیکن وہ سب اس بات پر متفق ضرور ہوئے کہ یہ کام اکیلے آدم خور شیر کا نہیں ہے کہ ایک ہی رات میں دو گاؤں سے شکار کرے، یقیناً یہ کام دو یا دو سے زائد شیروں کا ہے باقی حکیم اور کھوجی خاموش ہوگئے۔

لاشوں کو گاؤں پہنچایا گیا جہاں انہیں اپنی رسومات کے تحت شمشان گھاٹ میں اگنی کے سپرد کیا گیا اور اس طرح راجو اور رادھا کی پریم کہانی بھی خاک ہوگئی۔

☆......☆......☆

دھیرے دھیرے جیون کی گاڑی دوبارہ پٹڑی پر آگئی اور پھول نگر کی رونقیں بحال ہوگئیں، دن ہفتوں میں اور ہفتے مہینوں میں ڈھل گئے، مگر کوئی بھی ناخوشگوار واقعہ رونما نہیں ہوا، تبھی گاؤں والے سمجھے کہ آدم خور شیر کا خطرہ ٹل گیا لیکن حکیم اور کھوجی کے خدشات ابھی بھی ختم نہیں ہوئے، کوئی بھی ان کی بات ماننے کو تیار نہیں تھا، اوپر سے فاریسٹ آفیسر نے انہیں دبایا ہوا تھا کہ ایسی باتوں سے گاؤں والوں کو ڈرانے سے گریز کریں ورنہ ان کے خلاف قانونی کارروائی کی جائے گی۔ جبکہ راجو

کے ماں باپ تو اب تک اس صدمے سے نہیں نکلے تھے، کتنے ارمان تھے ان کے دل میں مگر آدم خور شیر نے سب ارمانوں کا گلا گھونٹ دیا۔

اکثر اولاد کی نافرمانی کی سزا ان کے والدین کو ملتی ہے۔

رات کافی تاریک تھی، ڈاکو جو کہ شہر سے ساہوکار کی تجوری لوٹ کر آئے تھے دس افراد پر محیط تھا اور سب گھوڑوں پر سوار تھے۔ اب وہ جنگل کی حدود میں داخل ہو چکے تھے، ان کے ساتھ گھوڑے بھی تھک چکے تھے۔

"سردار! اب خطرہ ٹل چکا ہے اور مسلسل سفر نے سب تھک چکے ہیں۔ اگر اجازت ہو تو کچھ سمے کے لئے یہاں جنگل میں پڑاؤ کیا جائے؟"

سردار جو خود بھی تھک چکا تھا اس نے اجازت دے دی۔ انہوں نے گھوڑوں پر لدے سامان کو اتارا اور ایک جگہ صاف کر کے وہاں بیٹھ گئے۔ جبکہ گھوڑوں کو قریب درختوں کے ساتھ باندھ دیا اور خود ٹولی کی شکل میں بیٹھ کر باتوں میں مصروف ہو گئے۔ جنگل کے ماحول میں عجیب سی کیفیت طاری تھی جبکہ ڈاکوؤں کے گھوڑے بھی بار بار ہنہنا رہے تھے۔

لیکن وہ سب کسی انجان خطرے سے بے پرواہ باتوں میں مصروف تھے کہ یکدم جنگل میں موت کی سی خاموشی چھا گئی۔ "سردار! یہ خاموشی کی بھی اپنی زبان ہوتی ہے۔ کیا خیال ہے آپ کا۔" سردار نے بندوق کو اپنے کندھے پر رکھتے ہوئے مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے مغرورانہ انداز میں بولا۔ "ڈاکو پرتاب سنگھ کے آگے بڑے سے بڑے سورماؤں کی دال نہیں گلتی تو یہ جنگلی بلا جسے تم شیر کہتے ہو۔ بھلا اس کی کیا اوقات۔"

دوسرے ڈاکو نے سردار کی چاپلوسی کرتے ہوئے کہا۔ "مان گئے سردار! آپ نے تو جنگل کی خاموشی کا مطلب بھی سمجھا دیا یعنی جنگل کا شیر اب ڈاکوؤں کے سردار سے مقابلہ کرنے تشریف لا رہا ہے۔" اس پر سارے ڈاکو زور زور سے قہقہے مارنے لگے۔

اچانک دور شیر کی دھاڑ گونجی اور وہ یکدم خاموش ہو گئے۔ "لگتا ہے شیر نے بھی ہماری بات سن لی۔" وہ دوبارہ ہنسنے لگے۔ سردار نے دو بندوں کو اوپر درخت پر چڑھ جانے کو کہا اور تنبیہ بھی کی کہ وہ اوپر سے نگرانی کریں گے اور حالات جیسے بھی ہوں شیر کو بھاگنے نہیں دینا ہے، دو افراد کو پاس والی گھنی جھاڑیوں میں بھیج دیا اور چوکنا رہنے کو کہا۔

باقی ڈاکو سردار کی سربراہی میں وہاں گھنی جھاڑیوں کے پیچھے گھات لگا کر بیٹھ گئے۔ شیر کی دھاڑ قریب ہوتی جا رہی تھی، سردار سرگوشی میں ہمیں حملے کی ہدایات دے رہا تھا۔

اچانک سامنے ایک نہیں بلکہ دو شیر نمودار ہوئے، ایک شیر تھا دوسری شیرنی، شیروں کا یہ جوڑا بہت ہی خونخوار اور بھیانک نظروں سے دائیں بائیں دیکھ رہا تھا۔ انہیں غالباً ان کی بو آ گئی تھی۔

سردار بھی بزدل نہیں تھا، دبے پاؤں وہ بھی ان کے سامنے آ گیا اور دوسرے ڈاکو اس کے پیچھے بندوق تانے کھڑے تھے، شیرنی وہاں کھڑی رہی اور شیر دور سے ہی ہوا میں لہرا کر سردار پر حملہ آور ہوا اور اس کے ساتھ ہی بندوق کی گولیوں کی بوچھاڑ شروع ہو گئی۔

اوپر درختوں پر بیٹھے ڈاکو بھی شیر کا نشانہ لینے لگے۔ اتنی گولیوں سے بھلا وہ کیسے بچتا، فضا ہی میں دو گولیاں کام آ گئیں، ایک گولی شیر کے سر کے آر پار ہو گئی اور دوسری گولی اس کے پیٹ میں لگی تھی۔

سردار سائیڈ پر ہو گیا اور شیر دھڑام سے نیچے زمین پر گر گیا۔ دوسری طرف شیرنی فرار ہونے کی کوشش کر رہی تھی، ایک گولی پہلے ہی اسے لگی تھی اور اب ساری بندوقیں اس کی رخ پر تھیں ایک ساتھ کئی فائر ہوئے اور شیرنی گولیوں سے چھلنی ہو گئی اور تھوڑا آگے جا کر گر گئی اور پھر ٹھنڈی ہو گئی۔

شیروں کی جوڑی مر چکی تھی۔

جبکہ سارے ڈاکو خوشی سے ہوائی فائر کر کے جیسے جشن منا رہے تھے۔ سب سردار کی بہادری پر داد دے رہے تھے جبکہ ڈاکوؤں کا سردار مونچھوں کو اکڑ کرتا وُدے

رہا تھا۔ سردار مرے ہوئے شیر کے پاس آیا اور مغرورانہ انداز میں کہا۔ "جنگل کا ایک ہی شیر ہے، اور وہ ہے سردار پرتاب سنگھ۔" سردار کے ساتھی اب نعرے مار رہے تھے۔ "سردار پرتاب سنگھ کی جے ہو، جنگل کا شیر کون...... سردار پرتاب سنگھ۔" اپنی جے جے سن کر ڈاکوؤں کا سردار بہت خوش ہوا اور اس طرح دن کا اجالا ہونے سے پہلے ہی وہ وہاں سے کوچ کر گئے۔

☆......☆......☆

فاریسٹ آفیسر انیل شرما اپنے چند ماتحت اہلکاروں کے ہمراہ معمول کے گشت پر تھے، وہ خوش گپیوں میں مصروف تھے کہ ایک اہلکار کی نظر شیر کی لاش پر پڑی تو اس نے چیخ کر کہا۔ "سر جی! وہ رہا شیر" یہ سنتے ہی انیل شرما پر تو جیسے بجلی گر گئی، وہ ڈرپوک تو پہلے ہی تھا شیر کا سن کر دوسرا اہلکار بولا۔ "سر جی لگتا ہے شیر مر چکا ہے کبھی تو حرکت نہیں کر رہا۔" یہ سنتے ہی انیل شرما کی جان میں جان آئی۔ اس نے ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا۔ "یار تو نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا...... میں سمجھا زندہ شیر گیا ہے۔"

انیل شرما اور اہلکار شیر کی لاش کے قریب آئے تو ان کی نظر مردہ شیرنی پر بھی پڑی۔ "ارے واہ ری قسمت، آج تو دو دو مردہ شیر جنگل میں پڑے ہیں، ہماری تو لاٹری نکل پڑی۔" فاریسٹ آفیسر کی لالچ سے رال ٹپک گئی اس کی آنکھیں چمک گئیں، اس نے اہلکاروں کو حکم دیا کہ دونوں مردہ شیروں کو ایک جگہ پر رکھو، انہوں نے حکم کی تعمیل کی۔

انیل شرما عیار تو پہلے ہی تھا اس نے سب اہلکاروں کو جمع کیا۔ ادھر ادھر دیکھا اور مکاری سے بولا۔ "ساتھیو! میری بات غور سے سنو۔ ہمارے سوا کسی کو بھی پتا نہیں ہے کہ یہ آدم خور شیر پہلے ہی سے مرے پڑے ہیں۔ ہم پھول نگر واسیوں سے کہیں گے کہ ان آدم خور شیروں کو ہم لوگوں نے مارا ہے۔ انعام کا انعام بھی اور شہرت الگ سے۔ بڑے بڑے شکاری ناکام ہوئے اور حکومت ہند نے ان آدم خور شیروں کو مارنے پر انعام بھی تو رکھا ہے۔ ہم گاؤں والوں کے ہیرو بن جائیں گے۔ ہمارا پروموشن بھی ہوگا اور جے جے کار بھی۔ ایک لمحے کے لئے سوچو ہم جدھر سے گزریں گے لوگ ہماری بہادری کی مثالیں دیں گے۔ لیکن میری بات یاد رکھنا اگر بھولے سے بھی کسی نے یہ راز کھول دیا تو بدنامی الگ اور نوکری سے بھی ہاتھ دھونا پڑ جائے گا۔" اہلکار بھی اس کی باتوں میں آ گئے۔

"سر جی اس بات کی چنتا مت کرو اور وشواس رکھو، مرتے دم تک یہ راز راز ہی رہے گا اور ہم آپ کے ساتھ ہیں، پر آپ ہمارا خیال رکھنا اور انعام کی رقم برابر تقسیم کرنا اور سرکار سے ہماری پروموشن کا بھی چرچا کرنا۔"

سب متفق ہو گئے تو انیل شرما نے ایک اہلکار کو بھگایا کہ پھول نگر سمیت آس پاس کے سارے گاؤں میں اعلان کرا دو کہ فاریسٹ آفیسر نے دونوں آدم خور شیروں کو مار دیا ہے اور وہ لوگ یہاں آ کر اپنی آنکھوں سے مردہ شیروں کو دیکھ سکتے ہیں۔

وہ اہلکار دوڑتا ہوا گاؤں کی طرف گیا۔ ادھر انیل شرما اپنے مستقبل کے سہانے خواب دیکھنے لگا۔ کوئی آدھے گھنٹے بعد جوق در جوق جنگل کی طرف آنے لگے جو بھی آتا جاتا وہ مردہ شیروں کو دیکھ کر دنگ رہ جاتا اور فاریسٹ آفیسر کے لئے تو تعریفوں کے پل بندھ گئے۔

بچے، بوڑھے، مرد، عورتیں، مطلب پورا گاؤں وہاں امڈ آیا۔ لوگ مردہ شیر کو اپنے ہاتھوں سے چھوتے اور جشن مناتے ہوئے فاریسٹ آفیسر اور اہلکاروں کو تو کندھے پر اٹھا لیا، ڈھول باجے والے بھی آ گئے۔

لیکن ان کے درمیان کھوجی رام دین سنجیدہ کھڑے تھے اور بار بار زمین پر جیسے کچھ کھوج رہے تھے۔ "انیل بابو تیرے سے کچھ بات کرنی ہے مگر اکیلے میں۔" رام دین کھوجی اور انیل شرما بھیڑ سے تھوڑے دور ایک درخت کے نیچے کھڑے ہو گئے۔

"بول کیا بات ہے؟" انیل شرما نے قدرے پریشانی میں پوچھا۔

پہلے تو کھوجی خوب ہنسا اور پھر انیل شرما کا پسینہ

صاف کرتے ہوئے بولا۔ ”دیکھو انیل بابو! کھوجی سے کوئی کھرا چھپا ہوا نہیں ہوتا۔ شیروں کے آس پاس سرکاری بوٹوں کے نشان نہیں ہیں، اس کا مطلب......؟“

انیل شرما نے سرعت سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور اسے خاموش کرتے ہوئے کہا۔ ”دیکھو چاچا مجھے پتا ہے کہ آپ اپنے کام میں ماہر ہو...... پوری زندگی کام کیا اور اب بڑھاپے میں آرام سے شانتی سے رہنا چاہتے ہو اور اپنے پریوار کے لئے فکر مند بھی ہو......مگر چنتا مت کرو میں ہوں نا، میں تمہیں انعام کی رقم سے برابر کا حصہ دوں گا۔ دیکھو سارے لوگ کتنا خوش ہیں...... میرا بھی پریوار ہے، میرا بھی جیون ہے...... میں آشا کرتا ہوں کہ تم اپنا منہ ہمیشہ کے لئے بند رکھو گے اور میری سہائتا کرو گے اگر ایسا نہیں ہوا تو تو مجھے جانتا ہے، آدم خور شیروں کو میں نے مارا ہے یا نہیں، یہ الگ بات ہے مگر میں تجھے ضرور ماروں گا اور اسی جگہ تیری ہتیا کرکے لوگوں سے کہوں گا کہ کسی جنگلی جانور نے کھوجی رام دین کا شکار کرلیا اور جنگل گاؤں والوں کے لئے بند......تو میرے محترم چاچا رام دین کھوجی صاحب اب تو مجھے آپ کی بھی چاپلوسی کرنی پڑے گی...... ہے بھگوان!“

رام دین جو خاموشی سے اس کی تقریر سن رہا تھا اس نے مسکرا کر کہا۔ ”چلو کیا یاد کرو گے، لیکن یاد رکھنا انعام کی رقم میں مجھے بھولنا نہیں۔“

انیل شرما نے اسے وچن دیا کہ انعام کی رقم ملتے ہی اس کا حصہ اس کے گھر تک پہنچ جائے گا۔ وہ اب بھیڑ میں آگئے تھے جہاں دیکھتے ہی دیکھتے کچھ اخباری نمائندے، اعلیٰ افسران، چینل والے اور محکمہ جنگلات کے عہدیداران جمع ہوگئے تھے۔

سب کے درمیان راجو اور رادھا کی فیملی بھی تھی جو آدم خور شیروں کی ہلاکت پر خوش ہورہے تھے کہ ان کے بچوں ان کا بدلہ پورا ہوگیا تھا۔ ایسے مواقع پر بھلا منتری کسی سے پیچھے کیوں رہیں، سو علاقے کا منتری بھی وہاں تشریف لایا اور جنتا کو دیکھ کر وہاں بھی بھاشن دینے لگ گیا، موصوف کے مطابق ان کی کوشش سے آدم خور شیر ہلاک ہوئے ہیں۔ آخر میں ایک آفیسر نے آگے بڑھ کر انیل شرما کو مبارک باد دی اور یہ اعلان کیا کہ محکمہ جنگلات کی طرف سے فاریسٹ آفیسر انیل شرما اور اس کی ٹیم کو اس شاندار بہادری پر ایک لاکھ روپے کا انعام دیا جاتا ہے اور میں دلی سرکار سے ان کی پروموشن کی چرچا کروں گا۔

انعام اور پروموشن کا سن کر انیل شرما اور اہلکار بہت خوش ہوئے جبکہ پھول نگر واسیوں نے تالیاں بجا کر ان کا خیر مقدم کیا، آج ہر چہرہ خوش تھا، جن لوگوں کے اپنے شیر کا شکار ہوئے تھے ان کی خوشی تو دیدنی تھی۔

سیٹھ تھارو مل کی کوٹھی میں ایک میٹنگ چل رہی تھی۔ سیٹھ تھارومل کا لکڑی کا کارخانہ تھا۔ پھول نگر میں کئی لکڑی کے کارخانے واقع تھے مگر سب سرکار کی پرمٹ سے جائز طور پر چلتے تھے سوائے سیٹھ تھارومل کے کارخانے کے۔ وہ جنگل سے غیر قانونی چوری شدہ لکڑیاں بیچتا تھا۔ اس نے اپنے کارخانے میں مزدور بھی اپنی طرح چور، بدمعاش، موالی اور اوباش پال رکھے تھے جو اپنے مالک کے اشارے سے جنگل سے لکڑیاں چراتے تھے، اس کام کے لئے سیٹھ تھارومل نے فاریسٹ آفیسر انیل شرما کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا تھا اور اسے معقول رقم بطور مستقل رشوت کے طور پر دیتا تھا تاکہ وہ ان کے کام میں دخل اندازی نہ کرسکے، اس نے چور اور چوکیدار کو ملا دیا تھا۔

آدم خور شیروں کی وجہ سے سیٹھ تھارومل کے کارخانے کو کافی مالی نقصان پہنچا تھا کیوں کہ ایک رات لکڑی چوری کرتے ہوئے کارخانے کے کئی مزدور آدم خور شیروں کا شکار ہوگئے اور چوری کی بدنامی کی وجہ سے سیٹھ تھارومل نے مشہور کروادیا کہ ان کی آپس کی دشمنی تھی جس کی وجہ سے وہ لوگ آپس میں لڑے اور مارے گئے۔

اس دن کے بعد کوئی بھی مزدور آدم خور شیر کے خوف کی وجہ سے جنگل سے چوری کی لکڑی کاٹنے پر آمادہ نہیں ہوا اور یوں قریباً کئی ماہ سے سیٹھ تھارومل کا

کارخانہ بند پڑا تھا۔ لیکن اب جبکہ فاریسٹ آفیسر نے آدم خور شیروں کو مارا تھا تبھی سب لوگوں کا حوصلہ بڑھ گیا۔ لوگ راتوں کو بھی گھروں سے نکلنے لگے تھے اور لکڑی چوروں کی تو چاندی ہوگئی تھی اسی لئے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سیٹھ تھارو مل نے آج اپنے کارخانے کے مزدوروں کو اپنے گھر پر بلایا تھا اور انہیں حکم دیا کہ کل سے ہی اپنا کام شروع کردو۔

رات کو جنگل سے لکڑی چوری کرکے کارخانے پر پہنچاؤ اور دن کے اجالے میں سرکاری پرمٹ سے ناجائز چوری شدہ لکڑی کو جائز طریقے سے بیچیں گے، آپ لوگوں کی دیہاڑی ڈبل اور کمیشن الگ سے۔ اس کے چور اور موالی مزدور راضی ہوگئے اور ایک بار پھر وہ پرانے دھندے پر لگ گئے اور میٹنگ بھی برخواست ہوئی۔

☆......☆......☆

پانچ افراد پر مشتمل یہ قافلہ لکڑی کاٹنے کے اوزاروں، جدید آرے مشین اور کلہاڑوں سے لیس رات کی تاریکی میں گھنے جنگل کی طرف رواں دواں تھے۔ رات اپنے جوبن پر تھی۔ انہوں نے وقت ضائع کئے بغیر کٹائی شروع کردی۔

ابھی انہوں نے مشکل سے ایک درخت ہی کاٹا ہوگا کہ ایک سایہ سرعت سے گزرا جسے دیکھ کر سارے چونک گئے۔ اور سہم کر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ ”وہ کیا تھا؟“ ایک اور بولا۔ ”یارو جنگل ہے، کوئی جنگلی جانور ہوگا...... کوئی فلمی ہیروئن تو آنے سے رہی، جلدی کام ختم کرو۔“ دوسروں نے بھی اس کی تائید کی اور وہ دوبارہ درخت کی کٹائی میں مصروف ہوگئے۔

ایک مزدور رفع حاجت کی غرض سے پاس والی گھنی جھاڑیوں میں گیا اور تھوڑی دیر بعد اس کی چیخ سنائی دی۔ وہ چاروں کام چھوڑ کر سرعت سے اس کی طرف دوڑے۔ اگلا منظر اتنا دہشت ناک اور ڈراؤنا تھا جسے دیکھ کر وہ سب سکتے میں آگئے، خوف سے ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وہ پتھر کے بت بن گئے، کیوں کہ منظر ہی ایسا تھا۔

ایک انسان نما حیوان جو سر سے پاؤں تک لمبے سیاہ بالوں میں ڈھکا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ کسی جنگلی بلے کی طرح مگر ناک نقوش آدمی کی طرح تھے، آنکھیں بے حد سرخ اور کان بے حد لمبے، بال اتنے کہ لباس کی ضرورت نہیں تھی وہ خطرناک حیران مزدور کا گوشت نوچ رہا تھا۔ جگہ جگہ سے اس کا گوشت نوچا ہوا تھا اور اب اس کا پیٹ چیر پھاڑ کر اس کی انتڑیاں نکال کر کھانے میں مصروف۔

درندے نے جب دوسرے مزدوروں کو دیکھا تو وہ ان کی طرف لپکا، ارے یہ کیا! یہ تو کسی چار پائے جانور یا کسی بھالو یا بندر کی طرح دونوں پاؤں اور دونوں ہاتھوں کے زور سے نیچے زمین پر جھک کر چل رہا تھا اور مینڈک کی طرح ہوا میں اچھل کر آگ کی طرف چل رہا تھا۔

ایک مزدور نے تو اس پر گولی چلادی جس کی ہشت اور آواز سے وہ خوفزدہ ہوا اور گولی کی آواز سے حواس باختہ ہوکر اپنا رخ موڑا اور گولی کی سی اسپیڈ سے وہ واپس بھاگنے لگا، اسے یوں بھاگتا دیکھ کر سب کی ہمت بندھی اور وہ بھی اس کے تعاقب میں دوڑ پڑے۔ اب سب کے ہاتھوں میں پسٹل تھے جو ایسے موقعوں کے لئے وہ اپنے ساتھ لائے تھے۔

تین مزدوروں نے تو کافی دیر تک اس کا پیچھا کیا لیکن وہ شاید کہیں چھپ گیا تھا جبکہ ایک مزدور جو کافی عمر رسیدہ تھا وہ تھک گیا تھا اور ان سے پیچھے رہ گیا تھا، وہ پکار پکار کر سب کو آواز دے رہا تھا لیکن اس کے ساتھی کافی آگے نکل چکے تھے، وہ ایک گھنے درخت کے نیچے بیٹھ گیا، وہ ہانپ رہا تھا اور سانس بحال کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ جس درخت کے نیچے وہ بیٹھا تھا۔

وہ حیوان بھی اس درخت کے اوپر پتوں میں چھپا ہوا تھا۔ غصے سے غرایا۔ اس کی غراہٹ کسی شیر کی طرح تھی، ارے وہ تو شیر کی طرح دھاڑ بھی رہا تھا۔ مزدور سمجھا درخت پر کوئی شیر بیٹھا ہے اور آج میری خیر نہیں ہے۔ پسٹل اس کے ہاتھ میں تھا، تب بھی وہ ڈر سے سہا ہوا تھا اور جان بلب ہونے کو آئی تھی۔ وہ بھگوان کو یاد کررہا تھا۔

اچانک کسی باز کی طرح وہ حیوان اوپر سے لپکا اور مزدور پر حملہ کردیا۔ مزدور زمین پر گر گیا لیکن گرتے سمے اس نے فائر کردیا۔ گولی کسی درخت سے ٹکرائی لیکن اس سے یہ فائدہ ہوا کہ گولی کی آواز کی دہشت سے وہ حیوان پھر گھبرا گیا اور جاتے جاتے غصے سے غرا کر مزدور کے قریب آیا اور اپنے بے حد نوکیلے دانتوں اور نوکیلے پنجوں سے مزدور کا بازو کاٹ ڈالا اور چباتا ہوا ایک طرف کو بھاگ گیا۔

مزدور کرب سے چیخا، گولی کی آواز سن کر اس کے بقیہ ساتھی بھی دوڑتے ہوئے اس کے پاس پہنچ گئے اور اس کی روداد سن کر دنگ رہ گئے۔ ”ساتھیو ہم اس حیوان سے مقابلہ نہیں کرسکتے، وہ نہ جانے کیا بلا ہے اس لئے ہم اپنا کام موخر کرتے ہیں۔“

اپنے مردہ ساتھی کی لاش سمیت وہ چاروں ناکام و نامراد ہوکر واپس جارہے تھے...... ان کا رخ سیٹھ تھارو مل کے لکڑی کے کارخانے کی طرف تھا۔ وہ شدید ڈرے ہوئے تھے، ان کی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ اپنی کتھا کس کو سنائیں، زخموں سے چور پسینہ پسینہ ایک لاش اٹھائے وہ کارخانے کے اندر گھسے اور اندر سے دروازہ بند کردیا۔ رات ابھی باقی تھی۔

☆......☆......☆

اتنا بڑا واقعہ بھلا کیسے چھپ سکتا تھا سو پھول نگر پر پھر سے خوف کے بادل منڈلانے لگے۔ پورا علاقہ ڈر اور خوف سے چلا اٹھا، گھر گھر اس خونی حیوان کو لے کر چرچا ہونے لگا، حالات کے پیش نظر پھول نگر کے مکھیا نے پنچایت بلالی۔

شام تک سارے گاؤں والے پیپل کے درخت کے سائے میں جمع ہوگئے تھے۔ جو گاؤں کے درمیان کھلے میدان میں واقع تھا۔ مکھیا نے باآواز بلند فرمایا۔ ”گاؤں والو پہلے آدم خور شیر کی وجہ سے ایک سمے کے لئے ڈر اور خوف کا ماحول بنا رہا لیکن اب معاملہ کچھ اور ہے۔ پہلے ہمارا مقابلہ آدم خور شیر سے تھا لیکن اب ہمارا مقابلہ آدم خور منش سے ہے۔ اس نے جس برے طریقے سے مزدور کا حشر کیا وہ سب آپ کے سامنے ہے۔ وہ کون ہے؟ کہاں سے آیا؟ ہمیں معلوم نہیں۔ لیکن بہت زیادہ شکتی شالی اور خطرناک ہے یہ معلوم ہے۔ وہ انسان ہے یا حیوان؟ معلوم نہیں لیکن انسان نما حیوان دکھائی دے رہا تھا۔ اس لئے ہم نے اس کا نام آدم خور منش رکھ دیا ہے۔ شیر تو جنگلی جانوروں کا شکار کرکے بھی زندہ رہ سکتا ہے مگر یہ درندہ صرف اور صرف لوگوں کا گوشت کھاتا ہے اس لئے میری سب گاؤں والوں سے بنتی ہے کہ احتیاط برتیں۔ اپنے آس پاس کے ماحول کا جائزہ لیں۔

شام کے سمے اپنے اپنے چھوٹے بچوں کو گھر سے باہر مت نکالیں۔ ہماری جانکاری کے مطابق اب بھی کچھ پریمی جوڑے رات کے سمے جنگل میں بھٹکتے ہیں، میں انہیں آخری چتاونی دیتا ہوں کہ اپنی غیر اخلاقی حرکتیں بند کردیں، ورنہ ان کا حشر بھی راجو سے بھیانک ہوگا۔ پریوار (خاندان) کے جتنے بھی بڑے ہیں میری ان سے بنتی ہے کہ اپنی جوان اولاد پر نظر رکھیں، خصوصاً رات کے سمے ان کی کڑی نگرانی کی جائے۔ اس موقع پر میں محکمہ جنگلات سے پورے بھول نگر کی طرف سے عرضی پیش کرتے ہیں کہ پہلے کی طرح اس بار بھی ہماری سہائتا کی جائے اور اس آدم خور منش کو مارنے یا پکڑنے کا انتظام کیا جائے۔

میں آشا کرتا ہوں کہ فاریسٹ آفیسر حکومت ہند تک ہماری یہ عرضی جلد سے جلد پہنچادیں گے۔

میں حکم دیتا ہوں کہ گاؤں میں دوبارہ چوکی بحال کی جائے۔ گاؤں کے داخلی اور خارجی راستوں کی نگرانی کی جائے اور اجنبی لوگوں کی خصوصی طور پر جانچ کی جائے۔ باری باری سارے گاؤں والے چوکی کی ڈیوٹی سرانجام دیں گے اور آخر میں پھر بنتی کروں گا کہ رات کے سمے غیر ضروری سفر سے پرہیز کیا جائے، ساودھان رہیں اور خوش رہیں۔“ مکھیا کا بھاشن ختم ہوگیا اور سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہوئے۔

☆......☆......☆

ساہوکار کی بیٹی سوناکشی لندن سے اپنی پڑھائی پوری کر کے واپس پھول نگر آ رہی تھی۔ صبح سے ہی ساہوکار کے بنگلے کو سجا رہے تھے اور اب شام ہونے کو آئی تھی۔ بمبئی ایئرپورٹ سے وہ کار پر گاؤں آ رہی تھی۔ ساہوکار کی فیملی خاصی خوش حال تھی اس لئے اپنی اکلوتی بیٹی کو لندن پڑھانے بھیجا تھا اور آج اس کی واپسی پر وہ بہت خوش تھے اور اس کا استقبال کرنے کے لئے صبح سے ہی تیاری کر رہے تھے۔

پھول نگر کے پھولوں کے کافی کھیتوں کا مالک وہ ساہوکار تھا۔ پورا بنگلہ پھولوں کی پتیوں، مالاؤں سے سجا دیا تھا۔ سوناکشی نے شام سات بجے گاؤں پہنچنا تھا۔ لیکن شام سے رات ہوگئی تھی اب اس کے گھر والوں کا انتظار پریشانی میں بدل گیا تھا۔ انہیں اپنی اکلوتی اولاد کی چنتا ستانے لگی۔ ساہوکار نے چند کارندوں کو بھیجا تھا کہ آگے جا کر پتا کرو کہ سوناکشی کہاں پہنچی ہے۔

ادھر سوناکشی بمبئی سے ہی لیٹ ہوگئی تھی، دراصل ان کی گاڑی بمبئی کی ٹریفک میں بری طرح پھنس گئی تھی۔ آخرکار ان کی کار بمبئی کی حدود سے باہر ہائی وے پر فراٹے بھرتی ہوئی اپنی منزل کی طرف رواں تھی۔ پھول نگر کے جنگلات کی حدود تک پہنچتے انہیں رات کے بارہ ہوگئے تھے۔

سڑک مکمل ویران اور گاڑیوں سے خالی تھی۔ اچانک سوناکشی کی کار رک گئی۔ ”کیا ہوا ڈرائیور؟“ ڈرائیور خود بھی حیران تھا کہ یوں اچانک کار کیسے رک سکتی ہے جبکہ پیٹرول کی ٹنکی تو فل تھی۔ ”دیکھتا ہوں میم صاحب۔“ ڈرائیور نے کار کا دروازہ کھولا اور اس نے انجن کا بونٹ کھولا۔

طویل سفر کی وجہ سے انجن گرم ہوگیا تھا، ڈرائیور نے ڈگی سے پانی کا خالی کین اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”میم صاحب کار کا انجن گرم ہوگیا ہے۔ میں تھوڑی دیر میں پانی بھر کے آتا ہوں۔ آپ یہیں بیٹھی رہیں، بس میں یوں گیا اور یوں آیا۔“

سوناکشی نے غصے سے کہا۔ ”بے وقوف گدھے! جب پتہ تھا انجن گرم ہو جاتا ہے تب پہلے ہی سے کین کیوں نہیں بھر کے رکھا تھا؟“ ڈرائیور بے چارہ سہم گیا۔ ”اب منہ کیا دیکھ رہے ہو جلدی پانی بھر آؤ پہلے ہی ہم لیٹ ہوگئے ہیں، ممی پپا کتنے پریشان ہوں گے، جلدی کرو۔“

ڈرائیور نے کین اٹھایا اور جنگل میں چلا گیا۔ سوناکشی کار میں ہی بیٹھی تھی اور بار بار گھڑی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جنگلی جانوروں کا شور اپنے عروج پر تھا۔ ویران سڑک پر کھڑی کار جیسے ان جنگلی جانوروں کا منہ چڑا رہی تھی۔ جانوروں کی چیخوں میں شیر کی دھاڑ بھی شامل ہوگئی۔ ایسے خطرے سے بے نیاز سوناکشی کار میں بیٹھی خود کو محفوظ محسوس کر رہی تھی کہ اچانک کار کا دروازہ کھلا اور آدم خور منش سرعت سے کار میں داخل ہوا اور سوناکشی پر ٹوٹ پڑا۔

سوناکشی کی چیخیں سن کر قرب و جوار کے سارے چرند پرند خوف سے سہم گئے۔ عصمت دری کے بعد آدم خور منش اس کا گوشت نوچ کر کھانے لگا اور اس کا پیٹ ادھیڑ کر رکھ دیا۔ کافی دیر بعد جب ڈرائیور واپس آیا تو کار کے باہر خون کے نشان دیکھ کر پانی کا کین اس کے ہاتھوں سے گر گیا۔ کار کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اسے پانی ڈھونڈنے میں کافی دیر ہوچکی تھی۔ اور ادھر آدم خور منش نے اپنا کام کر دیا تھا۔ اندر کار میں ہی سوناکشی کی لاش دیکھ کر وہ سکتے میں آ گیا وہ چکرا گیا اور سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

سوناکشی کی جگہ جب اس کی لاش گھر پہنچی تو ساہوکار سمیت سارے گھر والے ماتم کرنے لگے، وہ لاش سے لپٹ لپٹ کر رونے لگے۔ سوناکشی کی ماتا جی تو صدمے سے نڈھال بے ہوش ہوگئی۔ سوناکشی کی موت کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پورے گاؤں میں پھیل گئی۔

تھانیدار نے ڈرائیور کو گرفتار کرلیا اور تفتیش کے لئے جیل بھیج دیا۔ بس یہ تو رسمی کارروائی تھی پر حقیقت سب جانتے تھے کہ یہ خون آدم خور منش نے کیا ہے۔ آج پھول نگر میں پھر جیسے کانٹوں کی بارش تھی۔ ہر گھر ماتم کدہ تھا، ہر آنکھ اشکبار تھی اور ہر چہرہ اداس تھا۔

بعد از اں گاؤں والوں نے اپنے طور پر یکجا ہو کر اس آدم خور کی بہت تلاش کی مگر بے سود۔ نہ آدم خور ملا اور نہ ہی کوئی اس کا نشان سو گاؤں والے صبر کر کے بیٹھ گئے۔ وقت گزرتا گیا۔ رام دین کھوجی بھی گزر گیا۔

فاریسٹ آفیسر انیل شرما کی ترقی ہوگئی تھی اور ساتھ ہی اس کا تبادلہ بھی ہوگیا تھا۔ اس کی جگہ دلی سے نیا فاریسٹ آفیسر تعینات ہوا جس کا نام انسپکٹر عباس خان تھا۔ وہ بہت بہادر اور نہایت ہی ایماندار انسان تھا۔ پھول نگر کے جنگلات کا چارج سنبھالتے ہی پنچایت بلالی۔ گاؤں کے مکھیا نے سب کو پیپل کے پیڑ کے سائے تلے جمع کیا اور بھیڑ سے مخاطب ہو کر کہا۔

”گاؤں والو ہمارے پھول نگر میں نیا فاریسٹ آفیسر پدھارے آئے ہیں۔ شری عباس خان جو دلی سے ہیں۔ امید ہے کہ آپ اس کی سہائتا کریں گے اور ہر ممکن مدد کریں گے۔ جیسا کہ سب کو معلوم ہے کہ پھول نگر میں ہر دھرم واسی بستا ہے اس لئے ہمیں ہر دھرم کا احترام کرنا چاہئے۔ میں آشا کرتا ہوں کہ آدم خور منش کو مارنے میں فاریسٹ آفیسر اپنا کردار ادا کریں گے۔ اور پھول نگر واسیوں کو اس عفریت سے آزاد کریں گے۔ اب میں دعوت دوں گا فاریسٹ آفیسر شری عباس علی خاں کو کہ وہ آ کر اپنے خیالات کا اظہار کریں۔ گاؤں والوں نے تالیوں سے ان کا استقبال کیا۔

”شروع کرتا ہوں اللہ پاک کے بابرکت نام سے۔ سب کو میرا آداب۔ گاؤں والو سچ تو یہ ہے کہ مجھے یہاں آنے سے کافی ڈرایا گیا تھا۔ یہاں آ کر مجھے ان جنگلوں کی کہانیاں معلوم ہوچکی ہیں۔ مجھے آپ لوگوں کے جانی نقصان کا بہت دکھ ہے۔ پہلے آدم خور شیر اور پھر آدم خور آدمی نے آپ کے پیاروں کو مارا اور زخمی کیا اور اب بھی خطرہ ٹلا نہیں ہے۔

میں آپ سب سے وعدہ کرتا ہوں کہ بہت جلد ان جنگلوں سے آدم خوروں کا صفایا کردوں گا۔ انشاء اللہ۔ وہ جو کوئی بھی ہے شیر ہے یا آدم خور بہت جلد یہ عاجز عباس خان ایسے درندوں کو چن چن کر مارے گا اور ان سے آپ لوگوں کا بدلہ لے گا۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ عنقریب پھول نگر کی بہاریں واپس لوٹنے والی ہیں۔ اللہ ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔“

فاریسٹ آفیسر عباس خان نے اپنا کام تیز ترین کر دیا تھا وہ مرنے والے سبھی لوگوں کے پاس گیا اور ہمدردی کی اور انہیں تسلی دی کہ آدم خوروں کے ہاتھوں مرنے والے افراد کے ناحق خون کا بدلہ وہ لے گا۔ قلیل عرصے میں وہ پورے گاؤں میں مقبول ہوگیا۔ وہ ہر کسی سے ہمدردی سے پیش آتا تھا۔ اس نے اپنی تحقیق کا دائرہ وسیع کر دیا تھا۔ وہ سیٹھ تھارو مل کے لکڑی کے کارخانے بھی گیا جہاں اسے چشم دید گواہ بھی ملے وہ زخمی اور بچ جانے والے مزدوروں سے بھی ملا جو کہ اب تک شدید ڈرے ہوئے تھے۔

عباس خان پنجگانہ نماز بھی ادا کرتا تھا اور لوگوں کو اخوت کا درس بھی دیتا تھا۔ وہ ہر ہفتے ڈاک خانے جاتا تھا اور اپنی فیملی کو خط پوسٹ کرتا تھا۔ اپنی خیریت کا۔ تحقیق کی روشنی میں اسے پتا چلا کہ وہ آدم خور صرف رات کے وقت نکلتا ہے سو اس نے رات کا گشت بڑھا دیا تھا۔ وہ بے حد فرض شناس تھا اس نے اب ایک خیمہ جنگل میں نصب کر دیا تھا تاکہ تلاش تیز ہو سکے۔ اس کے ماتحت دو اہلکار بھی وہاں رہتے تھے۔

آدھی رات کو گشت سے تھکے ہارے وہ تینوں اپنے خیمے میں آ گئے۔ وہاں ضروریات زندگی کا سارا سامان موجود تھا۔ ان تینوں کے پاس سرکاری رائفل تھی۔ تھوڑی دیر گفتگو کے بعد سب سو گئے۔ جنگلی بھیڑیوں کا شور کچھ زیادہ ہی ہوگیا تھا اور خیمے کے ساتھ والے درخت کی ٹہنی پر بیٹھا اُلو کافی دیر سے آوازیں نکال رہا تھا۔

فاریسٹ آفیسر کی آنکھ کھلی اس کی سماعتوں سے ایک آہٹ ٹکرائی اس نے غور سے سنا باہر خشک پتوں پر جیسے کوئی چل رہا ہو۔ جیسے خیمے کے چاروں طرف کوئی دبے پاؤں چل رہا ہو۔

فاریسٹ آفیسر نے چپکے سے رائفل اٹھائی اور بجلی کی تیزی سے خیمے سے باہر نکلا لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ وہ آگے بڑھا کہ اچانک اس کی نظر سامنے پڑی تو عباس خان ٹھٹک پڑا کیونکہ چند قدم آگے ایک سفید ریش بزرگ کھڑے تھے۔ بزرگ پر بھرپور نظر پڑتے ہی عباس خان نے بندوق تان لی کہ اتنے میں بزرگ کی آواز سنائی دی۔ ’’عباس خان بندوق کندھے سے لٹکالو، اور میرے قریب آؤ۔‘‘

جب عباس خان بزرگ کے قریب پہنچا تو بزرگ بولے۔ ’’ماشاء الہ بہت فرض شناس ہو، تمہاری نیت اچھی ہے، تم دوسروں کا بھلا چاہتے ہو، تم سے پہلے والا فاریسٹ آفیسر لالچی اور بددیانت تھا، اس وجہ سے وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوسکا، خیر تم اپنے مقصد میں کامیاب ہوجاؤ گے، اللہ پر بھروسہ رکھو، دراصل جو درندہ لوگوں کو نقصان پہنچا رہا ہے، وہ شیر نہیں بلکہ ایک بلا ہے، جس نے کبھی شیر اور کبھی بن مانس کا روپ دھار لیتا ہے۔ اسے انسانی خون منہ کو لگ گیا ہے۔ تم ہر وقت باضو رہا کرو۔ گھبراؤ نہیں کامیابی تمہارا قدم چومے گی۔ ہمت مرداں مدد خدا، میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں، وہ آسیبی بلا تمہارے سامنے آئے گی، اور اس پر نظر پڑتے ہی بسم اللہ پڑھ کر گولی چلادینا...... آسیبی بلا اپنے انجام کو پہنچے گی۔ اور یہ شیشی اپنے پاس رکھ لو اس میں دم کیا ہوا پانی ہے، اس موذی کے مرتے ہی اس پر یہ پانی ڈال دینا، بلا کی روح ہمیشہ کے لئے ختم ہوجائے گی۔ اچھا بیٹے اب اجازت چاہوں گا۔ اللہ حافظ۔

اور یہ بول کر بزرگ سامنے کی طرف بڑھ گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے نظروں سے اوجھل ہوگئے۔

پھر عباس خان نے دائیں بائیں دیکھا لیکن کچھ بھی نظر نہیں آیا۔ اوپر درخت پر دیکھا لیکن وہاں بھی کوئی نہیں تھا۔ لیکن گیدڑوں کی آواز کہیں سے آرہی تھی اور آہستہ آہستہ ختم ہوگئی۔ ’’جو کوئی بھی تھا بچ نہیں سکتا۔ لگتا ہے کوئی ہماری نگرانی کررہا ہے یا پھر کوئی ہمیں ٹھکانے لگانے آیا تھا؟‘‘ اس نے خودکلامی کی اور واپس خیمے میں آکر سوگیا۔

☆......☆......☆

صبح سویرے ایک اہلکار نے ناشتہ تیار کیا تھا اس نے چائے کا کپ فاریسٹ آفیسر کو تھماتے ہوئے کہا۔ ’’کیا بات ہے سر جی! لگتا ہے رات ٹھیک سے سو نہیں پائے ہو؟‘‘

’’یار کشور مجھے لگا رات کو کوئی ہماری نگرانی کررہا ہے لیکن باہر تو کوئی نہیں تھا۔‘‘ عباس خان نے بزرگ والی بات چھپالی۔

اہلکار جس کا نام کشور تھا وہ بولا۔ ’’کوئی نہیں سر جی آپ کا وہم ہوگا۔‘‘ دوسرا اہلکار جس کا نام اجے تھا اب کی بار وہ بولا۔ ’’جو کوئی بھی تھا پر قدموں کے نشان تو چھوڑ گیا ہوگا۔‘‘

وہ تینوں باہر آئے سورج کی روشنی میں پاؤں کا عکس واضح طور پر دکھائی دے رہا تھا۔ خیمے کے چاروں طرف پاؤں کے نشان تھے اور پاؤں بھی بڑا بھاری بھرکم۔ پاؤں کے ساتھ ہاتھوں کے نشان؟ وہ تینوں چونک گئے۔ ایک اہلکار بولا۔ ’’سر جی بالکل وہی نشان ہے جیسا راجو اور رادھا کی لاش کے پاس پائے گئے تھے۔ اور کھوجی نے ان کی نشاندہی کی تھی۔‘‘

فاریسٹ آفیسر۔ ’’ہوں...... لگتا ہے وہ آدم خور یہاں آیا تھا پر حیرت ہے اس نے ہم پر حملہ کیوں نہیں کیا؟‘‘

دوسرا اہلکار بولا۔ ’’سر جی ہوسکتا ہے وہ ہماری طاقت دیکھنے آیا ہو اور تعداد بھی، اگلی دفعہ ہمیں ساودھان رہنا چاہئے۔‘‘

’’چلو ان پاؤں کا پیچھا کرو، دیکھتے ہیں یہ کہاں ختم ہوتے ہیں۔‘‘ اور تینوں ان پاؤں کے نشانات کا پیچھا کرنے لگے وہ کافی دور نکل آئے، آگے چھوٹی ندی تھی اور اس کے پار پہاڑی سلسلہ۔ ندی کے پاٹ پر وہ پاؤں کا نشان ختم ہوا۔ ’’لگتا ہے ندی پار کرکے وہ آدم خور جنگل میں شکار کرتا ہے اور سویرا ہونے سے پہلے ندی پار کرکے کسی پہاڑی غار میں غائب ہوجاتا ہے۔ کیوں

ساتھیوں کیا خیال ہے آپ کا؟‘‘

دونوں بولے۔ ’’سر جی ہم آپ سے متفق ہیں۔ ویسے بھی پرانی کہانیوں میں آدم خور اور چڑیلیں کسی غار میں رہتے تھے۔‘‘ ’’مگر یہ کوئی کہانی نہیں حقیقت ہے۔ تم لوگ تیرنا جانتے ہو؟‘‘

’’جی سر۔‘‘ ’’تو پھر دیر کس بات کی، میں آج کا کام کل پر نہیں چھوڑتا، آج ہم ان پربتوں کے مہمان ہیں۔ آؤ میرے ساتھ ندی پار چلتے ہیں۔‘‘ اور پھر تینوں ندی میں کود پڑے اور آرام سے تیرنے لگے۔ اور آخر انہوں نے ندی پار کرلی۔ یہ پہاڑی سلسلہ جو وسیع جنگلات کے شمال کی طرف تھا۔ بڑے بڑے پہاڑ، پتھریلے میدان اور خاردار درختوں پر محیط تھا۔ بڑے بڑے کیکر کے درخت کثرت سے پھیلے ہوئے تھے۔ فاریسٹ آفیسر اور اس کی ٹیم نے پہاڑوں میں واقع چھوٹے موٹے غاروں میں اپنی تلاش شروع کردی تھی۔ جگہ جگہ چھوٹے غار واقع تھے جہاں چھوٹے موٹے جانور اور جنگلی خرگوش وغیرہ بسیرا کئے ہوئے تھے۔ صبح سے شام ہوگئی تھی لیکن انہیں کوئی خاطر خواہ کامیابی نہیں ملی۔ فاریسٹ آفیسر نے دونوں اہلکاروں کو حکم دیا کہ اندھیرا پھیلنے سے پہلے جنگل سے خیمہ بمع سامان یہاں لے کر آؤ، تاکہ ہم یہیں کہیں رہائش اختیار کرسکیں، اہلکار چلے گئے اور وہ نماز پڑھنے میں مصروف ہوگئے۔

مغرب سے پہلے خیمہ لگ چکا تھا، وہ کھانے پینے کے لئے وافر مقدار میں راشن لے آئے تھے، ایک اہلکار جنگلی بٹیر شکار کرکے لایا اور شام کے کھانے بھوننے کے لئے رکھ دیا۔ یہاں جنگلی تیتر بٹیر کثرت سے پائے جاتے تھے۔ اور شکاری بڑے پہلے شوق سے ان کا شکار کرتے تھے لیکن آدم خور شیر کے خوف سے یہ سلسلہ رک گیا۔

شیر کے خوف سے نہ تو کوئی یہاں شکار کرنے آتا تھا اور نہ ہی کوئی لکڑی چوری کرتا تھا۔ فاریسٹ آفیسر نے ندی کے پاس ایک چھوٹی پہاڑی کے اوپر اپنا خیمہ لگوایا تاکہ ندی پر ہی آن جانے والے پر نظر رکھا جاسکے اور اس طرح دن گزرتے گئے۔

تینوں صبح تلاش پر نکلتے تھے اور شام کو واپس آجاتے تھے، لیکن ناکام۔ ’’سر جی لگتا ہے آدم خور ہمارے ڈر سے بھاگ گیا ہے۔‘‘ فاریسٹ آفیسر نے ندی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

’’وہ ہمیں بھگانے کے چکر میں ہے۔ وہ ہمیں مہلت دے رہا ہے کہ واپس لوٹ جائیں تاکہ ہم اس کی طرف سے بےخوف ہوجائیں۔ اور ہمیں غافل پاکر اچانک ہم پر حملہ کرسکے۔ میری بات غور سے سنو کوئی بھی اکیلا نہیں گھومے گا۔‘‘

فاریسٹ آفیسر نے احتیاطی تدابیر اپنا رکھی تھی۔ ورنہ کسی کی مجال تھی جو ایسی خطرناک جگہ کا رخ کرتا۔

اب ایک آدمی باقاعدہ پہرہ دیتا تھا۔ وہ خیمے کے ساتھ بنے پتھر کے فرش پر بیٹھا تھا، رائفل ہر وقت سب کے ساتھ ہوتی تھی۔ رات کا آخری پہر تھا۔ کشور پہرے پر تھا اس کی آنکھ لگ گئی تھی کہ اچانک پہاڑ کی بائیں جانب سے کسی بھیڑیے کی غراہٹ سنائی دے رہی تھی۔ اس کی آنکھ کھل گئی۔ رائفل پکڑی اور دبے پاؤں اس طرف بڑھنے لگا۔

اچانک برق رفتار سے کوئی سایہ پتھروں کے پیچھے چھپ گیا۔ بڑے بڑے دیوقامت پتھر اندھیری رات میں کسی دیومالائی داستان کی طرح اپنا سحر دکھا رہے تھے۔ کشور نے وہاں اکیلا جانا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ واپس آیا اور فاریسٹ آفیسر کو جگایا کہ کوئی ہے جو ہماری نگرانی کررہا ہے۔‘‘

فاریسٹ آفیسر نے رائفل اٹھائی، دوسرا اہلکار بھی جاگ چکا تھا، تینوں دبے پاؤں وہاں پہنچ گئے لیکن وہاں تو کوئی بھی نہیں تھا۔ البتہ فاریسٹ آفیسر کو ٹارچ کی روشنی میں وہاں زمین پر بال نظر آئے جو انسانی بالوں کی طرح تھے لیکن وہ اتنے لمبے بال تھے کہ سب حیران رہ گئے۔ ’’لگتا ہے آدم خور منش کے بال ہیں جو تھوڑی دیر قبل یہاں موجود تھا اور پہرہ دینے والوں کو

ڈرانے کی کوشش کررہا تھا۔

’’میرا اندازہ صحیح تھا۔ وہ ہمیں بھگانا چاہتا ہے۔ خیر دیکھا جائے گا۔‘‘ وہ واپس خیمے میں داخل ہوئے۔

فجر کی نماز ادا کرکے فاریسٹ آفیسر نے دعا مانگی۔ ’’یا اللہ ہمیں جلد کامیابی سے سرفراز فرما اور ہمیں دکھی انسانوں کی مدد کی توفیق عطا فرما، آمین۔‘‘

آج عباس خان کافی مطمئن نظر آرہے تھے۔ رات والے واقعے سے کافی امید بندھ گئی تھی کہ منزل اب نزدیک ہے۔ حسب معمول آج بھی تلاش جاری رہی لیکن بے سود۔

رات والے واقعے کو لے کر فاریسٹ آفیسر نے فیصلہ کیا کہ آج کوئی بھی نہیں سوئے گا، خیمہ خالی ہوگا اور وہاں تکیے کے اوپر چادر ڈال دی جائے گی تاکہ دور سے آنے والے کو لگے کہ کوئی سویا ہوا ہے۔

وہ تینوں خیمے کے نزدیک بڑے پتھر کی آڑ میں چھپ کر بیٹھ گئے۔ تینوں نے رائفل تھام رکھی تھی۔

چلتے چلتے رات اپنے آخری پہر میں داخل ہوگئی تھی۔ وہ تینوں جاگ رہے تھے اور خاموش تھے۔ دور سے گیدڑوں کے چلانے کی آوازیں دھیرے دھیرے سے قریب ہوتی جارہی تھیں۔ تینوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

فاریسٹ آفیسر نے ساتھیوں کو الرٹ کیا اور حکم دیا کہ جب تک میں نہ کہوں کوئی بھی فائر نہیں کرے گا، وہ سرگوشی میں بات کررہے تھے اور اب وہ خاموشی سے گیدڑوں کی آواز سن رہے تھے۔ گیدڑوں کو جیسے کسی نے بھگایا تھا جو اتنی خاموشی چھاگئی۔ اتنی خاموشی کہ ندی کے مینڈک کی آواز اور جنگل کی ٹڈی کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔

دل کی دھڑکن بھی صاف سنائی دے رہی تھی۔ خیمے سے کوئی آہٹ آرہی تھی۔ اندر کوئی تھا۔

فاریسٹ آفیسر عباس خان نے با آواز بلند ’’بسم اللہ‘‘ پڑھی اور ساتھ ہی رائفلوں سے گولیوں کی بوچھاڑ کردی۔

آدم خور منش ان کے سامنے تھا۔ وہ خیمے سے باہر آیا اور گولیوں کی زد میں آگیا۔

گولیوں کی دہشت سے وہ بوکھلا گیا تھا۔ عباس خان اس کے قریب پہنچ گیا تھا۔ ’’اکیلے اور نہتے انسانوں پر وار کرتا تھا۔ بزدل، آج عباس خان تیرے سامنے کھڑا ہے۔ آجا وار کر...... آج تجھے مجھ سے کوئی نہیں بچاسکا...... راجو، رادھا، سوناکشی اور مزدوروں سمیت ہر اس آدمی کا تجھے حساب دینا ہوگا جنہیں تونے بے دردی سے ہلاک کیا۔‘‘

آدم خور گولیوں سے چھلنی ہوچکا تھا۔ فاریسٹ آفیسر کی باتیں سن کر اور بھی زیادہ طیش میں آگیا تھا۔ لگتا ہے وہ سب سمجھ رہا تھا۔ اب وہ فرار ہونے کی ناکام کوشش کررہا تھا لیکن رائفل کی گولیوں نے اسے ادھیڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس کا پیٹ پھٹ چکا تھا اور وہ درد سے چلا رہا تھا۔ اس کے بھیجے میں سوراخ ہوچکا تھا، اس کی آنکھیں کھلی تھیں اور پورے وجود پر گولیوں کے سوراخوں سے خون نکل رہا تھا اور آخرکار تڑپ تڑپ کر اس نے جان دے دی۔

تینوں نے آدم خور کو غور سے دیکھا جو واقعی کسی منش کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ جسم کے بال بال سے خون کے قطرے ٹپک رہے تھے، وہ مر چکا تھا لیکن پھر بھی ہیبت ناک لگ رہا تھا۔

اس کے بعد عباس خان آگے بڑھا اور جیب سے چھوٹی شیشی نکالی جس میں پانی تھا، شیشی بزرگ نے دی تھی، جس میں دم کیا ہوا پانی تھا، عباس خان نے شیشی کا پانی آدم خور منش پر ڈالا تو بلا کے جسم سے دھواں اٹھنا شروع ہوا، اور اوپر آسمان کی طرف بڑھتے بڑھتے ختم ہوگیا۔

فاریسٹ آفیسر نے سجدہ شکر ادا کیا اور اپنے ساتھیوں کو بھی شاباشی دی اور اس کے ساتھ ہی پھول نگر کے آدم خور کی خونی مہم اپنے اختتام کو پہنچی۔





آسیبی جھونپڑی

مریم فاطمہ۔کراچی

اچانک کمرے میں آواز گونجی آتما کی، میں ایک آتما ہوں اور میں سامنے موجود خبرو حسینہ کی جان لینا چاہتی ہوں، اور وجہ یہ ہے کہ اس نے میرے آرام میں خلل ڈالا ہے اور میں اسے ماردوں گی کہ......

خودغرضی اور مطلب پرستی کی دلوں پر سکتہ طاری کرتی اور دل دہلاتی لرزیدہ کہانی

’’**یار** ویسے تو ہمارے اسکول کی لائف اتنی بورنگ ہے اور یہ بھی اچھا ہوا کہ اسکول والے ہمیں ٹرپ پر لے جارہے ہیں۔‘‘ سبرینہ نے اپنی دو سہیلیوں سے کہا۔

ہاں اس میں تو کوئی شک نہیں۔ یہاں پر کبھی کچھ مزے کا نہیں ہوتا۔‘‘ لولا نے بھی اس کی تائید کی۔

’’اوپر سے ہمارے اسکول کے اصول بھی بہت سخت ہیں۔‘‘ ہیلن نے کہا۔

’’وہ تینوں آپس میں بہترین دوست تھیں۔ کبھی کسی سے نہیں ڈرتی تھیں۔ پورے اسکول میں ان کی حکمرانی چلتی تھی۔ تمام لڑکیاں ان سے ڈرتی تھیں۔ اسکول میں رہنے والی لڑکیوں کے لئے ایک ہاسٹل تعمیر کیا گیا تھا۔ وہ سب وہیں رہتی تھیں۔ اس وقت ایک پیریڈ ختم ہوا تھا۔ اور پرنسپل یہ اعلان کرکے گئے تھے کہ وہ سب لوگ جنگل کی سیر کو جارہے ہیں۔ تمام لڑکیاں بہت

خوش تھیں۔ یہ صرف لڑکیوں کا اسکول تھا۔ سب اس وقت اپنے ٹرپ کی باتیں کر رہی تھیں۔

"میں نے سنا ہے کہ ان جنگلات میں ایک چھوٹا سا جھونپڑی نما گھر بھی ہے اور وہ آسیب زدہ ہے اور اس کے اندر کوئی نہیں جاتا۔ اس جھونپڑی کے ساتھ کئی پراسرار اور بھیانک کہانیاں منسوب ہیں۔" سبرینہ نے بتایا۔

"کارمیلا جو ایک شرمیلی اور ڈرپوک سی لڑکی تھی۔ اس نے پوچھا۔ "کیوں تمہیں کیا لگتا ہے کہ ہم مذاق کر رہے ہیں۔ سبرینہ جو سب سے زیادہ منہ چڑھی تھی۔ بدتمیزی سے بولی۔ لولا اور ہیلن بھی کارمیلا کو دیکھ کر برے برے منہ بنانے لگی تھیں۔ وہ تینوں مل کر ہمیشہ اس بے چاری کو تنگ کیا کرتیں۔

وہ انہیں کبھی کچھ نہ کہتیں اور ان سے ڈرتی رہتی۔ وہ اس کے ہر کام میں مداخلت کرنا ضروری سمجھتیں۔

تب ہی کلاس روم کا دروازہ کھلا اور مس نینسی اندر داخل ہوئیں۔ نینسی بیس سالہ ایک خوب صورت لڑکی تھی۔ اسے شروع سے کارمیلا بہت پسند تھی۔ اور اسے اس بات کا بھی اندازہ تھا کہ وہ تینوں بدتمیز لڑکیاں اسے ہر وقت ستاتی رہتی ہیں۔ نینسی نے آتے ہی ان تینوں کے کھلکھلاتے چہرے اور کارمیلا کا بجھا ہوا چہرہ دیکھا تو سمجھ گئی کہ ضرور وہ اسے چھیڑنے میں لگی ہیں۔ اس نے میز پر کتاب پٹخی اور سب کو پڑھائی کی طرف متوجہ کیا تو سب کی سب پڑھائی میں مشغول ہو گئیں۔ پیریڈ ختم ہوا تو نینسی نے کارمیلا کو اسٹاف روم میں بلالیا۔ تھوڑی دیر بعد کارمیلا اسٹاپ روم میں آ گئی، اسے دیکھ کر نینسی بولی۔

"بیٹھو۔" اس نے اسے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا تو کارمیلا فرمانبرداری سے بیٹھ گئی۔

"کارمیلا میری بات دھیان سے سنو۔ آخر یوں کب تک چلتا رہے گا۔ ان لوگوں کو خود سے جیتنے مت دو۔ ہرادو انہیں سمجھیں۔ انہیں انہی کے کھیل میں ہرادو۔" نینسی نے ہمدردی سے کہا۔ کارمیلا اثبات میں گردن ہلا کر رہ گئی۔

☆......☆......☆

سب لڑکیوں نے ٹرپ پر جانے کی تیاری شروع کردی تھی۔ اس وقت بھی وہ تینوں اپنے کمرے میں اپنا سامان پیک کر رہی تھیں۔ "یہ اسکرٹ رکھ لوں کیا۔" لولا نے پوچھا۔

"نہیں میرا خیال ہے کہ رہنے دو۔ وہاں مچھر بھی ہوں گے۔ پینٹ شرٹ رکھ لو تو زیادہ بہتر ہے۔" ہیلن نے مشورہ دیا۔

"ارے ہاں واقعی یہ تو سوچا ہی نہیں۔ ٹھیک ہے اسکرٹ کینسل۔" لولا نے اس کی جگہ دوسرے کپڑے رکھنے شروع کردیئے۔

"ویسے وہاں کیمپنگ کرنے کا بہت ہی مزہ آئے گا۔" ہیلن نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ "ہاں بالکل اور میں نے تو کارمیلا کو ستانے کی بہت اچھی ترکیب بھی سوچ لی ہے۔"

"اچھا وہ کیا؟" ہیلن نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔ تو پھر سبرینہ نے اپنا شیطانی منصوبہ انہیں بتایا۔ "واہ بہت اچھا آئیڈیا ہے۔" لولا نے خوش ہو کر کہا۔ اور پھر وہ تینوں ایک بار پھر سے سامان پیک کرنے میں لگ گئیں۔

☆......☆......☆

دوسری طرف کارمیلا بھی اپنا سامان پیک کر رہی تھی۔ اس کے روم میں میلیسا اور الزبتھ اسے کام کرتا اور کسی گہری سوچ میں غرق دیکھ رہی تھیں۔ "انہیں خود سے جیتنے مت دو۔ انہیں ہرادو۔ انہیں انہی کے کھیل میں ہرادو۔" کارمیلا کے ذہن میں نینسی کے الفاظ گھوم رہے تھے۔ "انہیں ہرادوں؟ لیکن کیسے؟ وہ تو مجھ سے بہت طاقتور ہیں۔" کارمیلا نے دل میں خود سے سوال کیا۔

"کیا سوچ رہی ہو؟" میلیسا نے پوچھا۔ "کچھ نہیں۔"

"اچھا یہ لو۔" اتنا کہہ کر کارمیلا نے اپنے پاس سے دو آرٹی فیشل لاکٹ نکالے اور ایک میلیسا اور دوسرا الزبتھ کی طرف بڑھایا۔ "یہ کس لئے۔" الزبتھ نے پوچھا۔ "یہ ہماری دوستی کی نشانی ہے۔ جب تک یہ لاکٹ تمہارے گلے میں رہے گا۔ اب تک ہمارے بیچ

دوستی قائم رہے گی۔"

"تب تو ہم اسے کبھی نہیں اتاریں گی۔" میلیسا اور الزبتھ نے خوش ہو کر کہا۔

کارمیلا ایسی ہی تھی۔ سب کے ساتھ پیار بانٹتی سب کا خیال رکھتی۔ وہ دونوں بھی اس کا خیال رکھتی تھیں۔ کافی دیر وہ تینوں ایک دوسرے سے گپ شپ کرتی رہیں۔ اور پھر باری باری شاور لے کر سونے کے لئے لیٹ گئیں۔ پرسوں انہیں جنگلات کی سیر کو بھی جانا تھا۔

☆......☆......☆

وہ سب اساتذہ کے ہمراہ جنگل میں پہنچیں۔ وہاں انہوں نے کیمپ لگائے اور پھر سب اپنے اپنے کیمپ میں چلی گئیں۔ سبرینہ ہیلن اور لولا اپنے کیمپ سے باہر آئیں اور جنگل میں وہ آسیبی جھونپڑی ڈھونڈنے لگیں۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد انہیں ایک جھونپڑی نظر آئی۔

"لگتا ہے یہی وہ جھونپڑی ہے۔" لولا نے کہا۔

"ہاں ضرور یہی ہے۔" سبرینہ نے بھی تائید کی۔ "چلو اب واپس چلتے ہیں۔ رات کو یہاں آئیں گے۔" ہیلن نے کہا اور پھر وہ تینوں واپس آ گئیں۔

☆......☆......☆

رات کے وقت جب سب کھانا کھا چکے تو وہ تینوں کارمیلا کے پاس آئیں۔ "ہماری بات سنو۔" لولا نے کہا۔

کارمیلا حیران تھی کہ آخر رات گئے انہیں اس سے کیا کام پڑ گیا۔ بہرحال وہ ان کے پیچھے چلی آئی۔ وہ اسے لے کر اسی جھونپڑی تک آ گئی۔ "ارے یہ کون سی جگہ ہے۔" کارمیلا نے جنگل میں موجود جھونپڑی دیکھ کر حیرانگی سے پوچھا۔ اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے وہ تینوں خاموش نظروں سے اسے گھورتی ہوئی اس کی طرف بڑھنے لگیں اور نزدیک آ کر انہوں نے اسے پکڑ کے جھونپڑی میں بند کر دیا۔

کارمیلا چیخنے چلانے لگی۔ "بچاؤ کیا کر رہی ہو تم لوگ۔" لیکن انہوں نے ایک نہ سنی اور اسے پکڑ کے اندر بند کر دیا اور باہر سے دروازہ لاک کر دیا اور پھر تینوں اپنی اس شرارت پر ہنسنے لگیں۔

کارمیلا اندر سے خوف کی حالت میں چلا رہی تھی۔ اندر بہت اندھیرا تھا۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ بہت بری طرح ڈری ہوئی تھی۔ اچانک ہی کارمیلا کو لگا کہ وہاں کسی کے سانس لینے کی آواز آرہی ہے۔ تو وہ بری طرح سہم گئی اور پھر کسی کے ہاتھ کا لمس اسے اپنی گردن پر محسوس ہوا تو اس کی چیخ نکل گئی پھر اچانک ہی اندر بالکل خاموشی چھاگئی۔ وہ تینوں حیران رہ گئیں کہ کارمیلا نے چیخنا کیوں بند کردیا۔

لولا نے اشارہ کیا تو ہیلن نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ اندر سے کارمیلا خاموشی سے باہر نکلی۔ لیکن وہ ڈری ہوئی بالکل بھی نہیں لگ رہی تھی۔ بلکہ سپاٹ چہرہ تھا۔ کسی قسم کے جذبات سے عاری۔ وہ اپنے راستے میں کھڑی سبرینہ کو دھکا دیتی آگے نکل گئی۔

سبرینہ کا مارے غصے کے برا حال ہوگیا۔ ایک منٹ ”ٹھہر جاؤ۔ تم خود کو بہت ہوشیار سمجھتی ہو۔“ اس نے کہا۔ لیکن کارمیلا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ”میں تم سے بات کررہی ہوں۔“ سبرینہ نے اسے للکارا۔ اب کی بار اس نے ایک دم پلٹ کر دیکھا تو وہ تینوں ڈر سی گئیں۔ کیونکہ اس کی آنکھیں بالکل انگارہ ہورہی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کی آنکھوں میں خونی چنگاریاں بھر گئی ہوں۔ وہ تینوں گھبرا کر الٹے قدموں واپس بھاگیں۔ لیکن کارمیلا نے ان کا پیچھا نہیں کیا اور خاموشی سے چلتی ہوئی اپنے کیمپ میں چلی گئی۔ جب وہ وہاں پہنچی تو دیکھا کہ الزبتھ اور میلیسا بھی اس کے کیمپ میں موجود تھیں۔ اس نے گھور کر ان دونوں کو دیکھا۔

ہائے کارمیلا ہم نے سوچا کہ سونے سے پہلے تم سے تھوڑی بات چیت ہی کرلیں۔ میلیسا نے مسکرا کر کہا۔

”تم دونوں اسی وقت یہاں سے دفع ہوجاؤ۔“ کارمیلا نے غرا کر کہا تو وہ دونوں شاکڈ رہ گئیں۔ ”یہ کیسا مذاق ہے۔“ الزبتھ نے اپنی حیرت پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔ ”تم خود کسی مذاق سے کم نہیں۔“ کارمیلا نے بری طرح گھورتے ہوئے کہا۔ ”یہاں سے دفع جاؤ سمجھیں۔“ اس نے پھر کہا تو وہ دونوں حیرت سے اسے دیکھتی وہاں سے چل دیں۔

☆......☆......☆

”نامعلوم کارمیلا کو کیا ہوگیا ہے۔“ سبرینہ نے پریشان لہجے میں کہا۔ ”ہاں میری تو خود سمجھ سے باہر ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے اس پر آسیب آگیا ہو۔“ لولا نے کہا۔ ”وہ جب سے اس آسیبی جھونپڑی سے باہر نکلی ہے عجیب طرح کررہی ہے۔“ ہیلن نے کہا۔

پھر تین دن پورے اسکول نے وہاں قیام کیا اور پھر واپس شہر کے لئے روانہ ہوگئے۔

☆......☆......☆

ساری لڑکیاں کلاس میں بیٹھی پڑھ رہی تھیں۔ مس نینسی اس وقت ان کی کلاس لے رہی تھیں۔ ”سبرینہ تم آؤ اور بورڈ پر یہ سوال حل کرو۔“ نینسی نے سبرینہ کو بلایا تو وہ اٹھ کر سوال حل کرنے لگی۔ لیکن اس نے غلط جواب لکھا۔ اس پہ کارمیلا پراسرار انداز میں ہنسنے لگی۔ نینسی کو تھوڑی حیرت ہوئی اس لئے کہ اس کا یہ مزاج ہرگز نہ تھا۔ وہ کبھی کسی کا مذاق نہیں اڑاتی تھی۔ ”کارمیلا اب تم آؤ؟“ نینسی نے اسے بلایا تو وہ چلتی ہوئی بورڈ تک آئی۔ اور پھر اس نے چاک سے لکھا۔ ”تم ایک پاگل ٹیچر ہو۔“ پوری کلاس ششدر رہ گئی۔

”کارمیلا یہ کیا بدتمیزی ہے۔“ نینسی بے حد حیران تھی۔

”کیوں سچ سننا کڑوا لگتا ہے۔“ کارمیلا نے بری طرح نینسی کو گھورتے ہوئے کہا۔ تو نینسی نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور ایک تھپڑ اس کے بائیں رخسار پر جڑ دیا۔

☆......☆......☆

آج کارمیلا کے گھر سے اس کا خط آیا تھا۔ مس نینسی نے وہ لولا کو دیا کہ اسے کارمیلا کو دے آئے۔ لولا پہلے تو بہت ڈری لیکن اپنی ٹیچر کا حکم بہرحال اسے ماننا تھا۔ وہ ڈرتے ڈرتے کارمیلا کے کمرے تک آئی۔ اس وقت الزبتھ اور میلیسا اندر نہ تھیں۔ اس نے سوچا کہ خط دروازے کے نیچے سے کھسکائے اور چلتی بنے پھر اس نے ایسا ہی کیا۔

تب اچانک کمرے کا دروازہ دھڑ سے کھلا اور کارمیلا نکل کر باہر آئی۔ لولا اسے دیکھتے ہی پیچھے کی طرف ہٹی اور وہاں سے جانے لگی۔ کارمیلا نے اسے بالوں سے پکڑا اور پیچھے کھینچ لیا اور پھر اسے گھسیٹتی ہوئی اندر کمرے میں لے گئی۔ لولا چیخنے چلانے لگی۔ اس کی چیخیں سن کر ہیلن اور سبرینہ اپنے کمرے سے نکل آئیں۔ اتفاق سے الزبتھ اور میلیسا بھی واپس آرہی تھیں۔ اس کی چیخیں سن کر وہ چاروں دوڑی چلی آئیں۔ ”کیا ہورہا ہے یہ سب۔ چھوڑو اسے کارمیلا۔“ میلیسا نے کہا۔ وہ چاروں اسے چھڑانے لگیں۔

اچانک اس کھینچا تانی میں کارمیلا کا سر دیوار سے ٹکرایا اور وہ چکرا کر گر گئی تو وہ چاروں لولا کو ساتھ لے کر مس نینسی کے پاس بھاگیں۔

☆......☆......☆

وہ پانچوں مس نینسی کے کمرے میں جمع تھیں۔ ”مس نینسی ہمارے خیال میں اب آپ کو یہ بات بتا دینی چاہئے۔“ ہیلن نے کہا۔

”کون سی بات؟“ نینسی نے حیران ہوکر پوچھا تو ان سب نے واضح طور سے پوری داستان مس نینسی کے گوش گزار کردی کہ ”کیسے ٹرپ پر ان تینوں نے کارمیلا کو اس آسیبی جھونپڑی میں بند کردیا تھا اور اس کے بعد سے وہ مشکوک حرکتیں کررہی ہے۔

نینسی اپنا سر تھام کر رہ گئی۔ ”اف یہ تم لوگوں نے کیا حرکت کی۔ اب کیا کریں۔ ہاں یاد آیا میں ایک عورت کو جانتی ہوں جو لوگوں پر سے آسیب اتارتی ہے۔ اس کا نام کرسٹی ہے۔ ہمیں اس کی مدد لینی ہوگی۔“ نینسی نے سوچتے ہوئے کہا۔

☆......☆......☆

اس وقت نینسی، ہیلن، سبرینہ، لولا، الزبتھ، میلیسا اور کرسٹی اسٹاف روم میں موجود تھیں جبکہ کارمیلا ان کے سامنے رسیوں سے جکڑی کرسی پر بیٹھی تھی۔

”کون ہو تم اور کارمیلا سے کیا چاہتی ہو۔“ کرسٹی نے بلند آواز سے پوچھا۔

”میں ایک آتما ہوں اور اس کی جان لینا چاہتی ہوں۔“ کارمیلا بدلی ہوئی آواز میں بولی۔

”لیکن کیوں اس نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔“ کرسٹی نے پھر پوچھا۔

”اس کا قصور یہ ہے کہ یہ میرے گھر میں داخل ہوئی۔ اس نے میرے آرام میں خلل ڈالا ہے۔“ کارمیلا نے ایک بار پھر بدلی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

پھر اچانک ہی کارمیلا کے جسم کو جھٹکے لگے اور وہ بالکل ساکت ہوگئی پھر وہ اپنی اصل آواز میں روتے ہوئے بولی۔ ”مس نینسی مجھے درد ہورہا ہے۔ مجھے آزاد کردو۔“

نینسی فوراً اپنی جگہ سے اٹھی اور اس کی رسی کھولنے لگی۔ ”رک جاؤ ایسی غلطی نہ کرنا۔“ کرسٹی نے اسے منع کیا۔ ”یہ اب ٹھیک ہوگئی ہے۔ ہمیں اسے کھولنا ہوگا۔“ نینسی نے کہا اور اسے کھول ڈالا۔

اچانک ہی کارمیلا اپنی جگہ سے اٹھی اور نینسی کا گلا دبانے لگی تو ساری لڑکیاں خوف سے چیخیں مارنے لگیں۔ ”بب بچاؤ۔“ نینسی نے ہکلاتے ہوئے کہا تو سبرینہ آگے بڑھی اور اسے بچانے لگی مگر کارمیلا نے اسے دھکا دے کر دور پھینک دیا اور وہ کراہ کر رہ گئی۔ کرسٹی بلند آواز سے منتر پڑھنے لگی۔ ”اے بھٹکی ہوئی آتما واپس اپنی دنیا میں چلی جا۔ اے بھٹکی ہوئی آتما اس لڑکی کا پیچھا چھوڑ دے۔“ اس کے منتر پڑھنے کے ساتھ ہی کارمیلا کی سرخ ہوتی آنکھیں بالکل ٹھیک ہوگئیں اور وہ نڈھال ہوکر فرش پر گر گئی۔

”ہاں اب وہ آتما جاچکی ہے۔“ کرسٹی نے مسکرا کر بتایا۔ تو سب کی سب خوش ہوگئیں۔ نینسی کارمیلا کو پیار کرنے لگی۔ سبرینہ لولا اور ہیلن نے اپنے سابقہ رویے کی کارمیلا سے معافی مانگی، اس کے بعد سے کارمیلا بھی ان کے گروپ میں شامل ہوگئی اور پھر ان کا گروپ مزید بڑا ہوگیا کیونکہ کارمیلا نے میلیسا اور الزبتھ کو بھی گروپ میں شامل کرلیا۔ اس دن کے بعد سے کبھی کوئی حادثہ پیش نہ آیا۔

خون آشام

شہزاد خان-صادق آباد

عفریت کی کٹی ہوئی گردن سے تازہ تازہ گاڑھا خون فوارے کی طرح نکل رہا تھا جس سے اس کا سارا جسم خون سے سرخ ہورہا تھا کہ پھر اچانک......

دل پر لرزہ طاری کرتی......اور دماغ کو ماؤف کرتی......اپنی نوعیت کی خوفناک کہانی

چھ گھوڑوں کی بگھی پر سیاہ لبادہ اوڑھے اور لمبا گھونگٹ نکالے ایک پراسرار شخص تیزی سے چابک لہراتے گھوڑوں کو بھگائے چلا جا رہا تھا۔ چاندی کی دودھیا روشنی میں نہر کے دوسرے کنارے پر چلتے ہوئے انہیں وہ سر کٹا واضح طور پر دکھائی دے رہا تھا جس کی گردن سے سرخ اور تازہ خون ایک فوارے کی مانند اُبل اُبل کر اس کے بقیہ دھڑ پر گر رہا تھا جس سے اس کا تمام جسم خون سے بھیگتا چلا جا رہا تھا۔ چاندنی رات میں اس قسم کا خوفناک منظر ایک اچھے بھلے انسان کے ہوش اڑا دینے کے لئے کافی تھا۔ وہ چلتے چلتے رکا اور ان کے دیکھتے ہی دیکھتے اس سر کٹے نے نہر کے ٹھنڈے پانی میں یک لخت چھلانگ لگا دی اور تیزی سے تیرتے ہوئے ان کی طرف بڑھنے لگا۔ یہ دیکھ کر ان کا وحشت سے برا حال ہوگیا۔ انہوں نے تیزی سے سامنے نظر آنے والے کھیتوں میں دوڑ لگا دی۔ دور بہت دور مکانوں میں جلتی ہوئی روشنیاں انہیں بہت مدھم مدھم سی دکھائی دے رہی تھیں۔ چاندی کی روشنی میں بھاگتے ہوئے انہیں رستہ صاف نظر آ رہا تھا۔ اس لئے وہ سرپٹ اندھا دُھند گاؤں کے نظر آنے والے مکانوں کی جانب بھاگتے چلے گئے۔ ایک دوبار انہوں نے رک کر اپنے پیچھے مڑ کر دیکھا تو دور سے انہیں وہی سر کٹا بھی تیزی سے اپنی طرف بھاگتا نظر آیا۔ یہ دیکھ کر خوف سے ان کی سٹی گم ہوگئی۔ چاندی کی دودھیا روشنی میں اس سر کٹے کی کٹی گردن سے اچھلتا ہوا خون دور سے عجیب منظر پیش کر رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے آتش بازی کے انار سے پھلجھڑیاں نکل رہی ہوں۔ سر کٹا برابر ان دونوں کے تعاقب میں تھا اور اب فاصلہ لحہ بہ لحہ کم ہوتا جا رہا تھا۔ پھر اس قدر کم رہ گیا کہ انہیں اپنے پیچھے اس کے بھاگتے قدموں کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔

گاؤں کے مکانوں کا سلسلہ ابھی بہت دور تھا وہ مسلسل کھیتوں میں بھاگتے بھاگتے تھک چکے تھے لیکن اپنی طرف بڑھتی ہوئی اس عفریت سے بچنے کے لئے وہ مسلسل بھاگتے چلے گئے۔ بھاگتے بھاگتے اچانک حامد کو ٹھوکر لگی اور اس کے پیچھے مسلسل بھاگتے ہوئے عمیر نے اچانک لگنے والی ٹکر سے بچنے کی کوشش کی مگر وہ بھی اس سے ٹکرا کر زمین پر گر گیا۔ اسی لمحے سر کٹا ان دونوں کے سر پر پہنچ گیا اور پھر اس قدر قریب پہنچ گیا کہ چار پانچ فٹ کا فاصلہ رہ گیا اور پھر۔۔۔۔۔۔

حامد اور عمیر نے اس بار گرمیاں گاؤں میں



گزارنے کا فیصلہ کیا تھا اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے انہوں نے شام سے ہی اپنے سامان کی پیکنگ کرنا شروع کر دی تھی۔ ابو سے انہوں نے صبح کے وقت ہی اجازت لے لی تھی اس لئے اب بے فکر ہو کر اپنا سامان ایک بڑے بیگ میں رکھ رہے تھے۔ ان کی امی ان کے لئے کچن میں کھانا بنانے میں مصروف تھیں۔ آج انہوں نے فرمائش کر کے مٹر پلاؤ پکوایا تھا اس لئے اپنے من پسند کھانے کی خوشی میں وہ سامان رکھنے کے ساتھ ساتھ ہلکے ہلکے گنگنا بھی رہے تھے۔ ان دونوں نے جڑواں ہونے کی بناء پر اکٹھے ہی میٹرک کیا تھا چونکہ فرسٹ ایئر کے داخلوں میں ابھی دیر تھی۔

بجائے اس کے کہ دن فراغت میں گزاریں ان دونوں نے گاؤں نانا کے ہاں کچھ دن گزارنے کی ٹھانی۔ امی سے فوراً اجازت ملتے ہی ابو نے بھی اجازت دے دی لیکن اس شرط پر کہ وہ وہاں آرام سے رہیں گے اور کسی قسم کی شکایت ہرگز برداشت نہیں کی جائے گی۔ حامد نسبتاً عمیر کے ذرا شرارتی واقع ہوا تھا اس لئے انہیں اس کی طرف سے زیادہ شرارت کی امید تھی اور ویسے بھی امی ابو نے اسے خصوصی تنبیہ کی تھی۔ ان دونوں نے ان سے وعدہ کیا کہ ان کی طرف سے کوئی شکایت نہیں ملے گی اور اسی شرط کے ساتھ ہی انہیں گاؤں جانے کی اجازت مل گئی تھی۔ گاؤں کے لئے آخری گاڑی شام ساڑھے چھ بجے روانہ ہونا تھی اور گاؤں کا رستہ لگ بھگ دو گھنٹے کا تو ضرور رہا ہوگا۔ اب شام کے پانچ بج چکے تھے اور سامان بھی پیک ہو چکا تھا کچھ ہی دیر میں امی نے میز پر کھانا چن دیا۔ کھانے سے اٹھنے والی گرم گرم خوشبو انہیں مسحور کئے دے رہی تھی۔ انہوں نے بے صبری سے پلیٹوں میں سے چاول اپنے اپنے معدے میں اتارے اور جلدی جلدی تیار ہو کر گھر سے نکلنے سے پہلے امی ابو کو خدا حافظ کہا اور باہر نکل کر رکشہ پکڑ کر اسٹیشن پر جا پہنچے۔

اسٹیشن چونکہ چھوٹا تھا اور کوئی بڑی گاڑی بھی اس پر نہیں ٹھہرتی تھی اس لئے اکا دکا مسافر ہی نظر آ رہے تھے۔ حامد نے سامان پلیٹ فارم پر رکھ کر ٹکٹ گھر سے دو ٹکٹ بخشا پور اسٹیشن کے لئے اور آن کر پلیٹ فارم پر موجود ایک بینچ پر عمیر کے ساتھ بیٹھ گیا۔ شام کا وقت ہونے کی وجہ سے پلیٹ فارم پر لالٹین کی روشنیاں دکھائی دینے لگیں۔

چھوٹا پلیٹ فارم ہونے کی وجہ سے شاید ریلوے حکام کو پلیٹ فارم پر بجلی پہنچانے کا خیال نہیں

آیا تھا۔ صرف اسٹیشن ماسٹر کے کمرے میں اکلوتا بلب روشن تھا جس کی ہلکی ہلکی روشنی باہر آ رہی تھی ورنہ ہر طرف اندھیرا ہی پھیلا ہوا تھا۔ جہاں جہاں لالٹین روشن تھیں وہیں روشنی کا ایک ہالہ سا دکھائی دے رہا تھا۔ خدا خدا کر کے پونے سات بجے گھنٹی ہوئی جس سے امید بندھی کہ اب گاڑی کے آنے کا وقت ہوا چاہتا ہے اور پھر ٹھیک سات بجے دور سے گہرا سیاہ دھواں اٹھتا ہوا دکھائی دیا اور سیاہ انجن شور مچاتا ہوا نمودار ہوا۔ اس کے پیچھے کل چار ڈبے لگے ہوئے تھے جن میں مسافر جانوروں کی طرف ٹھنسے ہوئے تھے دن بھر کے لوگ مزدوری اور کام کاج کے لئے شہروں میں نکلے ہوئے تھے۔ اس لئے واپسی کے لئے چونکہ یہ آخری گاڑی تھی اس لئے ہر شخص اس پر سفر کرنا اپنا حق سمجھتا تھا۔ ان میں بہت سے ایسے مسافر بھی تھے جن کے پاس کرایہ تک نہ تھا مگر چونکہ روزانہ کے آنے جانے والے تھے اس لئے گاڑی کا بابو ان سے کبھی کبھی رعایتاً کرایہ نہ لیتا تھا۔

گاڑی کے پلیٹ فارم پر رکتے ہی کچھ لوگ گاڑی سے اتر کر ٹہلنے لگے اور کچھ افراد اتر کر پلیٹ فارم سے باہر جانے والے راستے کی طرف بڑھ گئے۔

حامد اور عمیر نے بھی تھیلے کو مضبوطی سے تھامتے ہوئے ڈبوں میں نظریں دوڑانے کی کوشش کی کہ شاید کسی ڈبے میں گنجائش نکل آئے مگر اتنے افراد اترنے کے باوجود بھی رش اسی طرح ہی تھا۔ بہر حال انہوں نے کسی نہ کسی طرح تھوڑی بہت جگہ حاصل کر کے تھیلا سیٹوں کے اوپر بنے ہوئے شیڈ پر رکھا اور سمٹ سمٹا کر لوگوں کے درمیان بیٹھ گئے۔

گاڑی کو رکے پانچ منٹ ہو گئے تھے مگر وہ چلنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ پوچھنے پر پتہ چلا کہ سامنے سے ایک سپر ایکسپریس ٹرین آ رہی ہے اور لائن سنگل ہونے کی بناء پر کراس پڑے گا۔ اس لئے ابھی پندرہ بیس منٹ اور لگیں گے۔

حامد یہ سن کر پریشان ہو گیا وہ چونکہ پہلے ہی بہت لیٹ ہو چکے تھے اور انہیں اس بات کی بھی فکر تھی کہ بخشا پور کا گاؤں پلیٹ فارم سے لگ بھگ ڈیڑھ کلو میٹر کے فاصلے پر ہے۔ اس لئے وہ آٹھ بجے تک بھی بخشا پور پہنچ جاتے تو انہیں گاؤں کا اکلوتا تانگہ مل جاتا لیکن اب جس طرح وقت گزر رہا تھا اور رات کے سائے گہرے ہوتے چلے جا رہے تھے۔ اسے یہی فکر ستا رہی تھی کہ اگر انہیں کوئی سواری نہ ملی تو ان کے لئے مسئلہ کھڑا ہو جائے گا اور گاؤں تک کا فاصلہ انہیں پیدل ہی طے کرنا ہوگا۔ ابھی وہ ان ہی سوچوں میں گم تھا کہ گاڑی کے دائیں طرف ایک ٹرین تیزی سے گزرنے لگی۔ غالباً اسی ٹرین کے لئے انہیں روکا گیا تھا۔ اس کے جانے کے ٹھیک چار منٹ بعد گاڑی نے وسل دی اور آہستہ آہستہ پلیٹ فارم کو چھوڑنے لگی۔

رات کافی گہری ہو گئی تھی۔ گاڑی میں ہی انہیں ساڑھے سات کا وقت ہو گیا تھا۔ ابھی دو گھنٹے کا سفر باقی تھا اس لحاظ سے اگر وہ ساڑھے نو بجے بخشا پور پہنچتے ہیں تو انہیں کسی سواری کا ملنا محال ہوگا۔ گاڑی تیزی سے فراٹے بھرتی بھاگتی چلی جا رہی تھی۔ رات کے اندھیرے میں تیزی سے بھاگتے ہوئے درخت یوں لگ رہے تھے جیسے بہت سے دیو ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہے ہوں۔ کہیں کہیں چٹیل میدانوں کا سلسلہ بھی نظر آ جاتا۔ لیکن رات کے وقت اس قسم کا نظارہ کوئی اچھا تاثر نہیں چھوڑتا۔ اگر دن کے وقت کا سفر ہوتا تو دور دور تک پھیلا ہوا ہرے بھرے کھیتوں کا سلسلہ بہت بھلا معلوم ہوتا۔ درمیان میں گاڑی ایک دو اسٹیشنوں پر تھوڑی تھوڑی دیر کے لئے رکتی رہی جس سے ڈبوں میں کسی قدر رش کم ہوتا گیا۔

ٹھیک سوا نو بجے گاڑی غیر متوقع طور پر بخشا پور کے اسٹیشن پر پہنچ گئی۔ ان دونوں نے جلدی سے اپنا تھیلا سنبھالا اور پلیٹ فارم پر اتر گئے۔ گاڑی وسل دیتی ہوئی اپنی منزل مقصود کی طرف آگے روانہ ہو گئی۔ قسمت خراب کہ بخشا پور اترنے والے وہی دونوں مسافر تھے۔ کوئی اور مسافر شاید یہاں کا رہائشی نہ تھا اس لئے اب وہ پلیٹ فارم پر کھڑے آگے جانے کا سوچ رہے

تھے۔ پلیٹ فارم پر کوئی شخص تو کیا کوئی پرندہ تک نظر نہیں آ رہا تھا۔ دور دور تک کوئی بندہ بشر نہ تھا۔ اسٹیشن ماسٹر کے کمرے کی لائٹ جل رہی تھی۔ وہ دونوں اس کی طرف بڑھ گئے۔ اسٹیشن ماسٹر ایک ادھیڑ عمر کا شخص تھا جو سر پر ٹوپی رکھے کرسی پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ دروازے پر دستک سنتے ہی اس نے اچانک آنکھیں کھول کر ان کی طرف یوں دیکھا جیسے ان کا اچانک آ جانا اسے شدید ناگوار گزرا ہو۔ ”کیا بات ہے“ اس نے ترش لہجے میں پوچھا۔

”وہ جی ہم بخشا پور گاؤں جانا چاہتے ہیں گاڑی لیٹ ہونے کی وجہ سے اب ہمیں شاید کوئی سواری نہ ملے اس لئے ہم اس امید پر یہاں چلے آئے کہ شاید آپ ہماری کچھ مدد کر سکیں“۔ حامد نے تھوک نگلتے ہوئے جواب دیا۔

”لیکن اس وقت تمہیں گاؤں جانے کے لئے صرف اپنی ٹانگوں کا استعمال ہی کرنا ہوگا اور ہاں تم کس کے ہاں جانا چاہتے ہو اور کہاں سے آئے ہو“؟ اسٹیشن ماسٹر نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔

”ہم منصور نگر سے آئے ہیں اور بخشا پور چودھری عبدالحمید کے گھر جانا ہے۔ وہ ہمارے نانا ہیں۔“ حامد نے جواب دیا۔

چودھری عبدالحمید کا نام سنتے ہی اسٹیشن ماسٹر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ”اوہو! اچھا تو تم چودھری صاحب کے نواسے ہو۔ اب اس کا لہجہ بھی تبدیل ہو گیا تھا۔ دیکھو بھئی اس وقت رات کے نو بج رہے ہیں اور رات بھی کافی گہری ہو چکی ہے۔ میرا کہا مانو تو رات اس کمرے میں ہی گزارو۔ اور صبح ہوتے ہی گاؤں چلے جانا۔ ایسا میں صرف اس لئے کہہ رہا ہوں کہ تم چودھری صاحب کے نواسے ہو ورنہ میں کسی ایرے غیرے کو یہاں سونے کی اجازت ہرگز نہیں دیتا۔ اور ہاں ایک بات میں تمہیں بتانا بھول گیا کہ آج کل نہر کے ساتھ والے کھنڈرات میں لوگوں نے ایک سر کٹے کو نکل کر نہر کے کنارے گھومتے دیکھا ہے۔ خدانخواستہ اگر وہ تمہیں مل گیا تو میں کبھی بھی اپنے آپ کو معاف نہیں کر سکوں گا“۔ اسٹیشن ماسٹر نے انہیں ڈراتے ہوئے کہا۔

یہ سن کر حامد ہنسنے لگا وہ اس کو دقیانوسی باتیں تصور کر رہا تھا۔ ویسے بھی اسے اس قسم کی چیزوں پر کم ہی اعتقاد تھا۔ لیکن اس بات کا اسے پچھتاوہ ضرور تھا کہ اگر وہ نانا کو سرپرائز دینے کے چکر میں پہلے ہی سے اطلاع کر دیتا تو شاید انہیں لینے کے لئے کوئی نہ کوئی اسٹیشن ضرور پہنچتا اور گاڑی کا انتظار کر کے ہی واپس جاتا۔ لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ اس نے اسٹیشن ماسٹر کی بات سن کر کہا۔ ”بزرگوار آپ سر کٹے کی فکر نہ کریں۔ بس اب آپ ہمیں جانے کی اجازت دیں چونکہ باہر چاند کی روشنی پھیلی ہوئی ہے۔ اس لئے ہم شارٹ کٹ استعمال کرتے ہوئے نہر کی طرف سے ہی گاؤں جائیں گے۔ ڈیڑھ کلو میٹر کا فاصلہ انشاء اللہ آدھے گھنٹے میں طے کر کے ہم گاؤں پہنچ جائیں گے“۔ یہ کہہ کر انہوں نے تھیلا اٹھایا اور اسٹیشن ماسٹر کو ہکا بکا چھوڑ کر کمرے سے باہر نکل آئے۔ بحث کے دوران پندرہ بیس منٹ مزید ضائع ہو گئے تھے۔ بہر حال انہوں نے اللہ کا نام لے کر پلیٹ فارم سے اتر کر گاؤں جانے والے راستے پر قدم آگے بڑھانے لگے۔

چاند اپنے جوبن پر تھا۔ چاروں طرف دودھیا روشنی پھیلی ہوئی تھی جس سے آس پاس کا منظر روشن اور صاف دکھائی دے رہا تھا۔ کچھ ہی دیر میں وہ پیدل چلتے ہوئے نہر کی پٹری پر چڑھ گئے۔ پانی ساکت تھا اور اس پر پڑنے والا چاند کا عکس بہت بھلا معلوم ہو رہا تھا۔ دور کہیں کہیں گیدڑوں اور لگڑ بھگوں کے چلانے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ ورنہ چاروں طرف ایک وحشت ناک سناٹا چھایا ہوا تھا۔ نہر کی پٹری کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے وہ باتیں بھی کرتے جا رہے تھے۔ تھیلا حامد نے اپنے دائیں کندھے پر لٹکایا ہوا تھا۔ چاند کی روشنی میں راستہ صاف نظر آ رہا تھا اور انہیں چلنے میں کوئی تکلیف محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

ابھی انہیں چلتے ہوئے دس پندرہ منٹ ہی

گزرے ہوں گے کہ عمیر کی آنکھیں نہر کی دائیں پٹری پر چلتے ہوئے ایک سرکٹے انسان پر گڑ کر رہ گئیں۔ اسے اس طرح دیکھ کر حامد نے بھی دوسری طرف دیکھا تو تھیلا سرک کر اس کے کندھے سے نیچے گر گیا۔ اس کا منہ حیرت سے کھل گیا اور اس کی وحشت سے کھلی ہوئی آنکھیں پھیل کر کانوں سے جا لگیں۔

سرکٹا زندہ حالت میں ان کے سامنے موجود تھا۔ اسٹیشن ماسٹر کی بات سچ ثابت ہو چکی تھی وہ پتھر کے بت بنے اس پر نظریں جمائے کھڑے تھے اور ان کے دیکھتے ہی دیکھتے سرکٹے نے نہر کے پانی میں چھلانگ لگا دی۔ سرکٹا نہر سے باہر نکل کر ان کے تعاقب میں تھا۔ ایک لمحہ کے لئے انہیں کچھ سمجھ نہ آیا کہ وہ کیا کریں پھر ان دونوں نے دوڑ لگا دی۔ مسلسل بھاگتے ہوئے وہ دونوں آپس میں ٹکرا کر گر پڑے اور پھر آن واحد میں سرکٹا ایک خونی عفریت کی طرح ان کے سروں پر پہنچ گیا اور جیسے ہی قریب پہنچ کر اس نے انہیں دبوچنے کی کوشش کی۔

اچانک کہیں سے بلند آواز میں آیت الکرسی پڑھنے کی آواز سنائی دی۔ یہ سنتے ہی سرکٹا یوں پلٹا جیسے اسے ہزاروں وولٹ کا کرنٹ چھو گیا ہو۔ واپس پلٹتے ہی اس نے نہر کی طرف دوڑ لگا دی اور دیکھتے ہی دیکھتے نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ ان دونوں نے خوف زدہ نظروں سے اس طرف دیکھا جہاں سے آواز آئی تھی تو انہیں ایک دس بارہ سال کا بچہ نظر آیا، جس کے لباس سے ظاہر ہوتا تھا کہ کسان ہے۔ لیکن اس وقت اس کی یہاں موجودگی انہیں حیرت میں ڈالے ہوئے تھی۔

ابھی وہ یہی سوچ رہے تھے کہ وہ بچہ چلتا ہوا ان کے نزدیک پہنچ گیا۔ ”میں اپنے ابا کے ساتھ زمین کو پانی لگانے کے لئے آیا ہوا تھا۔ میں نے چاند کی روشنی میں تم دونوں کو گاؤں کی طرف بھاگتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور تمہارے پیچھے بھاگنے والا وہ منحوس شیطان بھی صاف دکھائی دے رہا تھا اس لئے میں چھپ کر درختوں میں کھڑا ہو گیا۔ یہ سرکٹا پتہ نہیں کہاں سے ہمارے گاؤں میں آ دھمکا ہے۔ اسے گاؤں کے بہت سے افراد دیکھ چکے ہیں اور دہشت کی وجہ سے رات کے وقت گھروں سے کم کم ہی نکلتے ہیں۔ لیکن میں اس سے نہیں ڈرتا کیونکہ میں نے بچپن میں قرآن پاک حفظ کر لیا تھا اور اب تو میں چلتے پھرتے اس کی تلاوت کرتا رہتا ہوں۔ اس لئے مجھے ان چیزوں سے بالکل بھی ڈر نہیں لگتا ہے۔ میری امی اور ایک بہن بھی قرآن کی حافظہ ہیں اور میرے والد صاحب بھی دین دار آدمی ہیں۔ ہماری اپنی کچھ زمین ہے جسے ہم باپ بیٹا دونوں مل کر کاشت کرتے ہیں۔ اب دیکھو میرے ابا سامنے کھیتوں میں پانی لگا رہے ہیں اور میں یہاں کھڑا تم لوگوں سے باتیں کر رہا ہوں۔ قرآن ہماری حفاظت کرتا ہے اس لئے ہم اندھیری راتوں میں بھی بے خوف و خطر نکل پڑتے ہیں“۔ بچے نے انہیں حیران کرتے ہوئے تفصیل بتائی۔

بچے کی باتیں سن کر حامد اور عمیر بہت شرمندہ ہوئے۔ انہیں اس بات کا شدت سے احساس ہوا کہ اگر انہوں نے بھی دنیاوی تعلیم کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم بھی حاصل کی ہوتی تو آج اس بچے کے سامنے شرمندہ نہ ہونا پڑتا۔ قرآن کی چند سورتیں تو انہیں بھی یاد تھیں مگر حالات کچھ اس تیزی کے ساتھ پیش آئے کہ انہیں اس بات کا خیال تک نہ رہا کہ سورتیں پڑھ کر اس سرکٹے کی طرف پھونکتے۔

ابھی وہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ اس بچے کا والد بھی وہاں پہنچ گیا۔ اس نے ان کے سروں پر ہاتھ پھیر کر پوچھا بچو کہاں سے آئے ہو اور کہاں جانا ہے؟ جواب میں حامد نے اسے سب حالات بتا دیئے۔ جسے سن کر اس نے خدا کا شکر ادا کیا کہ ان کی زندگیاں بچ گئیں۔ اس نے انہیں اپنا نام عبدالرحیم بتایا۔ انہوں نے اسے بتایا کہ گاؤں میں ان کا نانا رہتا ہے۔ یہ سن کر اس نے انہیں ساتھ لیا اور باتیں کرتے مختلف گلیوں سے ہوتے ہوئے گاؤں میں پہنچ گئے۔

اس وقت حویلی میں ایک بڑے سے کمرے

میں بہت سارے افراد بیٹھے ہوئے تھے۔ حامد اور عمیر کو ان لوگوں نے درمیان میں بیٹھایا ہوا تھا اور وہ انہیں تمام تفصیل بتا رہے تھے۔ نانا تو سخت ناراض ہو رہے تھے کہ ان لوگوں کو بتانا چاہئے تھا کہ وہ کس روز اور کس ٹرین سے گاؤں آ رہے ہیں تاکہ انہیں لینے کے لئے وہ بندے بھیج دیتے اور انہیں اس پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔

سرکٹے کی خبر تمام گاؤں میں پھیل چکی تھی اور اس نے ان لوگوں کے سچ کی تصدیق کر دی تھی جن لوگوں نے سرکٹے کو یوں اچانک نہر پر ٹہلتے دیکھا تھا۔ چودھری عبدالحمید نے ان کی باتیں سن کر فیصلہ کر لیا تھا کہ اب اس سرکٹے کو تلاش کر کے فوری ختم کرنا ہوگا۔ اس سے پہلے کہ کوئی بے گناہ شخص اس کے ستم کا نشانہ بنے۔

رات کا پچھلا پہر ہو گا جب دس افراد کی ٹولی لالٹین ہاتھ میں لئے چپکے سے رات کے گھپ اندھیرے میں نہر کی طرف جانے والے راستے پر خاموشی سے چلے جا رہے تھے۔ یہ بستی بخشا پور کے چودھری عبدالحمید کے آدمی تھے۔ ان میں حامد اور عمیر بھی شامل تھے۔ نانا کے منع کرنے کے باوجود ان دونوں نے ساتھ جانے کی ضد کی تھی۔ اس کے باوجود انہیں ساتھ بھیجنے میں چودھری نے سختی سے منع کیا تھا مگر ان کی ضد اور ہٹ دھرمی کے آگے بالآخر اسے گھٹنے ٹیکنے پڑے لیکن اس نے ان کے ساتھ جن افراد کو روانہ کیا تھا ان میں سب بہترین نشانہ باز اور بہادر تھے۔ چودھری نے خاموشی سے انہیں اسلحہ وغیرہ دے کر نہر کے کھنڈرات کی جانب روانہ کیا تھا۔ اور ان سب کو سختی سے تاکید کی گئی تھی کہ بلاضرورت فائرنگ نہ کی جائے کہ جس سے بستی کے افراد میں خوف وہراس پھیلنے کا اندیشہ پیدا ہو۔ صرف اسی وقت فائرنگ کی جائے جب وہ منحوس شیطان انہیں دکھائی دے۔ وہ سب خاموشی سے نہر کے کنارے پہنچ کر رک گئے۔ چاند کی چاندنی ہر سو پھیلی ہوئی تھی۔ نہر کے دوسری طرف جانے کے لئے ایک موٹے درخت کا تنا کاٹ کر اسے نہر کے بیچ رکھ دیا گیا تھا جس پر چلتے ہوئے وہ سب ایک ایک کر کے دوسری طرف پہنچ گئے۔ چند قدم چلنے کے بعد سامنے ہی پرانے کھنڈرات دیوؤں کی مانند سر اٹھائے کھڑے تھے۔ کسی دور میں شاید ان کی خوبصورتی دوسروں کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہو مگر اس وقت تو ان کی طرف دیکھ کر خوف طاری ہو رہا تھا۔

کھنڈرات کے آثار چاند کی روشنی میں خوب چمک رہے تھے۔ ہر طرف ہُو کا عالم طاری تھا۔ جھینگروں کی آوازیں اس خوفناک ماحول کو مزید ڈراؤنا بنانے میں اہم کردار ادا کر رہی تھیں۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ دل چاہتا تھا کہ یہیں بستر لگا کر خواب خرگوش کے مزے لوٹ لئے جائیں۔ مگر ایسا تصور صرف سوچنے کی حد تک تھا۔ اس کے پس پردہ جو منظر تھا اور جس مقصد کے لئے وہ سب اس وقت نکلے تھے یہ سوچ کر سب کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ ہر کسی نے بندوقیں ہاتھوں میں تھام رکھی تھیں اور چاند کی روشنی کی وجہ سے لالٹین روشن رکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس لئے حامد نے بھی لالٹین کو بجھا کر ہاتھ میں لٹکا لیا۔ وہ سب ادھر ادھر دیکھ رہے تھے لیکن دور دور تک سرکٹے کا نشان تک نہیں تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے اسے زمین نگل گئی ہے یا آسمان کھا گیا ہو۔

کافی دیر تک انتظار کرنے کے بعد فیصلہ کیا گیا کہ کھنڈرات کے اندر چل کر اسے تلاش کیا جائے۔ ہو سکتا ہے وہ اندر کسی کمرے میں موجود ہو۔ کچھ لوگوں نے اس سے اتفاق نہیں کیا۔ مگر اکثریت نے جب زور دے کر اندر چلنے کے لئے اصرار کیا تو سب متفقہ طور پر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے آگے بڑھتے چلے گئے۔

کھنڈرات میں صرف تین چار کمرے ہی تھے اور سب کے سب دروازوں سے عاری تھے۔ غالباً کوئی اکھاڑ کر لے گیا ہوگا۔ باری باری سب کمروں میں گھوم کر دیکھنے پر انہیں مایوسی ہوئی۔ شاید وہ شکار کے لئے باہر نکلا ہوگا یہ سوچ کر ان سب نے واپسی کی

ٹھانی۔ باہر نکلتے ہی ان کی خوف سے سٹی گم ہوگئی۔ سرکٹا جس کی انہیں تلاش تھی، اپنی تمام تر وحشت کے ساتھ ان کے سامنے موجود تھا۔ گاڑھا گاڑھا تازہ سرخ خون اس کی کٹی ہوئی گردن سے فوارے کی طرح اچھل اچھل کر باہر گر رہا تھا۔ جس سے اس کا تمام جسم سرخ رنگ میں رنگتا جا رہا تھا۔ اس کے پاؤں جوتوں سے خالی تھے اور اس کے دائیں ہاتھ میں ایک تیز دھار والا کھانڈا تھا جس کی دھار چاند کی دودھیا روشنی میں چمک رہی تھی۔ وہ کچھ دیر کے لئے رکا تو اس کے قدموں کے نیچے خون اکٹھا ہو کر ایک تالاب کی صورت اختیار کر گیا۔ ان کے درمیان تقریباً دس پندرہ فٹ کا فاصلہ ہوگا۔

پھر اچانک اس سرکٹے نے ان کی طرف پیش قدمی کی وہ سب بکھر کر دائیں بائیں ہو گئے۔ سرکٹا کھانڈا لہراتا ہوا ان کی طرف بڑھا مگر اس سے پہلے کہ وہ ان میں سے کسی ایک کو نقصان پہنچاتا ایک شخص نے تاک کر گولی اس کے سینے پر چلائی مگر شاید جلدی یا گھبراہٹ کی وجہ سے نشانہ چوک گیا اور گولی ایک دھماکے سے اس کی دائیں طرف نکل گئی۔ رات کی خاموشی میں گولی کی آواز سے آس پاس کے درختوں پر بیٹھے پرندے پھڑ پھڑا کر اڑ گئے۔ سرکٹا تیزی سے گھوما اور دوبارہ ان کی طرف بڑھا۔ مگر اب وہ ہوشیار ہو گئے تھے۔

حامد اور عمیر چونکہ خالی ہاتھ تھے اس لئے وہ ایک طرف سہمے سہمے کھڑے تھے۔ پہلے تو وہ بہادری دکھا رہے تھے مگر یوں سرکٹے کو اپنے سامنے دیکھ کر ان کا خوف سے سانس خشک ہو رہا تھا۔ حامد کے ہاتھ میں لٹکتی ہوئی لالٹین نیچے گر گئی تھی۔ سرکٹا تیزی سے جھکائی دے کر ایک بار پھر اپنی طرف آنے والی گولی سے بچا اور اس کے ساتھ ہی اس نے ہاتھ میں تھاما کھانڈا زور سے ایک شخص کی طرف اچھال دیا۔ کھانڈا ٹھیک نشانے پر لگا اور اس شخص کے سینے پر لگ کر اس کے گوشت میں دھنس گیا۔ اس کے منہ سے ایک زوردار چیخ نکلی اور وہ زمین پر جھک کر دوہرا ہوتا چلا گیا۔ یہ دیکھ کر بستی کے دیگر افراد نے اللہ اکبر کا زوردار نعرہ بلند کرتے ہوئے اکٹھے نشانے لگائے اور گولیاں ایک تواتر سے نکل کر سرکٹے کی جانب بڑھیں۔

سرکٹے نے گولیوں کی بوچھاڑ سے بچنے کی بہت کوشش کی مگر ان میں سے چند گولیاں سیدھی اس کے سینے میں جا گھسیں۔ وہ ایک جھٹکے سے زمین کی طرف جھکا اور اس کے سینے سے خون کا فوارہ اُبل پڑا اور دیکھتے ہی دیکھتے کچھ دیر میں خون کے تالاب میں ڈوبی ہوئی اس کی سربریدہ لاش سب کے سامنے تھی۔

ابھی وہ یہ دیکھ ہی رہے تھے کہ بستی کے بہت سے افراد ہاتھوں میں لاٹھیاں اور لالٹین اٹھائے ان کی طرف بھاگتے چلے آ رہے تھے۔ قریب پہنچنے پر انہوں نے بتایا کہ جیسے ہی بستی میں گولی چلنے کی آواز سنائی دی تو انہوں نے کھنڈرات کی طرف دوڑیں لگا دیں۔ وہ سب ان کی مدد کے لئے آئے تھے۔ راستے میں انہیں چودھری عبدالحمید بھی مل گیا جو پہلے ہی گھر سے ہاتھ میں بندوق لئے نکل پڑا تھا۔ وہاں پہنچنے پر انہیں جب یہ پتہ چلا کہ سرکٹا ہلاک ہو گیا ہے تو انہوں نے ان سب کو کندھوں پر اٹھا لیا لیکن اس کے ساتھ ساتھ انہیں کرمو کے مرنے کا بھی بہت دکھ تھا جو سرکٹے کے ہاتھوں ہلاک ہو چکا تھا مگر اس نے اپنی قربانی دے کر بستی کے تمام افراد کو اس موذی سے نجات دلا دی تھی ہمیشہ کے لئے نجات۔ شاید آئندہ آنے والی بستی والوں کی نسلیں اس کا یہ احسان کبھی نہ اتار سکیں۔

بستی پہنچ کر چودھری نے دوسرے دن دعوت عام کا اعلان کیا جس میں بستی کے ہر فرد نے شرکت کی اور اس شیطان کے مرنے کا بھرپور جشن منایا گیا۔ حامد اور عمیر کچھ دن وہاں ٹھہر کر واپس اپنے گھر لوٹ آئے۔ مگر آج بھی جب جب انہیں بخشاپور کا سرکٹا یاد آتا ہے تو خوف سے ان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔





موت کا لمحہ

مہر پرویز احمد دولو۔ میاں چنوں

اور پھر چشم زدن میں آگ کے شعلے بھڑک اٹھے، نہ جانے یہ کس کے کئے کی سزا تھی کہ اس میں بے گناہ لوگ بھی پل پڑے اور دیکھتے ہی دیکھتے لاشوں کا انبار لگ گیا، ہر آنکھ اشک بار تھی کہ......

قدم قدم پر خوف پھیلاتی اور جسم و جاں پر لرزہ طاری کرتی خوفناک اور ڈراؤنی کہانی

"اعمال کا دارومدار نیت پر ہے۔" یہ حدیث پاک، انسان کی پیدائش سے لے کر موت تک محیط ہے، جس نیت سے کام سرانجام دیا جائے، ویسا ہی نتیجہ نکلتا ہے۔

اقوال زریں ہے۔ "سوچ ہمیشہ مثبت رکھو اور باادب بانصیب بے ادب بے نصیب۔"

بعض اوقات نیک نیتی سے کام سرانجام دیا جاتا ہے لیکن نتیجہ توقع کے برعکس نکلتا ہے، وقتی تکلیف آزمائش ہوتی ہے، مستقبل میں نتیجہ اچھا ہی نکلتا ہے۔ لمحاتی تکلیف کے بدلے اللہ تعالیٰ آنے والے مصائب اور سختیوں کو رفع کر دیتا ہے۔

یہ ایک سچی اور اٹل حقیقت ہے کہ ہر انسان نے موت کے ذائقے سے ہمکنار ہونا ہے۔ یہ جہاں چھوڑ جانا ہے تو کیوں نہ ایسا رہا جائے، جیا جائے کہ مرنے

کے بعد اس کی کمی محسوس کی جائے، لوگ گلیاں، بازار، چوپال اور اٹھتے بیٹھتے آنسو بہائیں کہ بندہ بہت نیک تھا۔ کاش یہ سوچ ہماری ہوجائے۔

☆......☆......☆

نیا روڈ بننے سے ایک طرف پیدل چلنے کے عذاب سے جان چھوٹی اور پھر غریب، بے روزگار نوجوانوں کو روزگار کے مواقع ملے تو دگنا فائدہ ہوا۔

ویگن، رکشہ اور موٹر سائیکل وغیرہ مسافروں کو لانے لے جانے کے لئے استعمال ہونے لگے۔

صبح سے شام تک ویگن اور رکشے، سواریوں کو منزل مقصود پر پہنچاتے، لیکن شام ڈھلے ڈرائیور اسٹاپ پر آجاتے، دیر سے آنے والے اکا دکا مسافروں کو دیر سے آنے کی یوں سزا دیتے کہ من مرضی کا کرایہ وصول کرکے گھروں تک چھوڑ آتے۔ دن کی طرح رات کو بھی مسافروں کی آمدورفت بڑھنے لگی۔ معمولی مسافر سے لے کر آفیسر، کاروباری حضرات اور درمیانے طبقے کے مسافروں کا تانتا بندھ گیا۔

مالدار مسافروں کو دیکھ کر ڈرائیوروں کے منہ میں پانی بھر آتا، تنہا کچھ کر نہیں سکتے تھے۔ آخرکار جب ان کا صبر جواب دے گیا تو ان لوگوں نے مقامی لٹیروں، جیب تراش اور اچکوں سے مراسم بنالئے۔

جونہی مالدار سواری گاڑی میں سوار ہوتی۔ یہ لوگ لٹیروں کو فون کردیتے، وہ راستے میں گھات لگا کر بیٹھ جاتے اور متعلقہ گاڑی کے پیچھے اسلحہ تانے روڈ پر بھڑکیں مارنے آجاتے۔

آناً فاناً سواری کو لوٹ کر رفو چکر ہوجاتے، اگلے دن ڈرائیور کو حصہ مل جاتا۔ شیراز کی گاڑی میں اکثر ڈکیتی ہوجاتی، گاڑی شہر سے روانہ ہوکر جونہی ایک خاص مقام پر پہنچتی، گھات لگائے ڈھاٹے باندھے ڈاکو سامنے آجاتے، اسلحہ سے گاڑی کے آگے پیچھے فائرنگ کرتے۔

شیراز ہاتھ اٹھائے باہر آجاتا، مجبوراً سواری کو بھی باہر آنا پڑتا۔

دونوں کی تلاشی لی جاتی، گاڑی میں موجود سامان اٹھالیا جاتا، یوں مسافر بیچارہ کمائی سے ہاتھ دھو بیٹھتا۔ ایک دفعہ ویل سوٹڈ بوٹڈ، قیمتی پنج موبائل اور بریف کیس تھامے صاحب اسٹاپ پر پہنچے۔ شیراز نے آگے بڑھ کر گاڑی کی پیشکش کی تو وہ صاحب گاڑی میں سوار ہوگئے، اسی دوران شیراز نے دوست ڈاکوؤں کو اطلاع دے دی مگر بدقسمتی سے وہ کسی اور جگہ ناکا لگائے ہوئے تھے۔

کرنا خدا کا ایسا ہوا جونہی گاڑی ایک موڑ پر آہستہ ہوئی، ڈھاٹے باندھے رائفلیں لہراتے ڈاکو گاڑی کے سامنے آگئے، اور اندھا دھند فائرنگ شروع کردی، ایک گولی ونڈ اسکرین کو چیرتی ہوئی نکل گئی، شیراز اور سواری کے ہوش اڑ گئے، موت ہر لمحے قریب آرہی تھی۔ شیراز کے ساتھی تو کہیں اور گئے ہوئے تھے یہ کون تھے؟

ڈرائیور نے سائیڈ سے شیراز کو گھسیٹ کر باہر نکالا۔ ڈرائیونگ سنبھالی اور گاڑی فراٹے بھرتی آنکھوں سے اوجھل ہوگئی۔

اگلے دن اس ہولناک خبر نے ڈاکوؤں کے بھی چھکے چھڑا دیئے۔ اب تو وہ بھی پاؤں پھونک پھونک کر وارداتوں کے بارے میں غوروخوض کرنے لگے۔

گاڑی سے ہاتھ دھونے کے بعد کچھ دن شیراز بے روزگاری کے ہاتھوں بہت پریشان ہوا۔

بروقت گاڑی خریدنے کی استعداد نہ ہونے کی بنا پر اس نے روزی روٹی کمانے کے لئے موٹر سائیکل خریدی اور شام کے بعد اسٹاپ سے کسی نہ کسی مسافر کو گھر تک پہنچانے لگا۔

پیسے کی حرص نے اسے ایک بار پھر انسان سے حیوان بنادیا۔

اب تو تھوڑے فاصلے کے منہ مانگے دام وصول کرنے لگا۔ دیگر گاڑی والے کے بجائے شیراز کی طرف مسافر کھنچے چلے آتے تھے۔ اس لئے وہ اس اسٹاپ کو چھوڑ گئے۔ اسٹاپ کی ویرانی نے بھی شیراز کی

ہوس بڑھانے میں نمایاں کردار ادا کیا۔

"ہمیں شام نگر جانا ہے، بہت ضروری کام ہے کتنا کرایہ لوگے۔" ایک مرد اور عورت شیراز کے پاس آئے اور مدعا بیان کیا۔

متعلقہ فاصلہ بمشکل چھ سات کلومیٹر تھا، رات کے اندھیرے اور مجبوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے تین سو روپے کرایہ طے ہوا۔

وہ مرد عورت شیراز کے پیچھے بیٹھ کر منزل کی طرف روانہ ہوئے، شہری حدود میں داخل ہوتے ہی ایک اسپتال تھا، جس کے سامنے مرد نے گاڑی رکوائی اور اسپتال میں مریض کا حال پوچھنے چلا گیا۔ کچھ دیر بعد واپس لوٹا تو اس کے ہاتھ میں دوائیوں کی پرچی تھی۔

"میں شہر سے دوائیاں لے کر آتا ہوں۔ میری بیوی آپ کے پاس کھڑی ہے۔ میں ابھی بائیک پر دوائیاں لے کر آتا ہوں۔"

مرد نے شیراز سے بائیک لی اور شہر کی طرف چلا گیا۔

رات کے اندھیرے میں شیراز کو دل پشوری کا موقع ہاتھ آگیا، وہ عورت سے ہنسی مذاق اور بیہودہ حرکات کرنے لگا۔

"ہم کہیں بیٹھ کر اطمینان سے بات نہیں کرسکتے۔" عورت نے کہا تو شیراز تو آپے سے باہر ہوگیا اور قریب ایک ریسٹورنٹ کی طرف روانہ ہوگیا۔ شیراز جونہی ریسٹورنٹ میں داخل ہوا، عورت جھکائی دے کر نکل گئی۔ اندر خواتین کے کیبن میں داخل ہوتے وقت شیراز نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو کچھ بھی نہ تھا۔ اس کے تو ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ بائیک گئی اور جو زر ضمانت اس کے پاس موجود تھی وہ بھی رفوچکر ہوچکی تھی۔

کبھی اسپتال کے گیٹ کے سامنے اور کبھی ریسٹورنٹ پر چکر لگاتا۔ جب کچھ بھی حاصل نہ ہوا تو ناکام و نامراد گھر کو لوٹا۔

بداعمالیوں کے سبب پہلے گاڑی سے ہاتھ دھوئے، اب موٹر سائیکل بھی گنوا بیٹھا۔

دُعا......

دُعا......! روح اور آرزو کی ہم آہنگی کا نام ہے۔ دینے اور لینے والے کے مابین ایک ایسے لمحے کی تخلیق کا پیش لفظ ہے، جس میں خواہشوں کی تکمیل موجزن رہتی ہے۔ دعا مانگنے والے ہاتھ ان ریگستانوں کی مانند ہیں، جن پر پانی کی بوند برسائے بغیر بادل تیزی سے گزر جاتے ہیں۔

دعا تزکیہ نفس اور آرزو کا گہوارہ ہے۔ دعا پر اعتماد نیکی ہے۔ لیکن جب ہم تنہائی اور خاموشی میں دعا مانگ رہے ہوتے ہیں تو ہم اس یقین کا اعلان کررہے ہوتے ہیں کہ ہمارا خدا تنہائی میں ہمارے پاس ہے اور وہ خاموشی کی زبان بھی سمجھتا ہے۔ دعا میں بڑی قوت ہے۔ جب تک سینے میں ایمان ہے دعا پر یقین رہتا ہے۔

ذہن کو کنٹرول کرنے کیلئے اللہ سے لو لگائیں اس کو اپنا دوست بنائیں، اس کی رحمت پر بھروسہ رکھیں۔ اپنے آپ میں ڈوب کر اس کے سامنے ہاتھ پھیلائیں اور جو آپ چاہتے ہیں، اس سے مانگیں۔ جب آپ اپنے دل کی ساری باتیں اس سے کہہ دیں گے تو پھر دیکھیں کیا آپ ذہنی طور پر اپنے آپ کو کتنا تروتازہ اور پرسکون محسوس کریں گے۔

بندے اور اللہ تعالیٰ کے مابین کوئی پردہ نہیں ہوتا وہ دلوں کا حال ہم سے بہتر طور پر جانتا ہے۔ مگر وہ کہتا ہے کہ "اے بندے تو میرے سامنے ہاتھ جوڑ کر آ، میں تجھ کو اس سے کہیں زیادہ دوں گا، جتنا تو طالب ہے۔"

(ایس امتیاز احمد)

کچھ دن تو پریشانی، ناکامی اور بے بسی کا ماتم کرتا رہا، لیکن پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لئے ایک بار پھر موٹر سائیکل قسطوں پر لی اور نیت یہ تھی کہ اگر بائیک چھینی گئی تو قسطوں والے کی جائے گی۔

”چور چوری سے جائے، ہیرا پھیری سے نہ جائے۔“ موٹر سائیکل لی اور پرانی روش پر عمل پیرا ہوتے ہوئے سواریوں کو لوٹنے لگا۔

تنہا سواریوں کو لوٹنا اور عورتوں کی عزت سے کھیلنا معمول بنالیا۔

☆......☆......☆

خوبصورت وحسین لڑکی کو دیکھ کر اس کی باچھیں کھل گئیں۔ ”کاش یہ لڑکی میرے ساتھ سفر کرے۔ شیراز نے اسٹاپ پر تنہا ایک حسینہ کو دیکھ کر دل میں خواہش کی، اس کی سوچ ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ لڑکی قریب آ کر اپنے گاؤں جانے کے لئے منت سماجت کرنے لگی۔

شیراز اس سواری کو مفت لے جانے کو تیار تھا۔ رات کی تنہائی اور خوفناک اندھیرے سے ڈرا دھمکا کر پانچ سو کرایہ طے کیا۔ بائیک پر اپنے پیچھے بیٹھایا اور گاؤں کو روانہ ہوگیا۔

آدھے راستے میں پہنچتے ہی شیطان تھپڑ مارنے لگا اور اسے شیطانی فعل کے لئے مجبور کرنے لگا۔ حسینہ کا اس کا پیچھے ساتھ مل کر بیٹھنا ہی دل کو اتھل پتھل کر رہا تھا۔ لیکن انسان کی حرص ختم نہیں ہوتی، چاہے پوری دنیا کی آسائشیں اسے تھمادی جائیں۔ پہلے تو بائیک کا پیٹرول بند کیا۔ بائیک چند قدم کے بعد رک گئی۔

جان بوجھ کر پریشانی ظاہر کرتے ہوئے نیچے اترا، لڑکی سے چھیڑخانی شروع کی، پھر بوس وکنار کے لئے کوشش کرنے لگا، مگر لڑکی اتر کر کھیتوں کی طرف چلنے لگی۔

”اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔“ شیراز تو دل میں جھوم اٹھا۔ ”لو آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا۔“ کھیت کے درمیان پہنچتے ہی لڑکی نے مڑ کر شیراز کو پکڑا اور گلے سے لگالیا۔ گلے لگتے ہی لڑکی ہڈیوں کے پنجر میں تبدیل ہوگئی۔ ڈراؤنی شکل اور جسامت دیکھتے ہی شیراز کی گھگھی بندھ گئی، سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگا، گھبراہٹ سے پورا جسم تھر تھر کانپنے لگا، سانس بند ہونے کی وجہ سے بولتی بند ہوگئی۔ خوف وہراس نے زندگی کی سانسوں کی روانی کے آگے بند باندھ دیا۔

شیراز بھاگنا چاہتا تھا۔ مگر ہڈیوں کی زنجیر نے گرفت میں جکڑ لیا۔ سینے کے ساتھ زور سے لگایا۔ تو ہڈیوں کی تڑتڑ ہونے لگی۔

موت شیراز کی آنکھوں کے سامنے ڈانس کرنے لگی۔

ڈھانچے نے گریبان سے پکڑ کر اوپر اٹھایا اور زور سے زمین پر دے مارا۔ شیراز کی چیخ نے آسمان سر پر اٹھالیا۔ پورا جسم درد سے پھٹنے لگا۔ زخموں سے چور تھا۔ مگر درد پر کراہنے کے بجائے اسے جان بچانے کی فکر تھی۔

”کیا طریقہ اپنایا جائے کہ اس بدہیئت بلا سے جان چھوٹے۔“

”تم ایک انتہائی گھٹیا، نیچ اور کمینہ انسان ہو، ننگ انسانیت، آدمیت کے نام پر بدنما داغ ہو، پہلے مسافروں کو لٹیروں سے لٹواتے تھے، تمہاری گاڑی گئی، موٹر سائیکل گئی، لاکھوں کا نقصان ہوا، مگر تم ٹس سے مس نہ ہوئے، تمہارا ضمیر نہ جاگا، بلکہ نقصان پورا کرنے کے لئے انسانوں پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑ دیئے، مال واسباب کے ساتھ عزتوں کا کھلواڑ کیا، نقصان اٹھانے پر سبق سیکھنے کے بجائے وحشت میں اضافہ کردیا، مجبور مسافروں کی بے بسی سے لطف اٹھا کر ہواؤں میں اڑنے لگے۔

آج میں تم کو صرف سبق سکھانے کے لئے لڑکی کے روپ میں آئی ہوں، میں انسان نہیں چڑیل ہوں، لیکن تمہاری طرح انسانوں کی دشمن نہیں، تم تو پیسے کے لئے ماں، بہن، بیوی بیٹی بھائی کی عزت بھی داؤ پر لگانے سے نہیں گھبراتے، تم نے پیسے کو ایمان بنالیا ہے اور اس کے حصول کے لئے ہر جائز ناجائز حربہ، طریقہ درست سمجھتے ہو، تم ایک طرف تو اشرف المخلوقات کہلاتے ہو

انسانیت کے ٹھیکے دار بنتے ہو اور دوسری طرف تمہارا ایمان، دھرم، جینے کا مقصد صرف پیسے کا حصول اور عیاش زندگی گزارنی ہے۔

کچھ خوف خدا کرو، رب ذوالجلال نے تو تم کو اپنی عبادت اور انسانیت سے پیار کے لئے تخلیق کیا تھا۔

دنیا میں گزارنے کے تم نے اپنے اصول و ضوابط اور طریقے اپنا لئے، اللہ تعالیٰ کے احکامات اور مقدس نبیوں کی تعلیمات کو پس پشت ڈال دیا، یہی وجہ ہے کہ سب کچھ پا کر بھی تم تہی دامن ہو، شہنشاہ ہو کر بھی گداؤں سے ابتر ہو، انسان ہو کر انسانیت کے چہرے پر بدنما داغ ہو۔

تم کتنے عظیم ہو کہ رب ذوالجلال کے محبوب نبیؐ کی امتی ہو، کام تمہارے ایسے رذیل کہ بنواسرائیل بھی توبہ توبہ کرے۔

اب بھی وقت ہے، اپنے آپ کو بدلو، خیالات مثبت کرو، انسانوں کے ڈھنگ سے جیو، لوگوں کے لئے باعث رحمت بنو، ایسے جیو کہ لوگ تم سے محبت کریں، تمہاری کمی محسوس کریں، تمہارے لئے چشم راہ ہوں، آج تو میں تم کو معاف کر رہی ہوں، لیکن اگر دوبارہ غلطی کی تو بہت نقصان اٹھاؤ گے۔“

چڑیل نے لمبی چوڑی مبلغانہ تقریر کی اور پھر نظر سے اوجھل ہوگئی۔

شیراز جان بچی سو لاکھوں پائے کے مصداق بہت خوش تھا، ایمانداری سے کام کرنے کا ارادہ تھا۔

اگلی شام اسٹاپ پر مسافر درختوں کے پتوں کی طرح گرنے لگے، آدھی رات تک گاڑی چلاتے چلاتے شیراز تھک گیا، ساتھ ہی روپوں کا بھی ڈھیر لگ گیا، کچھ دن تو چڑیل کی نصیحتوں کا اثر اور ایمانداری کا خمار شیراز پر چھایا رہا، مگر وہ ہمیشہ اس پر کاربند نہ رہ سکا اور حرص وہوس کی دلدل میں ایک بار پھر دھنس گیا۔

اسٹاپ پر موجود کچھ دکاندار بھی مکروہ دھندے میں شیراز کا ساتھ دینے لگے۔

جب ظلم حد سے بڑھ گیا تو اللہ تعالیٰ کی بے آواز لاٹھی حرکت میں آ گئی۔

سہ پہر کے وقت پیٹرول سے بھرا ایک ٹینکر جونہی اسٹاپ پر پہنچا تو یکدم سامنے سے ایک بڑا بھینسا آ گیا، ٹینکر اسپیڈ میں تھا، ڈرائیور نے فوراً زور سے بریک لگائی۔ بریک لگتے ہی ٹینکر ڈولنے لگا۔ چند گز چلنے کے بعد ٹینکر ایک طرف جھک گیا اور پھر جھکتے جھکتے زمین پر الٹ گیا۔

ٹینکر کے الٹتے ہی پیٹرول روڈ پر پانی کی طرح بہنے لگا۔

اسٹاپ پر کھڑے لوگوں نے برتنوں میں پیٹرول بھرنا شروع کردیا۔

شیراز رات کی ڈیوٹی کر کے سویا ہوا تھا کہ اس کا موبائل بجنے لگا۔ بیوی نے موبائل کی گھنٹی سنی تو شیراز کو گہری نیند سے اٹھا کر کال سننے کو موبائل دیا۔

”شیراز اسٹاپ پر پیٹرول کا ٹینکر الٹ گیا ہے۔ پلاسٹک کی بوتلیں، کین لے کر آ جاؤ، تیل بھرو، یہاں پانی کی کھال کی طرح پیٹرول بہہ رہا ہے۔“ شیراز کو دوست دکاندار نے فون کیا۔

شیراز نے فوراً تیاری کی کین اور ڈرم رکشے میں رکھ کر اسٹاپ کی طرف دوڑ لگادی۔

لیکن شیراز کو پتہ نہ تھا کہ ”موت کا لمحہ قریب آ رہا ہے۔“ کتنے ہی لوگ برتنوں میں پیٹرول بھر رہے تھے جبکہ موٹر سائیکل والے مختلف حربوں سے ٹینکیاں بھرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

اس دوران کسی نے نشہ پورا کرنے کے لئے سگریٹ سلگائی، بخارات شعلے سے ٹکرائے اور پھر برازیل کے جنگلوں کی طرح آگ بھڑک اٹھی۔

پیٹرول کے آگ پکڑتے ہی موٹر سائیکل، انسان، دکانیں اور دیگر سامان آگ کے شعلوں میں گھر کر خاکستر ہونے لگے۔ شیراز بھی تڑپ تڑپ کر خاک ہوگیا۔

اور کچھ ہی دیر بعد وہاں نہ بندہ رہا نہ بندے کی ذات۔



مورتی

عثمان غنی۔پشاور

اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے زندہ وجود کا پورا جسم پتھر کی مورتی میں تبدیل ہونے لگا، اور جب پورا وجود پتھر میں تبدیل ہوگیا تو پورا وجود دھڑام سے زمین بوس ہوگیا اور پتھر کے ٹکڑے بکھر گئے لیکن……

ایسی کہانی جو مدتوں پڑھنے والوں کے ذہن سے محو نہ ہوگی، نئی راہ پر گامزن شاہکار کہانی

وہ ظالم تھا جو دل میں رہ کر بھی میرا نہ بن سکا
دل وہ کافر تھا جو مجھ میں رہ کر بھی اس کا ہو گیا

وہ تین دوست تھے، بچپن کے لنگوٹیے یار بیلی، ایک ساتھ جوان جہاں ہوئے تھے، ان تینوں کا ایک دوسرے کے سوا کوئی بھی نہیں تھا، وہی تینوں ایک دوسرے کی دنیا تھے۔ وہ بچپن سے ایک ساتھ تھے۔ ۱۹۴۷ء کے ہندوں، مسلم فسادات میں وہ تینوں ٹرین کے تباہ کار حادثے میں، اپنے خاندان سے بچھڑ کر کیسے پریتم پیارے یتیم خانے پہنچ گئے۔ ان کو کچھ پتہ نہیں تھا، وہیں ان تینوں میں گہری دوستی ہوگئی، ان کی دوستی کی بیل بچپن میں پروان چڑھنے لگی، پھر وقت کے ساتھ، ساتھ پکے جگری یار بن گئے۔ وہ تینوں اسی پریتم پیارے آناتھ اشرم میں جوان ہوئے۔ لگتا ہے ان کی قسمت ایک جیسی لکھی گئی تھی۔ وہ ساتھ رہے اور ساتھ بنے۔ کیونکہ ان کے بہت سارے دوست کو وقت کے ساتھ ساتھ امیر وکبیر خاندانوں نے ایڈاپٹ کر لیے، بہت سے بن بچوں والے ماں باپ، کے پاس اچھے خاندانوں میں چلے گئے، مگر وہ تینوں وہیں کے وہیں رہے۔

ابتدائی تعلیم ان کو یتیم خانے میں ہی ملی۔ اور پھر جب وہ لڑکپن کے دور میں پہنچے تو پریتم پیارے کے اونر ان کو ہنر سیکھنے کے لیے شہر سے باہر بھیج دیا، وہ قریبی بہت سے بچوں کے ساتھ ہنر سیکھنے لگے، وہ تینوں اپنے، اپنے پسند کے شعبوں میں چلے گئے۔ ان تینوں میں ایک جیکسن تھا، وہ عیسائی تھا، مگر اسے صرف اپنا نام بچپن سے یاد تھا، اسے بس اتنا پتہ تھا کے وہ عیسائی ہے، اسے ٹیلر بننے کا بہت شوق تھا، وہ درزی بن گیا، وہ اونچے قد کاٹ کا مالک سیاہ رنگ کا اچھے نقوش والا نوجوان تھا۔

دوسرا شاہد مسلمان تھا، مگر آناتھ اشرم میں صرف بچوں کو رکھا جاتا تھا، وہاں مذہب کا پرچار نہیں کیا جاتا تھا، وہ لوگ صرف انسانیت کی بھلائی پر یقین رکھتے تھے، اس لیے ایک مسلم بچے کو وہ پرورش دے سکے جو اس کا بنیادی حق تھا، شاہد کو صرف اپنے نام سے معلوم تھا، کہ وہ مسلمان خاندان کا چشم و چراغ ہے، اسے پتہ نہیں تھا، کہ مسلمان ہوتا کیا ہے، شاہد کو صنم کدے کا بہت شوق تھا، اسے بچپن سے بت تراش بننے کی آرزو تھی، اس نے اپنے شوق کی خاطر یہ فن اپنانے کا فیصلہ کر لیا، اور وہ مجسمہ سازی کرنے لگا،

ان کا تیسرا ساتھی آناتھ آشرم میں جوان ہونے والا ایک ہندو تھا، اس کا نام اکشے تھا، وہ اپنے گم نام

خاندان کو ڈھونڈنا چاہتا تھا، اس لیے وہ جادو کا شوق رکھتا تھا۔ اس لیے کہ وہ جادوگر بن کر اپنے خاندان کے بارے میں جاننے کی کوشش کرے گا۔ اسے مذہب کی تعلیم نہیں دی گئی تھی، ورنہ وہ کسی مسلمان لڑکے کا دوست بنا پسند نہیں کرتا۔ اکشے کا شوق تھا، اس لیے وہ بہت بڑے تانترک کے ہاں شاگرد ہو گیا، اور اس کی دسترس میں جادو جیسا علم سیکھنے لگا۔ تانترک اس کا من دیکھ کر اسے کالا جادو سکھانے لگا۔

☆......☆......☆

ٹھوکر لگی تو اپنے مقدر پہ جا گرا
پھر یوں ہوا کہ آئینہ پتھر پہ جا گرا

وقت آگے چلا گیا، اکشے بہت بڑا جادوگر بن گیا، اس نے جادو کے زور پر معلوم کیا، کہ اس کا خاندان اب اس دنیا میں نہیں ہے، اسے اس بات کا بہت دکھ تھا، کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔ مگر اب وہ بہت بڑا جادوگر تھا، وہ کالے جادو کا ماہر تھا، وہ لوگوں کے مسئلے اپنے جادوئی طاقتوں سے حل کرنے لگا۔ اس لیے وہ لوگوں میں بہت جلد مقبول گیا، بہت سارے لوگ اس کے پاس منڈلانے لگے۔

شاہد مجسمہ سازی کے فن میں طاق ہو گیا، وہ مجسمہ سازی کرتا، اور بہت بڑے، بڑے بت بناتا، ا ، کے بنائے بتوں کی لوگ پوجا کرتے، اور وہ اس بات پر فخر محسوس کرتا، اس بات پے غرور کرتا کہ لوگ اس سے اپنے خدا آرڈر پر بنواتے ہیں، وہ لوگوں کی سوچ پر ہنستا بھی۔

جیکسن کی بازار میں بہت بڑی دکان تھی، دکان کا نام تھری اسٹار شاپ رکھا گیا تھا۔ جیکسن ہر قسم کا لباس سی سکتا تھا، بڑے لوگ جیکسن سے کپڑے سلوا کر فخر محسوس کرتے تھے، اس کا نام مارکیٹ میں ہائی پرائیس پر تھا، آج کل وہ بڑے لوگوں کے لیے صرف ڈیزائن سوٹ سلوار ہا تھا، اور وہ لوگ اس کے ڈیزائن سوٹس کے دیوانے بن گئے تھے۔ پورے شہر میں اس کے بنائے گئے کپڑوں کی دھوم مچ گئی تھی۔

ان تینوں میں کبھی بھی مذہب ڈسکس نہیں ہوتا تھا۔ اور نہ وہ اپنے مذاہب کی عبادت کرتے تھے۔ اب وہ تینوں غریبی سے نکل آئے تھے۔ پوش علاقے میں ایک بہت بڑے بنگلے میں رہتے تھے، اور اب اچھے خاصے خوش و خرم مطمئن زندگی گزار رہے تھے۔

☆......☆......☆

ہم بھول گئے اپنی وہ ساری شان شوکت
اس بے جان سے پتلے کو کوئی نام تو دے جاؤں

شاہد ان دنوں تھوڑا سا سنجیدہ سا رہنے لگا تھا، اس کا اب کسی چیز میں بھی دل نہیں لگتا تھا، وہ انجانے سوچوں میں گم صم رہتا۔ اب وہ دوستوں کی محفل سے بھی اکتا سا گیا تھا۔ وہ تینوں کامیاب تو ہو چکے تھے، مگر ان کی زندگی میں ایک کمی سی محسوس ہوتی تھی۔ ایسا صرف شاہد کو لگتا تھا۔ اکشے تو اپنی جادوئی دنیا میں کھوپڑیوں اور مالاؤں کے ساتھ دن رات مصروف ہوتا تھا، اور جیکسن کے پاس اتنے آرڈر ہوتے، کہ وہ دن رات اس میں لگا رہتا، اتنی مصروفیت کے باوجود وہ تینوں رات کے ڈنر پر ساتھ ہوتے۔ اکشے اور جیکسن میں خوب بنتی، مگر شاہد ان دنوں کچھ سنجیدہ اور بے چین سا رہتا، وہ ان دونوں کو مکمل نظر انداز کر رہا تھا، اور اس کی سنجیدگی کو اکشے نوٹ بھی کر رہا تھا۔ جبکہ جیکسن کام کے بعد بہت تھک جاتا تھا، اور وہ شاہد کی سنجیدگی کو اس کی تھکاوٹ سمجھ کر نظر انداز کر دیتا۔

ایک رات اکشے اور جیکسن میں کسی بات پر ہنسی مذاق ہو رہا تھا، اور شاہد سنجیدگی سے بیٹھ کر ڈنر کر رہا تھا، اکشے نے شاہد کی طرف منہ بنا کر کے کہا۔ ”میں اپنے جادو کے زور پر معلوم کر کے رہوگا، جس کے خیالوں میں آجکل تم گم صم رہتے ہو۔“

شاہد ہنسا اور دیر تک مسکراتا رہا۔ مگر اس نے کچھ تردید نہیں کی۔

”اچھا تم میرے بات پر ہنسے تو سہی، ورنہ تم تو بالکل مسکرانا بھول چکے تھے۔“ اکشے نے شاہد کو دیکھا۔

”ایسی کوئی بات نہیں۔“ شاہد نے کہا۔

”جگر اگر ایسی بات ہے، تو بتا دو میں اس کو جادو کے زور ابھی تمہارے قدموں میں بیٹھا دوں گا۔“

جیکسن نے گلہ پھاڑ کر قہقہہ لگایا۔ ”کیا تم اب جادو سے لڑکیاں بلاؤ گے۔“

”بیٹا اڑا لوں مذاق، مگر ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔“ شاہد جز بز ہوا۔

”یار اگر کچھ ہے تو اکشے کو بتا دینا، اس کا جادو کام کرنے لگا ہے۔“ جیکسن نے شاہد کی طرف سنجیدگی سے دیکھ کر کہا۔

اس وقت بھی تینوں نے جیکسن کے ڈیزائن کپڑے پہنے ہوئے تھے، جیکسن ان کے لیے ڈیزائن کپڑے بناتا، اور وہ دونوں بڑے شوق سے پہنا کرتے تھے، ان کی زندگی خوب مزے میں گزر رہی تھی۔ اور بہت پرسکون تھی، کیونکہ ان کی زندگی میں آج تک کوئی لڑکی جو نہیں آئی تھی۔

مگر ان کے برعکس شاہد بہت زیادہ سنجیدہ ہو گیا تھا۔

اکشے دن بدن جادو میں مہارت حاصل کر رہا تھا، وہ آج کل کٹھن جاپ کرنے لگا تھا، وہ جاپ بہت زیادہ مشکل تھے پر نا ممکن نہیں تھے، اور اس لیے بھی اسے لڑکیوں سے بات تک کرنے کی فرصت نہ تھی۔

اور جیکسن کے صرف نقوش اچھے تھے، مگر کئی لڑکیاں جو اس کی ڈیزائن سوٹس کی دیوانی تھیں، اس کے بڑے دکان میں آتیں۔ مگر جیکسن کے پاس اتنا وقت کہاں ہوتا کہ وہ ان لڑکیوں کے ساتھ آنکھ مٹکا کرتا۔

ہمیشہ کام میں وہ اتنا مصروف ہوتا کہ کسی لڑکی کی طرف اس نے کوئی توجہ تک نہ دی، کیونکہ وہ ہر قسم کے ڈیزائن بنا رہا تھا۔ تھری پیس، کوٹ، پینٹ شرٹ، میکسیاں، ساڑھیاں، قمیص، شلوار، کوئی بھی ڈیزائن ہوتا وہ اس پر پورا توجہ دیتا۔ یہ سینا پرونا جیسے اس کا جنون بن گیا تھا۔

مگر شاہد کی سنجیدگی کی ... سی وجہ اس کے عجیب و غریب خواب تھے، وہ جب بھی سوتا، اس کے خوابوں میں ایک لڑکی کا چہرہ آتا تھا، اس چہرے نے اس کی نیندیں اڑا رکھی تھیں، اسے لگتا کہ وہ کسی پری کا چہرہ ہے، جو اسکی نیندیں خراب کرنے اس کے خوابوں میں آجاتی ہے۔ اور شاہد بنا سوچے سمجھے اس پر مرمٹا تھا، وہ اس چہرے کے بارے میں سوچتا رہتا تھا، اور اس کو اصل میں دیکھنے کے لیے بے چین و بے قرار تھا۔

اس کی سنجیدگی کی اصل وجہ بھی یہی خواب والا چہرہ تھا۔ وہ اسے دیکھنے کا خواہاں تھا، اس کے لیے پریشان تھا، وہ اکثر سوچا کرتا تھا، کہ وہ کسی بھی صورت اسے ایک بار دیکھ لے، اس کے لیے اس نے اخبارات، رسائل، اور ٹی وی، فیس بک اور سارے غیر ضروری مصروفیات بھی اپنالیں۔ اسے لگتا تھا، کہ شائد اسے کہیں نہ کہیں یہ چہرہ ضرور دکھ جائے گا۔ مگر ان چیزوں میں اسے یہ چہرہ کہیں پر بھی دکھائی نہیں دیا،

اس نے بازار میں ہر لڑکی کا چہرہ دیکھنا شروع کر دیا، مگر اسے کہیں پر بھی یہ چہرہ دکھائی نہیں دیا، اس سے وہ مزید سنجیدہ ہو گیا۔ اور ہنسی مذاق سے کافی دور ہو گیا۔

☆......☆......☆

بکھری ہوئی تھی شہر میں چہروں کی بازگشت
جس شخص کی تھی تلاش بس اک وہی نہ تھا

ایک دن شاہد نے خواب میں نظر آنے والا چہرہ پینٹ کرنے کا سوچا، اس دن اس نے کوشش شروع کر دی۔ اور وہ دکان پر نہیں گیا، وہ بنگلے کے تہہ خانے میں گیا، اور کینوس سیٹ کر کے رنگ اور برش ہاتھ میں پکڑ لیے، اس نے خواب والا چہرہ پینٹ کرنا شروع کر دیا۔ اور اب وہ چہرہ کینوس پر جگمگا رہا تھا۔ اس کے سامنے اس کے خوابوں کا چہرہ تھا، وہ خوشی سے پاگل سا ہونے والا تھا، وہ کبھی زندگی میں اتنا خوش نہیں دکھائی دیا، یہ شاہد کے ہاتھوں کا کمال تھا، جو اتنی صفائی سے اس نے یہ چہرہ پینٹ کر دیا تھا، اس میں انیس بیس کا کوئی فرق نہیں تھا۔ جو چہرہ اس کے خوابوں میں نظر آتا، یا جو کینوس پر ابھی جگمگا رہا تھا۔

یہ چہرہ تو کسی نہ کسی کا ہوگا۔ اسی دنیا کی رہائشی ہو گی، اس لیے تو یہ میرے خوابوں میں نظر آتی ہے۔ ایک بار یہ لڑکی مل جائے، میں اس کے لیے دنیا سے لڑ جاؤں

گا۔ اور اسے حاصل کرلوں گا، پر صرف ایک بار زندگی میں مل جائے، صرف ایک بار، شاہد من میں خود سے کہتا۔

پھر تو جیسے شاہد کا پیار جنون میں بدلنے لگا۔ وہ دکان سے چھٹیاں کرنے لگا، اور زیادہ تر وقت بیس مینٹ میں گزارنے لگا، وہ خواب والا چہرہ ہر دن نئے زاویے سے پینٹ کرتا۔ کبھی ایک سائیڈ سے، کبھی دوسرے انداز میں۔ اب تو دیواریں بھی بھرنے لگی تھیں۔

مگر ساتھ، ساتھ اس کی تلاش بھی جاری تھی۔ مگر مسلسل اسے اس میں ناکامی ہو رہی تھی، اور جوں جوں ناکامی ہو رہی تھی، توں، توں اس کی سنجیدگی میں اضافہ بھی ہو رہا تھا۔ اور وہ جنون میں مبتلا ہو کر وہ خواب والا چہرہ پینٹ کرتا رہا، ہر سمت اب مختلف انداز میں ایک ہی چہرے کے پوٹریٹ دکھائی دیتے تھے۔

اب وہ اکشے اور جیکسن کے ساتھ بھی اتنا کم وقت گزارنے لگا، کہ ان کو احساس ہو ہی گیا کہ کچھ تو ہے، جس کی پردہ داری کی جارہی ہے۔

اکشے اس کے پیچھے پڑ گیا، اور اس نے اسے ٹٹولنا شروع کیا، مگر شاہد کچھ بھی بتانے پر تیار نہیں تھا تب اکشے نے اپنے عمل کا سہارا لیا، اور اس نے اپنے عمل کے ذریعے معلوم کر ہی لیا۔ کہ شاہد کسی انجانی لڑکی سے محبت کرتا ہے، اور اس لڑکی کی تصویریں اکثر وہ پینٹ کرتا رہتا ہے۔

☆......☆......☆

آؤ کہ میرے پہلوں میں ہیں تنہائیاں
سنا ہے کہ بہت پر رونق ہے ذات تمہاری

شاہد ایک دن بیس مینٹ میں اسی طرح خاموشی سے پینٹ کر رہا تھا۔ کہ اکشے نے اسے جالیا، اور ایک دم اس کے سامنے آ گیا۔

پہلے تو حیرت سے اتنی ساری ایک ہی چہرے کی تصویریں دیکھ کے وہ حیران رہ گیا، پھر وہ شاہد کو بے یقینی سے دیکھنے لگا،

اوہ! تو وہ حسینہ عالم یہ ہے، تم اس لڑکی پے مر مٹے ہو۔" اس نے شاہد کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

شاہد اسے یوں اچانک سامنے دیکھ کے گھبرا گیا۔

"تم!" اس نے صرف اتنا ہی کہا۔

"ہاں، یار میں نے تو تمہیں پہلے ہی آفر دی تھی، کہ اگر کوئی لڑکی ہے، تو اپنی طاقت سے اسے تمہارے قدموں میں بیٹھا دوں گا۔

شاہد خاموش رہا اس نے کچھ بھی نہیں کہا۔

"دیکھو اب میں بہت بڑا جادوگر ہوں، میں ایسا کرسکتا ہوں۔" اکشے نے فخر سے کہا۔

"نہیں اکشے یہ میرے خوابوں میں آتی ہے۔ پتہ نہیں میں نہیں جانتا کہ یہ کون ہے؟"

"کیا تم اس سے کبھی نہیں ملے؟" اکشے کو حیرت ہوئی۔

"ہاں اکشے میں کبھی بھی اس سے نہیں ملا۔"

شاہد نے نہایت آفسوس سے کہا۔

"مگر تم نے مجھے بھی بتانا ضروری نہیں سمجھا، تم کم، از، کم ہمیں اتنا تو بتا ہی سکتے تھے ناں کہ یہ تمہیں پسند ہے۔"

"تم پسند کی بات کرتے ہو، یہ میرا جنون ہے، اس چہرے میں میرا سکون ہے، میں پتہ نہیں کیسے اس کے بنا جی رہا ہوں، یہ تو پھر میں جانتا ہوں یا میرا خدا۔" شاہد کا چہرہ دکھ سے بھر گیا۔

"تم مجھے بتاتے، میں ڈھونڈتا اسے تمہارے، لیے، اور اسے ڈھونڈ کر تمہارے قدموں میں لا دیتا۔"

"یہ ناممکن ہے، مجھے یہ جنت کی کوئی حور لگتی ہے، جو صرف میرے خوابوں میں آتی ہے، اور مجھے بے چینی دے کر اسے خوشی ملتی ہے۔ میں نے اسے بہت ڈھونڈا پر یہ کہیں نہ ملی۔"

اکشے ہنسا، اور دیر تک ہنستا رہا۔

"ہنس کیوں رہے ہو؟" شاہد الجھا۔

"اس لیے کہ تم اسے اس لیے پینٹ کر رہے ہو کہ تم اسے اس طرح اپنی زندگی میں شامل کر رہے ہو۔"

"ہاں تو اور میں، کر بھی کیا سکتا ہوں۔ میں نے اسے ہر جگہ ڈھونڈا، مگر مجھے یہ کہیں بھی نہیں ملی، تب جا کر

مجھے اسے پینٹ کرنے کا خیال آیا، اور دیکھو میں نے اسے اسی طرح پینٹ کیا ہے، جیسے یہ میرے خوابوں میں نظر آتی ہے۔"

"ارے تم تو بڑے چھپے رستم نکلے، چپکے سے ایک خواب میں نظر والے چہرے پر عاشق بھی ہو گئے اور ہمیں کانوں، کان، خبر بھی نہیں ہونے دی، اور دل ہی دل میں سب منصوبے بنا لیے۔" اکشے نے شکوہ کیا۔

"کیا بتاتا یار، مجھے تو خود نہیں پتہ، کہ یہ ہے بھی کہ نہیں، اور ہے تو کہاں ہے؟ کون ہے؟ رہتی کہاں ہے؟"

شاہد نے آفسوس سے کہا۔

"یہ اگر سورگ میں بھی ہوگی تو بھی اسے تمہارے لیے ڈھونڈ کرلے آؤں گا، یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔"

"ہاں اگر ایسا ہے، تو یہ تمہارا مجھ پر بہت بڑا احسان ہوگا۔" شاہد نے کہا۔

"یاری دوستی میں کوئی احسان وحسان نہیں ہوتا۔" اکشے نے ایک پوٹریٹ دیوار سے اتاری۔

"میں نے اسے ہر جگہ ڈھونڈنے کی کوشش کی، بازار میں، اخبارات میں، ہر لڑکی کا چہرہ، غور سے دیکھا، مگر یہ مجھے کہیں پر نہیں ملی۔" شاہد بے چین ہو گیا۔ بار بار بتانے لگا۔

آج سے میں اپنے عمل سے معلوم کروں گا، تم فکر مت کرو۔" اکشے نے تصویر واپس دیوار پر لگا ئیں۔

شاہد نے اسے گلے لگایا۔ "میں تمہارا زندگی بھر احسان مند رہوں گا۔"

اکشے وہاں سے اٹھ کر چلا گیا، اور شاہد گہری سوچ میں گم ہو کر رہ گیا۔

☆......☆......☆

مجھے کوئی رنگ دے کوئی روپ دے
کہ سب کہہ اٹھے تیری محبت کا جمال ہو

رات کو جب اکشے اور جیکسن ملے، تو اکشے نے شاہد کی ان دیکھی لڑکی کی کہانی جیکسن کو سنا دی۔ جسے سن کر جیکسن حیرانگی میں پڑ گیا۔

"میں ایسا کچھ مان ہی نہیں سکتا، کہ اس کے خوابوں میں ایک لڑکی آتی ہو، اور وہ اس کا چہرہ پینٹ کرتا ہو۔" جیکسن نے قدرے حیران ہو کر کہا۔

"ایسا ہی ہے، تم مانو یا نہ مانو۔ وہ کسی ان دیکھے چہرے پر ایسا فدا ہو گیا ہے کہ اس کے سوا اب اسے کچھ بھی نظر نہیں آتا۔"

"مگر جب اس لڑکی کا وجود ہی نہیں ہے، جس پر وہ عاشق ہو گیا ہے، اب وہ کیا کرے گا، اس کی سنجیدگی اور بے چینی دیکھ کے میرا دل کڑھتا ہے، میں اس کی یہ بے چینی اور برداشت نہیں کرسکتا۔

جیکسن میں بہت بڑا جادوگر ہوں میں اپنے علم کے ذریعے پتہ لگاؤں گا، کہ وہ لڑکی اس دنیا میں کس جگہ ہے؟ اتنی بڑی دنیا میں وہ چہرے والی لڑکی کہیں تو ہوگی۔"

"ہاں یہ بھی ٹھیک ہے، ایسا اگر ہو جاتا ہے تو ہمیں ہمارا ہنستا مسکراتا ہوا دوست واپس مل جائے گا، مجھ سے مزید شاہد کی سنجیدہ صورت برداشت نہیں ہو سکتی۔" جیکسن کو بہت آفسوس تھا، اس لیے وہ بھی کافی فکر مند دکھائی دیا۔

"آؤ، نیچے بیس مینٹ میں چلتے ہیں۔ وہاں شاہد اپنے خوابوں کی شہزادی کو پینٹ کر رہا ہوگا۔"

اکشے اٹھا تو جیکسن کو بھی اٹھنا پڑا، دونوں کا رخ اب بیس مینٹ کی طرف تھا۔

وہ اب شاہد کے پاس تھے، جیکسن اس لڑکی کی اتنی ساری تصویریں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اور ایک، ایک تصویر غور و فکر سے دیکھنے لگا۔

وہ تصویروں والا چہرہ اسے بے حد پر کشش لگا، اسے وہ واقعی جنت کی اپسرا، لگی۔ اور وہ اس کی پینٹنگز کو دیکھ کر گھبرا گیا۔

شاہد کے ہاتھوں میں اتنی صفائی تھی، کہ وہ پینٹ کی ہوئی تصویریں بالکل اصلی لگتی تھیں، جیسے کسی نے فائیو ڈی، لینس کے کیمرے سے لی ہوں۔

"شاہد واقعی یہ کسی یونانی دیوی سے ہرگز کم نہیں، یہ تمہارے خوابوں میں آتی ہے، تو ضرور یہ پچھلے

دور کی کوئی ماہ رانی ہوگی۔'' جیکسن نے جیسے خواب میں کہا۔ جسے سن کر اکشے بے تحاشا ہنس پڑا۔

''یار جیکسی تم بھی کمال کرتے ہو، اگر یہ ماہ رانی ہے، تو بھی ہمارا جگر کسی راجکمار سے ہرگز کم تو نہیں ہے۔''

''پتہ نہیں تم دونوں کیا بکواس کررہے ہو، بس یہ جو کوئی بھی ہے، مجھے یہ ہر حال میں چاہیے، میں اس کے بنا مر جاؤں گا۔'' شاہد نے دل کی بات ان کے سامنے گوش گزار کردی۔

''ارے مریں تمہارے دشمن ہمارے ہوتے ہوئے تم کیوں مروگے۔'' اکشے نے شاہد کے کندھے پر زوردار دھپ مارا۔

''یار شاہد میں تم سے بہت ناراض ہوں، تم نے اتنی بڑی بات مجھ سے چھپائی، حالانکہ کتنا میں نے تم سے پوچھا، مگر تم کچھ بھی نہیں بتاتے تھے۔'' جیکسن نے گلہ کیا۔

''یار میں کیا بتاتا، کہ یہ کون ہے؟ کہاں ہے؟ کیسی ہے؟ ہے بھی کہ نہیں؟ اور میں خود بہت زیادہ پریشان تھا، کہ اگر میں تمہیں بتا دوں اور تم دونوں میرا مذاق اڑاؤ، تو پھر میں کیا کروں گا۔''

''ہم کیوں تمہارا مذاق اڑاتے؟ اس میں مذاق اڑانے کی کیا بات تھی۔'' جیکسن نے دل سے کہا، شاہد بھی اسے ساری کہانی شروع سے بتانے لگا۔

''اب یہ اکشے ہی تمہاری مدد کرسکتا ہے، یہ لڑکی جہاں بھی ہوگی اکشے اپنے علم کے ذریعے معلوم کردے گا۔'' جیکسن نے اسے جیسے دلاسہ دیا۔

''ہاں اس پر تو مجھے پورا بھروسہ ہے۔'' شاہد نے امید سے کہا۔

''چلو اٹھو اب کافی دن ہوگئے ہیں، ہم باہر نہیں گئے۔'' جیکسن نے اس کا ہاتھ پکڑا، اور اسے زبردستی اٹھادیا۔

''جیکسن یہ بس تھوڑا سا رہتا ہے میں یہ تصویر مکمل کرلوں تو پھر جاتے ہیں۔''

''نہیں یہ بعد میں مکمل کردینا، اور یہ کیا تم نے تو جیسے اس چہرے کے پیچھے جوگ لے لیا ہے، تم دکان پر بھی نہیں جاتے، کتنے لوگ شکایت کرنے گھر تک آگئے۔ اکشے نے شاہد کے ہاتھ سے برش لے کر، رنگ والے پلیٹ پر رکھ دیا۔

''جب سے اس کو دیکھا ہے، کچھ بھی کرنے کو دل نہیں کرتا ہے۔'' شاہد نے بجھے سے لہجے میں بتایا۔

''اب تم کام میں دل لگانا شروع کردو۔ کیونکہ میں کل رات سے عمل شروع کررہا ہوں، تم بالکل بھی اب فکر نہ کرو، اس لڑکی کا بہت جلد پتہ چل جائے گا۔''

''اب سب کچھ چھوڑ کر باہر چلو دیکھو اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے۔ کیسے سر جھاڑ منہ پہاڑ حلیہ بنالیا ہے۔''

تھوڑی ہی دیر میں وہ تینوں بڑی سی گاڑی میں اس بڑے شہر میں گھوم پھر رہے تھے۔

☆......☆......☆

نہیں معلوم مجھے اس سے محبت ہے کہ چاہت
دن بدن اس کی یاد میں ٹوٹ کر بکھرتا جارہا ہوں

اکشے نے تین دنوں تک عمل کیا، مگر اسے اتنا پتہ چلا، کہ اس چہرے کی لڑکی پوری دنیا میں کہیں پر بھی نہیں ہے، خدا نے ابھی یہ چہرہ تخلیق ہی نہیں کیا، وہ کافی پریشان ہوگیا، اس نے شاہد سے وعدہ کیا تھا، کہ وہ اسکی خوابوں میں نظر آنے والی لڑکی کو ڈھونڈ کررہے گا، مگر ایسا کچھ بھی تو نہیں ہوا، اسے ناکامی ہوئی، اور وہ اپنی ناکامی پر پچھتانے لگا۔

اس نے دوبارہ عمل شروع کردیا، اسے لگتا تھا، کہ اس نے عمل میں ضرور کوئی نہ کہ غلطی کی ہوگی تبھی ایسا ہوا، ورنہ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا، دوبارہ جاپ کرکے بھی اسے کچھ پتہ نہ چلا، اور شاہد کی خاطر اس نے تیسری بار بھی کامیابی سے عمل دہرایا، اور وہ ناکام ہوگیا، تب اسے اپنا علم جھوٹا لگنے لگا، اسے لگنے لگا وہ اس دنیا کا ناکامیاب ترین انسان ہے، جو اپنی جان سے بڑھ کر دوست کے لیے کچھ بھی نہیں کرسکتا ہے،

تب اس نے اپنی ناکامی فیس کرنے کا فیصلہ کیا۔

شاہد اور جیکسن دو ہفتے سے بے چینی سے اس کا انتظار کررہے تھے۔ وہ چھوٹے، چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا ان کے پاس چلا گیا، اس نے کالے رنگ کے عجیب سے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ جسے دیکھ کہ دوسروں کو وحشت سی ہوتی تھی۔

''کچھ پتہ چلا؟ کہ یہ لڑکی کون ہے؟ کہاں رہتی ہے؟ کس جگہ پر ہے؟'' شاہد کی بے چینی اس کے سوالوں سے عیاں تھی۔

''شاہد! میرے دوست مجھے اپنے علم سے کچھ بھی معلوم نہ ہوسکا، کیونکہ یہ لڑکی اس دنیا کی ہے ہی نہیں۔ میں نے اس لڑکی کا پتہ چلانے کے لیے تین بار مختلف عمل کیے۔ مگر تینوں میں مجھے ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔'' جیکسن تو اکشے کی باتیں سن کر بجھ سا گیا، مگر شاہد کی تو جیسے روح فنا ہوگئی۔ وہ جیسے گہرے صدمے کا شکار ہوگیا۔

''مگر تم دل چھوٹا مت کرو میرے ذہن میں ایک ترکیب ہے، جس پر تم عمل کرسکتے ہو۔'' جیکسن اکشے کو نا سمجھی سے دیکھنے لگا۔

''کونسی ترکیب؟'' شاہد اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''دیکھو شاہد میں ایک جادوگر ہوں، میں نے ایمانداری سے عمل کیے، مگر میں اس کے بارے میں کچھ بھی پتہ نہ چلا سکا۔ مگر تم تو ایک سنگ تراش ہو، اگر تم چاہو تو تم اس کا مجسمہ بناؤ، تم سے بہتر مجسمہ کون بنا سکتا ہے، تم اس کی ایک مورتی بناؤ۔''

''یہ خیال مجھے پہلے کیوں نہیں آیا، مجھ سے بہتر اس کی مورتی کون بنا سکتا ہے؟'' شاہد خود سے بڑبڑایا۔

''ہاں بالکل جب تم اس کی مورتی بناؤ گے، تو اس دنیا کا سب سے خوبصورت لباس، میں تمہاری مورتی کے لیے بناؤں گا، اور وہ بہت قیمتی ہوگا۔'' جیکسن نے شاہد کے گلے لگتے ہوئے کہا۔

اکشے اور جیکسن کی بات سن کر شاہد اتنا خوش ہوا کہ دونوں کو بیک وقت گلے سے لگایا۔ ''میں بھی کتنا پاگل ہوں، یہ خیال مجھے پہلے کیوں نہیں آیا؟ تم دونوں بہت اچھے ہو۔''

''تمہارا یہ آئیڈیا کمال کا ہے، میں آج سے اس پر کام شروع کررہا ہوں۔'' شاہد اتنا خوش تھا، جیسے اسے نئی زندگی مل گئی ہو۔ اور پھر شاہد نے مورتی بنانے کا کام شروع کردیا۔ وہ دن رات ایک کر بیٹھا، وہ دل سے اپنی خوابوں کی ملکہ کی مورتی بنا رہا تھا۔

دوسری طرف جیکسن مورتی کے لیے دنیا کا سب سے بیش قیمت لباس ڈیزائن کرنے میں لگ گیا، وہ شاہد کو مورتی بنانے پر یہ قیمتی لباس تحفے کے طور پر دینا چاہتا تھا، وہ اعلیٰ سے اعلیٰ کپڑا خریدتا اور پھر اس سے بڑھ کر اور تلاش میں مارکیٹ میں گھومتا پھرتا۔ اکشے ان دونوں کو سرپرائز دینے کے لیے ایک عمل میں مصروف ہوگیا، تینوں اپنے، اپنے کاموں میں لگ گئے۔ شاہد کی محنت رنگ لانے لگی، مورتی کا شاہکار تیار ہونے لگا۔

اور پھر ایک دن مورتی بن ہی گئی۔ وہ ایک نارمل قد کاٹ والی لڑکی کی ہی جتنی مورتی تھی، اس کے خوبصورت لمبے لہراتے بال تھے، بڑی گہری پیاری آنکھیں تھیں، بیضوی دودھیا چہرہ تھا۔ وہ مورتی بن کر شاہد کے بالکل سامنے تھی، شاہد اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس کی آنکھوں میں مورتی کو دیکھ کر صرف اور صرف ستائش ہی تھیں، وہ خود حیران تھا، کہ اس نے اتنی خوصورت مورتی کیسے بنالی؟

اس کی مورتی اگر لوگ دیکھتے، تو اس کی بھی عبادت کرنے لگ جاتے، وہ پاگل لوگ ضرور اسے اپنی دیوی کا اوتار سمجھتے۔

شاہد کی مورتی ایک خوبصورت پری چہرے والی لڑکی معلوم ہوتی تھی۔ یہ بالکل وہی چہرہ تھا۔ جو شاہد نے خواب میں دیکھ رکھا تھا۔ وہ اس کی خوابوں کی حسینہ تھی، مگر مورتی کی صورت میں تھی، وہ بے جان تھی، وہ دور سے ایک خوبصورت لڑکی دکھائی دیتی تھی، مگر تھی تو ایک بے جان مورتی ہی ناں۔

خالص ریشم کے کپڑے سے بنایا ہوا وہ ایک بیش قیمتی لباس تھا، جس میں زربفت و کمخواب کے پیارے کپڑے لگائے گئے تھے، اور اس کے گلے پر جیکسن نے باریک ہیروں کا خاص کام کیا تھا۔ وہ لباس نیلے رنگ کا تھا، اور آسمانی رنگ پر سفید موتی کی مانند وہ ہیرے، بہت بھلے معلوم ہوتے تھے۔

جب مورتی بن گئی، تو جیکسن نے وہ قیمتی لباس شاہد کو بطور تحفہ دیا، جسے اپنے ہاتھوں سے شاہد نے مورتی کو پہنا دیا۔ اب وہ مورتی ایک لڑکی نظر آتی تھی، اگر کوئی اسے دیکھتا، تو دل تھام کر رہ جاتا۔

شاہد اکشے کا شدت سے انتظار کرنے لگا، کیونکہ اکشے نے بھی مورتی بن جانے پر نہایت قیمتی تحفہ دینے کا وعدہ کیا تھا۔ مگر اکشے کافی دنوں سے غائب تھا، اور جیکسن بھی بہت حیران تھا، کہ اکشے آخر وہ کونسا تحفہ شاہد کو دینے والا ہے۔ جس کے لیے وہ گم ہو چکا ہے۔

شاہد اس مورتی کی کوئی نمائش لگانا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے اس نے کسی کو مورتی کے بارے میں کچھ بھی نہیں بتایا۔

طوفان میرے دل میں اٹھا کر چلے گئے
خواب میں آئے تھے آ کر چلے گئے

اکشے ایک جادوگر تھا۔ علم پر بہت حد تک دسترس رکھتا تھا۔ اس نے نہایت خطرناک عمل شروع کر رکھا تھا، وہ عمل بہت بھیانک تھا۔ وہ اپنے عمل سے ایک لڑکی کے روح کو قید کرنا چاہتا تھا۔ اور اسی روح کو مورتی میں ڈال کر مورتی کو زندہ کرنا چاہتا تھا۔ یہ عمل اگرچہ بہت حد تک خطرناک تھا، مگر شاہد کے لیے وہ اتنا تو کر ہی سکتا تھا۔ اکشے اس عمل میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے ایک بھٹکی روح کو قید کر ڈالا۔ اب ایک روح اس کی دسترس میں تھی۔ وہ شاہد کے سامنے اس کی پتھر کی مورت میں جان ڈال کر سرخرو ہونا چاہتا تھا۔ اور اب وہ شاہد کو اپنا سرپرائز دینے والا تھا۔

کسی پتھر کی مورتی سے محبت کا ارادہ ہے
پرستش کی تمنا ہے عبادت کا ارادہ ہے
جو دل کی دھڑکنیں سمجھے نہ آنکھوں کی نظر سمجھے
نظر کی گفتگو سمجھے نہ جذبوں کا بیاں سمجھے
کسی پتھر کی مورتی سے محبت کا ارادہ ہے
اسی کے سامنے اس کی شکایت کا ارادہ ہے
سنا ہے ہر جواں پتھر کے دل میں آگ ہوتی ہے
مگر جب تک نہ چھیڑو شرمگیں پردے میں سوتی ہے
یہ سوچا ہے کہ دل کی بات اس کے روبرو کہہ دیں
نتیجہ کچھ بھی نکلے آج اپنی آرزو کہہ دیں
ہر اک بے جا تکلف سے بغاوت کا ارادہ ہے
کسی پتھر کی مورتی سے محبت کا ارادہ ہے
محبت بے رخی سے اور بھڑکے گی وہ کیا جانے
طبیعت اس ادا پہ اور بھڑکے گی وہ کیا جانے
وہ کیا جانے کہ اپنا کس قیامت کا ارادہ ہے
کسی پتھر کی مورتی سے محبت کا ارادہ ہے
پرستش کی تمنا ہے عبادت کا ارادہ ہے

اکشے شاہد کے سامنے کھڑا اس کے بنائے گئے شاہکار کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ یار واقعی تم کمال کے سنگ تراش ہو، اوپر والے نے تمہیں بے پناہ صلاحیتیں دے رکھی ہیں۔ یہ تو کوئی لڑکی لگ رہی ہے۔ یہ تو واقعی ایک شاہکار ہے۔

شاہد اپنی تعریف سن کر کافی خوش تو ہوا مگر اسے اکشے کا سرپرائز کا ابھی بھی شدت سے انتظار تھا۔

”ہاں میں نے اس کو بنانے میں اپنی جان لڑا دی ہے۔ یہ میری زندگی بھر کی محنت ہے، میں زندگی بھر اسی مورتی سے اپنی وفا نبھاؤں گا۔“ شاہد نے دل سے کہا۔

”اچھا تو پھر اب تم زندگی کا وہ حصہ اس کے نام کرو جو تم نے ابھی، ابھی کہا، کیونکہ یہ مورتی، ابھی کچھ دیر کے بعد زندہ ہونے والی ہے، اور میں ایسا کر رہا ہوں۔“ اکشے خوشی سے شاہد کو گلے لگاتے ہوئے بولا۔

”تم کیا کہہ رہے ہو، مجھے تو کچھ بھی سمجھ نہیں آ رہا ہے۔“ جیکسن حیرت سے اچھل پڑا۔

”بہت جلد سمجھ جاؤ گے، ابھی تم کافی ناسمجھ ہو۔“ اکشے نے جیکسن کا کندھا ہلایا۔

”کیا تم ایسا کر سکتے ہو۔ ایک بے جان بت کو زندہ کر سکتے ہو۔“ شاہد حیرت سے پوچھنے لگا۔

”ہاں جب تم ایک ایسا شاہکار بنا سکتے ہو، اگر دنیا اسے دیکھ لے، تو اسے اپنی دیوی کا اوتار جان کر اس کی پوجا کرنے لگیں۔ تو پھر میں ایک بے جان بت کو زندہ کیوں نہیں کر سکتا، جیکسن تم اس دنیا کا مہنگا ترین لباس بنا سکتے ہو، تو پھر میں، شاہد کے لیے اپنے علم کی بدولت اتنا تو کر ہی سکتا ہوں۔“

”اکشے کیا تم واقعی میں سچ کہہ رہے ہو، کیا تم میرے ساتھ کوئی مذاق تو نہیں کر رہے ہو۔“

”نہیں میری جان، میں اور مذاق، وہ بھی اتنے اہم مسئلے پر، ابھی تم دونوں میرا کمال دیکھو گے۔“

وہ تینوں مورتی کے بالکل سامنے بیٹھ گئے۔ اور اکشے جنتر منتر پڑھنے لگا، شاہد اور جیکسن عقیدت سے اس کو دیکھ رہے تھے۔ شاہد کو یقین نہیں آ رہا تھا، کہ اس کے بنائے گئے مجسمے میں کوئی جان ڈال کر اسے زندہ کر سکتا ہے۔

اکشے آدھے گھنٹے تک وہ منتر پڑھتا رہا، پھر اس نے ایک چھوٹے سے شیشے کا بنا جار نکالا، اس میں سفید رنگ کا دھواں تھا، اکشے نے جار کا ڈھکنا ہٹایا، تو وہ سفید دھواں جار سے نکل کر مورتی کی طرف بڑھنے لگا۔ اور وہ سفید دھواں مورتی کے اندر چلا گیا۔

اکشے نے اپنے جادو سے قیدی روح کو مورتی میں ڈال دیا، وہ مورتی جو پتھر کی تھی، وہ دھیرے، دھیرے گوشت پوست میں تبدیل ہونے لگی، اس نے پہلے پلک جھپکائے، پھر اس کے ہونٹوں نے جنبش کی۔ پھر وہ مسکرائی، اب اس کا وجود پتھر سے گوشت میں تبدیل ہونے لگا، اس کے ہاتھوں نے حرکت کی۔ اور اب وہ ایک مکمل گوشت پوست کی بنی ہوئی لڑکی تھی۔ وہ اب حرکت کر رہی تھی۔

شاہد مدہوشی جیسی حالت میں یہ مناظر دیکھ رہا تھا۔ اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا، کہ اس کی پتھر کی بنائی گئی مورتی میں سچ مچ جان پڑ گئی ہے۔ مگر یہ کوئی سپنا نہیں تھا، یہ ٹھوس حقیقت تھی، وہ پتھر کی سندر مورتی گوشت پوست کی لڑکی میں ڈھل چکی تھی۔ اور وہ تینوں اس عمل کو اپنے آنکھوں سے دیکھ چکے تھے۔

وہ سامنے کھڑی لڑکی جس نے جیکسن کا بنایا ہوا قیمتی ترین لباس پہنا ہوا تھا، وہ ریشم کا مہنگا ترین لباس اس کے بدن پر جچ رہا تھا۔ اس لباس میں قیمتی ہیرے جڑے ہوئے تھے۔

وہ اپنے ریشمی بال لہرا کر ان تینوں کے مد مقابل آ کھڑی ہوئی، اور انتہائی حیرانگی سے ان تینوں کو تکنے لگی۔

وہ وہی لڑکی تھی، وہی حسینہ جسے شاہد اپنے خوابوں میں دیکھا کرتا تھا۔ وہ وہی تو تھی، جو شاہد کے سپنوں پر حکمرانی کرتی تھی، اور اس کا حال بے حال کر گئی تھی، وہ وہی اپسرا تھی جسے کبھی شاہد نے اپنی دعاؤں میں مانگا تھا، وہ پورے سج دھج سے آج اس کے سامنے تن کر کھڑی تھی۔

”شاہد یہ رہی تمہاری مورتی!“ اکشے کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

اور اس لمحے تو شاہد اپنے حواسوں میں ہی نہیں لگ رہا تھا۔

”میری مورتی، صرف میری۔“ شاہد نے من سے کہا۔

”کون مورتی؟ وہ پوچھنے لگی۔“ اس کو حیرانگی سے دیکھنے لگی۔

”تم اور کون؟“ شاہد نے بتایا۔

”میں کون؟“ وہ حیرت سے ان کو دیکھ کر پوچھ بیٹھی۔

”تم!“ جیکسن نے جیسے خواب سے جاگ کر کہا۔

”میں، مگر میں کون ہو؟ اور تم لوگ مجھے مورتی کیوں بتا رہے ہو۔“ اس نے چتون اٹھا کر حیرت ظاہر کی۔

"تم موتی ہو، میری موتی۔" شاہد نے اس کے پاس جاکر کہا۔

"مگر تم کون ہو؟ اور یہ کون ہیں؟" اس نے اکشے اور جیکسن کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

"میں شاہد ہوں، اور یہ میرے دوست ہیں۔"

"مگر میں تم لوگوں کو نہیں جانتی، اور نہ مجھے پتہ ہے کہ میں کون ہوں؟ کہاں سے آئی ہوں؟"

"تم میری زندگی ہو، میری خوابوں کی ملکہ ہو، اور اور تم میری زندگی کا قیمتی سرمایہ ہو، شاہد اسے بتانے لگا، مگر اسے اس بکواس میں کچھ دلچسپی نہیں تھی۔

"تم کیا کہہ رہے ہو، میں یہاں کیسے آئی؟ مجھے کچھ بھی سمجھ میں نہیں آرہا ہے؟ مجھے کچھ یاد نہیں ہے، نہ مجھے اپنا نام پتہ ہے، نہ پہچان، میرا دماغ بالکل خالی ہے، میں نے اپنے دماغ پر بہت زور ڈالا مگر مجھے کچھ بھی تو یاد نہیں، اور یہ تم کیا ملکہ، ماہ رانی، کی گردان کر رہے ہو۔" وہ ایک سانس میں کئی سوال کرتی چلی گئی۔

وہ واقعی ان کو نہیں جانتی تھی، کیونکہ ان کی زندگی چند پل پہلے شروع ہوئی تھی، اس کا دماغ خالی تھا۔ اس میں کچھ بھی تو نہیں تھا، اگر وہ ان سے انکاری تھی، تو وہ ٹھیک تھی۔ اس کی کوئی یاداشت نہیں تھی، کچھ پل کی زندگی کی یاداشت اس کے ذہن میں تازہ تھی۔

"تم میری ہو۔ اور تمہارا نام موتی ہے، میں نے تمہیں تخلیق کیا ہے، اب تم میری ہو۔" صرف میری، شاہد نے اسے شانوں سے تھام کر جھنجوڑ ڈالا۔

"پتہ نہیں تم کیا ہو، اور بہت بھونڈا مذاق کر رہے ہو، میں تو تمہیں جانتی تک نہیں ہوں۔" اس نے ناپسندیدگی سے شاہد کو دیکھا۔

اکشے آگے بڑھا، اور شاہد کے ساتھ کھڑا ہوگیا۔

"موتی یہ ٹھیک کہہ رہا ہے، تم اس کی بنایا گیا ایک وجود ہو، اور اب یہ تمہارا مالک ہے، یہ تم سے سچی محبت کرتا ہے، تمہارا ایسا دیوانہ ہے، جو آج تک دنیا میں اس جیسا کوئی دوسرا پیدا ہی نہیں ہوا۔"

اکشے کی بات سن کر موتی اسے پیار بھری نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

"اور تم اپنے بارے میں کیا کہتے ہو؟" موتی نے اکشے سے پوچھا۔

"میں تو اس کا گواہ ہوں اور تمہیں شروع سے کھلے الفاظ میں بتاتا ہوں۔"

"مجھے کچھ نہیں سننا، کیونکہ مجھے تو کچھ بھی پتہ نہیں، اور میرا دماغ اور دل دونوں سلامت ہیں، میں اس سے فیصلہ کر سکتی ہوں، تم اپنے بارے میں بتاؤ، اس کو چھوڑو، اس کی کہانی کبھی فرصت میں سن لوں گی۔"

موتی کی باتیں اکشے کو الجھن میں ڈالنے لگیں۔ وہ کیا کہہ رہی تھی، اسے کچھ بھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

موتی شاہد کے بجائے اکشے میں زیادہ دلچسپی لے رہی تھی، اور یہی بات شاہد کو چبھ رہی تھی۔ موتی شاہد کو پہلی ہی نظر میں سخت ناپسند کر چکی تھی۔ اور اب اس کا شاہد کے سامنے اکشے میں یوں دلچسپی لینا اس کو جلا رہا تھا۔ جبکہ جیکسن کو اس نے پسند ناپسند کی نظر سے دیکھا تک نا تھا۔

اور شاہد تو موتی کے جنون میں بری طرح سے پاگل تھا۔ اس کے پاگل پن نے جنون کی شکل لے کر ہی، موتی کا وجود تخلیق کیا تھا، اور اب وہی موتی اس کے پیار اور دیوانگی سے منکر تھی۔ اور اسے پہچاننے سے انکاری تھی۔

موتی نے اکشے کا ہاتھ پکڑا۔ "مجھے ایسا لگتا ہے، کہ یہ صاف جھوٹ بول رہا ہے، کیونکہ یہ میرے خیال میں ایک جھوٹا انسان ہے۔"

"نہیں موتی یہ تمہارا مالک ہے، اس نے تمہیں بنایا ہے، اب تم نے اس کا تابع وفرمان رہنا ہے۔"

"اس نے مجھے بنایا ہے؟" موتی نے شہادت کی انگلی شاہد کی طرف کر کے پوچھا۔

"ہاں، اور اس بات کی گواہی میں بھی دیتا ہوں۔" جیکسن نے گہرے لہجے میں کہا۔

"تو کیا اس نے تم دونوں کو بھی بنایا ہے؟"

"نہیں تو؟" اکشے ہنسا۔ اور جیکسن بھی ہنسنے لگا۔

"تو پھر تم دونوں کو کس نے بنایا ہے؟"

"خدا نے۔" جیکسن نے جلدی سے کہا۔

"تو تم دونوں خدا کی تخلیق ہو۔" موتی مسکرانے لگی، اس کی مسکان میں گہرائی تھی۔

"ہاں۔" اکشے نے ہونٹ بھینچے۔ اور موتی کی طرف دیکھنے لگا، اسے موتی سے گھبراہٹ سی ہونے لگی تھی۔

کچھ دیر موتی سوچتی رہی، وہاں پر گہری خاموشی سی چھا گئی۔

اکشے نے موتی کا ہاتھ اپنے ہاتھ سے ہٹایا، اور چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔

شاہد آگے آیا، اس نے موتی کی آنکھوں میں دیکھنا شروع کر دیا۔ اور پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سر پر رکھا۔

"تم انجان ہو، اور بے خبر ہو، مگر میں تمہیں سب کچھ بتادوں گا، تم میری آنکھوں میں دیکھو، ان میں، میں تم ہی نظر آؤں گا، میں تمہارا پریمی ہوں، اور تم میرے خوابوں میں آتی تھی، میں نے تمہارے پینٹنگز بنانے شروع کر دیئے۔ پھر تمہارا مجسمہ بنایا، اور تم میں جان ڈال دی، یہ دونوں اس بات کے گواہ ہیں، اور تم میری تخلیق ہو۔ اور اب تم میری پابند رہوگی۔ مجھ سے وفا کروگی۔" شاہد نے جیسے ہی موتی کا دوسرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لینا چاہا، موتی نے اس کا ہاتھ سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں بری طرح جھٹک دیا۔

"تم نے مجھ کو بنایا، اور تم کو خدا نے بنایا، یہ خدا کون ہے؟؟" موتی نے سوال پوچھا، اور شاہد لرز اٹھا،

"خدا تو ساری کائنات کا خالق ہے، اس نے ہم سب کو بنایا ہے۔" شاہد وضاحت دینے لگا۔

"تو پھر تم خدا کے تخلیق ہو، اور کیا تم خدا کے پابند ہو؟ اگر ہو بھی۔ تو بھی میں تمہاری پابندی نہیں کر سکتی، نہ تو میں تمہیں جانتی ہوں، اور نہ میرا تم سے واسطہ ہے، اور نہ میرے دل میں تم وہ جگہ لے سکتے ہو۔ تم شکل سے کتنے منحوس لگتے ہو۔"

"یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو، میں تم سے پیار کرتا ہوں اور اسی لیے تمہارا وجود تخلیق کیا ہے۔" شاہد جلنے لگا۔

"میں کسی اور سے پیار کرتی ہوں، اور تم اس قسم کی بکواس باتیں مت کروں، تو اچھا ہے۔"

شاہد کو موتی کی بات سن کر زندگی کا سب سے بڑا دھچکا لگا۔ کیونکہ خدا نے انسان سے سب سے زیادہ محبت کی ہے، اسی لیے تو ساری دنیا کے مخلوقات کو پابند بنایا ہے، مگر انسان کو آزاد اور فیصلے کا اختیار دے رکھا ہے، کیونکہ جو خدا کا بندہ ہوتا ہے وہ راہ سے کبھی نہیں بھٹکتا۔

"تم یقین نہیں کر رہی ہو آؤ، میں تمہیں کچھ دیکھاتا ہوں، تم وہ سب دیکھ کر یقین کر لوں گی، شاہد نے جیسے ہی موتی کا ہاتھ پکڑنا چاہا، وہ کئی قدم پیچھے ہٹ گئی۔" مجھے کچھ بھی نہیں دیکھنا۔

"تم اپنی حد میں رہو، تم نے مجھے ضرور بنایا ہوگا، مگر احساسات اور جذبے تم نے نہیں بنائے، وہ میرے اپنے ہیں، میں اپنے دل کی مانتی ہوں، تمہاری سچائی اور تمہارا پیار مجھے تمہاری طرف مائل نہیں کر سکتا ہے۔" موتی شدت سے چیخ پڑی۔

"موتی تم صرف ایک بار میرے ساتھ بیس مینٹ چلو جاؤں تم خود اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ لو گی۔ تو تم میری دیوانگی کا یقین کر لو گی۔ تم فی الحال انجان ہو، نادانی میں ہو، اور جو انجان ہوتے ہیں، وہ اسی طرح پیار سے منہ موڑتے ہیں۔" شاہد بے تاب ہو گیا۔ اور اکشے کو دیکھنے لگا۔

موتی نے بھی اکشے اور جیکسن کی طرف دیکھا، دونوں پریشان تھے۔

"میں تمہیں شروع سے بتاؤں گا، ایک، ایک لفظ سچ، سچ بتاؤں گا، تم کو میری محبت کا یقین آجائے گا، اور تمہارا احساس جاگ جائے گا۔" شاہد نے موتی کے قریب ہو کر بے چینی سے کہا۔

"مجھے کچھ نہیں سننا، میں، اور میرے احساس تم سے انجان ہیں۔"

موتی تو وہ کبوتری بن گئی تھی، جو ہاتھ لگانے

سے پہلے پروں پر پانی تک ڈالنے نہیں دے رہی تھی۔

''انجان ہو، اس لیے تو ایسے کہہ رہی ہو، جب میں بتاؤں گا تو تم سب کچھ جان لوگی، اور جان کر تم، اور تمہارے احساس مجھے قبول کرلیں گے۔''

''ہونہہ! میں کچھ جاننا ہی نہیں چاہتی، تم مجھے کونسی رام کہانی بتانے کی کوشش کررہے ہو؟''

''میں اس سامنے کھڑے لڑکے سے پیار کرتی ہوں۔'' مورتی نے اکشے کی طرف شہادت کی انگلی سے اشارہ کردیا، جسے دیکھ کر خاموش تماشائی جیکسن اچھل ہی توپڑا۔

''کیا، مگر تم میری ہو، میں تمہیں شدت سے چاہتا ہوں، تم سے بے حد پیار کرتا ہوں، میرا دل صرف تمہارے لیے دھڑکتا ہے، اور اب تم صرف میری ہو۔ تم ایسا نہیں کہہ سکتی۔'' شاہد چیخا۔

ہاہا۔۔ہاہا۔ مورتی ہنسنے لگی کہ قہقہے لگانے لگی۔

''تم سنو۔۔ جیسا تمہارا دل میرے لیے دھڑکتا ہے، ایسے ہی میرا دل اس کے لیے دھڑکتا ہے، میں صرف اس کی ہوں اور اس سے بے پناہ محبت کرتی ہوں۔'' مورتی کی باتوں سے سچائی کی بو آرہی تھی، اور شاہد کی باتوں سے بے چینی کی، اور اکشے کے بدن سے جیسے کسی نے تو سارا خون ہی نچوڑ دیا تھا۔ وہ اپنی جگہ بت کی طرح ساکت تھا، بس اس کی سانس ہی چل رہی تھی، اور جیکسن تو حیرتوں کے پہاڑ تلے دبا ہوا بے یقین سا تھا، اسے تو یقین ہی نہیں آرہا تھا، کہ کیا ہورہا ہے۔

''موتی تم ہوش میں تو ہو، تم کہہ کیا رہی ہوں۔'' شاہد نے جیسے غصے میں آکر کہا۔

''مجھے تو آپ ہوش میں نہیں لگ رہے ہیں۔ دراصل میں نے جب سے اس کو پہلی نظر میں دیکھا تو مجھے اس سے محبت ہوگئی، مجھے نہیں پتہ کہ محبت کیسے ہوتی ہیں، کس طرح یہ جذبہ دل میں پیدا ہوتا ہے، مگر مجھے اس سے محبت ہوگئی ہے، میرا دل اس کا آرزو کرنے لگا ہے، اسے دیکھ کر میرے دل کو چین اور سکون ملتا ہے۔''

مورتی خود بے چینی سے اپنے الفاظ کی وضاحت کررہی تھی۔

''مگر میں تم سے محبت نہیں کرتا۔ اور تم یہ فضول خیال اپنے دل سے نکال دو۔'' اکشے نے ایک دم سے چیخ کر کہا۔

''تو مت کرو، میں یہ تو نہیں کہتی کہ تم بھی مجھ سے محبت کرو، میں تو اپنی بات کہہ رہی ہوں، اور یہی حقیقت ہے۔'' مورتی ہنسی۔

''میرا کیا ہوگا، اگر تم مجھے نہ ملی، تو میں مرجاؤں گا۔'' شاہد نے التجا کی۔

''تو مرجاؤ، مجھے کیا، اگر تم مجھے نہ ملے میں خود مر جاؤں گی۔'' مورتی نے اکشے کا ہاتھ پکڑلیا۔

اکشے نے جھٹکا دے کر پورا ہاتھ چھڑالیا، اسے کچھ بھی سمجھ نہیں آرہا تھا، کہ یہ سچویشن وہ کس طرح سے ہینڈل کریں۔

''تم مجھے ملو یا نہ ملو، مگر تم سن لو، میں تمہیں کبھی بھی نہیں ملوں گی۔ میں مرجاؤں گی، پر تمہاری نہیں بنوں گی۔'' مورتی چیخنے چلانے لگی۔ اس نے بیک وقت اکشے اور شاہد سے کہا۔

شاہد نے مورتی کا ہاتھ پکڑا، اور اسے گھسیٹتا ہوا تہہ خانے کی طرف لے جانے لگا۔ ''چھوڑو میرا ہاتھ، میں کہہ رہی ہوں چھوڑ دو میرا ہاتھ، تم اس طرح میرے ساتھ زبردستی نہیں کرسکتے۔'' وہ ہسٹریائی انداز میں چلانے لگ گئی۔

مگر شاہد اسے تہہ خانے میں لے گیا، وہاں پہنچ کر اس نے مورتی کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ اور مورتی حیرانگی سے دیواروں کو دیکھنے لگی۔ وہاں چاروں طرف مورتی کی بے شمار تصویریں تھیں، بیس مینٹ کے چاروں دیواریں اس کی پینٹنگز سے بھری ہوئی تھیں۔ مورتی جو کچھ دیر قبل چیخ رہی تھی، اب اس کے حیرانی قابل دید تھی۔ یہ کس کی تصویریں ہے، اس نے اپنی شکل آئینے میں کہاں دیکھی تھی۔ اور نہ اس کی یادداشت میں اپنی شکل محفوظ تھی۔ جیسے دیکھ کر وہ یقین کرلیتی۔

''یہ تمہاری ہی تصویریں ہیں۔ میں نے تمہاری پرستش کی ہے، بھگوان کی طرح تمہاری پوجا کی ہے۔ اور تم میری ہی ذات سے منکر ہو، میں تمہیں ماردوں گا مگر تمہیں کسی اور کا ہونے نہیں دوں گا۔'' شاہد چیخا۔

''دل زبردستی کا قائل نہیں ہوتا، تم نے میری پرستش کی یا پوجا، میں نہیں جانتی، میں اگر کچھ جانتی ہوں تو وہ میری دل کی آواز ہے، جو تمہاری محبت سے انکاری ہے، اب چاہے تم مجھے ماردو یا زندہ درگور کردو۔''

''مگر میں تمہاری نہیں ہوسکتی۔'' مورتی نے وہاں ایک لگے آئینے میں خود کو دیکھا۔

''کیا میرے جذبے جھوٹے ہیں؟ یا پھر یہ تصویریں؟ یا پھر مجھ میں کوئی کمی خامی ہے جو تم مجھ کو اور میرے جذبوں کو مان ہی نہیں رہی ہو۔'' شاہد اس بار روہانسا سا ہوگیا تھا، یہ بڑا ہی مشکل ہوتا ہے، کہ جسے آپ دل سے چاہیں وہی آپ کی ذات سے منکر ہو کر آپ کے جذبوں کو روند ڈالے۔

''جس طرح تم اپنے دل سے بے بس ہو، ایسے ہی میرے دل پہ میرا کوئی زور نہیں چل رہا۔ تم مان جاؤ اور مجھے اس کے ساتھ جانے دو۔ میرے دل میں اس کی تصویر بس گئی ہے، اب وہ ہی اس وجود کا مالک بن سکتا ہے۔'' مورتی نے منطقی انداز میں بات ختم کرنی چاہی، مگر شاہد اس کی بات سن کر بھڑک گیا۔

''وہ کبھی تمہارا نہیں بن سکتا، وہ تم سے پیار نہیں کرتا۔'' شاہد ہنسا۔

''یہ صرف تمہارا خیال ہے، میں نے اس کی آنکھوں میں اپنے لیے پیار دیکھا ہے، اور وہ مجھے تم سے زیادہ چاہتا ہے۔'' مورتی نے جیسے شاہد کو چیلنج دے دیا۔

''تو پھر ٹھیک ہے، اگر اس نے تمہاری محبت کو جھٹلا دیا۔ تو پھر تمہیں میرا ہونا پڑے گا، پورے من سے۔'' شاہد نے اس کو شانوں سے تھام کر کہا۔

''میں قسم کھاتی ہوں، اگر اس نے میری محبت ٹھکرادی، تو میں پورے من سے تمہاری ہوجاؤں گی۔ اور اگر اس نے میری محبت اپنالی، تو پھر تم کو ہمارے بیچ سے ہٹنا ہوگا۔'' مورتی نے اس کے دونوں ہاتھ اپنے شانوں سے نیچے کردیئے۔

''میں ہٹ جاؤں گا، مگر مجھے یقین ہے ایسا کبھی نہیں ہوگا۔'' شاہد کو جیت دکھائی دینے لگی تھی۔ اس کو امید کی کرن دکھائی دے گئی۔ اکشے ایسا کبھی نہیں کرے گا۔ اسے سو فیصد یقین تھا۔

''تمہاری خوش فہمی بہت جلد دور ہوجائے گی۔'' مورتی نے شاہد سے کہا۔ وہ دونوں سیڑھیوں سے اوپر آنے لگے۔ اوپر اکشے اور جیکسن خاموش کھڑے تھے۔

اکشے سوچ رہا تھا۔ مورتی کتنی حسین ہے، جب میں نے اسے اپنے علم سے ڈھونڈنا چاہا تو اس کا چہرہ پورے سنسار میں کہیں بھی نہیں تھا، اور اب یہ مجھ سے محبت کا دعویٰ کررہی ہے، تو یہ میری پچھلے جنم کی پریمیکا رہی ہوگی۔ مگر شاہد کو تو وہ اپنا پریمی مان بھی نہیں رہی ہے، تو اگر مورتی اپنے دعوے پر قائم رہتی ہے، تو میں اس کی مجبوری جان کر اس کی محبت کو تسلیم کرلوں گا۔ کیونکہ یہ صرف شاہد کی تخلیق نہیں ہے۔ اس نے صرف پتھر کی مورت بنائی تھی، اور مورتی میں جان میں نے ڈالی ہے۔ اگر میں نہ ہوتا تو آج بھی وہ صرف پتھر کی مجسمہ ہوتی۔ اور شاہد اس کا پجاری، مورتی اور میرا پچھلے دور کا ضرور کوئی نہ کوئی رشتہ رہا ہے۔ اس لیے وہ یاد جو مجھے یاد نہیں اسے یاد ہیں۔'' اکشے کا دماغ مورتی کا حسن دیکھ کر پھر گیا۔

مورتی اور شاہد آگے پیچھے بیس مینٹ سے باہر نکلے۔

☆......☆......☆

وہ پتھر جنہیں ہم نے عطا کی تھی دھڑکنیں
جب مل گئی گویائی ہم ہی پر برس پڑے

مورتی چند قدم آگے تھی، وہ اکشے کے قریب آئی۔ ''میری اور اس کی بات ہوگئی ہے، وہ راضی ہوگیا ہے، کہ اگر تم میری محبت قبول کرلو گے تو وہ پیچھے ہٹ جائے گا۔''

''دیکھو تم مجھے سچ سچ بتانا میں کس طرح اس دنیا

میں آئی، مجھے کچھ بھی سہی طرح سے پتہ نہیں ہے۔ میں معلوم کرنا چاہتی ہوں، اور یہ میرا حق ہے۔" مورتی نے اپنی شیریں آواز میں اکشے سے پوچھا۔ اور اکشے کو ایسا لگنے لگا کہ اس کے اردگرد مندر کی گھنٹیوں کی گونج سنائی دینے لگی ہو۔

شاہد کا خیال تھا کہ مورتی اکشے سے صرف ایک سوال کرے گی، اسے اکشے ہاں یا نہ میں جواب دے کر بات ختم کردے گا۔ مگر مورتی نے تو جیسے پرانی بات چھیڑ دی تھی، اب سب کچھ اکشے پر تھا۔

اور شاہد کو یقین نہیں آرہا تھا، کہ اکشے مورتی کو سب کچھ سچ، سچ بتادے گا۔

وہ شروع سے اسے سب کچھ ایک، ایک لفظ بتانے لگا تھا، اور مورتی پوری توجہ سے سن رہی تھی۔

ساری رام کہانی سنانے کے بعد مورتی نے شاہد کی طرف دیکھا، اور اکشے سے مخاطب ہوئی۔

"میں اس سے محبت نہیں کرتی، میں اگر پیار کرتی ہوں، تو وہ صرف اور صرف تم سے کرتی ہوں۔ یہ تو سنگ تراش ہے، اپنے لیے دوسری تیسری، چوتھی مورتی بنالے گا۔ اور تم تو جادوگر ہو اپنے جادو سے اس کی مورتی میں پھر سے جان ڈال دو گے، اور یہ جیکسن اس کی نئی والی مورتی کے لیے پیارا سا لباس بنادے گا۔ اور شائد نئی مورتی کے دل اور دماغ میں شاہد کا بسیرا ہوگا۔ اور وہ والی مورتی اس کی اپنی والی مورتی ہوگی، ہاں اور اس سے زیادہ حق تمہارا مجھ پہ بنتا ہے، تم نے مجھ میں جان ڈال کر زندہ کردیا تھا۔ تمہارا حق اس لیے بھی زیادہ ہے، کیونکہ میں تم سے محبت کرتی ہوں اور تمہیں پورے دل کی گہرائیوں سے چاہتی ہوں، اور اپنا مانتی ہوں۔" اکشے کا دل اس کا حسن اور شباب دیکھ کر پہلے ہی بدل چکا تھا، وہ اگر خاموش تھا، تو صرف اور صرف اپنی دوستی کی وجہ سے، اور مورتی کو بھلے ہی کچھ یاد نہ ہو، مگر اس میں جان پڑنے کے بعد وہ بات پوری دلیل سے کرتی تھی، اور اس کا یہ منطق اکشے کا من بدل کر رکھ گیا۔

"ٹھیک ہے، میں تمہارا پیار قبول کرتا ہوں، اور تم ٹھیک کہہ رہی ہو، شاہد تو سنگ تراش ہے، وہ اپنے لیے دوسری مورتی تیار کرلے گا۔ جیسے اس نے اپنے لیے بے شمار تصویریں بنائی ہیں، اور میں اسکی بنائی گئی مورتی میں جان ڈال دوں گا۔"

شاہد کے اندر چھن سے کچھ ٹوٹ گیا، وہ اس کا دل تھا، اور اس کے دل کی ٹوٹنے کی آواز کسی نے بھی تو نہیں سنی، کیونکہ دل ٹوٹنے کی آواز ہوتی ہی نہیں ہے، شاہد کو یقین نہیں آرہا تھا کہ اس کا دوست اس کے ساتھ ایسا کرسکتا ہے۔ وہ ایک خوبصورت چہرے کے لیے اس سے دغا کرسکتا ہے۔

اکشے نے مورتی کا ہاتھ تھام لیا، اور شاہد کے روبرو کھڑا ہوگیا۔

"مورتی ٹھیک کہہ رہی ہے، تم اپنے لیے ایک اور مورتی بناؤ، میں اپنے علم سے اس میں جان ڈال دوں گا۔ اور وہ والی مورتی صرف اور صرف تمہاری ہوگی، اس کے دل اور دماغ پر کسی دوسرے کا نقش نہیں ہوگا۔" شاہد اکشے کی بات سن کر بجھ سا گیا۔

"اگر اس نئی مورتی کو جیکسن پسند آگیا۔ تو پھر میرا کیا ہوگا۔" شاہد نے طنز کیا۔

اکشے شاہد کی بات سن کر پریشان ہوگیا، مگر مورتی جلدی سے بولی۔ "تو تم پھر ایک اور مورتی بنا لینا۔ اور اکشے اس میں تمہارے لیے جان ڈال کر ہمیشہ کے لیے تمہارا کردے گا۔"

"ٹھیک ہے۔" شاہد بجھے دل سے بولا وہ مورتی کی بات سمجھ گیا۔

مورتی خوش ہوگئی اور ہنسنے لگی۔ "اب تو تم خوش ہونا، اکشے کہ ہم ایک ہونے جارہے ہیں، اب کسی کو کوئی اعتراض تو نہیں ہے ناں۔"

"مجھے اعتراض ہے۔" جیکسن چیخا۔

شاہد اور اکشے حیرت سے جیکسن کو دیکھنے لگے، ابھی تک تو وہ صرف خاموش تماشائی کھڑا تھا، اور ابھی ایک دم سے اس نے اپنی بات اعتراض سے شروع کردی۔

شاہد مورتی اور اکشے حیرت سے جیکسن کو دیکھنے لگے۔

"تم ہوتے کون ہو؟ اعتراض جتانے والے؟ بات تو ان دونوں کی تھی۔" مورتی نے چتون اٹھا کر کہا۔

"میں ان دونوں کا تیسرا دوست ہوں، تم صرف اور صرف شاہد کی خواہش پر دنیا میں آئی تھی۔ اور میں تمہیں بتادوں، شاہد کی تم اولین اور آخری خواہش تھی، مورتی نے اگر شاہد کا پیار ٹھکرایا، تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے۔ مگر اکشے تم شاہد کے ساتھ ایسا کیسے کرسکتے ہو، تم تو اس کے دوست ہو، اگر تم مورتی کو جان ڈال کر اپنا کہہ سکتے ہو، تو قیمتی لباس دے کر میں بھی اس میں اپنا حصہ مانگ سکتا ہوں۔ کیونکہ اگر شاہد اس کا مجسمہ نہ بناتا تو تم نہ اس میں جان ڈال سکتے اور نہ میں اس کے لیے لباس بنا سکتا۔ اس لیے اب اگر شاہد مورتی سے دستبردار ہو ہی رہا ہے، تو میں اور تم مورتی میں اپنا، اپنا حصہ لیتے ہیں، تم نے اس میں جان ڈال دی ہے ناں، تو یہ روحانی طور پر تمہاری ہوئی، مگر میں نے اس کے بدن کو ڈھانپا ہے، اس کی عزت کو چھپایا ہے، یہ جسمانی لحاظ سے اب صرف میری بنتی ہے۔"

"یہ کیا بکواس کررہا ہے۔" مورتی نے شاہد اور اکشے کی طرف دیکھا۔

"یہ بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔" شاہد نے مورتی کے کا منہ بند کردیا۔ "تم بڑے دلائل اور منطق پیش کر رہی تھی۔ اب جو یہ کہہ رہا ہے تو اس کی بات پوری طرح سے درست ہے، اکشے تم سے زیادہ مورتی کا حقدار جیکسن بنتا ہے۔ تم مورتی کو اس کے حوالے کردو۔ کیونکہ میں مورتی کے خیالوں میں رہوں گا، تم مورتی کے دل میں اور جیکسن اس کے بانہوں میں، بس فیصلہ ہوگیا ہے۔"

"تم اپنی بکواس بند کردو۔ اکشے کے ہوتے ہوئے مجھے کوئی چھو بھی نہیں سکتا، ورنہ خون کی ندیاں بہہ جائیں گی۔" مورتی نے غصے سے کہا۔

مورتی کا ایسا کہنا ہی غضب ہوگیا، اکشے جو گہری سوچ میں ڈوبا لگ رہا تھا، وہ ایک دم سے طیش میں آگیا۔

"مورتی جو بھی کہہ رہی ہے۔ ٹھیک کہہ رہی ہے۔" اکشے نے دونوں کو خبردار کیا۔

"نہیں اگر انصاف ہی کرنا ہے، تو پھر مورتی انصاف نہیں کررہی، اور میں انصاف کی بات کررہا ہوں۔" شاہد نے مورتی سے کہا۔

جیکسن نے زبردستی مورتی کا ہاتھ پکڑ لیا، اور اسے اپنی سمت کھینچنے لگا۔

"تمہاری ہمت کیسے ہوئی، اسے ہاتھ لگانے کی؟" اکشے جیکسن کے مقابل آگیا۔

"جس طرح تمہاری ہمت ہوئی، اسے شاہد سے چھیننے کی۔" جیکسن غرایا۔

"میں کہہ رہا ہوں مورتی کا ہاتھ چھوڑ دو، ورنہ تمہارے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔

"میں نے مورتی کا ہاتھ چھوڑنے کے لیے نہیں پکڑا ہے، اور ویسے بھی اب صرف اور صرف مورتی میری ہے۔ کیونکہ ہم تین ہیں، اور انصاف یہی کہتا ہے کہ جس پر مورتی کا حق سب سے زیادہ بنتا ہے وہ میں ہوں، میں نے اسے لباس دیا ہے۔ اور لباس عزت اور تحفظ ہوتا ہے۔"

"تم نے مجھے لباس دیا ہے ناں، تو میں تمہیں تمہارا لباس واپس کررہی ہوں، میں یہ لباس اپنے سے الگ کردوں گی۔" مورتی چیخی۔

"تم مجھے لباس واپس کروگی، تو کیا شاہد کو اس کا بنایا ہوا وجود بھی واپس کردوگی؟ اکشے کو وہ روح بھی واپس کردوگی جو اس نے تمہارے وجود میں ڈالا ہے۔"

مورتی حیرت سے جیکسن کی طرف دیکھنے لگی۔ جیکسن چیخ، چیخ کر کہہ رہا تھا۔

"تم کیا کیا لوٹاؤ گی؟ تم کچھ بھی نہیں لوٹا سکتی۔ تم ایک فساد کی آگ ہو۔"

"میں لوٹا سکتی ہوں، میں تمہیں تمہارا بنایا گیا لباس واپس کرہی سکتی ہوں۔" مورتی نے اپنے گریبان میں ہاتھ ڈالا، اور پوری شدت سے لباس پھاڑ دیا، کرِکی آواز سنائی دی، اس کا لباس دو ٹکڑے ہوگیا، اس نے وہ قیمتی لباس اپنے وجود سے الگ کیا، اور حقارت سے جیکسن کی طرف پھینک دیا، اور اس کا دودھیا وجود عریاں ہوگیا، شاہد نے اپنی آنکھوں پر غم سے ہاتھ رکھ لئے، وہ مورتی کو اپنے دوستوں کے سامنے یوں عریاں نہیں دیکھ سکتا تھا۔

اکشے غم وغصے سے پاگل ہوگیا تھا، وہ زخمی چیتے کی مانند غرایا، اور اس نے جیکسن پر چھلانگ لگادی، وہ جیکسن کو بری طرح سے مارنے لگا، جیکسن اپنے بچاؤ میں ہاتھ پیر چلانے لگا، مگر اکشے پر تو جیسے خون سوار تھا، وہ مکوں، لاتوں اور سر کی ٹکروں سے جیکسن کو لہولہان کرگیا، جیکسن زمین پر گرگیا، اور اکشے اسے تب تک مارتا رہا جب تک وہ بے دم نہ ہوا، مورتی اس کو حقارت سے دیکھتی رہی، وہ اسی طرح برہنہ کھڑی تماشا دیکھ رہی تھی۔

جیکسن کے گلے پر اکشے نے اتنی لاتیں برسائیں، کہ وہ بے چارہ دم توڑ گیا۔

اکشے نے حقارت سے جیکسن کو دیکھا، اور پھر اس نے ایک میلی کچیلی سی چادر اٹھا کر مورتی کے اردگرد لپیٹ دی، آؤ مورتی اندر چلیں۔ اکشے نے اس کا ہاتھ پکڑا، اور اسے اندر اپنے کمرے میں لے جانے لگا۔

"ٹھہرو، ابھی فیصلہ نہیں ہوا ہے، اگر مورتی اتنی ہی اصول پرست ہے، تو مجھے میرا بنایا ہوا جسم واپس چاہیے، تم نے مورتی میں صرف روح ڈالی تھی ناں، تو تم اپنی روح رکھ لو۔"

اکشے حیرت سے شاہد کو دیکھنے لگا۔ "تم کیا کہہ رہے ہو۔"

"تم سمجھ نہیں رہے ہو کیا، اور نہ میں کسی دوسری زبان میں بات کررہا ہوں۔"

"اب تمہارا بنایا ہوا جسم تمہیں نہیں مل سکتا، کیونکہ اس کے ساتھ روح مل گئی ہے، اور جب تک اس سے روح نہیں نکلتی، جسم تب تک بے جان نہیں ہو سکتا۔" اکشے نے شاہد کو سلگایا۔

"تو جب میرا بنایا ہوا جسم تم نہیں دے سکتے، تو جیکسن کا بنایا ہوا لباس بھی دینے سے انکار کرتے۔"

"مورتی مجھے تم سے اپنا بنایا ہوا، وجود واپس چاہیے، کیونکہ تم منطق کی بات کرتی ہو، اور جب تم جیکسن کا بنایا ہوا لباس واپس کرسکتی ہو، تو میرا بنایا ہوا وجود بھی واپس کرہی سکتی ہو۔"

"میں تمہارا، وجود واپس کررہی ہوں، بتاؤ میں کیا کروں۔" مورتی نے شاہد کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا۔

"تم ایسا کچھ نہیں کررہی ہو، یہ پاگل ہو چکا ہے، اور شاہد تم نے ابھی جیکسن کا حال دیکھ لیا ہوگا، کہیں میں تمہارا بھی وہی حشر نہ کردوں۔" اکشے غضب ناک ہوگیا۔

"تم سے کوئی بعید بھی نہیں ہے، جب تم ایک لڑکی کے لیے دوست کی جان لے سکتے ہو، تو تم کچھ بھی کرسکتے ہو۔" شاہد نے دکھ سے کہا۔

"جب پتہ چل ہی چکا ہے، تو اب میرے راستے میں مت آؤ۔"

"نہیں جب تم اور جیکسن اپنے حق کے لیے لڑے تھے، تو اب اپنے حق کے لیے میں بھی لڑوں گا۔"

"میں اپنا حق لوں گا، یا پھر جیکسن کی طرح اس صفحہ ہستی سے فنا ہوجاؤں گا۔" شاہد کی آنکھیں لہو رنگ تھیں۔

"ٹھیک ہے تو پھر ہم دونوں میں سے ایک ہی مورتی کا مقدر بنے گا۔" اکشے شاہد کے مقابل آکر بولا۔

وہ دونوں ایک دوسرے کے مقابل آگئے۔

مورتی دونوں کو دیکھنے لگی۔ وہ کچھ سوچ رہی تھی۔

شاہد کو جیکسن کی موت کا کچھ زیادہ ہی ملال تھا، اور اسے اکشے سے یہ اُمید تو ہرگز نہ تھی، کہ وہ اس کا پیار ہتھیانے کی سازش کرے گا۔ اور جیکسن کی جان لے لے گا۔

شاہد نے اپنا سر زور سے اکشے کے منہ پر مارا، اور شاہد کا ایسا کرنا ہی غضب ہوگیا، اکشے کے کئی دانت باہر گر گئے، خون کی کئی چھینٹیں مورتی کے چہرے پر پڑگئیں۔

شاہد کا غصہ عروج پر تھا، اکشے پر وہ ہاتھوں اور پیروں سے مکے اور لاتیں برسانے لگا، اکشے نے اسے پورے زور سے گردن سے پکڑلیا، شاہد نے اس کی ٹانگوں کے بیچ کئی لاتیں ماری، مگر اکشے صرف غوں غاں کی آوازیں نکالتا، اور شاہد کی گردن پر گرفت مضبوط کردیتا۔

شاہد کی توانائی کم ہورہی تھی، اس نے بڑی مشکل سے اکشے کی گرفت سے خود کو چھڑایا، اور قریب پھلوں کی ٹوکری سے تیز دھار والا چاقو اٹھا کر لمحے میں اکشے کے سینے پہ کئی وار کردیئے۔

اکشے دھڑام سے زمین پر گرگیا۔ اور تڑپنے لگا، شاہد نے اسے ایک زوردار لات ماری، اور مورتی کی طرف فاتحانہ نظروں سے دیکھنے لگا، مورتی ابھی تک حیران اور پریشاں کھڑی تھی، شاہد مورتی کی طرف بڑھ رہا تھا، اس نے چند ہی قدم لیے ہوں گے۔

کہ اکشے اٹھا اس نے اپنی چھاتی سے خنجر نکالا، اور مورتی کی طرف جاتے ہوئے شاہد کی شہہ رگ میں گھونپ دیا، خون کا فوارہ اُبل پڑا، اور زمین پر گرنے لگا۔

اکشے زمین پر گرتا چلا گیا، اور شاہد زمین پر گرکر تڑپ رہا تھا، مورتی، ان دونوں کو مرتا ہوا دیکھنے لگی۔

اور پھر اس نے آسمان یعنی اوپر کی طرف دیکھنا شروع کردیا۔

وہ زور، زور سے قہقہے لگانے لگی۔

شاہد کی آنکھیں، کھلی رہ گئیں۔ اور اکشے نامراد سا آخری سانس بمشکل لے سکا۔

دونوں کے مرتے ہی مورتی کا دل شق کر گیا، کیوں کہ وہ ان کی بنائی گئی تھی، اور ان ہی کے لیے فساد کی سبب بنی، اکشے نے جادو سے اس میں جو روح ڈال دی تھی، اب اس پتھر کی مورت میں وہ نہیں رہ سکتی تھی۔ اکشے کے واصل جہنم ہوتے ہی وہ روح آزاد ہوگئی۔

اس کا گوشت پوست کا وجود رفتہ، رفتہ پتھر کی مورتی، میں تبدیل ہونے لگا۔ پہلے اس کے پیر پتھر کے ہوگئے، پھر اس کا دھڑ اور اب وہ پوری پتھر میں تبدیل ہو گئی۔ اور جب وہ پتھر ہوگئی، تو پوری شدت سے زمین بوس ہوگئی۔ زمین پر گرتے، ہی وہ ٹکڑے، ٹکڑے ہو گئی۔ اس مورتی کے کئی ٹکڑے ادھر اُدھر پھیل گئے۔

وہاں تین لاشیں پڑی تھیں، اور ایک خوبصورت لڑکی نما مورتی کے بے شمار پتھر کے ٹکڑے۔

جتنا بھی کسی مورتی کو پوجا جائے، وہ کبھی کسی کو نہیں ملتی، مورتیاں تو پوجنے کی لائق نہیں ہوتیں، بس یہ انسانی المیہ ہے، کہ وہ اپنے ہاتھوں سے بنائی گئی مورتیوں کی پرستش کرتے ہیں۔

چند دن بعد جب وہاں تحقیقات ہوئیں، تو اخبار میں سرخی چھپی تھی۔ "تین دوستوں نے ایک بے جان مورتی کی خاطر ایک دوسرے کی جان لے لی۔" ماہرین اس مورتی کے ٹکڑوں کو جوڑنے کی کوشش کررہے ہیں، مگر یہ کوشش بے کار ہے، کیونکہ اس کے کئی سو ٹکڑے ہو چکے ہیں، اور کئی ٹکڑے اتنے چھوٹے اور باریک ہیں کہ ماہرین کو سمجھ نہیں آرہی ہے، کہ وہ ٹکڑے کس حصے کے ہیں۔

کہانی ختم ہوئی اور کردار مر ہی گئے
لوگ رونے لگے تالیاں بجاتے ہوئے





عفریت

ملک این اے کاوش۔سلانوالی سرگودھا

قسط نمبر 5

خوف و ہراس کی وادی میں تہلکہ مچاتی اور جسم و جاں کو لرزہ براندام کرتی دہشت ناک، وحشت ناک، ہولناک اور خوفناک، ناقابل فراموش دل و دماغ پر سکتہ طاری کرتی لرزیدہ لرزیدہ کہانی جوکہ پڑھنے والوں کو ڈر کے شکنجے میں جکڑلے گی۔

ایک خونی عفریت کی دل دہلاتی اور کرب واذیت سے دوچار کرتی......دلخراش کہانی

تبھی میری نگاہیں شانزیب صاحب کی نگاہوں سے ٹکرائیں۔وہ بھی ٹکٹکی باندھے اپنی دختر کو ہی تکے جارہے تھے۔ان کی آنکھوں میں بھی ایک عجیب سی حیرت اور بے یقینی پھیلی ہوئی تھی۔جیسے انہیں یقین نہیں ہورہا تھا کہ سامنے ٹیبل پر کھانا کھانے والی ان کی ہی دختر ہے۔چکن کڑاہی کی ایک بھری پلیٹ بھی انوسہ چٹ کرگئی۔پھراس نے بریانی کی ڈش ایک بار پھراپنی طرف بڑھائی توانوسہ کے عین سامنے براجمان مہمان عورت بولے بنانہ رہ سکی۔

”انوسہ بیٹا کیابات ہے۔زیادہ بھوک لگ رہی ہے کیا؟“

انوسہ اس کی بات سن کریوں چونکی جیسے گہری نیند سے چونکی ہو۔اس نے ایک حیرت زدہ نگاہ سب پرڈالی۔اورجب اسے اس بات کا پتہ چلاکہ سب اس کی طرف ہی متوجہ ہیں۔توخجالت کے مارے نہ صرف اس کی نگاہیں جھک گئیں۔بلکہ اس نے پلیٹ آگے سرکادی۔ایک ٹشواٹھاکراس سے پہلے منہ اور پھر ہاتھ صاف کرنے لگ گئی۔انوسہ نے اس عورت کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔کھانے کے بعددیگرے سب ڈائننگ روم سے اٹھ کرٹی وی لاؤنج میں جمع ہونا شروع ہوگئے تھے۔

نجانے کیوں میرے بھی ذہن میں عجیب عجیب سے خیالات جنم لینے لگ گئے تھے۔میں اورانوسہ ابھی تک ڈائننگ ٹیبل کے گردہی براجمان تھے۔میں نے ایک گہری نگاہ انوسہ پرڈالی۔وہ کسی مشکل کا شکاردکھائی دے رہی تھی۔یوں لگ رہاتھا جیسے وہ سوچوں کے تانے بانے میں بری طرح سے الجھی ہوئی تھی۔اس کے اس انداز پر میں حیرت زدہ ہوئے بنانہ رہ سکا۔میں نے ارادہ کرلیاتھا کہ اس بارے میں ضرور اس سے ڈسکس کروں گالیکن اس وقت اس ٹاپک پر بحث کرنا بہتر نہیں تھا۔ٹی وی لاؤنج میں مہمان اکٹھے تھے۔ ہمارے دونوں کی عدم موجودگی میں کوئی غلط نظریہ بھی قائم کیاجاسکتاتھا۔

میں بھی فوراًاٹھ کرٹی وی لاؤنج میں پہنچ گیا۔ٹی وہ لاؤنج میں بیٹھ کرسب نے چائے پی تھی۔انوسہ ٹی وی لاؤنج میں آنے کی بجائے سیدھی اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔چائے پینے کے بعدایک ایک کرکے سب سونے کے لیے کمروں میں جانے لگے۔اب میں اورشانزیب صاحب تنہارہ گئے تھے۔

”تم نے کچھ محسوس کیا برخوردار؟“ اچانک ٹی وی لاؤنج کی سکوت زدہ فضامیں شانزیب صاحب کی بازگشت گونجی تومیں ان کی طرف متوجہ ہوا۔

میں جانتاتھا کہ وہ کس بات کی طرف اشارہ کررہے ہیں۔میرے خیال میں اتنا کچھ انہوں نے بھی

محسوس نہیں کیا ہوگا جتنا کچھ میں محسوس کر چکا تھا۔

''جی ہاں۔'' میں نے مختصر جواب پر اکتفا کیا۔

''میری بیٹی نے آج تک آدھی روٹی سے زیادہ نہیں کھایا تھا۔'' شانزیب صاحب نے ہونٹ بھینچتے ہوئے کہا۔

''میں جانتا ہوں۔'' میں نے ان کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔

''یہ بات میری سمجھ سے بالاتر ہے کہ آج اسے کیا ہوگیا تھا؟'' شانزیب صاحب ایک گہری سانس لیتے ہوئے بولے۔

''آپ چنتا مت کیجئے انکل۔'' میں نے ان کی ڈھارس بندھاتے ہوئے جواب دیا۔

''اگر آپ اجازت دیں تو میں انوسہ سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں؟''

''برخوردار مجھے خوشی ہوتی ہے جب انوسہ کو تمہارے ساتھ دیکھتا ہوں۔'' شانزیب صاحب نے جواب دیا۔

''تمہارے ساتھ رہ کر وہ کافی خوش دکھائی دیتی ہے۔ جب سے تم اس گھر میں آئے ہو تب سے اس کے چہرے پر رونق سی پیدا ہوگئی ہے۔ مجھے پتہ ہے کہ اگر میں اس سے اس بارے میں کوئی سوال کروں گا تو وہ ٹال مٹول سے کام لے گی۔ اور میں اپنی بچی کے ساتھ ضد بازی نہیں لگا سکتا۔ لیکن اگر میری جگہ تم اس سے کچھ پوچھ تاچھ کرو گے تو وہ ضرور تمہیں سب کچھ بتائے گی۔ ایک دوست اور باپ کے درمیان بہت بڑا فرق ہوتا ہے۔ کچھ ایسی باتیں ہوتی ہیں۔ جو انسان چاہ کر بھی اپنے والدین کے ساتھ شیئر نہیں کر سکتا لیکن اپنے دوستوں کے ساتھ ضرور شیئر کرتا ہے۔''

اتنا کہہ کر شانزیب صاحب چپ ہوگئے۔ میں ان کی کسی بات کا کوئی جواب دیئے بنا اٹھا اور انوسہ کے کمرے کی طرف چل پڑا۔ انوسہ کے کمرے میں ایک مہمان عورت بھی لیٹی ہوئی تھی۔ جس کے خراٹوں کی آواز میں نے دروازے پر پہنچتے ساتھ ہی سن لی تھی۔ میں نے دروازے کو تھوڑا سا زور لگایا تو دروازہ کھلتا چلا گیا۔ مہمان عورت گہری نیند سو رہی تھی جبکہ انوسہ تکیئے کے سہارے نیم دراز تھی۔ میرے کمرے میں داخل ہونے پر بھی اس کے انداز میں کوئی تبدیلی رونما نہ ہوئی۔ حالانکہ میں نے کھنکار کر اسے مخاطب بھی کرنا چاہا لیکن وہ میری طرف متوجہ نہ ہوئی۔ تب میں نے اسے پکارا۔

''انوسہ۔''

میرے لفظوں کی بازگشت انوسہ سمیت اس مہمان عورت کی سماعت سے بھی ٹکرا گئی تھی۔ دونوں ایک ساتھ میری طرف متوجہ ہوئیں۔ میں حیرت زدہ رہ گیا کہ میں نے اتنی دھیمی آواز میں انوسہ کو مخاطب کیا تھا۔ جبکہ اس عورت کے خراٹوں کی آواز اتنی زیادہ تھی کہ میری بازگشت اس عورت کی سماعت سے ٹکرانا بجا نہ تھا۔ لیکن اس وقت میرے قدموں تلے زمین سرک گئی۔ جب اس عورت نے بے یقینی کے عالم میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کبھی مجھے اور کبھی انوسہ کو دیکھنا شروع کیا۔

''کیا بات ہے؟'' وہ عورت تلخ لہجے میں بولی۔ اس کے لہجے میں شک کی آمیزش کو میں اچھی طرح سے پہچان چکا تھا۔

''اس وقت تم انوسہ کے کمرے میں کیوں آئے ہو۔ بتاؤ کیا کام ہے؟''

''کچھ نہیں۔'' میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''انوسہ کو شانزیب صاحب بلا رہے ہیں۔ اس لیے اسے بلانے آیا ہوں۔''

''میں بھی ساتھ چلتی ہوں۔'' اس عورت نے کمبل سے باہر نکلتے ہوئے کہا۔

''نہیں خالہ آپ آرام کیجئے۔'' انوسہ نے اس عورت کو ہاتھ سے پکڑ کر کہا تو چار و ناچار وہ رک گئی لیکن اس کی کھا جانے والی آنکھیں متواتر مجھ پر ہی مرکوز تھیں۔

جیسے ہی انوسہ بیڈ سے اتری۔ میں نے اپنا داہنا ہاتھ بڑھا کر اس کا ہاتھ پکڑنا چاہا۔ انوسہ نے ہاتھ آگے بڑھا اور میرے پکڑنے سے قبل ہی ہاتھ پیچھے کھینچ کر عجیب انداز سے مجھے گھورنے لگی۔ اس کی چہرے پر خوف کی پرچھائیاں سایہ فگن ہوگئی تھیں۔ میں نے حیرت سے انوسہ کی طرف دیکھا۔

''کیا بات ہے؟'' میں نے انوسہ سے پوچھا۔

''تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟''

''کک...... کچھ نہیں۔'' اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا اور مجھ سے فاصلہ رکھ کر چلنا شروع ہوگئی۔

میری حیرت ہویدا رہ گئی۔ یہ پہلا منظر تھا جب اس نے میرا ہاتھ نہیں تھاما تھا۔ وگرنہ میرے ہاتھ بڑھانے کی دیر ہوتی تھی اور وہ فوراً ہاتھ تھام کر میرے ساتھ چلنا شروع کر دیتی تھی۔ انوسہ سپیڈ کے ساتھ دروازے سے باہر نکل گئی۔ میں بھی اس کے پیچھے فوراً ہی نکلا اور نکلتے ساتھ ہی دروازہ بند کر دیا۔ تاکہ وہ مہمان عورت اندر ہی لیٹی رہے۔ انوسہ کا یہ بدلہ ہوا رویہ مجھے کچھ مشکوک سا لگنے لگا تھا۔ گھر کے اندر مہمانوں کی آمد اور اس کا بدلہ ہوا رویہ کسی اور رخ ہی میری سوچوں کا دھارا بہے جا رہا تھا۔ لیکن میں یہ بات ماننے کے لیے رضامند نہیں تھا کہ مجھ سے والہانہ محبت کرنے والی انوسہ کسی اور کی ہو سکتی ہے۔

ایک دم مجھے ایک اور تبدیلی کا احساس ہوا۔ جیسی بدبو ڈرائنگ روم میں پھیلی ہوئی تھی۔ وہی بدبو انوسہ کے پاس سے آ رہی تھی۔ مجھے ابکائی سی آنے لگی۔ انوسہ کے پاس سے ایسی بدبو کا آنا غیر فطری امر تھا۔ سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ آخر یہ سب ہو کیا رہا ہے۔ انوسہ مجھ سے دو قدم آگے چل رہی تھی۔ وہ بو پیہم میرے نتھنوں سے ٹکرا رہی تھی۔ میں یکدم تیزی سے چلتی انوسہ کے سامنے آ کر کھڑا ہوگیا۔ اس نے غیر یقینی انداز میں مجھے گھورنا شروع کر دیا۔

''انوسہ میرا ہاتھ پکڑو۔'' میں نے الفت بھرے انداز میں اپنا ہاتھ انوسہ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''کیا بات ہے؟ تم مجھ سے ایسا بی ہیو کیوں اپنا رہی ہو؟''

''کچھ نہیں۔'' اس نے سہمے ہوئے لہجے میں تھوک نگلتے ہوئے جواب دیا۔

اس کی پیشانی پر خوف کی سلوٹیں عیاں ہوگئی تھیں۔ مجھے کافی حیرت ہوئی کہ مجھ سے والہانہ محبت کرنے والی انوسہ آج مجھ سے ہی کیوں خوف کھائے جا رہی ہے۔

''ہوا کیا ہے؟'' میں نے استفسار کرتے ہوئے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔ بس مجھے تم سے ڈر لگ رہا ہے۔'' انوسہ نے متواتر سہمے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

''کیا فضول سی باتیں کیے جا رہی ہو انوسہ۔'' میں نے پیچ و تاب کھاتے ہوئے کہا۔

اتنا کہہ کر میں اس کی جانب بڑھا لیکن اگلا منظر دیکھ کر میرے پیروں تلے زمین سرک گئی۔ انوسہ نے یکبارگی باہر کی طرف چھلانگ لگا دی اور کسی چھلاوے کی طرح باہر کی راہداری کی طرف دوڑنا شروع کر دیا۔ میرے حواس باختہ ہو چکے تھے۔ میں نے بھی سرعت سے اس کے پیچھے دوڑنا شروع کر دیا۔ میں انوسہ کو آوازیں بھی دے رہا تھا اور اس کے پیچھے بھی بھاگا جا رہا تھا لیکن انوسہ کی رفتار ناقابل یقین حد تک تیز تھی۔

اس کا رخ اس عمارت کی طرف تھا۔ جسے میں نے اپنے ہاتھوں سے سپرد آتش کیا تھا۔ جس کی دیواریں بھی اب کالے رنگ کی ہو چکی تھیں۔ مجھے کافی حیرت ہوئی کہ انوسہ اس عمارت کی طرف کیوں دوڑے جا رہی ہے۔ میری لاکھ سعی کے باوجود بھی وہ دوڑتی ہوئی اس عمارت کے اندر گھس گئی۔ میری چھٹی حس مجھے خبردار کر رہی تھی کہ دال میں ضرور کچھ کالا ہے۔ انوسہ کی بے رخی، مجھ سے دور ہو کر چلنا اور پھر یکبارگی دوڑ لگا کر اس عمارت میں آ کر گھس جانا۔ یہ سب باتیں میری سمجھ سے بالاتر تھیں۔ میں کوئی بھی فیصلہ نہیں کر پا رہا۔

انوسہ کی زندگی کا مسئلہ تھا۔ میں جانتا تھا کہ یہ سب اسی مخلوق کا کیا کرتا ہے۔ گویا ابھی تک وہ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئے تھے۔ اگر میں ایک سیکنڈ بھی مزید ضائع کروں تو کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ مجھے اپنی جان کی کوئی چنتا نہیں تھی۔ لیکن انوسہ میرے لیے بہت اہم تھی۔ کوئی

اس کا بال بھی بیکا کرے میں یہ برداشت نہیں کرسکتا تھا۔

میں سرعت سے اس عمارت میں داخل ہوا۔ کئی دنوں کے بعد میں اس عمارت میں داخل ہوا تھا۔ دیواریں کالی ہوچکی تھیں۔ جس کی وجہ سے عمارت کے کمروں اور راہداریوں کے اندھیرے میں مزید اضافہ ہوگیا تھا۔ اندر داخل ہوتے ساتھ ہی ایک ناگوار بو نے میرا خیر مقدم کیا۔ میں جانتا تھا کہ یہ جلن کی بو ابھی تک اس عمارت کے در و دیوار سے آرہی تھی۔

”انوسہ۔“ میں نے ادھر ادھر نگاہیں دوڑاتے ہوئے انوسہ کو آواز دی۔

”انوسہ یہ کیا مذاق ہے۔ سامنے آؤ۔ دیکھو اس وقت یہ کوئی مذاق کا وقت نہیں ہے۔ رات کافی ہوتی جارہی ہے۔ شانزیب صاحب اور باقی لوگ بھی ہماری وجہ سے خواہ مخواہ پریشان ہورہے ہوں گے۔“

میری کسی بات کا کوئی جواب نہیں ملا تھا۔ چاندنی رات ہونے کی وجہ سے چاند کی چاندنی اس عمارت کے کچھ حصے پر پھیلی ہوئی تھی۔ جس کی وجہ سے اندر بھی اتنی کچھ چاندنی تھی کہ میں راستے کا تعین ٹھیک سے کررہا تھا۔ یوں محسوس ہورہا تھا جیسے میرے علاوہ کوئی بھی اس عمارت میں موجود نہ ہو۔ اپنے دل کی دھڑکنوں کی بازگشت میں واضح طور پر سن رہا تھا۔ حقیقت تو یہ تھی کہ اتنے دنوں کے بعد اس عمارت میں داخل ہونے کے بعد میں پوری طرح سے خوف کی لپیٹ میں آچکا تھا۔

خوف نے میرے پورے شریر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ میرا پورا شریر وائبریٹ کررہا تھا۔ یہی نہیں میرا پورا شریر پسینے میں شرابور ہوچکا تھا۔ کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی کہ کروں تو کیا کروں۔ کیسا گھناؤنا مذاق انوسہ کررہی تھی۔

ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ کہیں سے سانس تک لینے کی آواز نہیں آرہی تھی کہ میں اندازہ لگا سکتا کہ انوسہ کس کونے کھدرے میں آکر چھپی ہے۔

”انوسہ پلیز میرے سامنے آؤ۔ دیکھو میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔ نہ ہی تمہارا ہاتھ پکڑنے کی ضد کروں گا۔ دیکھو پلیز سامنے آؤ۔“

میں نے ایک بار پھر بلند آواز میں کہا لیکن وہی سکوت میرا منہ چڑا رہا تھا۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی۔ مزید آگے بڑھنا بھی خطرے سے خالی نہ تھا۔ میں ایک دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا ہوگیا۔ میرے اندر بے چینی کا سمندر موجزن تھا۔ انوسہ ضرور کسی عجیب و غریب حادثے کا شکار تھی۔ وہ اس وقت اپنے آپ میں نہیں تھی۔ میں یاد کرنے لگا کہ اس سے پہلے میں نے کب اس کی یہ کیفیت دیکھی ہے۔ لیکن ایسا کوئی بھی دن میری یادداشت میں نہیں تھا۔ نہ ہی اس سے پہلے اس نے کبھی ایسا گھناؤنا مذاق کیا تھا۔

پہلی بار میں نے اس میں یہ تبدیلیاں دیکھی تھی۔ ایک ساتھ ہی کئی آدمیوں کا کھانا ہڑپ کرجانا۔ اور پھر یکبارگی اس عمارت کی طرف اتنی سپیڈ سے دوڑنا۔ یہ سب ناقابل یقین کیفیات تھیں۔ جن کے بارے میں کوئی بھی اندازہ لگانا بے کار تھا۔ انوسہ عمارت کے اندر داخل ہوکر کہاں غائب ہوگئی تھی۔ میری سمجھ سے بالاتر تھا۔ کافی دیر تک میں انوسہ کو آوازیں دیتا رہا لیکن کوئی جواب نہ ملا۔

میں دبے قدموں واپس چل پڑا۔ دروازے پر پہنچ کر ایک بار پھر انوسہ کو آواز دی لیکن اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے تہیہ کرلیا کہ میں جاکر شانزیب صاحب کو اس سارے واقعے کے بارے میں انفارم کرتا ہوں۔ اور ان سے اس سلسلے میں کوئی مدد مانگتا ہوں۔ مجھے پتہ تھا کہ وہ اس وقت ٹی وی لاؤنج میں براجمان ہوں گے۔ میں حویلی کے اندر داخل ہوا تو ٹی وی لاؤنج خالی پڑا تھا۔ گویا شانزیب صاحب اپنے کمرے میں چلے گئے تھے۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی کہ کروں تو کیا کروں۔

پہلے میں نے سوچا کہ الطاف کے پاس جاؤں اور اسے ساری بات سے آگاہ کروں۔ پھر اس کے ساتھ مل کر ایک بار پھر انوسہ کو اس حویلی میں تلاش کروں۔ تبھی میرے ذہن میں خیال آیا کہ ایک بار پھر انوسہ کے روم میں جاکر دیکھ آؤں کہ اس کی شکی

القلب خالہ سو رہی ہے یا جاگ رہی ہے۔ اگر تو وہ جاگ رہی ہے تو جلد ہی اس نے کوئی نہ کوئی واویلا مچا دینا ہے۔ اگر سو گئی ہے تو پھر کوئی حل تلاش کرتا ہوں۔

میں دبے قدموں انوسہ کے کمرے کی طرف چل پڑا۔

میرا دل بری طرح سے دھڑک رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے دروازہ کھولتے ساتھ ہی انوسہ کی مہمان خالہ مجھ پر ہلہ بول دے گی۔ مجھے اپنی بدنامی مترشح دکھائی دے رہی تھی۔ میں انوسہ کے کمرے کے سامنے پہنچ چکا تھا۔ کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ میں دروازہ کھولوں یا نہ کھولوں۔ بالآخر تمام تر ہمت کو یکجا کرکے میں نے دروازہ کھولا اور اگلا منظر دیکھتے ساتھ ہی میری اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی سانس نیچے اٹک کر رہ گئی۔ مجھے اپنی قوت بینائی پر وشواس نہیں ہورہا تھا۔

انوسہ اپنے بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ وہ گہری نیند سو رہی تھی۔ اس کی خالہ بھی شاید نیم خوابیدہ تھی۔ میرے قدموں کی چاپ اور دروازہ کھلنے کی آواز پر دونوں میں سے کسی نے بھی آنکھ نہیں کھولی تھی۔ میں تھوڑی دیر تک وہاں رک کر سانسیں بحال کرتا رہا۔ میں دبے قدموں انوسہ کے کمرے سے نکل کر اپنے کمرے میں آیا۔ دروازے کو چٹخنی لگا کر میں تقریباً بیڈ پر ڈھے سا گیا۔ میرے سوچنے سمجھنے کی تمام تر صلاحیتیں مفقود پڑ چکی تھیں۔

تھوڑی ہی دیر کے اندر کیسے عجیب سے واقعات رونما ہوگئے تھے۔ میں نے پل بھر کے لیے آنکھیں بند کیں اور گزشتہ واقعات کے بارے میں سوچا تو حیران و ششدر رہ گیا کہ کچھ ہی لمحات میں کیسے کیسے واقعات سے نبرد آزما ہوچکا ہوں۔ انوسہ کی کیفیت، اس کا بھیڑیوں کی طرح کھانے پر ٹوٹ پڑنا، عمارت کی طرف دوڑنا اور غائب ہوجانا، پھر اپنے بستر پر ملنا۔

ان سب کے بارے میں سوچ سوچ کر میرا تو دماغ پھٹا جارہا تھا۔ میں اچھی طرح سے جانتا تھا کہ میں جتنی دیر اس عمارت میں رہا تھا۔ میں نے انوسہ کو اس عمارت سے باہر نکلتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ تو پھر یکبارگی وہ اپنے کمرے میں کیسے پہنچ گئی؟

کتنے ہی سوالیہ نشان میری آنکھوں کے سامنے لہرا رہے تھے۔ میرے پاس میرے کسی سوال کا جواب نہیں تھا۔ لیکن پھر بھی میں نے شکر کیا کہ وہ اپنے کمرے میں واپس آگئی ہے۔ ورنہ آج کی رات میرے لیے کسی قیامت سے کم نہ ہوتی۔ خاص کر شانزیب صاحب تو میری جان ہی لے لیتے۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی۔ یقیناً یہ سب کچھ ان پراسرار قوتوں کا کیا دھرا تھا۔ جن کو میرے ہاتھوں کافی نقصان پہنچ چکا تھا۔

یہ پہلی دفعہ ہوا تھا کہ انہوں نے میرے علاوہ کسی اور پر حملہ کیا تھا۔ ان کا اصل شکار تو ویسے ہی انوسہ ہی تھی۔ اب وہ کھلم کھلا اسی پر اپنے وار کرنے شروع ہوگئے تھے۔ لیکن میں نے تہیہ کرلیا تھا کہ انوسہ کو کچھ نہیں ہونے دوں گا۔ لازمی نہیں تھا کہ میں انوسہ سے محبت کرتا تھا۔ اس لیے اس کا محافظ بنا ہوا تھا۔ بلکہ ان لوگوں نے اس وقت مجھے سہارہ دیا تھا۔ جب مجھ سے ہر سہارہ چھن چکا تھا۔ اور میں مجبور ہوکر اپنی زندگی کا خاتمہ کرنے کا مصمم ارادہ کیے ہوئے تھا۔

یوں لگ رہا تھا جیسے وقت رک گیا ہو۔ کروٹیں بدل بدل کر بھی میں تو تھک چکا تھا۔ نیند تھی کہ آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ ایک ایک منٹ دشوار لگ رہا تھا۔ بار بار دل کررہا تھا کہ اٹھ کے دوبارہ جاؤں اور انوسہ کے کمرے میں دیکھوں کہ وہ ابھی تک وہیں سوئی ہوئی ہے کہ نہیں۔ لیکن میں جانتا تھا کہ میری اس حرکت کو کس انداز سے دیکھا جائے گا۔ رات کے اس پہر یہ فعل ویسے بھی زیب نہیں دیتا تھا۔

اللہ اللہ کرکے آذانیں شروع ہوئیں۔ اور میں اس خالق کے حضور سجدہ ریز ہوگیا۔ پہلے کچھ دنوں سے میں متواتر اس خالق کے حضور سجدہ ریزی کرنے لگ گیا تھا۔ میں جان چکا تھا کہ سوائے اللہ تعالیٰ کی مدد کے میں کوئی بھی کام نہیں کرسکتا۔ وہی میرا اللہ ہی میرے لیے سبب پیدا فرما رہا ہے۔ میں نے نماز فجر کے بعد اپنے کمرے میں ہی تلاوت کلام پاک کی اور کمرے

سے باہر نکل آیا۔

دن کا اجالا پھیلنا شروع ہوگیا تھا۔ میں انوسہ کے کمرے کی طرف جانا چاہتا تھا لیکن مجھے کاشف دکھائی دیا۔ جو اپنے کمرے کے باہر کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ وہ کسی گہری سوچ میں مبتلا تھا۔ اس کی نگاہیں بار بار اس کھنڈر عمارت کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ جہاں رات میں انوسہ کی تلاش میں گیا تھا۔ اس کا پرتشویش لہجہ میری آنکھوں کے سامنے تھا۔ تھوڑی دیر تک میں کمرے کے سامنے کھڑا جالی دار دروازے میں سے اسے گھورتا رہا۔ پھر میں نے فیصلہ کیا کہ انوسہ کے کمرے کی طرف جانے کی بجائے مجھے پہلے الطاف کے پاس جانا چاہیے۔

میں راہداری عبور کرکے مین انٹرنس سے باہر نکلا تو الطاف کی سوالیہ نگاہیں مجھ پر مرکوز ہوگئیں۔ وہ ٹکٹکی باندھے مجھے دیکھے جارہا تھا۔ اس کے اس طرح دیکھنے پر میں حیران و ششدر رہ گیا۔

"کیا بات ہے الطاف؟" میں الطاف کے قریب جاکر بولا تو اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ لیکن منہ سے کچھ نہ بولا۔

"خیریت تو ہے ناں۔ تم ٹھیک تو ہو ناں؟"

"عفان۔" کاشف نے عجیب سے انداز میں مجھے گھورتے ہوئے مخاطب کیا تو میں ہمہ تن گوش ہوگیا۔

"رات آپ کو کیا ہوا تھا۔ جب یکبارگی آپ دوڑتے ہوئے راہداری پھلانگ کر باہر آئے اور دوسرے ہی لمحے اس کھنڈر عمارت (بائیں ہاتھ سے عمارت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) کے اندر گھس گئے۔ آپ بار بار انوسہ میڈم کو آوازیں دے رہے تھے؟"

الطاف کے سوال نے میرے حواس باختہ کرکے رکھ دیئے۔ گویا اس نے مجھے اس حویلی کے اندر جاتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ کاشف کی بات سن کر میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ پھر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر سرگوشیانہ انداز میں اس سے مخاطب ہوا:

"اندر آؤ۔"

اتنا کہہ کر میں اس کے کمرے میں داخل ہوگیا۔ الطاف بھی میرے پیچھے ہی کمرے میں آگیا۔ ہم دونوں آمنے سامنے صوفے پر بیٹھ گئے۔ الطاف کی سوالیہ نگاہیں متواتر مجھ پر ہی ٹکی ہوئی تھیں۔ میں جانتا تھا کہ وہ مجھ سے کئی سوال کرنا چاہتا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ سوالوں کی بوچھاڑ کرے مجھے اسے ڈیٹیل سے سب کچھ بتادینا چاہیے۔ ویسے بھی پہلے کون سا کوئی بات اس سے مخفی ہے۔ میں نے الطاف کو ساری بات تفصیل کے ساتھ بتائی۔ تو اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

"عفان اس کا مطلب ہے کہ انہوں نے اب انوسہ میڈم پر بھی وار کرنا شروع کردیا ہے؟" الطاف نے حیرت کے سمندر میں غوطہ زن ہوکر پوچھا۔

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" میں نے الطاف کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔

"حالات کشیدگی اختیار کرتے جارہے ہیں۔ اگر یہ سلسلہ ایک بار پھر سے شروع ہوگیا تو بہت مسئلہ بن جائے گا۔ یہ سلسلہ میری ذات تک محدود رہے تو بہتر تھا۔ لیکن اب یہ سلسلہ آگے بڑھ رہا ہے۔ اور میں نہیں چاہتا کہ عفریتیں میرے علاوہ کسی کو بھی ایذا پہنچائیں۔"

"اب تو وہ خالق ہی کوئی وسیلہ پیدا کرسکتا ہے۔" الطاف نے بے چارگی کے عالم میں کہا۔

میں اس کی بات کا مطلب سمجھ چکا تھا۔ وہ باتوں باتوں میں مجھے مولوی ندیم کی کمی کا احساس دلا رہا تھا۔ مولوی ندیم صاحب واقعی ہمارے لیے بہت بڑا سہارا بن کر سامنے آئے تھے۔

"میں ٹھہر کے چکر لگاتا ہوں الطاف۔" میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

"کچھ ٹائم مہمانوں کو دینا چاہتا ہوں۔"

"بہت بہتر۔" الطاف نے مختصر سا جواب دیا۔

میں الطاف کے کمرے سے نکل کر سیدھا انوسہ کے کمرے کی طرف چل پڑا۔ میں نے انوسہ کے کمرے کے سامنے جاکر اپنی تمام تر ہمت کو یکجا کیا۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ انوسہ کے کمرے میں موجود مہمان

عورت مجھے ایک بار پھر نہ صرف شکی نگاہوں سے دیکھے گی بلکہ سوالات کی بوچھار کردے گی۔ میں نے دروازے کو تھوڑا سا زور لگایا۔ دروازہ کھلتا چلا گیا۔ میں اندر داخل ہوا تو یہ دیکھ کر مضطرب ہوگیا کہ کمرے میں صرف مہمان عورت موجود تھی لیکن انوسہ نہیں تھی۔ مجھے کمرے میں داخل ہوتا دیکھ کر وہ عورت فوراً بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

"اچھا ہوا تم آئے۔" اس عورت نے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"انوسہ تمہارے ساتھ ہی ہے کیا؟"

"نہیں تو۔" میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ "کیوں کیا ہوا؟"

"میں کافی دیر سے جاگ رہی ہوں لیکن انوسہ کمرے میں موجود نہیں ہے۔" اس عورت نے بتانا شروع کیا۔

"میں سمجھی کہ شاید واش روم میں گئی ہو۔ میں نے دروازہ کھٹکھٹایا اور آواز دی لیکن کوئی جواب نہ آیا۔ دروازہ کھلا تھا۔ اندر دیکھا تو اندر کوئی نہیں تھا۔ میں سوچ رہی تھی کہ باہر جاکر دیکھوں کہ کہاں ہے تو تم آگئے۔"

"میں نے تو اسے کہیں نہیں دیکھا۔" میں نے کہا۔

"بہرحال آپ فکر مت کریں میں ابھی پتہ کرکے آتا ہوں۔ ممکن ہے وہ شانزیب انکل کے کمرے میں ہو۔"

میں فوراً ہی انوسہ کے کمرے سے باہر نکل آیا۔ میں شانزیب صاحب کے کمرے کی طرف بڑھا اور دروازے پر دھیمی سی دستک دی لیکن اندر سے کوئی جواب نہ ملا۔ جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ شانزیب صاحب ابھی تک سو رہے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ انوسہ شانزیب صاحب کے کمرے کی طرف بھی نہیں آئی تھی۔ اگر وہ یہاں بھی نہیں آئی اور اپنے کمرے میں بھی نہیں ہے تو کہاں جاسکتی ہے۔ ایک ایک کرکے میں نے سارے کمرے دیکھ مارے لیکن بے سود۔ میری چھٹی حس ایک بار پھر مجھے انجانے خطرے سے آگاہ کررہی تھی۔

میرے قدم سرعت سے مین انٹرنس کی طرف بڑھے اور میں باہر نکل آیا۔ میرا رخ کاشف کے کمرے کی طرف تھا۔ جب میں کاشف کے کمرے میں داخل ہوا تو اس وقت کاشف اپنا ڈریس پریس کررہا تھا۔ مجھے یکبارگی کمرے میں داخل ہوکر اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔

"خیریت تو ہے ناں عفان؟" الطاف نے پوچھا۔

"کیا تم نے انوسہ کو دیکھا ہے؟" میں نے فوراً پوچھا۔

"انوسہ میڈم کو...... نہیں تو۔" الطاف نے حیرت سے جواب دیا۔

"اوہ شٹ۔" میں غصے سے پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔

میں فوراً الطاف کے روم سے باہر نکلا تو الطاف بھی میرے پیچھے سرعت سے باہر نکلا۔ میں نے اسے روکا نہیں۔ ہم دونوں تقریباً دوڑتے ہوئے اس کھنڈر عمارت کی طرف بڑھے اور فوراً ہی سامنے والے حصے سے اندر داخل ہوگئے۔ اندر قدم رکھتے ساتھ ہی میں نے ایک بار پھر بلند آواز سے انوسہ کو آواز دی۔

"انوسہ یہ کیا شرارت ہے۔ کہاں ہو تم؟ سامنے آؤ پلیز۔"

لیکن میری آواز اس حویلی کے درو دیوار سے ٹکرا کر واپس آگئی۔ وہ پراسرار شہر خموشاں کا سا سکوت ہر طرف طاری تھا۔ میں نے سرعت سے ادھر ادھر دوڑنا شروع کردیا۔ ایک ایک کمرہ ہم دونوں چیک کررہے تھے۔ میں نے ایک کمرے کا دروازہ کھولا تو مجھے احساس ہوا جیسے کوئی اندر ہے۔ اندھیرے کی وجہ سے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

"انوسہ کیا تم یہاں ہو؟" میں نے آہستہ سے پوچھا۔

"میاؤں...... میاؤں۔"

یکبارگی میری سماعت سے کسی بلی کی میاؤں میاؤں کی بازگشت ٹکرائی۔ وہ سفید رنگ کی ایک بلی تھی۔ جو ایک طرف کونے میں کھڑی مجھے کھا جانے والی

آنکھوں سے گھور رہی تھی۔ دوسرے ہی لمحے وہ سرعت سے میری طرف دوڑی۔ مجھے اپنے جسم میں خون کی گردش رکتی ہوئی محسوس ہوئی لیکن وہ میری ٹانگوں کے درمیان سے گزر کر باہر بھاگ گئی۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔

میں نے اپنی بے ترتیب سانسوں کی روانی پر قابو پانا شروع کیا۔ ایک بار پھر میں نے انوسہ کو آوازیں دینی شروع کردیں۔ الطاف میری سماعت سے کاشف کی بازگشت ٹکرائی۔

''عفان......عفان۔''

الطاف کی آواز سنتے ہی میں سرعت سے اس طرف بھاگا جدھر سے آواز آئی تھی۔ میں جیسے ہی اس طرف آیا جس طرف سے الطاف کی آواز سنائی دی تھی۔ تو اگلا منظر دیکھ کر میری حیرت ہویدا رہ گئی تھی۔ الطاف کی حالت مرغ بسمل کی سی ہوچلی تھی۔ اس کی گردن ٹیڑھی ہورہی تھی۔ اس کا ایک پاؤں اوپر کی طرف اٹھا ہوا تھا۔

یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی اس کی گردن کو بانہوں میں بھر کر اسے گرانے کی کوشش کررہا ہو۔ تبھی الطاف کا جسم فضا میں یکدم اٹھا اور تقریباً چار پانچ فٹ اوپر اٹھ کر پیچھے والی دیوار سے جا ٹکرایا۔ الطاف کے منہ سے ایک دلدوز چیخ برآمد ہوئی۔ الطاف کے منہ سے خون شروع ہوچکا تھا۔ میں سرعت سے الطاف کی طرف بڑھا اور اسے سہارہ دے کر اٹھایا۔

میں نے جیسے ہی الطاف کو کھڑا کیا۔ یوں لگا جیسے کسی نے زبردست گھونسہ الطاف کے منہ پر مارا تھا۔ ایک بار پھر ایک چیخ مار کر الطاف زمین پر جا گرا۔ میں نے فضا میں ہی ہاتھ پاؤں چلانے شروع کردیئے۔ غم وغصے کی زیادتی کے باعث میری سانسیں پھول چکی تھیں۔

''سامنے آ۔'' میں غصے سے پیچ وتاب کھا کر چلایا۔

''ہمت ہے تو سامنے آکر لڑ۔ نامردوں کی طرح چھپ کر وار کرنے سے بہادری کا کوئی تمغہ نہیں ملنے والا تمہیں۔''

مجھے یوں لگا جیسے کوئی سپیڈ کے ساتھ میرے پاس سے گزرا ہو۔ الطاف ایک طاقتور انسان تھا۔ اس کے ساتھ اتنا کچھ ہونے کے بعد بھی اس نے ہمت نہیں ہاری تھی۔ اس کے منہ سے متواتر خون نکل رہا تھا۔ جو شاید ان دیکھے گھونسوں کی وجہ سے تھا۔ وہ بھی ہمت کرکے کھڑا ہوگیا۔

''یہ جو بھی ہے نامرد ہی ہے۔'' الطاف اپنے پیروں پر کھڑا ہو کر بولا تو میں اس کی طرف متوجہ ہوا۔

الطاف ہاتھ کے کف سے اپنے منہ سے نکلنے والا خون صاف کررہا تھا۔ میں نے جینز کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ ایک ملفوف شدہ ٹشو ہاتھ آیا میں نے وہ الطاف کی طرف بڑھایا اور کاشف نے اس سے منہ صاف کرنا شروع کردیا۔

اس کے بعد ہمارے ساتھ کوئی خاص واقعہ پیش نہ آیا۔ میں الطاف کو سہارہ دے کر اس کے کمرے تک آیا۔ یہ تو شکر تھا کہ کسی نے ہمیں دیکھا نہیں تھا۔ الطاف کمرے میں پہنچتے ساتھ ہی صوفے پر تقریباً ڈھے سا گیا۔ وہ گہری گہری سانسیں لے رہا تھا۔ میں نے اس کے کمرے میں رکھا فرسٹ ایڈ کا سامان اٹھایا۔ اور اس کے منہ کو صاف کیا۔ اس کی حالت پہلے سے قدرے بہتر ہوچکی تھی۔ خون رک چکا تھا۔ لیکن منہ کے اندر کچھ زخم ہوگئے تھے۔ میں نے ان زخموں پر سپرٹ لگا کر انہیں صاف کیا تو الطاف نے درد کی شدت کو برداشت کرتے ہوئے آنکھیں بھینچ لیں۔

''اب کیسا محسوس کررہے ہو الطاف؟'' میں نے الطاف سے پوچھا۔

''پہلے سے بہتر محسوس کررہا ہوں۔ تم من فکر ہوجاؤ۔'' الطاف نے آہستہ سے لہجے میں کہا۔

''شکر کرو ہمیں ابھی تک کسی نے دیکھا نہیں۔'' میں نے فرسٹ ایڈ کا سامان ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔

''تم جاؤ۔'' الطاف نے مجھے مخاطب کرکے کہا۔

''انوسہ میڈم شاید خطرے سے دوچار ہیں۔ انہیں بہر صورت وہاں سے نکال لائیے۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی انہونی......''

الطاف کے فقرہ مکمل کرنے سے قبل ہی میں نے اس کے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے چپ کروادیا۔

''تم آرام کرو میں جلد ہی آکر تمہیں نوید سناتا ہوں۔'' میں نے کہا اور الطاف کے کمرے سے باہر نکل آیا۔

میں چلتے چلتے یکدم رک گیا۔ میرے ذہن میں رات والے واقعات گردش کرنے لگے۔ رات بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔ اور جب میں حویلی سے تھک ہار کر انوسہ کے کمرے میں گیا تو انوسہ اپنے کمرے میں من فکر سو رہی تھی۔ اس لیے مجھے بجائے حویلی میں جانے کے پہلے انوسہ کے کمرے میں جا کر پتہ کرنا چاہیے کہ وہ ابھی تک کمرے میں پہنچی ہے کہ نہیں۔

اس خیال کے ذہن میں آتے ہی میں مین انٹرس کی طرف چل پڑا۔ میں نے ابھی راہداری میں قدم رکھا ہی تھا کہ دو ملازم دکھائی دیئے۔ دونوں کے چہروں پر سے ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ ان کی حالت قابل رحم تھی۔ انہیں دیکھ کر میں حیرت زدہ رہ گیا۔ عین اسی وقت ان کے پیچھے شانزیب صاحب اور مہمان عورت جو انوسہ کے کمرے میں سوئی تھی۔ دونوں دکھائی دیئے۔ اس عورت کی آنکھوں سے چھن چھن اتھرو برس رہے تھے۔

''میری بچی کہاں ہے؟'' خالہ نے میرے قریب آکر روتے ہوئے پوچھا۔

''میں تو سمجھا کہ وہ اندر ہی ہوگی۔'' میں نے لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے جواب دیا تو وہ عورت شانزیب صاحب کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''ہمت سے کام لیجئے کچھ نہیں ہوگا ہماری بچی کو۔'' شانزیب صاحب نے اس کی ڈھارس بندھاتے ہوئے کہا۔

''اس نے کہاں جانا ہے۔ یہیں کہیں آس پاس ہی ہوگی۔ بس آتی ہی ہوگی۔''

عین اسی وقت ملازم اختر دوڑتا ہوا ہمارے پاس آیا۔

''صاحب جی بی بی صاحبہ کمرے میں ہیں۔''

اختر کی بات سن کر تقریباً ہم سب دوڑتے ہوئے اس کمرے کی طرف لپکے جس کی طرف وہ اشارہ کررہا تھا۔ اختر کا اشارہ میرے کمرے کی طرف تھا۔ میرے پیروں تلے زمین سرک گئی۔ اس مہمان عورت اور شانزیب صاحب نے سوالیہ نگاہوں سے مجھے گھورا۔ لیکن میں ان کی کسی بات کا کیا جواب دیتا۔ میں تو خود انوسہ کو تلاش کرتا پھر رہا تھا۔ اور انوسہ یہاں میرے کمرے میں......میرے خدا رحم فرما۔

انوسہ پریشان سی میرے پلنگ پر براجمان تھی۔ اس نے کسی قدر خوف بھری نگاہوں سے ہماری طرف دیکھا۔ خالہ تو دوڑ کر اس سے لپٹ گئی۔ اور ایک ساتھ اس کا منہ ماتھا چومنا شروع کردیا۔

''یہاں کیا کررہی ہو؟'' شانزیب صاحب نے پہلی بار انوسہ کو مخاطب کیا تو اس نے شانزیب صاحب کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھا۔

''یہاں کیوں آئی ہو میری بچی۔ جانتی ہو ہم لوگ کس وقت سے تمہیں تلاش کررہے ہیں۔''

انوسہ نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن بول نہ سکی۔ میں تھوڑے فاصلے پر کھڑا مبہوت زدہ حالت میں اسے دیکھ رہا تھا۔ مجھے فوراً احساس ہوگیا کہ انوسہ اس وقت ٹھیک ہے۔ وہ پہلے جیسے کیفیت سے دوچار نہیں ہے۔

نہ تو اب بدبو آرہی تھی اور نہ ہی انوسہ کے چہرے پر وہ عجیب وغریب کیفیت طاری تھی۔ جس کی وجہ سے انوسہ میں ہونے والی تبدیلیوں کو سب نے محسوس کیا تھا۔

''انوسہ یہاں تمہارے کمرے میں ہے اور ہم لوگ اسے پورے گھر میں ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔'' شانزیب صاحب نے قدرے ناگواری سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا تو میں ان کی بات سن کر انگشت بدنداں رہ گیا۔

''اگر وہ تمہارے ساتھ تھی تو بتا دیتے۔ تم جانتے ہو ناں کہ میری جان انوسہ کے اندر ہے۔ اگر اسے کچھ ہوگیا تو میں جیتے جی مرجاؤں گا۔''

شانزیب صاحب کے لہجے نے مجھے پریشان کرکے رکھ دیا تھا۔ لیکن یہ تو حقیقت تھی کہ میں خود بھی اس

بات سے آشنا نہ تھا کہ انوسہ میرے کمرے میں ہے۔

''انکل میں تو خود نہیں جانتا تھا کہ انوسہ میرے کمرے ہے۔'' میں نے لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے جواب دیا۔

''پتہ نہیں کب اور کس وقت وہ میرے کمرے میں آئی ہے۔ میں تو خود اس بات سے آشنا نہیں ہوں۔''

شانزیب صاحب نے پہلی بار مجھے مشکوک نگاہوں سے دیکھا اور کمرے سے تیزی سے نکل گئے۔ ان کے دیکھنے کا انداز مجھے بالکل بھی اچھا نہ لگا تھا۔ وہ جو کچھ بھی سوچ رہے تھے۔ اپنی جگہ بجا تھا۔ انوسہ کا میرے کمرے سے ملنا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ لیکن یہ بھی تو حقیقت تھی کہ مجھے اس بارے میں کوئی علم نہ تھا۔

میں بھی بنا سوچے سمجھے شانزیب صاحب کے پیچھے کمرے سے باہر نکل گیا۔ ہم دونوں یکے بعد دیگرے انوسہ کے کمرے میں داخل ہوئے۔ وہ مہمان عورت انوسہ کو پانی پلا رہی تھی۔ انوسہ شانزیب صاحب کو دیکھتے ساتھ ہی ان سے آ کر لپٹ گئی تھی۔ اس نے زاروقطار رونا شروع کر دیا۔

''کیا ہوا ہے بیٹا؟'' شانزیب صاحب نے اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

''ہمت کرو بتاؤ مجھے کیا ہوا ہے؟''

''مجھے کچھ نہیں پتہ ابو۔'' انوسہ نے روتے ہوئے لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے جواب دیا۔

''کل سے میں اپنے کندھوں پر بس ایک عجیب سا بوجھ محسوس کر رہی ہوں۔ کل سے مجھے کوئی بات یاد نہیں ہے۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں غنودگی کے عالم میں ہوں۔''

''لیکن یہ سب کچھ ہوا کیسے؟'' مہمان عورت نے استفسار کیا۔

''مجھے اتنا یاد ہے کہ کل میں باہر کیاری سے پھول توڑ رہی تھی کہ اچانک سارے پھول میرے ہاتھوں سے گر گئے اور اس کے بعد مجھے کچھ یاد نہ رہا۔'' انوسہ نے بتایا۔

''مجھے کیا ہوا تھا ابو۔ کیا میری طبیعت زیادہ خراب ہو گئی تھی جو آپ لوگ اس طرح پریشان ہوئے جا رہے ہیں؟''

انوسہ کا سوالیہ چہرہ شانزیب کی طرف تھا۔ مجھے کچھ سکون ملا کہ چلو انوسہ کی باتوں سے شانزیب صاحب کے دل میں میرے لیے پیدا ہونے والے شک میں کچھ تو کمی واقع ہوئی ہوگی۔

''نہیں بیٹا بس تمہیں تھوڑا بخار کی شکایت ہوئی تھی۔'' شانزیب صاحب نے جھوٹ بولتے ہوئے اس کی ڈھارس بندھائی۔

''تم ایسا کرو بیٹا آرام کرو۔ تاکہ تھکاوٹ ختم ہو جائے۔ نہ سو سکنے کی وجہ سے تمہاری آنکھیں بھی سرخ ہو چکی ہیں۔ میں ابھی ڈاکٹر صاحب کو فون کرتا ہوں۔ وہ جلد ہی آ کر تمہیں چیک کریں گے۔''

شانزیب صاحب اتنا کہہ کر کمرے سے باہر نکلے لیکن دروازے تک جا کر رک گئے اور پھر میری طرف متوجہ ہوئے۔

''برخوردار بات سنو ذرا۔'' شانزیب انکل آہستہ سے بولے اور دھیرے دھیرے چلنا شروع کر دیا۔ میں ان کی بات سن کر لپک کر ان کے ساتھ ہو لیا۔

''مجھے انوسہ بہت پیاری ہے۔''

چلتے چلتے وہ گویا ہوئے۔ میں ان کی طرف ہمہ تن گوش ہو گیا لیکن منہ سے کچھ نہ بولا۔

''بیٹی کی یکبارگی گم ہونے کی وجہ سے میں بہت زیادہ پریشان ہو گیا تھا۔ اس لیے کبھی سنی کے لیے معافی چاہتا ہوں۔''

شانزیب انکل چلتے چلتے یکبارگی رک گئے۔

''انکل آپ شرمندہ کر رہے ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''بات شرمندہ کرنے کی نہیں ہے برخوردار۔'' شانزیب انکل نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولے۔

''بات اصول کی ہے اور اصول یہی ہے کہ جذبات میں آ کر میں نے نہ صرف ایک غلطی کی ہے۔

بلکہ تمہارے ساتھ اونچے بول بولے ہیں۔ جن کے تم حقدار نہ تھے۔ اس لیے تم سے معافی مانگنا میرا حق بنتا ہے۔''

''انکل میں آپ سے ناراض نہیں ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

''میں آپ کے احساسات و جذبات سے آشنا ہوں۔ انوسہ سے آپ کی محبت کی انتہا مجھ سے پنہاں نہیں ہے۔''

''یہ سب کچھ جانتے ہوئے دل میں کسی بھی قسم کی میل نہ رکھنا برخوردار۔ میں تمہیں اپنا بچہ سمجھتا ہوں اور بڑے کبھی غصے ہو لیں تو بات کو پس پشت ڈال دینا چاہیے۔'' شانزیب انکل مجھے سمجھاتے ہوئے بولے۔

''میں نے اس بات کو قطعی دل پر نہیں لیا۔'' میں نے زیرلب مسکرا کر کہا تو انہوں نے میرا کندھا تھپتھپایا۔

''اچھا اور سلجھا ہوا انسان ہر بات کو پرکھتا ہے۔ تم میں یہ ساری خوبیاں ہیں۔'' شانزیب انکل اتنا کہہ کر ٹی وی لاؤنج کی طرف بڑھ گئے کیونکہ انہوں نے ڈاکٹر کو فون کرنا تھا۔

میں کچھ پل وہیں کھڑا رہا پھر زیرلب مسکراتا ہوا الطاف کی اور چل پڑا۔ الطاف اپنے کمرے میں ہی موجود تھا۔ اس کی طبیعت پہلے سے کچھ بہتر ہو چکی تھی۔ میرے پہنچتے ساتھ ہی اس نے مجھ سے ناشتے کے بارے میں پوچھا میں ناشتہ کرنا تو نہیں چاہتا تھا لیکن جانتا تھا کہ اگر انکار کیا تو وہ بھی فقط چائے پر گزارا کرے گا۔ چائے اور دیگر لوازمات کا سامان اس کے پاس ہی شانزیب انکل نے رکھوا دیا تھا۔ بس ناشتہ اور کھانا وغیرہ اندر سے اس کے لیے بھی تیار ہو کر آتا تھا۔ شانزیب انکل نے کبھی کاشف کے ساتھ بھی بیگانوں والا سلوک نہیں کیا تھا۔ وہ اسے بھی میرے جتنی ہی ترجیح دیتے تھے۔ شانزیب انکل کا لہجہ بہت دل موہ لینے والا تھا۔

الطاف نے اپنے ناشتے کے ساتھ میرا ناشتہ بھی منگوا لیا تھا۔ شاید اسے معلوم تھا کہ میں اندر آج مہمانوں کی موجودگی میں ناشتہ نہیں کروں گا۔ یا پھر اندر ہونے والے حالات سے اسے خبر تھی۔ بہرحال ہم دونوں نے اکٹھے ناشتہ کیا اور ناشتے کے فوراً بعد ہی الطاف نے چائے تیار کر دی۔

''عفان کیا بات ہے؟'' الطاف نے چائے کے کپ میز پر سجاتے ہوئے مجھے مخاطب کیا۔

''آج آپ کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی ہیں۔ کوئی خاص بات ہے کیا؟''

میں نے ایک نظر الطاف کی طرف دیکھا اور پھر پھیکی سی مسکراہٹ نہ چاہتے ہوئے بھی میرے لبوں پر پھیل گئی۔

''بس یار کیا بتاؤں۔'' میں نے ایک لمبی سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔

الطاف تب تک میرے ساتھ والے صوفے پر بیٹھ چکا تھا۔ اس نے چائے کا کپ اٹھایا اور چسکی بھر کر دوبارہ گویا ہوا: ''پھر کچھ تو بتائیں؟''

اس کے استفسار پر میں نے اسے ساری کہانی کہہ سنائی۔ جسے سن کر وہ حیرت زدہ رہ گیا۔

''اب بتاؤ میرے بھائی تمہارا کیا خیال ہے ان سب باتوں کے بارے میں؟'' اپنی بات مکمل کرنے کے بعد میں نے الطاف سے پوچھا۔

''عفان یار میں کیا کہہ سکتا ہوں۔'' الطاف نے خالی کپ ٹیبل پر رکھ کر کہا۔

الطاف چائے ختم بھی کر چکا تھا اور میرا کپ ویسے ہی پڑا تھا۔ میں نے بھی ہاتھ بڑھا کر اسے اٹھا لیا کیونکہ ٹھنڈی چائے کا کوئی مزہ نہیں رہتا۔

''لیکن عفان میں ایک بات کہنا چاہتا ہوں اگر تم مائنڈ نہ کرو تو؟''

الطاف کی بات سن کر میں نے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔ ''ہاں ہاں کہو بھلا اس میں مائنڈ کرنے والی کیا بات ہے؟''

''عفان تمہیں اس حویلی میں آگ نہیں لگانی چاہیے تھی۔'' الطاف نے کہا۔

''بس میں یہ سمجھ رہا ہوں کہ آگ لگانے کی وجہ

سے شایداس مخلوق کا کوئی نقصان ہوا ہے۔اوراب وہ باؤلے کتے کی طرح ہم لوگوں کے پیچھے پڑ چکے ہیں۔“

”ہاں شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن جس طرح انہوں نے میرا جینا دوبھر کر رکھا تھا۔اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی تو نہ تھا۔“میں نے الطاف سے کہا۔

”اب وہ لوگ بھوکی شیرنی کی طرح بپھر چکے ہیں۔“الطاف بولا۔

”دیکھا نہیں انہوں نے مجھ پر بھی اپنا غصہ اتار دیا۔صرف اس لیے کہ میں بھی آپ کا ممدو معاون ہوں۔ایسی مخلوق کا ہمیں کیا معلوم کہ ممکن ہے ان میں سے کوئی اس وقت بھی ہمارے آس پاس ہو۔ہم پر گہری نگاہ رکھے ہوئے ہو۔“

الطاف کی بات حقیقت پر مبنی تھی۔ہمیں کیا معلوم تھا کہ کوئی ان میں سے ہمارے ساتھ بھی آ کر بیٹھ جائے تو بھلا ہمیں کیسے معلوم ہو۔اس مخلوق کے پاس تو شکتیاں ہیں۔جو وہ ہمارے سامنے ظاہری طور پر آئیں یا غائبانہ طور پر۔

”میں واقعی بہت شرمندہ ہوں الطاف کہ میری وجہ سے تمہیں اتنا نقصان ہوا۔“میں نے الطاف کی طرف دیکھتے ہوئے افسوس بھرے لہجے میں کہا۔

”ایسی باتیں کر کے شرمندہ مت کرو دوست۔“الطاف بولا۔

”ہم لوگ عزت دار خاندان سے ہیں۔عزت سے جیتے اور مرتے ہیں۔عفان دل سے تم کو اپنا بھائی اور دوست تصور کیا ہے۔اور ہم لوگ رشتوں کی قدر کرتے ہیں۔آپ کسی بھی بات کی طرف سے پریشان مت ہوؤ۔بس تم اپنی اور انوسہ میڈم کی جس قدر ہو سکے حفاظت کرو کیونکہ مجھ سے زیادہ ان کا بیر آپ لوگوں کے ساتھ ہے۔“

”بس یار الطاف حالات ہیں کہ کشیدہ ہی ہوتے جا رہے ہیں۔“میں نے بے چارگی کے عالم میں کہا۔

”کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔پہلے دن سے ہی ایسے دگرگوں حالات سے نبرد آزما ہوتا آ رہا ہوں۔یقین جانو تو اب تھک گیا ہوں۔میرے ان ناتواں کندھوں میں اب ان مصیبتوں کا بوجھ اٹھانے کی مزید جسارت نہیں رہی۔“

بات مکمل کر کے میں نے چائے ختم کی۔الطاف کسی گہری سوچ میں مبتلا تھا۔اس کی نگاہیں مجھ پر ہی ٹکی ہوئی تھیں لیکن دماغ کسی اور ہی پگڈنڈی پر محو سفر تھا۔

”کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ شانزیب انکل نے مجھے یہاں لا کر شاید کوئی غلطی کی ہے۔میری وجہ سے ان کے گھرانے کو بھی مصیبتوں سے دوچار ہونا پڑ رہا ہے۔“

”ایسا نہ کہو یار تمہارے آنے سے میرے خیال میں ان لوگوں کے چہروں پر مسکراہٹ ابھری ہے۔“الطاف نے بتایا۔

”اچھا عفان یار انوسہ میڈم اب کیسی ہیں؟“

”پہلے سے کچھ بہتر ہے۔سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ اس گھر میں میرے علاوہ بھی کافی لوگ ہیں۔“میں نے دل کی بھڑاس نکالتے ہوئے کہا۔

”خیر اب تو شانزیب انکل نے کچھ ملازم بھی رکھ لیے ہیں۔لیکن مجھ پہلے شانزیب انکل اور تم بھی تو اس گھر میں تھے۔لیکن اس مخلوق نے مجھے ہی کیوں اپنا آلہ کار بنانا چاہا؟“

”یار کبھی تنہائی میں بیٹھ کر سوچنا شاید اس مخلوق نے نہیں بلکہ قدرت نے آپ کو اس نیک کام کے لیے چنا ہے۔“الطاف نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔

اس کی بات واقعی ٹھیک تھی۔میں غصے سے میں بے شک بہت کچھ کہہ گیا تھا لیکن کاشف نے جو بات کی تھی۔اس میں کافی دم تھا۔شاید اس خالق نے مجھے ہی اس نیک کام کے لیے چنا تھا۔

”ہاں تم ٹھیک کہہ رہے ہو الطاف۔“میں نے اس کی بات کی تصدیق کرتے ہوئے کہا۔

”عفان تم ہمت مت ہارو۔“الطاف نے ایک بار پھر میری ڈھارس بندھاتے ہوئے کہا۔

”دیر سویر ضرور ہوتی رہتی ہے لیکن صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔بے صبری کے اندر انسان اکثر ناشکری کے

کلمات بول بیٹھتا ہے۔جس کا اسے بعد میں شدت سے احساس ہوتا ہے۔ہمیشہ مشکل کے بعد ہی منزل ملتی ہے۔لیکن اگر انسان راستے میں ہی تھک جائے تو منزل مزید دور ہو جاتی ہے۔آپ اس خالق پر بھروسہ رکھیے۔انشاء اللہ جلد ہی حالات بہتری کی طرف مائل ہو جائیں گے۔“

”انشاء اللہ۔“میں نے الطاف کی بات سن کر جواب دیا۔

”مجھے بس سمجھ اس بات کی نہیں آتی کہ ان کا اصل لیڈر کون ہے۔جس کے کہنے پر یہ لوگ یہاں آباد ہیں؟“

”وہ جو کوئی بھی ہو عفان حالات اسے خود ہی ہم سب کے سامنے لے آئیں گے۔“الطاف نے کہا۔

”وہ جو کوئی بھی ہے بہت گھٹیا ہے۔“میں نے نفرت سے کہا تو الطاف نے میری بات سن کر بس سر ہلا دیا۔

اچانک میرے ذہن میں انوسہ کے الفاظ گردش کرنے لگے۔اس نے کہا تھا کہ وہ پھول توڑنے کے لیے کیاری کے پاس کھڑی تھی۔اس نے پھول توڑے تھے جو یکبارگی اس کے ہاتھوں سے گر گئے تھے۔اور اس کے بعد اسے کچھ ہوش نہیں رہا تھا۔

اس کا واضح مطلب تھا کہ رات کو اس نے دستر خوان پر جو کھانے کے ساتھ ہاتھا پائی کی تھی۔وہ سب کچھ عالم ہوش میں نہیں تھا۔بلکہ وہ کسی خاص کیفیت کا شکار تھی۔جس کے بارے میں وہ کچھ بتا نہیں پا رہی تھی۔لیکن میرا ذہن بہت کچھ سمجھ چکا تھا۔

الطاف بھی ٹھیک کہہ رہا تھا کہ براہ راست ان لوگوں سے لڑائی لڑنا ہمارے بس سے باہر ہے۔وہ پس پردہ ہمیں جل دے کر نقصان پہنچا رہے ہیں۔اس کے علاوہ وہ کر بھی کیا سکتے ہیں۔اب یہ بات بھی عیاں ہو چکی تھی کہ وہ مخلوق ایک بار پھر اس عمارت میں لوٹ آئی تھی۔میں جانتا تھا کہ یہ سب شانتری کا کیا دھرا ہے۔جو مجھے ذلیل و خوار کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کر رہی۔لیکن میں بھی ہمت ہارنے والا نہیں تھا۔وہ جس روپ میں بھی میرے سامنے آ جائے یہ تو کسی طور ممکن نہیں کہ میں اس سے شادی کرنے پر رضامند ہو جاؤں گا۔

الطاف کو سوائے ایک بات کے میری ہر بات کا پتہ تھا کہ میں انوسہ سے محبت کرتا ہوں۔اس بات میں اسے رازدار بنانا مجھے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔کل کو حالات کا دھارا اگر الٹے رخ بہہ نکلے تو میری لیے کوئی نئی مصیبت نہ کھڑی ہو جائے۔میں ان سب باتوں کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے فی الوقت اسے اس راز میں شریک نہیں کرنا چاہتا تھا۔بات یہ نہیں تھی کہ مجھے اس پر اعتماد نہیں تھا بلکہ بات یہ تھی کہ میں فی الحال کوئی رسک نہیں لینا چاہتا تھا۔

میں انوسہ سے محبت کرتا تھا اور میری محبت یک طرف نہیں تھی۔بلکہ انوسہ بھی اتنی ہی مجھ سے محبت کرتی تھی۔اور پھر کیسے ممکن تھا کہ میں کسی اور کے بارے میں سوچتا۔شامین اور شانتری کے تصور کے ساتھ ہی میرے ذہن میں وہ منظر آ گیا۔جب میں ان کی حویلی میں گیا تھا۔جہاں مجھے ان کے ایک ساتھی آصف میلو نے بھیجا تھا۔وہاں مجھے مردہ شامین زندہ حالت میں ملی تھی۔ممکن ہے وہ درحقیقت شامین نہ ہو بلکہ شامین کے اندر شانتری ہو جو مجھے مائل کرنے کے لیے پاپڑ بیلنے کی سعی کر رہی تھی۔

دوسری طرف اس کے والدین مجھے ملے تھے۔وہاں بھی شانتری تھی پتہ نہیں وہ حقیقت میں شانتری ہی تھی یا کوئی اور جو شانتری کا بھیس بدل کر میرے سامنے موجود تھی۔مجھے اپنی طرف مبذول کرنے کے لیے شامین نے جس طرح میرے ساتھ ٹائم گزارا تھا۔ممکن ہے میں ان حالات سے بے خبر ہوتا تو اب تک اس کے پھیلائے ہوئے جال میں بری طرح سے پھنس چکا ہوتا اور اب تک تو ان کا کٹھ پتلی غلام بن چکا ہوتا۔لیکن قدرت مجھ پر مہربان تھی۔مجھے فوراً ہی ان کے چنگل سے بچا لیا گیا اور ان کی حقیقت میرے سامنے عیاں ہو گئی۔مارے خجالت کے پھر ان میں سے

کوئی بھی میرے سامنے تک نہیں آیا تھا۔اس وقت تک تو وہ سب نو دو گیارہ ہو گئے تھے۔لیکن اب دیکھتا ہوں کب ان سے دوبارہ ٹکراؤ ہوتا ہے۔

☆......☆......☆

انوسہ کی حالت رات کو کافی بہتر دکھائی دی تھی۔رات کو وہ پرسکون سوئی رہی تھی۔اس کی خالہ نے وہ رات جاگ کر اس کے پاس گزاری تھی۔صبح کو اس کی خالہ کی آنکھیں نیند پوری نہ ہونے کی وجہ سے لال ہو چکی تھیں۔اب یہ روٹین بن چکی تھی کہ اس کی وہ خالہ تقریباً اس کے پاس بیٹھ کر رات جاگ کر گزار دیتی اور دن کو اپنی نیند پوری کرتی۔انوسہ جب سے بیمار ہوئی تھی۔اس کی وہ مہمان عورت خالہ اس کے پاس ہی تھی۔باقی سارے مہمان دوسرے دن ہی چلے گئے تھے۔لیکن وہ عورت ابھی تک نہیں گئی تھی۔میرا اس کے ساتھ کوئی تعارف نہیں کروایا گیا تھا۔جس کی وجہ سے مجھے اس کے بارے میں کوئی صحیح انفارمیشن نہیں تھی کہ وہ اس کی کیا لگتی ہے۔بس انوسہ اسے خالہ کہہ کر پکارتی تھی۔جس کی وجہ سے میں نے بھی سمجھ لیا تھا کہ وہ اس کی خالہ ہی ہوگی۔

ایک رات میں انوسہ کے کمرے میں گیا تو پتہ چلا وہ ٹائم سے پہلے ہی سو گئی تھی۔اس کی خالہ اس کے سرہانے بیٹھی اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھی۔مجھے دیکھ کر اس نے سوالیہ نگاہوں سے مجھے دیکھا لیکن منہ سے کچھ نہ بولی۔میں تھوڑی دیر تک انوسہ کے معصوم اور خوبصورت چہرے کو تکتا رہا۔مجھے اس سے بے پناہ پیار تھا۔جب سے یہ مہمان عورت اس گھر میں آئی تھی۔مجھے انوسہ سے بات کرنے کا کوئی خاص وقت نہیں مل پا رہا تھا۔چاہنے کے باوجود بھی میں اس سے ملاقات نہیں کر پا رہا تھا۔جس وقت دیکھو شہد کی مکھی کی طرح یہ اس کے ساتھ چپکی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔کبھی کبھی تو مجھے اس پر اتنا غصہ آتا کہ میرا دل کرتا اس کی جان ہی لے لوں۔لیکن جب انوسہ کو دیکھتا اور اس کے چہرے پر سکون کی پرچھائیاں دیکھتا تو ارادہ موقوف کر دیتا کیونکہ اس عورت نے اس کے لیے اپنی راتوں کی نیند تک قربان کر دی تھی۔

پتہ نہیں اس سب کے اندر اس کا کوئی مطلب پنہاں تھا یا جو بھی تھا۔لیکن فی الوقت وہ انوسہ کو اپنے بچوں کی طرح ٹائم دے رہی تھی۔میں تو یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ اس کا کوئی بچہ بھی ہے کہ نہیں۔

یکے بعد دیگرے دو حملے انوسہ پر ہو چکے تھے۔مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ میں انوسہ کی کیسے مدد کروں۔سب سے بڑی بات یہ تھی کہ میں اس شہر میں کچھ زیادہ شناسائی بھی نہیں رکھتا تھا کہ کسی سے اس بارے میں بات کر سکوں۔کاشف کے ذریعے مولوی ندیم سے رابطہ ہوا تھا۔وہ ایک امید بن کر سامنے آئے تھے لیکن تھوڑی دیر کے لیے اس کے بعد......

شانزیب صاحب بیچارے وہ تو خود بہت پریشان تھے۔ان سے تو بات کرنا بھی فضول تھا کیونکہ اگر ان سے میں اس معاملے پر بات کرتا تو ممکن ہے وہ مزید پریشان ہو جاتے اور میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ انہیں کوئی پریشانی لاحق ہو۔ممکن ہے جلد بازی میں وہ کوئی قدم اٹھائیں اور اس کا الٹا نتیجہ سامنے آ جائے۔یہ بات تو روز روشن کی طرح عیاں تھی کہ انہیں بھی اس مخلوق کے بارے میں ساری انفارمیشن تھی۔نجانے انہوں نے آج تک ان کے خلاف کوئی قدم کیوں نہیں اٹھایا تھا۔شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے۔کہ انہیں اندیشہ لاحق ہو کہ ان کے اٹھائے گئے کسی بھی قدم کی وجہ سے ان کی دختر کو کوئی پریشانی نہ لاحق ہو جائے۔اس بات میں کوئی شک نہ تھا کہ شانزیب صاحب اپنی بیٹی سے والہانہ محبت کرتے تھے۔

میں اس خاردار راستے کا تنہا ہی مسافر رہ گیا تھا۔الطاف بے چارہ میری مدد کیا کرتا۔وہ تو خود میری وجہ سے بری طرح سے زدوکوب ہو چکا تھا۔لیکن اس نے اف تک نہ کی تھی۔اب اس میں اس کا بھلا کیا قصور تھا۔

اچانک ہی میرے ذہن میں ایک نئے خیال نے قدم رکھا بے شک یہ ایک عجیب ہی خیال تھا لیکن کوشش کرنے میں کوئی حرج نہیں تھا۔مجھے اس گھر کی خفیہ

رکھوالی کرنی چاہیے کیونکہ ایک بار میں نے اس آصف میلو کو اس گھر میں دیکھا تھا۔رات کے وقت اسے اس گھر میں دیکھنا کوئی عام بات نہ تھا۔آصف میلو نے مجھے کھل کر شانتری سے شادی کرنے کی آفر دی تھی۔مجھے لالچ میں مبتلا کرنے کے لیے بہت کچھ سمجھایا بجھایا لیکن دودھ پیتا بچہ تو میں بھی نہیں تھا۔

اس خیال کے ذہن میں آتے ہی میں اپنے کمرے سے باہر نکل آیا۔پھر کچھ سوچ کر میں الطاف کی طرف چل پڑا۔کاشف اپنی ڈیوٹی پر تھا۔گیٹ کے پاس ہی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔مجھے آتے دیکھ کر اس نے سرعت سے اندر سے ایک اور کرسی نکال لی تھی۔

''الطاف یار ایک کام جانا ہے۔بزی تو نہیں ہو؟'' میں نے الطاف سے پوچھا۔

''نہیں تو۔'' الطاف نے نفی میں سر ہلایا۔

''خیریت تو ہے ناں عفان؟''

اس نے پوچھا تو میں نے ہاں میں سر ہلا دیا۔اب الطاف میرے ساتھ جہاں بھی جاتا تھا۔وہ انٹرکام پر اپنی جگہ اندر سے ایک ملازم بلوا کر اسے بٹھا کر جاتا تھا۔خاص کر جب سے اس حویلی کو نذر آتش کیا تھا۔تب سے تو وہ کچھ زیادہ ہی چوکنا ہو گیا تھا۔اس وقت بھی اس نے انٹرکام پر نمبر ملا کر ایک ملازم کو بلایا اور اسے اچھی طرح سے سمجھانے کے بعد گاڑی کی طرف بڑھا جب کہ میں باہر نکل کر کھڑا ہو گیا۔ہم دونوں گاڑی میں گھر سے باہر نکلے تو گاڑی گیئر میں ڈالتے ہوئے الطاف گویا ہوا:

''کہاں جانا ہے عفان؟''

''آصف میلو کے ہاں۔'' میں نے مختصر سا جواب دیا تو الطاف نے چونک کر مجھے دیکھا۔

''کیا؟'' الطاف حیرت کے سمندر میں غوطہ زن ہو گیا تھا۔شاید اسے اس جواب کی توقع نہ تھی۔

''آپ کیوں جان بوجھ کر اپنے پیروں پر کلہاڑی مار رہے ہیں۔یہ جانتے ہوئے بھی کہ آپ نے بھیڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈال دیا ہے۔پھر ابھی کے پاس جا رہے ہیں۔میں سمجھتا ہوں کہ آپ غلط کر رہے ہیں۔''

الطاف نے بات مکمل کرنے تک گاڑی فل آہستہ سپیڈ میں کر دی تھی۔

''تم چتامت کرو اور گاڑی کو گیئر میں ڈالو کچھ نہیں ہوگا۔'' میں نے الطاف کی طرف فیصلہ کن لہجے میں دیکھتے ہوئے کہا۔

جلد ہی ہم دونوں آصف میلو کے گھر کے سامنے تھے۔گیٹ پر کھڑا دربان ہمیں دیکھتے ساتھ ہی ہماری طرف لپکا۔

''السلام علیکم سر۔'' اس نے قریب آ کر جھک کر سلام کیا۔

''وعلیکم السلام۔'' میں نے سلام کا جواب دیا۔

''آصف میلو صاحب گھر پر ہیں؟''

''نہیں صاحب۔'' اس دربان نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

''صاحب کہیں کام گئے ہوئے ہیں۔بتا کر نہیں گئے کہ کب تک لوٹیں گے۔''

میں نے دربان کی بات سننے کے بعد ہونٹ سکیڑے۔دربان سے کچھ کہنا فضول ہی تھا۔اسے ہاتھ کے اشارے سے چلے جانے کا کہہ کر میں نے الطاف کو گاڑی موڑنے کا کہا۔نجانے کیوں اب میرا من چاہ رہا تھا کہ میں اس کوٹھی میں جاؤں جہاں شامین اپنے والدین کے ساتھ میرے سامنے آئی تھی۔میں اپنی سوچوں میں گم تھا کہ الطاف کے الفاظ میری سماعت سے ٹکرائے۔

''اب کہاں جانا ہے عفان؟''

میں نے الطاف کی بات سن کر سر کو جھٹکا اور پھر اسے اس کوٹھی پر چلنے کا حکم دیا جہاں شامین اور اس کی فیملی سے میری ملاقات ہوئی تھی۔اس بات الطاف منہ سے تو کچھ نہ بولا لیکن اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔میں جانتا تھا کہ ہزاروں سوال اس کے دماغ میں جنم لے چکے تھے۔لیکن وہ انہیں زبان پر لانے سے کترا رہا تھا۔

شہر کے نواحی علاقے میں بنی کوٹھیاں اپنی مثال آپ تھیں۔ مگر اس کوٹھی کی تو کیا ہی بات تھی۔ جو جنگل میں منگل کا ساماں پیش کرتی تھیں۔ لیکن آج اسی کوٹھی کے گیٹ پر نگاہ پڑتے ساتھ ہی میرے قدموں تلے زمین سرک گئی۔

مجھے اچھی طرح سے یقین تھا کہ یہ وہی کوٹھی تھی۔ جس کی تعریف کے لیے الفاظ نہیں تھے۔ لیکن آج اس کوٹھی کے نین نقش ہی بدلے ہوئے تھے۔ اس وقت یہ کوٹھی اور اس کے آس پاس کا سارا ماحول دل موہ لینے والا تھا۔ شروع میں ایک انتہائی خوبصورت لان کئی رنگ کی بجری سے بنا خوبصورت سا فرش تھا۔ لیکن اب اس کوٹھی کے آس پاس پیلے رنگ کی جلی ہوئی بدصورت گھاس اور راستہ بدنما دکھائی دے رہا تھا۔ یہی کیفیت گیٹ کی بھی تھی۔ بدرونق اور جگہ جگہ سے اکھڑے ہوئے رنگ۔ یہی نہیں گرل کا بھی ستیاناس ہوا ہوا تھا۔

”لگتا ہے تم بے خیالی میں کسی غلط طرف گاڑی لے آئے ہو؟“ میں نے الطاف کو سرزنش کرتے ہوئے کہا۔

”نہیں نہیں یار عفان کیسی بات کر رہے ہو؟“ الطاف نے میری بات کی نفی کرتے ہوئے کہا۔

”میں اس جگہ کے بارے میں بھلا کیسے بھول سکتا ہوں نا۔ اس شہر کے چپے چپے سے میں واقف ہوں۔ یہ وہی کوٹھی ہے۔“

الطاف کے جواب پر میں نے ایک بار پھر اس کوٹھی کو بغور دیکھا۔ مجھے یقین نہیں ہو رہا تھا کہ یہ وہی کوٹھی ہے۔ جو چند دنوں میں اتنی خستہ حال ہو گئی ہے۔

”یار مجھے تو لگتا ہے کہ یہ کوٹھی اسی مخلوق کی آماجگاہ تھی۔ اور انہوں نے اپنی شکتیوں کے بل بوتے پر اس کے نین نقش سنوار دیئے تھے۔“

الطاف نے کہا۔ اس کی بات میں دم تھا۔ لیکن پھر بھی میں اس کوٹھی کے اندر ضرور جانا چاہتا تھا۔ جب میں نے اپنی اس خواہش کا اظہار الطاف کے سامنے کیا تو اس نے عجیب نظروں سے مجھے گھورا۔

”عفان تم کیا سمجھتے ہو کہ اس کوٹھی کے اندر جانا بہتر رہے گا؟“ الطاف نے پوچھا۔

”چنتا مت کرو الطاف کچھ نہیں ہوگا۔“ میں نے اس کی ڈھارس بندھاتے ہوئے کہا۔

الطاف گاڑی سے اترا۔ میں بھی اس کے پیچھے ہو لیا۔ گیٹ کو مقفل نہیں کیا گیا تھا۔ الطاف نے جیسے ہی زور لگایا وہ بنا کوئی آواز نکالے کھلتا چلا گیا۔ گیٹ کھولنے کے بعد میں نے کاشف کو گاڑی اندر لانے کا کہا اور جب الطاف گاڑی اندر لے آیا تو میں نے دروازہ بند کر دیا۔ کیونکہ میں کسی کی نظروں میں نہیں آنا چاہتا تھا۔

یکبارگی میری نگاہ کوٹھی کے اندر ایک سائیڈ پر لگے درختوں کی طرف اٹھ گئی اور اگلا منظر دیکھ کر میں گنگ رہ گیا۔ ان درختوں کے نیچے ایک قیمتی گاڑی کھڑی تھی۔ جسے پہچاننے میں مجھے ذرہ بھی دیر نہ لگی کیونکہ اس گاڑی کو میں آصف میلو کے پورچ میں دیکھ چکا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ آصف میلو اسی کوٹھی کے اندر موجود ہے۔ میرے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہونے لگی تھی۔ ایک ان دیکھے خوف نے میرے پیر جکڑ لیے تھے۔ میرا دل کر رہا تھا کہ فوراً سے بھی پیشتر الطاف کے ساتھ واپس چلا جاؤں لیکن میرے اس فعل سے الطاف یہی سمجھے گا کہ میں ڈر گیا ہوں۔ الطاف نے بھی اس گاڑی کو دیکھ لیا تھا۔ اس کی سوالیہ نگاہیں میری طرف اٹھیں لیکن میں اسے کیا جواب دیتا۔

کوٹھی کے اندر یوں سکوت چھایا ہوا تھا۔ جیسے شہر خموشاں کے اندر ایک جان لیوا سکوت چھایا ہوا ہوتا ہے۔ دوسری طرف آصف میلو کی گاڑی کا کھڑے ہونا اس بات کا منہ بولتا ثبوت تھا کہ اندر کوئی نہ کوئی ضرور موجود ہے۔ بہرحال کوئی ہو یا نہ ہو آصف میلو یہاں ہی ہے۔ اس کا گھر نہ ملنا اور اس کے گھر پہلی بار پورچ میں دکھائی دینے والی گاڑی کا یہاں کھڑے ملنا اس بات کا منہ بولتا ثبوت تھا کہ وہی یہاں آیا ہے۔

”الطاف تم یہاں رکو۔“ میں نے تمام ترہمت یکجا کر کے الطاف کو کہا۔ [illegible] نے ایک بار پھر حیرت

سے مجھے گھورا۔ ”میں اندر ہو کر آتا ہوں۔“

”عفان میں بھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔“ الطاف نے برجستہ جواب دیا۔

”فکر مت کرو کچھ نہیں ہوگا۔“ میں نے الطاف کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا اور خود مین انٹرس کی طرف بڑھا۔ مین انٹرس کے پاس رک کر میں الطاف کی طرف متوجہ ہوا۔

”تم گاڑی کا رخ بدلو اور گیٹ کو کھول دو۔“

اتنا کہہ کر میں اندر داخل ہو گیا جبکہ الطاف سر ہلاتا ہوا گاڑی کی طرف بڑھا۔ میرا دل بری طرح سے دھکا دھک دھڑک رہا تھا۔ کوئی بھی انہونی جان لیوا ثابت ہو سکتی تھی۔ میں جانتا تھا کہ اس مخلوق کا میں نے کتنا نقصان کر دیا تھا اور اب ہیرو بن کے ان کے مکان پر چلا آیا تھا۔ مجھے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا کہ کروں تو کیا کروں۔ کبھی دل کرتا الٹے قدموں واپس مڑ جاؤں۔ لیکن واپس مڑنا میری مردانگی کے خلاف تھا۔

میں پہلے بھی اس عمارت میں آ چکا تھا۔ لیکن آج اس عمارت سے مجھے خوف محسوس ہو رہا تھا۔ دل اتنی تیزی سے دھڑک رہا تھا کہ یوں لگ رہا تھا جیسے ابھی پسلیوں کو چیر کر باہر آ گرے گا۔ عمارت سونی صدو ہی تھی۔ لیکن اس کی خستہ حالی سمجھ سے بالاتر تھی۔ اچانک میری سماعت سے سرسراہٹ کی بازگشت ٹکرائی۔ میں فوراً پلٹا اور اگلا منظر دیکھ کر میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

میرے سامنے کافی سارے چوہے تھے۔ جو ادھر ادھر دوڑ رہے تھے۔ اس حویلی کے فرش میں ان گنت سوراخ تھے۔ چوہے مجھے اندر داخل ہوتے دیکھ کر لپک لپک کر ان سوراخوں میں گھستے چلے جا رہے تھے۔ میں حیرت کے سمندر میں غوطہ زن تھا کہ وہ فرش جس کی کوئی ایسی جگہ نہ تھی جہاں قیمتی ریشمی قالین بچھا ہوا دکھائی نہ دے۔ اس فرش کی خستہ حالی اس بات کی گواہی دے رہی تھی کہ شاید میں نے سوتے میں کوئی خواب دیکھا تھا۔

میں نے ساتھ والے کمرے کے دروازے سے اندر جھانکا تو حیران رہ گیا۔ اس کمرے کی دیواروں میں کتنے ہی دروازے اور کھڑکیاں دے رہے تھے۔ مجھے کافی حیرت ہوئی کیونکہ میں نے اس سے قبل اس کمرے میں صرف ایک ہی دروازہ دیکھا تھا۔ ابھی میں حیرت کے سمندر میں غوطہ زن اس سب کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ مجھے یوں لگا جیسے سامنے والے کمرے کے دروازے پر لٹکا پردہ ہلا ہو میری نگاہ فوراً اس دروازے پر ٹک سی گئیں۔

مجھے یقین ہو گیا تھا کہ اس پردے کی اوٹ سے کسی نے جھانک کر مجھے دیکھا تھا اور جیسے ہی میں اس طرف متوجہ ہوا تھا۔ وہ سرعت سے ایک طرف ہٹ گیا تھا۔ گویا اس عمارت میں کوئی موجود ہے۔ چاہے وہ آصف میلو ہی کیوں نہیں۔ میرا دل دھکا دھک دھڑکنے لگا تھا۔ بے شک میں ان عفریتوں کا عادی ہو چکا تھا لیکن پھر بھی ایک انجانا خوف مجھے اپنی آغوش میں بھر چکا تھا۔

”کک...... کون ہے وہاں؟“ میں نے اس کمرے کی طرف منہ کر کے آہستہ سے کہا۔

”مجھے...... آصف میلو سے ملنا ہے...... کہاں ہے وہ......؟ اگر...... اگر تم آصف میلو ہو تو...... پلیز میرے سامنے آؤ۔“

میں نے بمشکل تمام اپنا فقرہ مکمل کیا لیکن فقرہ مکمل ہونے سے پہلے میں پوری طرح سے پسینے میں شرابور ہو چکا تھا۔ لیکن میری یہ آواز آ کر میرے سماعت سے ٹکرائی۔

بالآخر تمام ترہمت یکجا کر کے میں اس دروازے کی طرف بڑھا جس کے پردے کے دوسری طرف کسی نے مجھے دیکھا تھا۔ یہ کمرہ پچھلی بار میری نگاہوں میں نہیں آیا تھا۔ یا شاید آیا بھی ہو تو مجھے یاد نہیں۔ حالانکہ شاہین نے مجھے پوری حویلی کی سیر کروائی تھی۔ اس وقت میں نے اس حویلی کی اتنی تعریف کی تھی کہ مجھے یوں لگنے لگا تھا جیسے ابھی بھی میں اس کی مکمل طریقے سے تعریف نہیں کر پا رہا۔ لیکن اس وقت یہ سب کچھ ناقابل فہم تھا۔ میں حیرت سے پھٹی پھٹی آنکھوں سے چہار سو دیکھ رہا تھا۔

میں نے پردہ ہٹایا اور اللہ کا نام لے کر اس کمرے میں داخل ہوگیا لیکن یہ دیکھ کر حیران و ششدر رہ گیا کہ اندر کوئی بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ کمرے کی دیواروں پر بڑے سائز کی تصویریں آویزاں کی گئی تھیں۔ جن پر گرد کی موٹی تہہ جمی ہوئی تھی۔ میں نے ایک دو تصویروں کو بغور دیکھا جو گرد کے باوجود کچھ دکھائی دے رہی تھیں لیکن میری پہچان میں نہیں آئی۔ اس کمرے کے اندر بھی جابجا چھوٹے چھوٹے سوراخ بنے ہوئے تھے۔ لیکن یہ دیکھ کر میری حیرت ہویدا ہوگئی کہ ان سوراخون میں زرد زرد رنگ کی چھوٹی چھوٹی بتیاں جلتی ہوئی دکھائی دینے لگیں۔ ساتھ ہی ساتھ ہلکی ہلکی سرسراہٹیں بھی سنائی دینے لگ گئی تھیں۔ وہ زرد بتیاں کبھی بجھتی تو کبھی آف ہوجاتی جسے مجھے سمجھنے میں ذرہ بھر دیر نہ لگی کہ وہ آنکھیں ہیں۔ جو بار بار جھپکی جارہی ہیں۔

میرے قدمون تلے زمین سرک چکی تھی۔ ہر سوراخ میں سے کئی کئی آنکھیں مجھ پر ٹکی ہوئی تھیں۔ م میرے کدا یہ سب کیا ہے۔ یکبارگی اس گھر نے کیسا روپ اختیار کرلیا ہے۔ دوسرے ہی لمحے میری نظر کمرے کے وسط میں لٹکتی ایک رسی پر پڑی۔ وہ رسی اوپر چھت تک جارہی تھی۔ اس رسی کا نیچے لٹکا ہوا سرا پھندے کی شکل کا تھا۔ جسے دیکھ کر میری اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی سانس نیچے اٹک کر رہ گئی۔

مین نے اس رسی کے قریب جا کر اسے چھوا تو عین اسی وقت میری سماعت سے مدھم سی آوازیں ٹکرانے لگکیں۔ جب میں غور کیا تو پتہ چلا کہ وہ آوازیں گھنٹیوں کے جیسے ہیں۔ میں نے فوراً سے بھی پیشتر ہاتھ میں پکڑی اس رسی کو چھوڑ دیا اور مڑ کر دیکھا تو وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ حالانکہ سنائی دینے والی آوازیں مجھے اپنی پشت کی طرف سے محسوس ہوئی تھیں۔

جب میں دوبارہ رسی کی طرف متوجہ ہوا تو ایک اور قابل حیرت واقعہ رونما ہوا۔ رسی سے تھوڑی دور فرش پر ایک کرسی پڑی ہوئی تھی۔ مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ جب میں اس کمرے میں داخل ہوا تھا تو وہ رسی اس کمرے میں موجود نہیں تھی۔ پھر یکبارگی اس رسی کا کمرے میں ہونا واقعی حیرت میں مبتلا کرنے والی بات تھی۔ اس کرسی پر طرح طرح کے نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ اچانک مجھے یوں لگا جیسے کوئی اس کرسی پر بیٹھا ہوا ہے۔ پہلے تو مجھے کچھ واضح دکھائی نہ دیا۔ میں نے زور زور سے اپنی آنکھوں کو مسلا اور پھر اگلا منظر دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔

سیاہ لباس میں ملبوس ایک شخص جس کی سرخ انگاروں کے جیسے دہکتی آنکھیں مجھ پر ہی ٹکی ہوئی تھی۔ سوائے چہرے کے اس کا باقی ماندہ جسم سیاہ لبادے میں چھپا ہوا تھا۔ میرے جبڑے بھینچ گئے۔ میں یکدم اس کمرے میں اس کی موجودگی سے کافی پریشان ہوگیا تھا۔ مجھے اپنی بینائی پر یقین نہیں ہو رہا تھا کہ ایک کمرے کے اندر یکبارگی اتنے واقعات رونما ہو سکتے ہیں۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ شخص تیزی سے اس کرسی سے اٹھا۔ اسے اٹھتا دیکھ کر میں اپنی جگہ سے دو چار قدم پیچھے ہٹ گیا۔ میں سمجھا کہ شاید وہ مجھ پر حملہ آور ہونے لگا ہے۔ لیکن وہ اٹھتے ساتھ ہی دروازے کی طرف بڑھا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ میرے اندر اتنی جسارت نہ تھی کہ میں اس کا پیچھا کر سکتا۔

اس پر ہیبت شخص کے جانے کے بعد ایک بار پھر کمرے کے اندر موت کا سا سکوت طاری ہوگیا۔ میں ادھر ادھر دیکھنے لگا اور دل ہی دل میں دعا کرنے لگا کہ کوئی ایسی چیز میرے ہاتھ لگ جائے جسے بوقت ضرورت میں اپنے دفاع کے لیے استعمال کرسکوں۔ لیکن افسوس کہ ایسی کوئی بھی چیز میرے ہاتھ نہ لگی۔ پھر نہ چاہتے ہوئے بھی میں کمرے سے باہر نکل آیا۔ اس لمبی راہداری میں مجھے کوئی بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ لیکن میں اس بات سے اچھی طرح سے آشنا تھا کہ آصف میلو یہاں ہی کہیں چھپا ہوا ہے۔

میں ایک بار پھر کمرے میں داخل ہوگیا۔ نجانے مجھے یوں لگا جیسے کمرے کے اندر اور بھی کوئی ہوگا۔ میں جیسے ہی رسی کے قریب پہنچا یکبارگی کسی چیز پر میرا پاؤں

آیا اور میں پھسل پڑا۔ پھسلتے پھسلتے میں نے رسی کو مضبوطی سے تھام لیا تاکہ کوئی نقصان نہ ہو۔ لیکن رسی پر جیسے ہی دباؤ پڑا اگلا منظر دیکھ کر میری آنکھیں چندھیا گئیں۔

دروازے کے دائیں طرف والی دیوار میں ایک بڑا سا شگاف پڑنے لگا۔ اس شگاف میں سے تیز روشنی باہر پھوٹنے لگی۔ جس نے کمرے میں اتنی روشنی بھر دی کہ میں ٹھیک سے آنکھیں بھی نہیں کھول پا رہا تھا۔ یہ روشنی پیلے رنگ کی تھی۔ جب میں کچھ اس ماحول میں دیکھنے کے قابل ہوا تو بغور اس شگاف کو دیکھنے لگا۔ اس شگاف کے پڑنے کی دیر تھی کہ ایک عجیب سی بھیانک آواز میری سماعت سے ٹکرانے لگی۔ آواز بہت عجیب تھی۔ کوئی اونچی آواز میں ہوں ہوں کر رہا تھا۔ میں اپنی جگہ سے اٹھا اور اس شگاف کی طرف بڑھا۔ جیسے ہی میں اس شگاف کے قریب پہنچا یہ دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گیا کہ دیوار کے ساتھ ہی مجھے ایک زینہ دکھائی دیا۔ یہ زینہ ضرور نیچے کسی تہہ خانے میں جا رہا تھا۔

اس خیال کے ذہن میں آتے ساتھ ہی میں نے اللہ کا نام لے کر وہ زینہ عبور کرنا شروع کر دیا۔ زیادہ سے زیادہ دس سیڑھیاں ہوں گی۔ جن کے اختتام پر ایک وسیع و عریض ہال تھا۔ سیڑھیاں اتر کر میں نے دیکھا کہ اس وسیع عریض تہہ خانے کے اندر جگہ جگہ چراغ روشن تھے۔ گویا اوپر کمرے میں داخل ہونے والی پیلی زرد روشنی انہی چراغوں کی تھی۔ لیکن اچانک میں ٹھٹھک کر رک گیا کیونکہ جنہیں میں چراغ سمجھ رہا تھا وہ صرف چراغ نہیں تھے۔

اس بات کا انکشاف مجھے اس وقت ہوا جب میں نے ایک چراغ کے پاس بیٹھ کر اسے اٹھانا چاہا۔ وہ چراغ نہیں بلکہ سفید رنگ کے سانپ تھے جو کنڈلی مارے سر اٹھائے ایک گھیرا بنائے بیٹھے تھے۔ اور جلتے چراغ ان کے سرون پر روشن تھے۔ لیکن یہ چراغ بھی کافی عجیب قسم کے تھے۔

”اف میرے خدا۔“

مٹی کے بنے ان چھوٹے چھوٹے چراغوں کے اندر چھوٹے چھوٹے انسانی اعضاء کٹے ہوئے رکھے گئے تھے۔ ساتھ ہی انسانی خون ڈال کر چراغ روشن کیے گئے تھے۔

جب میری آنکھیں مزید کچھ دیکھنے کے قابل ہوئیں تو اگلا منظر اس سے زیادہ بھیانک دکھائی دیا۔ وہ سانپ ایک دائرہ بنائے ہوئے تھے۔ اور اس دائرے کے اندر مجھے دو انسانی وجود دکھائی دیے۔ دونوں وجود چھوٹی چھوٹی چوکیوں پر براجمان تھے۔ ایک کا رخ میری طرف تھا جبکہ دوسرے کی پشت میرے طرف تھی۔ جس کا منہ میری طرف تھا۔ اسے پہچاننے میں مجھے دیر نہ لگی۔ وہ آصف میلو ہی تھا۔ جو اس وقت ایک لمبا سا چوغہ زیب تن کیے ہوئے تھا۔ اس چوغے کا رنگ گندمی سا تھا۔ آصف میلو کے سر کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ بڑا ہی عجیب وغریب حلیہ اس نے بنا رکھا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔

”ہوں۔ ہوں۔“

یہ آواز ایک بار پھر میری سماعت سے ٹکرائی اور مجھے اپنے طرف پشت کرکے بیٹھے وجود کو پہچاننے میں بھی ذرہ برابر دیر نہ لگی۔ وہ کوئی اور نہیں بلکہ خبیث شانتری تھی۔ جس کے منہ سے ہوں ہوں کی آوازیں نکل رہی تھیں۔ وہ متواتر بل رہی تھی۔ اور اسی کے منہ سے ہوں ہوں کی آواز بھی نکل رہی تھی۔

عین اسی وقت آصف میلو نے آنکھیں کھولی۔ اور اس نے چونکے بغیر مجھے گھورا۔ پھر نجانے وہ منہ ہی منہ میں کیا بڑبڑاتا رہا۔ اس کے بعد اس نے سانپوں کی طرف ہاتھ ہلایا تو میرے قریب سے سانپ ادھر ادھر ہونے لگ گئے۔ گویا وہ مجھے گزرنے کے لیے راستہ دے رہے تھے۔

”آجاؤ عفان۔“ آصف میلو کی بازگشت نے میری سماعت پر دستک دی۔

میں اس دائرے میں داخل نہیں ہوا۔ بلکہ دو قدم بڑھا کر ان سے تھوڑے فاصلے پر کھڑا ہوگیا۔

”میں یہاں بیٹھنے نہیں آیا آصف میلو۔“ میں نے آصف میلو کو مخاطب کرکے کہا۔

''اتنا تو مجھ پر آشکار ہو چکا ہے کہ وہ تم ہی ہو جوان سب کے پیچھے ہو۔ یہ سب کچھ کیا دھرا تمہارا ہی ہے۔ بہرحال اب میں تم سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں؟''

''تم نے بہت بڑی غلطی کی ہے عفان۔'' آصف میلو نے میری بات کو پس پشت ڈالتے ہوئے کہا۔

''تم نے ایک خطرناک جنگ کا آغاز کردیا ہے۔ ابتدا تم نے ہی کی ہے اور اس بات کو بھی ذہن نشین کرلو کہ تم یہ جنگ بہرصورت ہارنے والے ہو۔''

''مجھے تم لوگوں کی ان گیدڑ بھبکیوں سے کوئی ڈر نہیں لگتا۔'' میں نے تمام تر ہمت کو یکجا کرکے کہا۔

''اب بتاؤ کیا بات کرنا چاہتے ہو تم؟'' آصف میلو نے زہرخند لہجے میں پوچھا۔

''بس یہی کہ تمہارا اصل مقصد کیا ہے؟'' میں نے بھی اسے کھا جانے والی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''تم لوگ اچھی طرح سے جانتے ہو کہ اس کھیل کا آغاز میں نے نہیں کیا تھا۔ بلکہ تمہارے سامنے بیٹھی اس شیطان شانتری نے کیا تھا اور اسی کی وجہ سے میں اس حویلی میں گیا اور اس کی بیٹی میرے ہاتھوں موت کی نیند سوئی۔ جو سب ایک اتفاقیہ واقعہ تھا۔ میں تو خود قلاش اور بے سہارا تھا اور اپنی زندگی ختم کرنے چلا تھا لیکن رحم دل شاہزیب صاحب نے مجھ پر ترس کھایا اور مجھے اپنے گھر لے آئے۔

لیکن جس دن مجھے ان کے ہاں ٹھیک سے ہوش آیا اسی دن سے ہی مجھے پیہم تنگ کیا جانے لگا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ تم سب کون ہو اور کیوں میرے دشمن بن گئے ہو؟ لیکن بلاوجہ کی دشمنی تو تم شیطانوں نے مجھ سے مول لے لی ہے۔''

آصف میلو میری بات سن کر قہقہے ہانکنے لگا لیکن شانتری مجھے کھا جانے والی آنکھوں سے گھور رہی تھی۔ میں نے کچھ الفاظ ہی ایسے ادا کیے تھے کہ اسے مرچیں لگنا تو لازمی امر تھا۔ لیکن آصف میلو نے شاید میرے الفاظ پس پشت ڈال دیئے تھے اور پاگلوں کی طرح قہقہے مارنے لگا۔

''ساری دنیا ایک ہی بات کہتی ہے عفان کہ ناآگہی انسان کو بہت نڈر کردیتی ہے۔'' آصف میلو نے مجھے مخاطب کرکے کہا۔

''اگر تم واقف ہوتے کہ یہ پراسرار مخلوق ہے اور کس طرح تم پر حاوی ہوسکتی ہے تو تمہارے دل کی حرکت بند ہوجاتی۔ لیکن تم بہت ہی عجیب و غریب حرکتیں کرتے رہے۔

شانتری کی بیٹی شامین نے جب تمہیں دیکھا تو وہ تم پر فدا ہوگئی تھی اور تم سے پیار کرنے لگ گئی تھی۔ تمہیں چاہنے لگی تھی۔ وہ تمہاری ہی طرف بڑھنا چاہتی تھی لیکن تم نے اپنی بدنصیبی پر خود ہی اپنے ہاتھوں سے مہر ثبت کردی۔ اور اس بے چاری کو ابدی نیند سلا دیا۔''

اس سے قبل کہ آصف میلو مزید کوئی بات کرتا میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

''اب جب تم منصف بننا ہی چاہ رہے ہو تو انصاف کی لگام تھامو آصف میلو۔'' میں نے آصف میلو کو اس انداز سے مخاطب کیا جس کا وہ اصل حقدار تھا۔

میرے اس انداز پر آصف میلو نے حیرت سے مجھے گھورا۔ یہی نہیں شانتری نے پہلے مجھے اور پھر آصف میلو کی طرف دیکھا لیکن مجھے ان کی حیرت سے کچھ لینا دینا نہیں تھا۔ وہ عزت کے قابل ہی نہیں تھے۔

''میں تجسس میں ڈوب کر اس عمارت نما کھنڈر کی طرف بڑھا کیونکہ اس شانتری نے میرا جینا محال کردیا تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ کھنڈر نما عمارت تم لوگوں کی آماجگاہ بنی ہوئی تھی۔ میں نے تو پرانی عمارت گرداتے ہوئے اپنی حفاظت کے لیے ایک چھڑی بھی اٹھالی۔ عین اس وقت جب میں عمارت کے اندر داخل ہوکر آگے بڑھ رہا تھا۔ وہ بلی یعنی شامین یکبارگی میری طرف دوڑی اور اپنا بچاؤ کرتے ہوئے میرا ہاتھ گھوما اور وہ چھڑی اس بلی کو لگی۔ لیکن اس وقت وہ مری نہیں، بلکہ وہ بازار سے باہر نکل کر کسی کونے میں غائب ہوئی تھی۔''

(جاری ہے)

ادھورا انسان

محمد رضوان قیوم۔ راولپنڈی

اچانک ایک کرخت اور غراتی ہوئی آواز سنائی دی کہ اتنے میں لڑکے کے والد نے جھپٹا مار کر لڑکے کو اپنی طرف کیا اور کہا میرے بچے کو کہیں دور لے جاؤ نہیں تو وہ کالی چڑیل میرے بچے کو مار دے گی لیکن......

اور اپنے دام میں خود صیاد آ گیا اسی کے مصداق دل و دماغ پر اثر کرتی...... حقیقی کہانی

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ وہ عیدالاضحی کا موقع اور 1990ء تھا۔ میں دفتر سے چھٹیاں ہوئی تھیں۔ اس دن میں ضروری سودا سلف لینے کی غرض سے اپنے شہر کی مشہور و معروف ترین مارکیٹ میں پیدل رواں دواں تھا کہ لوگوں کے بے پناہ ہجوم میں عام لوگوں سے مختلف ایسا مافوق الفطرت شخص نظر آیا جس کے جسم کا صرف ایک اعضا تھا یعنی دو کی جگہ اس کی ایک آنکھ، ایک ہاتھ، ایک ٹانگ حتیٰ کہ حیرت انگیز حد تک اس کا کان بھی ایک تھا۔ میں جس مقصد یعنی خریداری کے لئے گیا تھا وہ تو میں اسے دیکھ کر یکسر بھول ہی گیا تھا بس میری نظریں اس پراسرار شخص کی جانب گڑھی ہوئی تھیں۔

چونکہ بمشکل لڑکھڑاتا ہچکولے کھاتا چل رہا تھا۔ ضرور اس شخص کے اندر کوئی کہانی لپٹی ہوئی ہے۔ یا یہ خود کہانی ہے میرا دل یہ گواہی دے رہا تھا۔ لہٰذا میں نے کسی نہ کسی طرح اس سے ملنے کی ٹھان لی۔ بازار میں بھیڑ بہت تھی۔ اگلے دن کیونکہ عید کا دن تھا لوگ ضروریات زندگی کے حصول کے لئے خریداری کررہے تھے۔ کندھے سے کندھا ملا ہوا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ مجھے اس تیز چلتے شخص کے قریب جاتے ہوئے انتہائی تکلیف ہورہی تھی۔ بہرحال میں اپنے دونوں ہاتھوں کی مدد سے ہجوم ہٹاتا ہوا کسی نہ کسی طرح سے اس بزرگ جس کی ادھوری جسمانی کیفیت دیکھ کر لگتا تھا جیسے وہ ادھورا انسان ہے یا وہ اس پرانی چلتی گاڑی کی مانند لگ رہا تھا جس کی ایک لائٹ، ایک پہیہ، ایک دروازہ غائب تھا اور سونے پہ سہاگہ کہ ہارن بھی آدھا......!

''السلام علیکم۔'' میں نے زبردستی اسے اپنی جانب مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''وعلیکم السلام۔'' معاف کیجیے گا لیکن تم کون ہو؟ بھائی؟ اس نے میری طرف جواباً دیکھتے ہوئے سوالیہ انداز میں پوچھا۔ ''جی دراصل میں ایک سچی کہانیاں لکھنے والا شوقیہ لکھاری ہوں نہ جانے مجھے کیوں محسوس ہوا کہ آپ کے اندر کوئی نہ کوئی کہانی لپٹی ہوئی ہے۔ لہٰذا معاف کیجیے گا برا نہ مانیے گا آپ کی اس ادھوری جسمانی کیفیت کو دیکھا تو میرے اندر تجسس پیدا ہوا کہ آپ سے پوچھوں کہ اس حالت کا اصل سبب کیا ہے......؟'' اس نے خلاف متوقع میری طرف مسکرا کر دیکھا۔ اور بولا۔ ''یار! تم بہت بعید نظر اور چھوٹی چھوٹی شے کا مشاہدہ کرنے والے معلوم ہوتے ہو۔ لیکن بیٹے! یہ بھرا بازار ہے یہاں کیسے میں تمہیں بتلاؤں کہ میرے ادھورے جسمانی اعضا کے ہونے کے اندر کیا کہانی پوشیدہ ہے اور دوسرے میں آپ کو صحیح طرح سے جانتا بھی نہیں کہ تم کون ہے......؟'' آیا کہ واقعی تم سچی کہانیوں کے مصنف ہو یا......؟ یا تمہارے مراد......؟'' میں نے ان سے تجسس کے انداز میں پوچھا۔ ''بیٹا! یا سے مراد یہ ہے کہ آج کل زمانہ بہت خراب ہے بہت سے نوسرباز فراڈ کرکے

معصوم لوگوں کو لوٹ لیتے ہیں۔"

"نہیں نہیں بزرگو! میرا (نام محمد رضوان قیوم) میں واقعی ملکی، غیر ملکی رسائل میں دلچسپ سچی کہانیاں لکھتا ہوں۔ اگر آپ کو یقین نہیں آ رہا ہو تو چلیں میرے ساتھ نزدیکی کسی رسائل، بک شاپ پر جہاں آپ کو میں اپنی لکھی کہانیاں شائع شدہ دکھا سکتا ہوں۔"

"اچھا تم ایسا کرو میرا ٹیلی فون نمبر لے لو۔ میں دراصل ایک پتھارے دار حکیم ہوں۔ (میرا نام صابر حسین) ہے۔" اس نے مجھے اپنا ایڈریس اور فون نمبر لکھوا دیا۔

"اچھا بیٹا عید کے ایک ہفتے بعد مجھ سے رابطہ قائم کرنا۔" جاتے جاتے میں نے اس سے عاجزانہ معذرت کی۔ "بزرگو! مجھے معاف کر دینا میں نے آپ کو ادھورا انسان کہا۔"

انہوں نے مسکرا کر کہا۔ "کوئی بات نہیں بیٹا! میں ہوں بھی تو ادھورا انسان۔ ایک انسان ہوں تم دل پرشاں کی نہ رہو۔" عید کی مجھے اتنی خوشی نہ تھی لیکن مجھے اصل انتظار اس ادھورے انسان کی کہانی سننے کا تھا۔ کیا وجہ ہے......؟ کیا کوئی حادثہ تھا اگر حادثہ تھا۔ کتنا عجیب تھا جو اس کو ادھورا بنا گیا ہے جو اس کی ایک آنکھ، بازو، ٹانگ، کان لے گیا...... یہ کیا ماجرہ ہے اس قسم کے بہت سے عجیب سوال در سوال میرے شعور، اعصاب کو تنگ کرنے لگے تھے۔

میں حسب وعدہ ان کے بتائے ہوئے پتے پر جب ان کے پتھارے پر پہنچا۔ جہاں وہ حکیمی نسخوں کا عطاری ٹھیہ لگائے بیٹھے تھے۔ انہوں نے مجھے پہچان لیا۔ میں بھی سلام کر کے ان کے پتھارے پر ہی بیٹھ گیا۔ اس پتھارے کے آگے مزید غریب لوگوں نے چھوٹی چھوٹی اشیا کو بیچنے کے لئے اسٹال وغیرہ لگائے ہوئے تھے۔ "یار! معاف کرنا میں پہلی نگاہ میں تمہیں سچی بات ہے کوئی چور اچکا، جیب کترا سمجھا۔" ہاں تو پہلے تمہیں چائے پلاؤں کیونکہ اس وقت تم میرے مہمان ہو۔ چل کر میرے پاس آئے ہو۔ چند لمحوں کے بعد چائے کی بے رنگی چھوٹی سی کیتلی اور پیالیاں ہمارے سامنے تھیں۔ "شکریہ۔" آپ نے مجھے اپنی کہانی سنانے کے لئے مواقع فراہم کیا۔ "یار! میرا نام، پتہ اور جگہ حفظ ماتقدم کے تحت تبدیل کر دینا۔" ہاں آپ بے فکر رہیں میں ہمیشہ اپنی لکھی سچی کہانیوں میں اس امر کا خاص خیال رکھتا ہوں۔ (قارئین میں نے اس کہانی میں راوی کا اصل نام سے لے کر جگہوں کے نام تبدیل کر دیئے ہیں۔ ایسا کرنا ادبی تقاضوں کے مطابق بہت لازمی تھا) صابر حسین نے کیتلی اٹھا کر اس میں چائے ایک گرم دھار کے ساتھ انڈیلی اور پھر پیالی میرے ہاتھوں میں تھماتے ہوئے کہا کہ "بیٹا! میری پیدائش ایک جدی پشتی حکیمی خاندان میں 1941ء میں دولت گاؤں میں ہوئی۔ میرے باپ کا نام اگرچہ نور محمد تھا لیکن گاؤں میں ان کا نام بگڑ کر نورا پڑ چکا تھا۔ پورا گاؤں انہیں حکیم نورا کہا کرتا تھا۔ میرے باپ کی جب شادی ہوئی تو میری ماں نے دو بیٹیوں کو اوپر تلے جنم دیا۔ میرے باپ کو اولاد نرینہ کی بہت خواہش تھی۔ انہوں نے چھوٹے موٹے مزاروں، سینکڑوں پیر فقیروں کے آستانوں میں بیٹے کی خواہش کے لئے دعائیں، مرادیں مانگیں۔ بہرحال نہ جانے کس کے سبب سے میری شکل میں خدا نے انہیں بیٹا دیا۔ بقول میرے باپ کے میں پیدائشی طور پر ہر لحاظ سے نارمل اعضا اور رواجی شکل کا مالک تھا۔ بقول میری ماں کے ایک دن جب میری عمر صرف 6 ماہ تھی اور میں اپنی ماں کی گود میں کلکاریاں مار رہا تھا کہ اچانک میری انگلی کسی کچے دھاگے کی طرح ٹوٹ کر میری ماں کے ہاتھوں میں آ گئی۔ گھر میں رونا دھونا پڑ گیا یہ کیسے ہو گیا......؟ سب ہکا بکا رہ گئے مجھے فوری طور پر راولپنڈی ڈاکٹر کے پاس لے جایا گیا وہاں ان کی سمجھ میں بھی کچھ نہ آیا۔ وہاں میری انگلی بھی کٹی اور الٹا انگلی کٹنے کا زخم اتنی حد تک پھیل گیا۔ میرا ہاتھ سوکھ کر لٹک کر اکڑ گیا۔ ڈاکٹروں نے مجھے ہر طرح کی دوائی، علاج سے ٹھیک کرنے کی سر توڑ کوشش کی لیکن ناکام رہے۔ وہ بالآخر میرے والدین کو کہتے تھے کہ:

"اگر اسے جسم سے جدا نہ کیا تو ہوسکتا ہے کہ کینسر بن جائے اس کے دل و دماغ کی جانب نہ اپنا سفر موت شروع کر دے۔" میرے باپ کا مطب گھر کی بغلی

جانب تھا۔ یہ دراصل مکان کی بیٹھک تھی۔ جسے مطب کی شکل دے دی گئی تھی۔ وہاں سارا دن رنگ برنگی بیماریوں پر مشتمل مریض آتے رہتے تھے۔ ابا کا کام اچھا تھا۔ اب میں ایک بازو سے محروم بچہ گھر میں چلنے پھرنے لگا۔ میرا سارا خاندان خاص طور پر میری بدقسمتی کو دیکھ کر روتے کہ اتنی سی عمر میں مجھے اتنی بھیانک پراسرار بیماری آن لگی تھی۔ ماں کہتی تھی کہ "کاش! میرا بازو کٹ جاتا" اس واقعہ کو بمشکل 3 سال گزرے تھے کہ مجھے یاد ہے۔ اس رات سخت سردی تھی ہم سب گھر والے میری دو بہنیں۔ میں سب سے چھوٹا اماں کے ساتھ لحاف میں گھسے، دبکے، لیٹے ہوئے تھے۔ ابا نے اس رات جلدی مطب بند کر دیا تھا۔ انہوں نے ماں سے کہا۔ "ایسا کرو۔ سب بچوں، اپنے اور میرے لئے دس انڈے ابال لے۔" ایک اور برا وقت ہمارا منتظر تھا۔ ماں نے جیسے ہی مٹی کے تیل کے سٹوپ پر دیا سلائی پھینکی۔ وہ دھڑام سے نہ جانے کس طرح گرا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے آگ ہی آگ پھیل گئی۔ اماں چیخی۔ "بچاؤ...... بچاؤ کی آوازیں گونجیں۔" مجھے اتنا یاد ہے کہ ہم سب بہن، بھائی والد سب جل رہے تھے۔ میری آنکھ اسپتال میں کھلی۔ تو میرے سامنے اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ مجھے اپنا جسم اس طرح محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی نے میرے جسم کی کھال کو ہلکی آنچ پر رکھا ہوا ہو۔ صرف رونے دھونے کی آوازیں کان پڑ رہی تھیں۔ سننے میں صاف محسوس ہو رہا تھا کہ یہ بہت سے لوگ بین کر رہے تھے۔ ہائے نورین میری بہن اور ماں جل کر مر گئی۔ باپ نے روتے ہوئے میرے ماتھے پر بوسہ دیا کہ یہ ہمارے ساتھ کیا انہونی ہو رہی ہے۔ میرا گھر تباہ برباد ہو رہا ہے۔ جب ڈاکٹروں نے میری پٹی کھولی تو یہ کیا انڈوں کے ابالنے کی آگ نہ صرف میری والدہ، بہن کو جلا کر راکھ کر گئی بلکہ میری دائیں آنکھ کی روشنی کو بھی مجھ سے محروم کر گئی تھی۔ اب صرف ایک آنکھ میں کچھ روشنی دیکھنے لائق باقی ہے۔ یہی نہیں بیٹا رضوان! میرے کان کا لووں کا چمڑا بھی بالکل ختم ہو کر بے جان ہو گیا تھا۔ اسے بھی ڈاکٹروں نے نشتروں سے کھینچ کر میرے وجود سے الگ کر دیا۔ اب میں صرف تین سال کی عمر میں ایک آنکھ، ایک کان اور بازو سے محروم ہو چکا تھا۔ میں اپاہج زندہ لاش بن کر رہ گیا تھا۔ میرا باپ اور بہن جو حادثے میں زندہ بچے تھے۔ مجھے حاجت زندگی کی ضروریات پورا کرنے میں مجھے سہارا دیا کرتے تھے۔ اب جو واقعہ اس سے آگے ہے جو آپ کو سنا رہا ہوں وہ میری دلخراش کہانی کی بہت اہم اور قابل فراموش کہانی ہے۔ ہوا یوں کہ وقت ایک تیز ہوا کی طرح گزرتا رہا میری عمر اس وقت 9 سال تھی۔ میری شکل و صورت کے نقش کافی حد تک کراہت انگیز میں تبدیل ہو چکے تھے۔ میرے پورے چہرے پر جلنے کے بڑے بڑے نشان اور کھال کھینچی، جلی صاف دکھائی دیتی تھی۔ پورے گاؤں کے شرارتی بچے مجھے ایک کان کاٹا کہا کرتے تھے۔ شروع شروع میں تو میں خوب ہراساں اور روتا تھا۔ بعد مجھے صبر آ گیا تھا۔ ایک شام کا واقعہ ہے کہ میں اپنے باپ کے ساتھ مطب میں بیٹھا ان سے ان کے آگے پڑی ہوئی جڑی بوٹیوں کے خواص، استعمال کے بارے میں بچگانہ طور پر معلومات حاصل کر رہا ہے کہ اچانک نہ جانے میرے باپ کو کیا ہوا ان کے جسم پر لرزہ ہو گیا۔ وہ بڑے بھیانک انداز میں کتوں کی آواز میں بھونکنے لگے۔ میں نے گھبرا کر ان سے پوچھا۔ "کیا ہوا ابا......؟ کیا ہوا ابا......؟" وہ کچھ نہ بولے، میں فٹا فٹ پڑوس میں بھاگا ہوا گیا۔ وہاں میں نے اپنے پڑوسی دھرم لالہ کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہ باہر ہڑ بڑا کر نکلا۔ "جی...... جی وہ ابا کو کچھ ہو گیا ہے۔" اس نے زور سے کوئی آواز دی۔ دو تین لوگ اور آ گئے۔ ہم جب مطب میں پہنچے تو وہاں ابا کے منہ سے خون اور سفید جھاگ مائل پانی رس رہا تھا وہ نیم بے ہوش اپنے ہاتھ جوڑے یہ کہہ رہے تھے کہ "مجھے معاف کر دے۔ خدا کے لئے میرے خاندان والوں کو بخش دے۔" ایک پڑوسی نے ان کے منہ پر پانی کا پورا گلاس انڈیل دیا۔ انہیں بڑی مشکل سے ہوش میں لا کر دھرم لالہ نے پوچھا۔ "ابے! بتلا یہ تجھے اچانک سے کیا دورہ پڑا ہے اور تو یہ کس سے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگ رہا تھا......؟" ابا نے میری جانب

دیکھا تو لپک کر پاگلوں کی طرح مجھے جھپٹا مار کر کہا کہ "خدا کے لئے میرے اس صابر حسین کو کہیں دور لے جاؤ وہ کالی چڑیل مجھے غصے سے کہہ رہی تھی کہ تو نے مجھے وقت سے پہلے غلط علاج کر کے مار دیا۔"

"واہ کیا پہیلیاں بجھوا رہا ہے۔ تو ذرا کھل کر اماں سے پوری بات بتا۔" ایک بزرگ نے ان سے کہا۔ "یہ غلط علاج سے تیرا کیا مطلب......؟" "مجھے سمجھ نہیں آیا کہ.... وہ یہ کیا کہہ رہی ہے؟" ابا نے کہا۔ "لیکن وہ یہ کہہ رہی تھی؟" ابا نے کہا۔ "میں تجھے کہتی رہی کہ مجھے ہڈیوں والی ٹی بی نہیں ہے لیکن تو مجھے غلط علاج کی غلط دوائی دیتا رہا۔ تو نے مجھے وقت سے پہلے عالم ارواح پہنچا دیا ہے۔ میں تو عزور سے محبت کرتی تھی۔ اس لئے مجھ سے شادی کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن تو نے مجھے وقت سے پہلے غلط غلط ملط دوائیاں دے کر مار دیا۔

لیکن یاد رکھ میری روح ابھی تک صحیح طریقے سے آسمان میں اپنی جگہ نہیں پہنچی۔ میں تجھ سے تیری اولاد سے ایسا بدلہ لوں گی جسے دیکھ کر دنیا تجھ پر تھوکے گی۔ میں تیرے لاڈلے صابر حسین کو ادھورا انسان بنا دوں گی۔" ابا کے منہ سے یہ کلمات سن کر وہاں کھڑے سب لوگوں نے اپنے مذہب کے مطابق توبہ والی عبادت (پراتھنا) کی جبکہ ابا یہ جان نہ سکے کہ انہوں نے کسی ایسی مریضہ کی ہڈیوں کی ٹی بی کا غلط علاج کیا ہے......؟ جو وقت سے پہلے مر گئی۔ بہرحال بقول انہیں اس قسم کی کوئی عورت یاد نہیں آ رہی تھی کیونکہ وہ کہتے تھے انہوں نے زندگی میں ہزاروں مریضوں کا اپنی عقل کے مطابق علاج کیا ہے۔ ہو سکتا ہے کسی عورت کا علاج بے ارادی سے ہو گیا ہو......؟ اب وہ مری ہوئی عورت کی روح چڑیل بن کر اس نیم حکیم خطرہ جان کی اولاد سے انتقام لے رہی ہے۔ میں نے کہا۔ "یہ آپ کی ٹانگ کیسے ٹوٹی ہے......؟" انہوں نے روتے ہوئے کہا۔ "میرے باپ کی زبان کے پیچھے درحقیقت وہ کالی چڑیل یہ کہہ کر دھمکی دے رہی تھی کہ تیرے بچوں سے عمر بھر کسی نہ کسی شکل میں انتقام لیتی رہوں گی۔" میرے باپ نے اس کے آگے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ "خدا کے لئے میرے بچوں کو معاف کر دے۔" تو وہ بولی۔ "انسان کسی کی خطا معاف کر سکتے ہیں لیکن ہم جن کو کوئی سزا دیتے یا ستاتے ہیں تو اس میں معافی کا تصور نہیں ہوتا۔"

میری ٹانگ درحقیقت 1953ء میں سیالکوٹ میں اس طرح ٹوٹی کہ میں ایک رات اندھیرے میں کسی قبرستان میں اپنے عزیز کو دفنانے گیا تھا تو وہاں ایک ٹوٹی خالی قبر میں بے دھیانی میں نہ جانے کیسے گر گیا۔ گرا کیا تھا مجھے ایسے لگا جیسے کسی غیر مرئی طاقت نے اپنی طرف کھینچ لیا تھا۔ خالی قبر میں گرتے ہی میرے ساتھ عجیب واقعہ پیش آیا وہ یہ کہ حیرت انگیز اور ناقابل یقین حد تک میرے ہوش اپنی جگہ پر نہ تھے۔

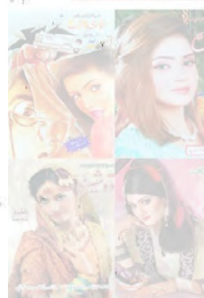
میں نے قبر کے اندر گری ہوئی حالت میں اوپر کی جانب دیکھا کہ ایک کالی سیاہ چڑیل جو کہ بہت دبلی، پتلی تھی وہ مجھے ہنستے ہوئے کہہ رہی تھی کہ "ابھی تو تم نے میرا اور انتقام دیکھنا ہے میرے انتقام کی آگ ابھی ٹھنڈی نہیں ہوئی ہے۔" مجھے اپنی لرزاش مافوق الفطرت یہ کہانی سناتے ہوئے بزرگ حکیم صاحب کہنے لگے کہ "بیٹا! کسی نے سچ ہی کہا ہے کسی کی یہ کرنی بعض دفعہ اس کی آنے والی نسلوں کو بھگتنی پڑتی ہے۔ یعنی بڑوں کے بد اعمالوں کی سزا ان کی اولادوں کے آگے کسی نہ کسی روپ میں آتی ہے۔"

آخر میں نے ان سے پوچھا کہ "آپ جو یہ حکیمی نسخے راہ چلتے مریضوں کو دیتے ہیں ایسا نہ ہو کہ آپ اپنے ابا کی طرح کہیں غلطی دہرائیں اور کوئی بدروح آپ کو یا آپ کی نسل کو نہ حق نقصان نہ پہنچائے۔" اس پر انہوں نے جواب دیا کہ "بیٹا! بتلاؤ میں اپاہج، غریب، یتیم اور کر بھی کیا سکتا ہوں؟ میں نے کسی نہ کسی طرح اپنی بہن اور اپنا پیٹ تو پالنا ہی تھا۔ میری بہن عالم جوانی میں ایک موذی بیماری کا شکار ہو کر 1959ء میں وفات پا گئی اور میں نے پھر زندگی بھر شادی نہ کرنے یہ سوچ کر ایسا نہ ہو کہ میں غلطی کروں اور بھگتنا کسی اور کو پڑے۔









جادوئی حصار

اقراء قریشی - راولاکوٹ

ہر طرف اندھیرا پھیلا ہوا تھا لمبے لمبے دیوقامت درخت ماحول کو مزید خوفناک بنا رہے تھے اور سامنے ایک عجیب الخلقت بلا کھڑی تھی جسے دیکھ کر دل حلق میں آرہا تھا کہ بلا کی چنگھاڑ نے......

زبان خلق کو نقارۂ خدا نہ سمجھنے والوں کیلئے ایک سبق آموز اور ذہن کو حیرت میں ڈالتی کہانی

جیک کچھ دنوں سے سوچ رہا تھا کہ بہت عرصہ ہوا ہم سارے دوست کہیں گھومنے پھرنے نہیں گئے۔ اس بار کسی اچھی سی جگہ گھومنے چلتے ہیں۔ ویسے بھی ان دنوں کالج سے چھٹیاں تھیں اور جیک بے چارا اکیلا بور ہو گیا تھا۔ جیک نے فوراً اپنا فون اٹھایا اور اپنے دوست جارج کو فون کیا۔ ایک ہی رنگ پر جارج نے فون اٹھا لیا اور کہنے لگا! "ہاں! تو جیک آخرکار تمہیں میری یاد آ ہی گئی، لیکن کیسے؟"

جیک فوراً بول اٹھا: "تم تو جیسے مجھے روز یاد کرتے ہو ناں، ویسے جب سے چھٹیاں ہوئی ہیں تم سب تو گم ہی ہو گئے ہو۔ ویسے میں سوچ رہا تھا کیوں ناں ہم کہیں گھومنے چلیں؟"

جارج خوشی سے کہنے لگا۔ "ہاں! ہاں کیوں نہیں یہ تو بہت اچھا آئیڈیا ہے۔ چلو پھر بتاؤ ہم کب چل رہے ہیں تاکہ میں سب کو انفارم کر دوں۔"

جیک بولا: ”بس پرسوں تیار رہنا تم انفارم کرو سب کو میں بھی بتا دیتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے بائے!“ جارج نے کہا اور رابطہ منقطع ہوگیا۔

☆......☆......☆

ہفتہ کی صبح سب تیار تھے اور جیک کے گھر پر موجود تھے۔ ایملی اور روز تو سب سے مل کر بہت خوش تھیں۔ جیک سب سے مخاطب ہوا اور کہنے لگا: ”جانے سے پہلے میں تم سب سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ ہم سب کہاں چلیں؟“

جارج بولا: یار اس دفعہ تو ہم کسی جنگل کی سیر کو چلتے ہیں؟“ ایملی اور روز نے بھی جارج کی بات پر اتفاق کیا اور خوش ہوکر کہنے لگیں: ”ہاں! ٹھیک ہے، بہت مزا آئے گا۔“

اور پھر سب لوگ جیک کی گاڑی میں سوار ہوگئے۔

گاڑی ابھی شہر کی حدود میں ہی تھی، سفر کرتے دو گھنٹے گزر چکے تھے۔ سب لوگ خوش گپیوں میں مصروف تھے اور آنے والے خطرے سے انجان منزل کی جانب بڑھتے جارہے تھے۔

جیک نے گاڑی ایک قصبے کے چھوٹے سے ہوٹل کے پاس روکی، وہ کئی گھنٹے سفر کرنے کے بعد اب تھک چکے تھے اور انہیں بھوک بھی لگ رہی تھی۔ تمام دوست گاڑی سے اتر کر ہوٹل کی جانب بڑھے۔ ہوٹل میں اتنا زیادہ رش نہیں تھا، انہوں نے کھانا منگوایا۔ جب تک کھانا آتا وہ آگے کی پلاننگ کرنے لگے۔

روز اکتاہٹ بھرے لہجے میں کہنے لگی۔ ”یار! میں تو ابھی سے تھک گئی ہوں۔ پتہ نہیں اور کتنا سفر کرنا پڑے گا۔“

ایملی نے بھی اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

جارج یہ سب سن کر کہنے لگا۔ ”تم دونوں تو ابھی سے اکتا گئی ہو وہاں پہنچ کر کیا خاک انجوائے کروگی؟“

جیک بولا۔ ”تم سب ہی نے جنگل جانے کا بولا تھا۔ اب تم سب کیا سمجھتے ہو وہ شہر میں ہی ہوگا کیا؟“

جارج کچھ کہنے ہی لگا تھا کہ ویٹر کھانا لے آیا اور ان سب کو دیکھ کر کہنے لگا۔ ”لگتا ہے آپ سب اس قصبے میں پہلی بار آئے ہیں۔“

جیک بولا۔ ”جی ہاں! ہم یہاں پہلی بار ہی آئے ہیں۔ وہ دراصل ہم سب گھومنے جارہے ہیں، بھوک لگی تو ہم سب یہاں رک گئے۔“

جیک کی بات سن کر ہوٹل کا مالک حیران ہوگیا اور پوچھنے لگا۔ ”تم لوگ کدھر گھومنے جارہے ہو؟“

ایملی اور روز کو اس کی یہاں موجودگی پہلے ہی ناگوار لگ رہی تھی اوپر سے اس کے بار بار سوال کرنے پر غصہ آنے لگا تھا۔ ایملی غصہ میں کہنے لگی: ”آپ کو کیا یہ بتانا ضروری ہے کہ ہم لوگ کہاں جارہے ہیں۔“

ہوٹل کا مالک ایملی کی بات سن کر مسکرایا اور کہنے لگا۔

”نہیں! نہیں! میرا مطلب یہ نہیں تھا میں تو بس یہ کہنا چاہتا تھا کہ یہاں سے آگے تین گھنٹے کی مسافت کے بعد شہر کا حدود ختم ہوجائے گا، تو آپ سب لوگ کدھر جارہے ہیں، آگے تو صرف جنگل ہے اور سنسان راستہ، اور جنگل ہے بھی بہت خطرناک۔“

جارج فوراً بول پڑا۔ ”بھئی! ہم اس جنگل کی جانب ہی تو جارہے ہیں۔“

جارج کی بات سن کر ہوٹل کے مالک کے تاثرات خوفزدہ دکھائی دینے لگے اور یہ بات سب نے محسوس کی پھر ہوٹل کا مالک کچھ کہے بغیر وہاں سے چلا گیا۔

ایملی کہنے لگی۔ ”بڑا ہی عجیب شخص تھا۔“ جیک، جارج اور روز نے بھی اثبات میں سر ہلایا اور کھانا کھانے لگے۔ جب وہ کھانا کھا چکے تو جیک نے پھر سے ہوٹل کے مالک کو بلایا اور بل ادا کیا۔ وہ سب کرسیوں سے اٹھے اور جانے لگے کہ انہیں پھر اس ہوٹل کے مالک کی آواز کی وجہ سے رکنا پڑا۔ ایک بار پھر سب کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات آگئے۔ ہوٹل کا مالک آگے بڑھا اور کہنے لگا: ”دیکھو! میں جانتا ہوں تم آج کل کے بچے پرانی باتوں پر یقین تو نہیں کرتے لیکن میں ایک بات بتاتا چلوں کہ اس جنگل سے متعلق عجیب وغریب باتیں جڑی ہیں جو بھی گیا ہے آج تک واپس نہیں آیا۔ میری مانو تم سب اپنا ارادہ بدل لو اور واپس چلے جاؤ۔“

ایملی تو پہلے ہی غصہ میں تھی کہنے لگی۔ ”ہماری مرضی

ہم جہاں بھی جائیں تم کون ہوتے ہو ہمیں روکنے والے اپنا کام کرو اور دوسروں کے معاملات سے دور رہو سمجھے!“ اور گاڑی کی جانب بڑھ گئی۔ روز بھی اس کو منانے اس کے پیچھے چل پڑی۔ جبکہ جارج اور جیک اس ہوٹل کے مالک جس کا نام چارلی تھا اس سے ایملی کے رویے پر معذرت کرنے لگا اور پھر وہاں سے سب چل دیئے۔

گاڑی پھر سے منزل کی جانب رواں دواں ہوچکی تھی۔ تین بج چکے تھے۔ تقریباً دو گھنٹے بعد شہر کا حدود ختم ہوچکا تھا۔ آگے جاتی سڑک سنسان تھی۔ سب خوش ہوگئے۔ جارج ایملی اور روز کو جگانے لگا جو کہ سوچکی تھیں۔ ایملی اور روز اٹھیں تو خوش ہوگئیں کیونکہ جنگل کی طرف جانے والی سڑک پر گاڑی رواں تھیں۔

جارج کہنے لگا: ”ہم سب کو بہت مزا آنے والا ہے۔ ہم یہ سب کالج جاکر سب کو بتائیں گے۔“ جیک کی بات سن کر سب کھلکھلا کر ہنسنے لگے۔

شام ہونے لگی تھی۔ سفر اب بھی جاری تھا۔ روز کہنے لگی۔ ”اب کتنا راستہ باقی ہے؟“ جیک کہنے لگا۔ ”یار! ہم سب ہی پہلی بار جارہے ہیں۔ خیر فکر نہیں کرو مجھے لگتا ہے ہماری منزل قریب ہی ہے۔“ اچانک اب پکے راستے کے بجائے کچا راستہ شروع ہوگیا اور تھوڑا ہی دور سامنے تین راستے دکھائی دینے لگے۔ جیک نے اندھیرا ہونے کی وجہ سے ہیڈ لائٹس آن کرلی تھیں۔ جیک نے گاڑی روک دی تھی۔

سب کہنے لگے۔ ”گاڑی کیوں روک دی؟“

جیک بولا۔ ”سامنے دیکھو!“ سب نے ایک ساتھ باہر کی جانب دیکھا تو وہ بھی پریشان ہوگئے۔ روز کہنے لگی۔

”اب کیا کریں؟ کس راستے کا انتخاب کریں؟“

جارج کہنے لگا۔ ”درمیان والا راستہ ٹھیک رہے گا۔“

”ایملی کہنے لگی: تمہیں کیسے پتا؟“

جارج بولا: ”میں تو بس ایسے ہی کہہ رہا تھا۔“ جیک کہنے لگا۔ ”چلو کوئی بات نہیں! اسی راستے پر چلتے ہیں۔ شاید یہ تینوں راستے ہی جنگل کی طرف جاتے ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔“ سب بولے اور گاڑی جیک نے درمیان والے راستے پر دوڑادی۔

جیسے ہی گاڑی درمیان والے راستے سے اندر داخل ہوئی۔ تمام راستے ختم ہوگئے اور ایسا لگنے لگا جیسے پیچھے کبھی کوئی راستہ تھا ہی نہیں۔ یہ بات کسی نے نوٹ نہیں کی تھی کہ واپسی کے تمام راستے بند ہوچکے تھے۔

سب خوشی سے جھوم رہے تھے کہ چلو اب تو منزل بہت قریب ہے۔ رات ہوچکی تھی۔ وہ سب جنگل کے وسط میں پہنچ چکے تھے۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ سب نے اپنی اپنی ٹارچیں آن کرلی تھیں۔ جیک اور جارج گاڑی سے سامان نکالنے لگے۔ ایملی اور روز بھی ان کی مدد کروانے لگیں۔

تھوڑی ہی دیر میں انہوں نے دو خیمے تیار کرلئے۔ سب نے ساتھ لایا ہوا کھانا کھایا پھر ایک خیمے میں جارج اور جیک جبکہ دوسرے خیمے میں روز اور ایملی سونے کے لئے چلی گئیں۔ کیوں کہ پورا دن سفر کرنے کے بعد سب بہت تھک چکے تھے۔

☆......☆......☆

رات کا نجانے کون سا پہر تھا کہ جیک کی آنکھ کھل گئی اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اسے کسی نے جان بوجھ کر اٹھایا ہو۔ جیک پہلے تو بہت حیران ہوا پھر اس نے سوچا کہ شاید یہ اس کا وہم ہو اور پھر سے سونے کے لئے لیٹ گیا۔ لیکن اب اسے نیند نہیں آرہی تھی۔ جنگل میں حشرات الارض کی آوازیں ماحول کو اور بھیانک بنا رہی تھیں۔ جیک سونے کی کوشش کررہا تھا کہ اچانک اس کے ذہن میں چارلی کی کہی ہوئی باتیں گونجنے لگیں۔ جیک نے ان خیالات کو ذہن سے جھٹکنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ ایسا نہ کرسکا۔

اچانک جیک کو لگا جیسے کسی نے اس کا نام پکارا ہو۔ جیک کو وہ آواز خیمے کے باہر سے آرہی تھی۔ پھر اچانک خیمے کے باہر کوئی سایہ چلتا ہوا دکھائی دیا۔ جیک نے سوچا شاید روز اور ایملی اسے ڈرانا چاہ رہی ہیں۔ وہ اٹھا اپنی ٹارچ آن کی اور خیمے سے باہر نکل آیا۔

باہر ہر طرف اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ لمبے لمبے دیو قامت درخت ماحول کو مزید خوفناک بنا رہے تھے۔

اچانک ہی جیک کو زور سے دھکا لگا اور وہ منہ کے بل زمین پر گر پڑا۔ دھکا بہت شدید تھا۔ جیک کی ٹارچ دور

جا گری تھی۔ جیک کو ایسا لگا تھا جیسے کوئی اس کے قریب سے بھاگا ہو، جیک کے کندھے میں شدید درد تھا اس سے اٹھا نہیں جا رہا تھا۔ اچانک اس کی نظر سامنے پڑی۔

سامنے ایک بہت ہی عجیب الخلقت شے کھڑی تھی۔ جسم اس کا انسانوں جیسا تھا جبکہ چہرہ اتنا بھیانک تھا کہ کوئی بھی شخص اسے دیکھ کر سانس لینا بھول جاتا۔ جیک کے ڈر کے مارے پسینے چھوٹ گئے۔

اچانک وہ بلا اس پر جھپٹی لیکن جیک ایک دم سائیڈ پر ہو گیا۔ جیک اپنی جان بچانے کے لئے اٹھا اور بھاگنا شروع ہو گیا۔ وہ بلا جیک کے پیچھے اب بھی تھی۔ جیک کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کہاں جائے۔ جیک چیخنا چاہتا تھا لیکن حلق سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ جیک اپنی پوری طاقت کے ساتھ بھاگتا جا رہا تھا کہ اچانک وہ کسی سے ٹکرایا اور پھر سے گر پڑا۔

جیک نے سامنے جو دیکھا تو اس کا دل حلق میں آ گیا، آگے ایک بوڑھی عورت کھڑی تھی جس کا دھڑ سر سے الگ تھا اور وہ اپنے ہاتھ میں اپنا سر اٹھائے کھڑی تھی۔

اس کو دیکھ کر جیک چیخنے لگا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کیا کرے۔ کیوں کہ اگر وہ پیچھے جاتا تو وہ بلا اسے مار ڈالتی جبکہ سامنے وہ عورت۔ وہ دونوں جیک کی طرف بڑھ رہے تھے۔

جیک کو اپنی موت یقینی نظر آ رہی تھی۔ جیک نے دائیں جانب دیکھا اور اندھا دھند بھاگنا شروع کر دیا اچانک ہی اس کا سر درخت کے ساتھ ٹکرایا اور وہ وہیں بے ہوش ہو کر گر گیا۔

☆......☆......☆

صبح کا اجالا ہر سو پھیل چکا تھا۔ ایملی اٹھی اور اس نے روز کو اٹھایا۔ پھر دونوں خیمے سے باہر آ گئیں۔ جنگل اب بھی سنسان پڑا تھا اور درختوں کی وجہ سے روشنی بہت کم جنگل میں داخل ہو رہی تھی۔ وہ دوسرے خیمے میں جارج اور جیک کو اٹھانے گئیں۔ خیمے میں داخل ہوتے ہی انہوں نے دیکھا جیک اپنے بستر پر موجود نہ تھا۔ انہوں نے فوراً جارج کو اٹھایا تو وہ آنکھیں ملتا ہوا اٹھ گیا۔ انہوں نے جیک کے بارے میں پوچھا تو اس نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ وہ کہنے لگا۔ ”شاید وہ تفریح کرنے کے لیے نکل گیا ہو ہم ان کا انتظار کرتے ہیں ہو شاید وہ تھوڑی دیر تک واپس آ جائے۔“ وہ سب جیک کا انتظار کرنے لگے۔

ایک گھنٹہ گزر گیا، اب سب کو تشویش ہونے لگی تھی۔ وہ تینوں بہت پریشان ہو کر جیک کی تلاش میں نکل گئے۔ وہ جیک کو تلاش کرتے ہوئے کافی دور تک آ گئے۔ وہ بہت تھک چکے تھے اسی لئے وہیں بیٹھ گئے۔

ابھی انہیں بیٹھے تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ ایملی کو سامنے سے جیک آتا دکھائی دیا۔ وہ فوراً چلا اٹھی۔ ”وہ دیکھو جیک۔“ سب تقریباً اس کی جانب دوڑ کر گئے۔ جیک کو دیکھ کر سب خوش ہوئے۔ لیکن اس کی حالت دیکھ کر پریشان ہو گئے۔ اس کے چہرے پر جگہ جگہ زخم لگے ہوئے تھے اور خون جم چکا تھا۔ وہ سب اسے لے کر خیمے میں آ گئے۔ سب جیک کی حالت دیکھ کر پریشان تھے۔ وہ جیک سے پوچھنے لگے کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔

تو جیک نے اپنے ساتھ رات کو گزری پوری صورتحال بتا دی۔ جیک کی بات سن کر سب ڈر گئے۔ روز اور ایملی تو بالکل رونے کے قریب ہو گئیں۔ اب ان سب کو چارلی کی کہی ہوئی باتیں یاد آنے لگیں۔

جارج کہنے لگا۔ ”ہمیں ابھی یہاں سے نکلنا ہوگا۔ کہیں ہم کسی بڑی مصیبت میں نہ پھنس جائیں۔ سب اٹھے اور سامان گاڑی میں رکھنے لگے۔ وہ چاروں جلدی سے گاڑی میں بیٹھ گئے۔ جیک نے گاڑی اسٹارٹ کی اور کچے راستے پر گاڑی دوڑانے لگا۔ وہ سب جلد سے جلد اس جنگل سے نکل جانا چاہتے تھے۔ ابھی گاڑی نے آدھا راستہ بھی طے نہیں کیا تھا کہ جیک کو گاڑی کو روکنا پڑی۔ کیونکہ سامنے راستہ ختم ہو چکا تھا۔ اب وہاں راستے کے بجائے لمبے اور گھنے درخت موجود تھے۔ ایک بار پھر وہ سب مصیبت میں پڑ چکے تھے۔ آگے جانے کا کوئی راستہ نہ تھا اور واپس پیچھے وہ جانا نہیں چاہتے تھے۔ ایملی خوف اور پریشانی کے عالم میں کہنے لگی: ”اب ہم یہاں سے کیسے نکلیں گے۔ لگتا ہے کہ یہ کوئی جادوئی چکر ہے۔“ روز بھی کہنے لگی: ”ہم لوگوں کو جلد سے جلد یہاں سے نکلنا ہوگا۔ رات ہو گئی تو ہم میں سے کوئی نہیں بچے گا۔“

”جلدی سب اپنا اپنا سامان لو اور گاڑی سے نکلو ہم پیدل چل کر ہی جنگل سے نکل جاتے ہیں۔“ ایملی اور روز کی بات سن کر جارج بولا۔ ”جیک نے بھی اس کی تائید میں سر ہلایا۔ پھر وہ چاروں گاڑی سے باہر نکل آئے اور ایک سمت میں چلنے لگے۔ وہ چاروں ایک دوسرے کے آگے پیچھے چل رہے تھے کہ اچانک جنگل خوفناک قسم کی چیخوں سے گونج اٹھا۔

چیخیں بہت تیز تھیں لگتا تھا کہ کانوں کے پردے پھاڑ ڈالیں گی۔ روز ڈر کے مارے زور زور سے چلانے لگی: ”مجھے گھر جانا ہے، ہمیں یہاں آنا ہی نہیں چاہئے تھا۔“ اور وہ پھر رونے لگی۔ ایملی اسے سنبھالنے کی کوشش کرنے لگی۔ جبکہ جیک اور جارج بھی اس کی حالت دیکھ کر پریشان ہو گئے۔

اچانک ہی چیخیں آنا بند ہو گئیں۔ ایملی نے روز کو سہارا دے کر اٹھایا جو کہ وہیں بیٹھ چکی تھی اور ایک بار پھر سب نے آگے بڑھنے لگے۔ کچھ ہی دیر گزری تھی کہ جنگل میں اندھیرا چھانے لگا۔ جو تھوڑی سی روشنی نظر آ رہی تھی۔ وہ بھی غائب ہو گئی۔ جیک فوراً بولا: ”سب لوگ اپنی اپنی ٹارچ آن کر لو۔“ اندھیرے کی وجہ سے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔

جیک نے جیسے ہی ٹارچ روشن کی تو دیکھا کہ روز اپنی جگہ پر نہیں تھی۔ جارج اور ایملی بھی روز کو وہاں نہ پا کر پریشان ہو گئے۔ ایملی رونے لگی۔ جبکہ جارج اور جیک اسے چپ کروانے کی ناکام کوشش کرنے لگے۔ وہ سب اب روز کو آوازیں دینے لگے۔ جنگل ان تمام لوگوں کی آوازوں سے گونج رہا تھا۔

اچانک ہی روز کے چلانے کی آواز آنے لگی۔

”مجھے بچاؤ! مجھے بچاؤ یہ مجھے مار ڈالے گی۔“ وہ تینوں اس سمت بھاگے جہاں سے آواز آ رہی تھی۔

اچانک ہی کیا دیکھتے ہیں کہ وہی خوفناک عورت ایملی کو بالوں سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے ایک جانب لے کر جا رہی تھی۔ ایملی مسلسل رو رہی تھی۔

جارج اور جیک فوراً روز کو بچانے کی خاطر آگے بڑھے۔ لیکن جیسے ہی وہ آگے بڑھے وہ عورت روز کو ساتھ لئے غائب ہو چکی تھی۔

اچانک ہی ایک خوفناک آواز آئی: ”تم میں سے کوئی بھی نہیں بچ پائے گا۔“ اور خوفناک قہقہے گونجنے لگے۔ جارج اور جیک بھی اب خوفزدہ ہو چکے تھے۔ یہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ بھی نہیں دکھائی دے رہا تھا۔ پھر بھی جیک ایملی اور جارج سے کہنے لگا: ”ہم سب کو ہمت کرنا ہوگی۔ ورنہ وہ ہمیں بھی مار ڈالے گی۔ ایک دوست کو تو ہم پہلے ہی کھو چکے ہیں۔“

ایملی کی آنکھوں میں پھر سے آنسو آ گئے۔

جارج، جیک اور ایملی پھر سے ایک جانب چلنے لگے۔ روشنی دوبارہ سے پھیل گئی تھی۔ انہوں نے اپنی ٹارچیں بند کر لیں۔ وہ احتیاط سے آگے بڑھتے جا رہے تھے۔

لیکن سامنے کا منظر دیکھ کر پھر سے ان کے ہوش اڑ گئے۔

کیونکہ سامنے درخت پر روز کی سر کٹی لاش لٹکی ہوئی تھی اور اس سے خون ٹپک رہا تھا۔ ایملی تو یہ سب دیکھ کر بے ہوش ہو گئی۔ جارج اور جیک خوفزدہ ہو گئے اور ایملی کو ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگے۔

جیسے ہی ایملی ہوش میں آئی جارج کہنے لگا۔ ”ایملی تمہیں خود کو سنبھالنا ہوگا ورنہ ہم اس جگہ سے کبھی نہیں نکل پائیں گے۔“ ایملی پھر سے اٹھی اور وہ تینوں پھر سے راستہ تلاش کرنے لگے۔

دوپہر ہو چکی تھی۔ وہ راستہ تلاش نہیں کر پائے تھے اور تھکن سے برا حال تھا، اور بھوک کی وجہ سے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے۔

ایملی نے اپنے بیگ سے بسکٹس نکالے اور وہ تینوں مل کر کھانے لگے۔ ابھی انہیں بیٹھے تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ پھر سے اندھیرا پھیلنا شروع ہو گیا اور پھر سے وہی چیخ و پکار شروع ہو گئی۔ تینوں ڈر کے مارے اپنی اپنی جگہ پر ساکت بیٹھے تھے اور دہلا دینے والی خاموشی ان پر کپکپی طاری کر رہی تھی۔

کہ اچانک چند لمحوں کے بعد جنگل جارج کی

چیخوں سے گونج اٹھا۔ جیک اور ایملی اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں پارہے تھے، ڈر کے مارے ایملی کا دل بند ہونے کو تھا کہ اچانک خاموشی چھا گئی۔

پھر رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا کہ اچانک جارج کی بھیانک چیخ سنائی دی، اور جب جارج کی چیخ سن کر ایملی اور جیک جاگے تو دیکھا کہ جارج سامنے درخت پر الٹا لٹکا ہوا تھا۔ اس کے منہ سے خون کا فوارہ جاری تھا، جارج مر چکا تھا۔ یہ دیکھ کر ایملی اور جیک خون کے آنسو رونے لگے۔

☆......☆......☆

صبح ہوئی تو ایملی اور جیک پھر سے راستہ تلاش کرنے لگے۔ دن سے شام ہونے لگی تھی۔ ایملی مسلسل روئے جارہی تھی وہ روتے ہوئے جیک سے کہنے لگی: ”اس نے روز اور جارج کو مارڈالا ہے اور ہم بھی زندہ نہیں بچیں گے دیکھنا ہماری لاش بھی کسی کو نہیں ملے گی۔“

جیک جو کہ خود بھی خوفزدہ تھا ایملی کو حوصلہ دیتے ہوئے کہنے لگا۔ ”جو بھی ہو ہمت مت ہارو، ہمیں یہاں سے نکلنا ہی ہوگا۔“ ایملی نے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر وہ دونوں پھر سے باہر نکلنے کا راستہ تلاش کرنے لگے۔ ایملی نے جیک کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔

وہ دونوں آگے بڑھتے جارہے تھے۔ رات ہو چکی تھی۔ ٹارچ انہوں نے آن کر رکھی تھی۔ صبح سے چل چل کر وہ بہت تھک چکے تھے۔ ایملی چلتے ہوئے جیک سے کہنے لگی: ”جیک! اب مجھ سے نہیں چلا جارہا، میں ذہنی اور جسمانی طور پر بہت تھک چکی ہوں۔ میں کچھ دیر آرام کرنا چاہتی ہوں۔“ جیک اس کی حالت دیکھ کر رضامند ہوگیا۔ ورنہ وہ تو اس عجیب وغریب جگہ سے جلد سے جلد نکل جانا چاہتا تھا۔

ایملی اور جیک بیٹھ گئے تو ایملی نے جیک کے کندھے پر سر رکھ کر آنکھیں موندلیں۔ جیک بیٹھے بیٹھے سوچنے لگا کہ اس جگہ سے کیسے نکلا جائے وہ انہیں سوچوں میں غرق تھا جبکہ ایملی نیند کی آغوش میں جا چکی تھی کہ ان کے پیچھے وہی عورت نمودار ہوئی اور ان کی جانب بڑھنے لگی۔ جیسے ہی اس نے جیک کو چھوا تو وہ زوردار جھٹکے سے دور جا گری۔ گرنے کی آواز سن کر فوراً ایملی جاگ گئی اور وہ دونوں دیکھنے لگے کہ وہ عورت سامنے گری ہوئی تھی۔ غصہ سے اس کی آنکھیں لال انگارہ ہوئی جارہی تھیں۔ ایک بار پھر وہ آگے بڑھی، اس بار اس کا نشانہ ایملی تھی۔ ایملی اس عورت کو اپنی جانب بڑھتا دیکھ کر ڈر کے مارے چیخنے لگی۔

لیکن جیسے ہی اس خوفناک بڑھیا نے ایملی کو چھوا اسے پھر سے زوردار جھٹکا لگا اور وہ دور جا گری، دو تین بار اس نے جیک اور ایملی کے قریب آنے کی کوشش کی لیکن ناکام ہوگئی پھر وہ وہاں سے غائب ہوگئی اور ایک آواز گونجنے لگی: ”تم دونوں کسی طور نہیں بچ پاؤ گے۔“

ایملی اور جیک بچ جانے پر بہت خوش تھے انہیں سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ کیسے بچ گئے اس عورت کے وار سے پھر ایملی کو یاد آیا کہ اس کے اور جیک کے گلے میں ہولی کراس ہے۔ دراصل ایملی اور جیک ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔ ایملی ہر اتوار کو چرچ ضرور جاتی تھی۔ اس بار جب وہ چرچ گئی تو وہاں سے اپنے اور جیک کے لئے ہولی کراس لے آئی۔ ایک اس نے خود گلے میں پہن لیا اور دوسرا جیک کو دیا اور جیک سے کہا کہ وہ اسے اپنے گلے میں ڈال لے اور یہ وعدہ بھی لیا کہ وہ اسے اتارے گا نہیں۔ جیک نے ایملی کی وجہ سے وہ ہولی کراس پہن لیا جو کہ اب تک اس کے گلے میں موجود تھا۔

ایملی بچ جانے کی خوشی میں جیک کے گلے لگ گئی اور رونے لگی جیک اسے چپ کروانے لگا اور کہنے لگا: ”ایملی تمہارا بہت شکریہ! آج تمہاری وجہ سے ہم دونوں کی جان بچ گئی۔ لیکن خطرہ ابھی ٹلا نہیں ہے۔ ہولی کراس کے ہوتے ہوئے وہ ہمیں کچھ کہہ تو نہیں پائے گی لیکن ہمیں اس جگہ سے نکلنا ضروری ہے۔“ ایملی اس کی بات سن کر سر ہلانے لگی۔ وہ دونوں بہت تھک چکے تھے۔ دونوں پر غنودگی طاری ہوئی اور پھر دیکھتے دیکھتے نیند کی وادی میں پہنچ گئے۔

☆......☆......☆

صبح کی روشنی تمام جانب پھیل چکی تھی۔ مگر اس گھنے اور خوفناک جنگل میں سورج کی کرنیں بڑی مشکل سے پہنچ رہی تھیں۔ جیک اٹھ چکا تھا۔ اس نے ایملی کو جگایا۔ دونوں

نے ایملی کے پاس موجود بسکٹس سے بھوک مٹائی اور ایک بار پھر راستے کی تلاش شروع کردی۔ جیک اور ایملی خوفزدہ تو اب بھی تھے کیونکہ بلا تو اب بھی نہیں ٹلی تھی۔ وہ آگے بڑھتے جارہے تھے کہ اچانک پھر سے اندھیرا چھیلنا شروع ہوگیا۔ وہ بھیانک عورت پھر سے قہقہے لگاتی نمودار ہوئی۔ ایملی جیک کے ساتھ لپٹ گئی۔ وہ عورت پھر سے ان دونوں پر حملہ آور ہوئی۔ لیکن پھر سے اس کا حملہ ناکام ہوگیا۔ وہ عورت پھر سے دور جا گری۔ ایک بار پھر وہ قہر آلود نظروں سے ان دونوں کی جانب دیکھنے لگی۔ ایملی دیکھ چکی تھی کہ وہ عورت انہیں کچھ نہیں کہہ پارہی تھی۔ اس لئے وہ غصے سے بولی: کیوں تم ہمیں مارنا چاہتی ہو؟ ہم نے کیا بگاڑا ہے تمہارا۔ تم نے ہمارے دوستوں کو بھی مار ڈالا۔ کیا چاہتی ہو تم ہم سے۔“

وہ عورت ایملی کی بات سن کر خوفناک آواز میں کہنے لگی: ”تم نے نہیں بگاڑا تو کیا۔ لیکن تم جیسوں نے ہی میری اتنی سالوں کی محنت برباد کرڈالی۔ کئی سالوں پہلے میں اس جنگل میں رہتی تھی۔ مجھے کالے جادو کا بہت شوق تھا۔ مختلف عاملوں اور جادوگروں سے میں نے کالا جادو سیکھنے کی فرمائش کی لیکن ہر کوئی منع کردیتا تھا۔

پھر ایک دن میں ایک بہت ہی بوڑھے جادوگر سے ملی جو کہ اپنی زندگی کے آخری دن بہت ہی بری حالت میں گزار رہا تھا۔ میں نے اس سے بھی کالا جادو سکھانے کی فرمائش کی لیکن وہ نہ مانا۔ میرے مسلسل اصرار پر وہ راضی تو ہوگیا لیکن ساتھ ہی اس نے یہ بھی بتایا کہ بلیک میجک سیکھنے میں نہ صرف بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا ہوگا بلکہ جان بھی جاسکتی ہے۔ لیکن یہ تمام باتیں بھی مجھے میری خواہش پوری کرنے سے نہ روک سکیں۔ پھر اگلے ہی دن سے اس جادوگر نے مجھے منتر بتایا جسے میں نے چالیس دن کرنا تھا۔

بہت سی آزمائشوں اور مشکلات کے بعد میں منتر کا جاپ کرتی رہی۔ وہ میرے منتر کا آخری دن تھا۔ میں سکون سے اپنے جاپ میں مصروف تھی کہ تمہاری ہی طرح کے کچھ نوجوان اس جنگل میں گھومتے گھومتے میرے قریب پہنچ گئے اور میرے جاپ کے دوران مجھے تنگ کرتے رہے۔

کچھ دیر تو میں یہ سب برداشت کرتی رہی لیکن آخر کار میرا ضبط جواب دے گیا اور میں یہ بھول گئی کہ جاپ کے دوران جو بھی ہوجائے اپنی جگہ سے ہلنا نہیں ہے۔

میں غصے میں اٹھی اور منتر پڑھ کر ان کی طرف وار کیا جس کی وجہ سے وہ نوجوان دور جا گرا لیکن اچانک ہی میرے گرد کالے کالے لباس پہنے کچھ لوگ آنے لگے۔ میں فوراً ہوش میں آئی اور مجھے سمجھ آ گیا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ لیکن تب تک بہت دیر ہوچکی تھی۔

اچانک ہی کچھ لوگوں نے مجھ پر وار کرنا شروع کردیئے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے سو لوگ مل کر مجھے کوڑے مار رہے ہوں۔ میں چیختی رہی کہ مجھے معاف کردو۔ لیکن میں نے یہ راستہ خود ہی چنا تھا پھر انہوں نے مجھے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹنا شروع کردیا اور میری گردن سر سے جدا کردی اور میرے جسم کو جلا ڈالا۔ تب سے اس جنگل میں جو بھی آتا ہے میں اسے نہیں چھوڑتی اور نہ ہی تم لوگوں کو زندہ جانے دوں گی۔ ایک مرتبہ پھر وہ آگے بڑھی۔

ابھی وہ ان دونوں سے کچھ قدم دور ہی تھی کہ ایملی نے فوراً جیک کو اپنا ہولی کراس اتار کر اس عورت کے گلے میں ڈالنے کے لئے بولا۔

جیسے ہی وہ عورت ایملی کے قریب آئی۔ جیک نے فوراً اپنا ہولی کراس اتار کر چشم زدن میں اس کے گلے میں ڈال دیا۔

ہولی کراس جیسے ہی اس کے گلے میں پڑا تو تمام جنگل خوفناک اور بھیانک چیخوں سے گونج اٹھا۔ ایسا لگتا تھا کہ یہ چیخیں کانوں کے پردے پھاڑ دیں گی۔ اس عورت کا وجود جلنے لگا۔ کچھ ہی دیر کے بعد وہاں کالا دھواں پھیل گیا۔ اور پھر جیسے ہی دھواں چھٹا ایملی اور جیک نے خود کو گاڑی کے پاس پایا۔ جان بچ جانے پر ایملی جیک کے گلے لگ گئی۔ دونوں فوراً گاڑی میں بیٹھے اور کچھ ہی دیر بعد وہ اس جنگل سے باہر تھے کیونکہ اس عورت کا جادو سے لگایا ہوا حصار ختم ہوچکا تھا۔ گاڑی فراٹے بھرتی شہر جانے والی سڑک پر رواں دواں ہوگئی۔



جن زادی

محمد قاسم رحمان۔ہری پور

یکدم ہوا کے جھونکے سے کھڑکی کے پٹ کھل گئے پھر کمرے کے ایک کونے سے دھواں اٹھنا شروع ہوگیا اور جب دھواں چھٹا تو ایک نوجوان کھڑا تھا اس کے وجود سے خون بہہ رہا تھا اور پھر نوجوان کی روح......

ایک جن زادی کی تہلکہ مچاتی اور دل پر سکتہ طاری کرتی کہانی، جو دل کے ہاتھوں مجبور تھی



اس نے ڈرتے سہمتے اور ہچکچاتے ہوئے گھر کی دہلیز سے اپنا پہلا قدم باہر رکھا تھا......دل تھا کہ زور زور سے دھک دھک کررہا تھا جیسے ابھی سینہ توڑ کر باہر نکل آئے گا......دماغ چلا چلا کر آگے قدم بڑھانے سے روک رہا تھا......اور کہہ رہا تھا کہ سوائے ذلت کے اس راستے کی منزل کوئی نہیں ہے جس پر وہ چلنے والی ہے......ابھی وقت ہے......موقع بھی ہے......اپنے قدم واپسی کی طرف موڑ لے......یہ نہ ہو کہ یہ وقت بند مٹھی میں ریت کی طرح پھسل جائے......لیکن دل، دماغ کی نفی کررہا تھا......اسے سمجھا رہا تھا کہ آج اپنی محبت ثابت کرنے کا دن ہے......دنیا پر ثابت کردو کہ تمہاری محبت نفسانی خواہشات سے پاکیزہ ہے......اور محبت کرنا گناہ نہیں ہے۔

جب عشق و محبت کے معاملے میں دل اور دماغ کی جنگ ہو تو اکثر دل کی آرزوئیں، دماغ کی ساری دلائل پر بھاری پڑجاتی ہیں......آج بھی دل اور دماغ کی اس جنگ میں دل کی جیت ہوئی تھی اور دماغ کی مات۔

اس نے اپنے قدم باہر نکال لئے......رات کا وقت تھا......اور موسم کے تیور بھی خطرناک تھے......گلی کوچے میں لوگ نہ ہونے کے برابر تھے۔ایسے میں اپنے حسین وجود کو ایک سیاہ چادر میں چھپائے وہ چل رہی تھی......اسے محسوس ہورہا تھا کہ اس کی ٹانگیں کپکپا رہی ہیں......اس وقت اس کا سارا کانفڈنس جھاگ کی طرح بیٹھ گیا تھا......وہ روڈ پر آگئی......

ہوا اور تیزی سے چلنے لگی تھی......اور ہلکی ہلکی بوندا باندی بھی شروع ہوگئی تھی......اچانک تیز ہوا کا جھونکا آیا اور اس کی چادر اس کے سر سے سرک گئی......اس بار نجانے کیوں دل اتنی زور سے دھڑکا تھا......جیسے کچھ برا ہونے والا ہو......

ابھی وہ اپنی چادر سنبھال نہیں پائی تھی کہ ایک ٹیکسی اس کے پاس آکر رکی۔

ڈرائیور نے اپنا سر باہر نکالا اور کہا۔"میڈم کہاں جانا ہے۔آئیں بیٹھ جائیں۔"

وہ پہلے ہی حواس باختہ تھی، اچانک ٹیکسی ڈرائیور کی بات سن کر جی جان سے کانپ اٹھی۔

پھر وہ پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی اور ٹیکسی ڈرائیور کو اپنی منزل کا بتایا......ٹیکسی چل پڑی۔

ٹیکسی ڈرائیور بھی بار بار بیک ویو میرر سے اسے دیکھ رہا تھا اور اس کے بارے میں مفروضے قائم کرنے کی

کوشش کر رہا تھا...... معصومیت اور خوف کے امتزاج نے اس کے حسن کو چار چاند لگا دیئے تھے۔

ٹیکسی میں بیٹھی وہ بدنصیب لڑکی اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھی...... جہاں تباہیاں اور رسوائیاں بانہیں پھیلائے اس کی منتظر تھیں۔

☆......☆......☆

طوفان آنے سے پہلے اپنی خبر نہیں دیتا...... اور جانے کے بعد اپنے اثرات چھوڑ جاتا ہے...... اس بستی سے بھی طوفان گزر چکا تھا اور اس کی تباہی ناقابل برداشت تھی۔ رو رو کر اس کا برا حال تھا اور کوئی دلاسہ دینے والا بھی نہ تھا...... اور پھر اس کے ماں باپ، بہن بھائی اور باقی سب رشتہ داروں کو اس جادوگر بھجن ناتھ نے مار ڈالا تھا...... لیکن وہ اپنی موت سے بھی بچ نہ سکا تھا......

اصل میں بھجن ناتھ ایک شیطانی جادوگر تھا......

اس کے آقا نے اسے حکم دیا تھا کہ اگر وہ اس جناتی بستی کو تباہ کرے گا تو اس کا شیطان آقا اسے مہان شکتی دے گا...... ایک دانست میں بھجن ناتھ نے ساری بستی کو صفحہ ہستی سے مٹا ڈالا تھا......

لیکن جن زادی روزینہ اس وقت بستی میں نہ تھی اس لئے وہ بچ گئی تھی...... اور یہی بات بھجن ناتھ کے آقا کے طیش کا سبب بنی تھی...... بھجن ناتھ کے شیطان آقا نے طیش میں آ کر اپنے بھگت بھجن ناتھ کی جان لے لی تھی۔

اور اب جن زادی روزینہ تنہا رہ گئی تھی اس کے آگے پیچھے کوئی نہ تھا، وہ لاوارث ہو کر رہ گئی تھی...... اس جادوگر نے اس سے اس کا سب کچھ چھین لیا تھا...... اسے تنہائی کا عذاب دے گیا تھا...... اس بستی میں جہاں اس نے آنکھیں کھولی تھیں۔ وہ بستی آج اجڑ چکی تھی۔ ویران ہو گئی تھی۔ روزینہ نے اپنے آنسو صاف کئے اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ایک پل میں روزینہ نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اس نے کیا کرنا ہے...... بھجن ناتھ جیسے جادوگروں کا خاتمہ کرنا ہے...... اور یہ جادوگر انسانی بستیوں میں پائے جاتے ہیں...... اس لئے اس نے انسانی بستی میں جانا تھا...... ایک خاندان حاصل کرنا تھا...... اپنے اوپر سے لاوارث کا ٹیگ اتارنا تھا...... اور اپنے مقصد کی تکمیل کرنی تھی......

☆......☆......☆

کرن کی آج گاڑی نہیں آئی تھی اس لئے وہ رکشہ لے کر گھر واپس آئی تھی...... کرن کالج میں سیکنڈ ایئر اسٹوڈنٹ تھی......

رکشہ نے کرن کو گھر سے ذرا دور اتار دیا تھا......

اور اب کرن پیدل ہی گھر کی طرف جا رہی تھی۔ گرمیوں کا موسم تھا اور گلیاں ایک دم سنسان و بیابان تھیں...... اچانک کرن کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کے پیچھے کوئی ہے۔ کرن نے مڑ کر دیکھا تو کوئی نہ تھا۔ وہ اسے اپنا وہم سمجھتے ہوئے آگے کی طرف چل پڑی۔ اچانک پیچھے سے کسی نے بہت زور سے کرن کے سر پر ڈنڈا مارا...... کرن گر گئی اور بے ہوش ہو گئی۔ اور آناً فاناً اس گلی میں وہ جن زادی روزینہ ظاہر ہوئی اور کرن کو اٹھا کر یوں اپنے کندھے پر ڈالا جیسے وہ کوئی موم کی بنی ہوئی گڑیا ہو...... اور غائب ہو گئی۔

کرن کو جب ہوش آیا تو اس نے اپنے آپ کو ایک کرسی سے بندھا ہوا پایا...... آس پاس کوئی نہ تھا...... تاحد نگاہ کوئی آدم زاد نہ تھا۔

وہ اس وقت ایک نخلستان میں قید تھی...... اچانک سامنے سے کوئی آتا ہوا دکھائی دیا...... کرن نے ذرا غور سے دیکھا تو وہ ایک لڑکی تھی...... جو نہایت باوقار چال چلتے ہوئے اس کے قریب آ رہی تھی...... وہ قریب آئی تو کرن نے دیکھا کہ اس لڑکی نے سفید رنگ کا فراک نما لباس پہن رکھا ہے۔ اس کے کھلے ہوئے حسین بال اس کے چہرے کے نقوش کے ساتھ اٹکھیلیاں کر رہے تھے......

کرن کو لگا دنیا کی حسین ترین صورت اس کے سامنے کھڑی ہے۔

بولنے کی ابتدا بھی اس حسین دوشیزہ نے کی۔

"ہمارا نام روزینہ ہے اور ہم ایک جن زادی ہیں...... آپ ہمارے حسن کے سحر سے باہر نکل کر غور کریں کہ آپ یہاں؟ اسوقت اس نخلستان میں ہماری قیدی کی حیثیت سے موجود ہیں۔"

روزینہ کی بات سن کر کرن کو احساس ہوا کہ وہ کسی

کی قید میں ہے۔ وہ سوچنے لگی کہ ابھی تک میں گھر نہیں گئی پتہ نہیں تایا جان کس قدر پریشان ہوں گے۔

روزینہ نے کہا۔ "ہاں واقعی تمہارے تایا جان بہت پریشان ہیں۔"

کرن حیرت سے بولی۔ "تمہیں کیسے پتہ کہ میں یہ سوچ رہی ہوں۔"

"شاید آپ نے پہلے سنا نہیں...... ہم ایک جن زادی ہیں...... بہت شکتی شالی۔ دوسروں کے دلوں کی بات جان لیتی ہوں۔"

آخری بات پر روزینہ کا لہجہ بھرا سا گیا۔ وہ غصے سے بولی۔ "کیا بکواس کر رہی ہو۔ اس سائنسی دور میں جن زادی، بھوت پریت کچھ نہیں، یہ صرف اور صرف ہماری بنائی ہوئی کہانیاں ہیں...... تم اپنی شعبدہ بازی بند کرو اور مجھے یہ بتاؤ کہ مجھے کیوں لائی ہو۔"

روزینہ چلتی ہوئی کرسی کے پاس آئی جس پر کرن بندھی ہوئی تھی۔ روزینہ نے کرن کے بالوں کو اپنی مٹھی میں لیا اور بولی۔ "بیوقوف آدم زادی...... تجھے میں ابھی یقین دلاتی ہوں کہ میں کون ہوں۔" اتنا کہتے ہی روزینہ لڑکی سے ایک خوب صورت چڑیا بن گئی اور کرسی کے آس پاس اڑنے لگی...... خوف کی وجہ سے کرن کی چیخیں نکل آئیں......

روزینہ واپس اپنی انسانی شکل میں آئی اور پوچھا۔

"اب یقین آ گیا ہے ناں کہ میں کون ہوں...... جن زادی ہوں۔" روزینہ نے چلا کر کہا۔

"ہاں یقین آ گیا۔" کرن ڈرتے ڈرتے بولی۔

"لیکن مجھ سے کیا چاہتی ہو۔"

"تمہاری جگہ۔" روزینہ نے جواب دیا۔

"میری جگہ کیا مطلب میرے نام تو کوئی پراپرٹی نہیں ہے جن زادی بہن۔"

"چلو ہم تمہیں شروع سے سب بتاتے ہیں۔" روزینہ نے کہا۔

"جیسا کہ تمہیں پتہ ہے کہ ہمارا نام روزینہ ہے اور ہم ایک جن زادی ہیں...... ہماری بستی تھی...... ایک خاندان تھا...... لیکن وہ بستی، وہ خاندان...... وہ آشیانہ ایک حاسد کی نظر کا شکار ہو گیا اور وہ بستی اجڑ گئی...... ہم لاوارث ہو گئے...... لیکن اب ہماری زندگی کا ایک ہی مقصد ہے...... اس حاسد بھجن ناتھ جیسے جادوگروں کا خاتمہ...... اور اس کے لئے ہمیں انسانی بستی میں رہنا ہوگا۔ کیونکہ یہ جادوگر اور سادھو انسانی بستیوں میں ہی رہتے ہیں...... اور انسانی بستی میں رہنے کے لئے ہمیں تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔"

کرن جو یہ سن کر حیران ہو رہی تھی اس نے پوچھا۔ "میں کیسے تمہاری مدد کر سکتی ہوں؟"

کرن کی بات سن کر روزینہ نے قہقہہ لگایا اور اچانک روزینہ بدل گئی اب اس کی جگہ ایک اور کرن کھڑی تھی۔

"یہ تم نے میری شکل کیسے اختیار کر لی۔" کرن نے خوف سے پوچھا۔

نقلی کرن ہنستے ہوئے بولی۔ "ہم تمہیں کتنی بار بتائیں کہ ہم جن زادی ہیں...... اور ہم کسی کا بھی روپ دھار سکتے ہیں۔"

"تو تم میری طرح یعنی کرن بن کر میری فیملی کے ساتھ رہو گی؟" کرن نے حیرت سے پوچھا۔

"بالکل میں یہی چاہتی ہوں۔"

"اور میرا کیا ہوگا...... کیا میں اس ویرانے میں قید رہوں گی...... دیکھو تمہیں اللہ کا واسطہ میرے اوپر اتنا بڑا ظلم نہ کرو مجھے میری فیملی سے جدا نہ کرو...... میں نے تمہارا بگاڑا کیا ہے۔" کرن رو رہی تھی۔

نقلی کرن نے کہا۔ "چلو تم پر رحم کھاتی ہوں اور تمہیں اس ویرانے میں نہیں رہنے دوں گی۔"

ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ وہ جگہ ایک خوب صورت اپارٹمنٹ بن گیا...... کرن کے ہاتھ رسیوں کی بندش سے آزاد ہو گئے وہ ایک صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی۔

نقلی کرن ہنستے ہوئے بولی۔ "دیکھا میری جناتی طاقتوں کا کرشمہ...... یہ ایک طلسمی گھر ہے...... اور تم اس میں رہو گی اور میں تمہارے گھر والوں کے ساتھ...... کرن

بین کرنا ہاہا۔"

"کرن رو رہی تھی وہ بولی "تو مجھو میں اپنے کزن عمیر سے پیار کرتی ہوں مجھے ان سے جدا نہ کرو... میں ان کے بنا نہیں جی سکتی۔"

"اوہ یہ پیار بھی کیا ظالم شے ہے۔ چلو میں تم سے وعدہ کرتی ہوں کہ اپنا مقصد پورا کرنے کے بعد تمہیں فیملی میں صحیح سلامت لوٹا دوں گی۔" نقلی کرن نے کہا اور غائب ہوگئی۔

اصلی کرن رونے لگی اور اب ویسے بھی وہ رونے کے سوا کر بھی کیا سکتی تھی۔

☆......☆......☆

سید وجاہت شاہ بڑی بے چینی سے کرن کو کال کررہے تھے مگر اس کا نمبر مسلسل آف جارہا تھا... شام کے پانچ بج چکے تھے اور وہ کالج سے ابھی تک واپس نہیں آئی تھی... عام طور پر وہ ایک بجے تک واپس آجاتی تھی مگر آج ابھی تک لوٹ کر نہ آئی تھی... وجاہت شاہ کا تو ٹینشن کے مارے برا حال تھا... عمیر بھی ابھی تک یونیورسٹی سے واپس نہیں آیا تھا... وجاہت عالم نے عمیر کو کال کی تو وہ بھی کال ریسیو نہیں کررہا تھا لیکن انہیں اپنے بیٹے کی طرف سے کوئی ٹینشن نہ تھی... کیونکہ وہ جانتے تھے کہ عمیر کلاس اٹینڈ کررہا ہوگا تب ہی اس کا موبائل خاموش ہے... اصل ٹینشن تو انہیں اپنی بھتیجی کی طرف سے تھی جو ابھی تک لوٹ کر نہ آئی تھی... طرح طرح کے وسوسے اور اندیشے ان کے دل میں آرہے تھے۔

اچانک دروازہ کھلا اور کرن گھر میں داخل ہوئی اس پر نظر پڑتے ہی وجاہت عالم نے بے صبری سے پوچھا۔ "کرن کہاں تھی تم... چار گھنٹے لیٹ گھر آئی ہو... کیا تمہیں پتا ہے کہ میں کس قدر ٹینشن میں تھا بی لو ہو رہا تھا میرا... کیوں کرتی ہو میرے ساتھ ایسا۔" وجاہت عالم بہت غصے میں لگ رہے تھے۔

"تایا جان آئی ایم ریئلی سوری... اصل میں کالج سے واپسی پر میں اور میری دوست روڈ کراس کررہی تھیں کہ اچانک میری دوست کا ایکسیڈنٹ ہوگیا میں اسے اسپتال لے کر گئی اور جب اس کی فیملی آگئی تو انہوں نے مجھے واپس بھیج دیا۔" کرن نے مکاری سے جواب دیا۔

"اوہ اب کیسی ہے تمہاری سہیلی؟" وجاہت عالم نے فکر کے ساتھ پوچھا۔

"بہتر ہے وہ پہلے سے۔" کرن نے جواب دیا۔

وجاہت عالم بولے۔ "سوری بیٹا مجھے تمہارے ساتھ اس لہجے میں بات نہیں کرنی چاہئے تھی۔ لیکن تم تو جانتی ہو کہ میں تمہارے معاملے میں کس قدر حساس ہوں... میرے بھائی کی واحد نشانی تم ہی تو ہو میرے پاس... تم میرے لئے عمیر سے بھی بڑھ کے ہو۔"

کرن آگے بڑھی اور وجاہت عالم کے سینے سے لگ گئی اس کا ضمیر چلا چلا کر کہہ رہا تھا۔ "روزینہ تم ان مخلص آدم زادوں کے ساتھ تم بہت غلط کررہی ہو۔"

اور کرن (روزینہ) سوچ رہی تھی کہ وہ اپنے ضمیر کی آواز سے کیسے پیچھا چھڑائے۔

☆......☆......☆

عمیر کی کلاس ہوچکی تھی اور اب وہ رمشا کی کلاس کے باہر کھڑا ہوا راؤنڈ لگا کر اس کی کلاس کے ختم ہوجانے کا انتظار کررہا تھا۔ رمشا فرنٹ سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی اور شاید اس نے عمیر کو کلاس کے باہر دیکھ لیا تھا تب ہی اپنی مسکراہٹ کو چھپا نہ سکی اور سر عمران نے شاید رمشا کو مسکراتا ہوا دیکھ لیا تھا تب ہی اپنا لیکچر روک کر بولے۔

"بیٹا میں تنگ ہوتا ہوں اپنی توجہ لیکچر پر دو۔"

اور پھر اللہ اللہ کرکے رمشا کی کلاس کا ٹائم اوور ہوا اور رمشا کلاس سے باہر نکلی۔

"اوہ کتنی دیر لگادی تمہیں پتا ہے کہ میں پچھلے ایک گھنٹے سے تمہارا انتظار کررہا ہوں۔" عمیر غصے سے بولا۔

"اس میں میرا کیا قصور... تمہیں تو پتہ ہے ناں کہ کلاس کی ٹائمنگ کیا ہے۔"

"اچھا کلاس کی ٹائمنگ کا تو مجھے پتا ہے لیکن مجھے تم ایک بات بتاؤ۔" عمیر غصے سے بولا۔ "وہ لڑکا جو تمہارے پیچھے بیٹھا ہوا تھا تم سے کیا بات کررہا تھا۔"

اب وہ دونوں ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔

"اوہ" رمشا اپنی مسکراہٹ دباتے ہوئے بولی۔ "وہ لڑکا مجھے پرپوز کررہا تھا۔"

"وہاٹ ربش... یہ کیا بکواس کررہی ہو۔" عمیر نے سے کہا۔

"ریلیکس یار میں مذاق کررہی تھی... ٹینشن کیوں لے رہے ہو۔" رمشا نے کہا۔ "اور رہا اس لڑکے کا سوال تو وہ لڑکا مجھ سے نوٹس مانگ رہا تھا۔"

"یار مجھے اس طرح کا مذاق نہیں پسند۔" عمیر نے منہ پھلاتے ہوئے کہا۔

"اوکے بابا موڈ آف نہ کرو... کل شام کو میں اپنی دوست کی شادی میں جب جارہی تھی تب میں نے تمہیں تیار ہوکر مس کیا تھا، دیکھا تم نے۔" رمشا نے پوچھا۔

عمیر بولا۔ "پہلے تو نہیں دیکھا لیکن ابھی دیکھ لیتے ہیں۔" اتنا کہہ کر عمیر نے پاکٹ سے اپنا سیل فون نکالا تو کئی مسڈ کالز تھیں... عمیر نے مسڈ کالز چیک کیں تو اس کے ابو وجاہت عالم کی مسڈ کالز تھیں۔ عمیر ایک دم پریشان ہوگیا۔

رمشا نے عمیر کو پریشان دیکھا تو اس نے پوچھا۔ "کیا ہوا ہے عمیر سب خیریت تو ہے ناں۔"

"یار ابو کی مسڈ کال ہیں، انہیں پتا ہے کہ اس ٹائم میری کلاس ہوتی ہے پھر کیوں کال کررہے ہوں گے۔" عمیر نے کہا۔

رمشا بولی۔ "تو پریشان ہونے کے بجائے انہیں کال کرکے پوچھ لوناں۔"

اوکے۔" عمیر نے کہا اور اپنے والد کا نمبر ڈائل کیا۔ "ہیلو بیٹا" دوسری رنگ پر کال ریسیو کرلی گئی تھی، ابو آپ کی مسڈ کالز ہیں، سب خیریت ہے ناں۔" عمیر نے پوچھا۔

"ہاں بیٹا وہ اصل میں کرن گھر واپس نہیں آئی تھی۔ تب میں پریشان ہوگیا تھا۔" وجاہت عالم بولے۔ "لیکن اب کرن آگئی ہے۔

"کرن اس ٹائم آئی ہے وہ تو دو بجے تک کالج سے واپس آجاتی ہے اور اب تو ساڑھے پانچ بج چکے ہیں۔" عمیر نے کہا۔

"وہ بیٹا اصل میں اس کی دوست کا ایکسیڈنٹ ہوگیا تھا اس لئے وہ لیٹ ہوگئی۔" وجاہت عالم نے کہا۔

"اوکے میں گھر آکے بات کرتا ہوں۔" عمیر بولا۔

"ٹھیک ہے بیٹا اللہ حافظ۔"

عمیر نے کال کاٹ دی۔ رمشا اس کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ اس نے پوچھا۔

"یہ کرن کون ہے؟"

عمیر بولا۔ "تمہیں بتایا تھا ناں کہ میرے چچا کی بیٹی ہے۔ چچا چچی کی ڈیتھ کے بعد وہ ہمارے ساتھ رہتی ہے۔"

اوکے۔ رمشا بولی۔ چلو کیفے چلتے ہیں۔

"نہیں یار آئی ایم سوری میں نہیں جاسکتا مجھے پہلے گھر جانا ہوگا۔"

"اوکے کوئی بات نہیں۔" رمشا نے ہمیشہ کی طرح عمیر کے ساتھ کو آپریٹ کیا۔ عمیر کو رمشا کی یہی عادت بہت پسند تھی۔

☆......☆......☆

کرن کے کمرے میں روزینہ جو کہ کرن کے روپ میں تھی، کرن کی چیزوں کا جائزہ لے رہی تھی کہ اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی۔ نقلی کرن اپنے کمرے سے باہر نکلی اور دروازہ کھولا... سامنے ایک لڑکا کھڑا تھا۔ نقلی کرن سمجھ گئی کہ یہی عمیر ہے۔

"کیسی ہو کرن؟؟" عمیر نے پوچھا۔

"ٹھیک ہوں... آپ بیٹھیں میں آپ کے لئے پانی لاتی ہوں۔" کرن بولی۔

"نہیں۔" عمیر نے نفی میں سر ہلایا۔ "تم میرے لئے پانی نہ لاؤ کیونکہ مجھے پیاس نہیں ہے۔ یہ بتاؤ ابو کہاں ہیں۔"

"اوپر اپنے کمرے میں آرام کررہے ہیں تایا

جان۔‘‘ کرن نے جواب دیا۔

’’ابو بتا رہے تھے کہ آج تمہاری دوست کا ایکسیڈنٹ ہوگیا تھا۔‘‘ عمیر نے پوچھا۔

’’میری دوست کا ایکسیڈنٹ۔‘‘ کرن نہ سمجھتے ہوئے بولی۔ پھر ایک دم سے اپنی گڑھی ہوئی کہانی یاد آگئی۔

’’اوہ آج کالج سے واپسی پر میرے ساتھ رملہ تھی اس کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے۔‘‘ نقلی کرن نے کہا۔

’’اوہ چلو چلتے ہیں اسے دیکھنے کے لئے۔‘‘ عمیر نے آفر کی۔

’’نہیں۔‘‘ کرن جلدی سے بولی۔ ’’اس کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ میں پہلے ہی اسپتال میں اس کے ساتھ دو گھنٹے گزار چکی ہوں...... اس کی فیملی نے زبردستی مجھے گھر بھیجا ہے۔‘‘

’’اوکے فائن......‘‘ عمیر بولا۔

☆......☆......☆

روزینہ کو کرن بنے ہوئے ایک مہینہ گزر گیا تھا۔ اس ایک مہینے میں روزینہ بالکل بدل گئی تھی...... اس کے مقاصد بدل گئے تھے۔ اس کے جینے کی وجہ بدل گئی تھی۔ اب انسانی زندگی گزارنا اسے اچھا لگنے لگا تھا...... وہ عمیر سے محبت کرنے لگی تھی...... وہ یہ بات بھول گئی تھی کہ وہ آگ سے بنائی گئی ہے اور عمیر کو مٹی سے پیدا کیا گیا ہے۔

روزینہ عمیر کی محبت میں گرفتار ہوگئی تھی اور وہ عمیر کو جنون کی حد تک چاہنے لگی تھی۔ اس نے ارادہ کرلیا کہ وہ اپنے اور عمیر کے درمیان کی ساری دیواروں کو گرا دے گی۔

روزینہ کے راستے میں پہلا کانٹا اصلی کرن تھی جو اس کے حلق میں پھانس کی طرح چبھ رہی تھی۔ اس نے فیصلہ کرلیا کہ وہ اس کانٹے کو سب سے پہلے اپنے راستے سے ہٹائے گی اس لئے وہ اس طلسمی اپارٹمنٹ میں آگئی جو اس نے اپنی طاقتوں کے بل بوتے پر کرن کے لئے بنایا تھا۔

کرن صوفے پر سوئی ہوئی تھی...... اس کا متورم چہرہ گواہی دے رہا تھا کہ وہ روتی رہی تھی......

’’کرن......‘‘ روزینہ نے کرن کے پاس آکر اس کو پکارا تو کرن اٹھ کر بیٹھ گئی۔

’’اوہ شکر ہے۔‘‘ کرن بولی۔ ’’تم آگئی......‘‘

’’یقیناً تمہارا مقصد بھی پورا ہوگیا ہوگا۔ اب مجھے میری فیملی کے پاس جانے دو دیکھو تم نے وعدہ کیا تھا۔‘‘

روزینہ جھٹ بولی۔ ’’ہاں کیا تھا میں نے وعدہ...... کہ جب میرا مقصد پورا ہوجائے گا میں تمہیں جانے دوں گی...... لیکن مجھے پیار ہوگیا ہے...... اور جانتی ہو کس سے...... تمہارے کزن عمیر سے...... اور میں اسے پاکر رہوں گی۔‘‘

کرن زور سے چلائی۔ ’’منحوس جن زادی کیا تیرا دماغ خراب ہوگیا ہے۔‘‘

’’ہاں ہوگیا ہے دماغ خراب۔‘‘ روزینہ نے جواب دیا۔ ’’اور عشق نے کیا ہے میرا دماغ خراب...... لیکن اب تیری قسمت خراب ہونے والی ہے...... تو بے موت مرنے والی ہے۔‘‘

کرن نے پوچھا۔ ’’تو مجھے کیوں مارے گی۔‘‘

روزینہ بولی۔ ’’کیونکہ تو میرے راستے کا کانٹا ہے اور مجھے اس کانٹے کو ہٹانا ہے۔ ہر حال میں ہٹانا ہے۔‘‘ اتنا کہہ کر روزینہ نے کرن کی گردن پکڑلی اور اسے دبانے لگی۔ کرن نے اپنے آپ کو چھڑانے کی بہت کوشش کی لیکن بے سود...... آخر کرن کی جان نکل ہی گئی اور پھر روزینہ وہاں سے غائب ہوگئی۔

☆......☆......☆

نقلی کرن ٹیرس پر کھڑی تھی جب عمیر اس کے پاس آیا۔

’’کیا ہو رہا ہے کرن۔‘‘ عمیر نے فرینڈلی پوچھا۔

’’کچھ نہیں بس ویسے ہی ٹائم پاس کررہی ہوں۔‘‘ کرن نے جواب دیا۔

عمیر بولا۔ ’’اس کا مطلب ہے کہ ابھی فری ہو۔‘‘

’’ہاں فری ہی سمجھیں۔‘‘ کرن نے کہا۔ ’’کوئی کام ہے کیا؟‘‘

’’کام......‘‘ عمیر اپنے ماتھے کو کھجاتے ہوئے بولا۔ ’’ہاں کام ہی سمجھو آؤ کمرے میں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔ اور دونوں کمرے میں پہنچ گئے۔

’’ہاں جی اب بولیں۔‘‘ کرن بیٹھتے ہوئے بولی۔

’’کرن میں تم سے واضح طور پر بات کرنا چاہتا ہوں۔‘‘ عمیر نے کہا۔

’’جی میں سن رہی ہوں۔‘‘ نجانے کیوں اسے لگ رہا تھا کہ عمیر کوئی بہت اہم بات کرنے والا ہے۔

عمیر نے کہنا شروع کیا۔ ’’کرن جیسا کہ تم جانتی ہو کہ میری اور تمہاری منگنی بچپن میں ہمارے بڑوں کی رضامندی سے ہوگئی تھی...... لیکن کرن زندگی ہم نے گزارنی ہے...... زمانہ بدل گیا ہے...... جو آپ کا ہمسفر بننے والا ہو اس کی سوچ تم سے ملنی چاہئے دل تو اپنے آپ مل جاتے ہیں...... اور کرن میں نے نوٹس کیا ہے کہ تمہاری اور میری سوچ ایک دم مختلف ہے...... ہم ساتھ خوش نہیں رہ سکیں گے۔ انفیکٹ میں تمہیں خوش نہیں رکھ پاؤں گا...... تم سمجھ رہی ہو ناں کہ میں کیا کہنا چاہ رہا ہوں۔‘‘ عمیر نے استفہامیہ نظروں سے کرن کی طرف دیکھا۔

کرن اٹھ کر کھڑی ہوگئی اور رخ پھیر لیا کہ کہیں اس کی آنکھوں کے آنسو عمیر نہ دیکھ لے...... اس کے دماغ میں آوازیں گونج رہی تھیں۔ ’’ایک جن زادی کی آنکھ میں آنسو اور وہ بھی ایک انسان کی وجہ سے...... کیا فائدہ ہوا اس معصوم کرن کی جان لینے کا۔

’’کرن اس قدر خاموش کیوں ہو کچھ بولو تو سہی۔‘‘ عمیر نے کہا۔

کرن نے اپنی آنکھوں سے آنسو صاف کئے اور عمیر کی طرف مڑی۔

’’عمیر یہ سچ ہے کہ میں آپ سے بے پناہ محبت کرتی ہوں، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں آپ کو حاصل بھی کرنا چاہتی ہوں...... میں صرف اتنا چاہتی ہوں کہ آپ خوش رہیں کیونکہ آپ کی خوشی میں میری خوشی ہے...... اور اب آپ مجھے بتائیں کہ آخر آپ کی خوشی ہے کس میں...... تاکہ تایا جان کو منانے میں آپ کی مدد کرسکوں۔‘‘

’’مجھے تم سے اسی سمجھداری کی امید تھی۔‘‘ عمیر نے کہا۔ ’’لیکن پھر بھی آئی ایم سوری۔‘‘

’’سوری فار وہاٹ؟‘‘

’’کیا میں تمہاری محبت کا جواب محبت سے نہیں دے سکتا۔‘‘ عمیر نے کہا۔

کرن بولی۔ ’’میں آپ سے محبت کرتی ہوں بزنس نہیں۔‘‘ عمیر مسکرانے لگا۔

’’اچھا اب بتائیں کہ وہ کون ہے جس کے ساتھ آپ کی سوچ ملتی ہے؟‘‘ کرن نے پوچھا۔

عمیر بولا۔ ’’اس کا نام رمشا ہے۔ ہم کلاس فیلوز ہیں لیکن وہ دوسرے سیکشن میں ہے۔‘‘

’’اوکے کب ملوائیں گے اس سے۔‘‘ کرن نے پوچھا۔

’’جب تم ملنا چاہو ملوا دوں گا کیا یاد کرو گی۔‘‘ اتنا کہہ کر عمیر ہنسنے لگا تو کرن کو بھی بادل نخواستہ اس کا ساتھ دینا پڑا۔ مبادا اسے شک نہ ہوجائے۔

☆......☆......☆

صبح کے نو بج رہے تھے۔ آنکھوں پر سن گلاسز چڑھائے ہوئے نقلی کرن گلیوں میں اپنے مطلوبہ گھر کو ڈھونڈ رہی تھی۔ اچانک اسے ایک لڑکا اپنی طرف آتا ہوا نظر آیا۔

’’ایکسکیوزمی۔‘‘ کرن نے کہا۔ ’’کیا آپ مجھے بتاسکتے ہیں کہ نائلہ کا گھر کون سا ہے۔‘‘

’’جی شاید آپ افضل انکل کے گھر کا پوچھ رہی ہیں۔ نائلہ باجی ان کی بیٹی ہیں...... یہ سامنے والا گھر ان کا ہے۔‘‘

’’اوکے تھینکس......‘‘ کرن نے کہا اور آگے بڑھ کر دروازے پر دستک دی۔

’’جی آپ کون؟‘‘ دروازہ کھولنے والی لڑکی نے استفسار کیا۔

’’جی مجھے نائلہ سے ملنا ہے کیا وہ یہیں پر رہتی ہیں۔‘‘

”میں ہی نائلہ ہوں۔“ وہ لڑکی بولی۔

”او کے کیا ہم اندر تھوڑی دیر بیٹھ کر بات کر سکتے ہیں؟“ کرن نے پوچھا۔

نائلہ ایک طرف ہٹتے ہوئے بولی۔ ”ٹھیک ہے اندر آ جائیں۔“ کرن کو نائلہ نے ڈرائنگ روم میں بیٹھایا اور پوچھا۔

”چائے چلے گی یا کافی۔“

کرن نے سن گلاسز اتارتے ہوئے کہا۔ ”کچھ نہیں بس آپ میری بات سن لیں۔“

نائلہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ”ٹھیک ہے فرمائیں میں ہمہ تن گوش ہوں۔“

کرن نے کہا۔ ”پہلے آپ مجھے ایک بات کا جواب دیں کیا آپ کو پیار ہوا ہے۔“

”الحمدللہ میں اس بیماری سے محفوظ ہوں لیکن اپ کیوں پوچھ رہی ہیں۔“

”لیکن میں نے محبت کی ہے۔“ کرن نے نائلہ کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ”دل و جان سے چاہا ہے اپنے محبوب کو...... اور جانتی ہو میری محبت کون ہے...... تمہارا کلاس فیلو اور بیسٹ فرینڈ عمیر عالم...... عشق کرتی ہوں میں اس سے...... وہ میرا فرسٹ کزن ہے۔“

”کیا؟“ نائلہ حیرت اور تذبذب کا شکار ہونے لگی۔ ”تو آپ ہیں کرن شاہ...... عمیر کی کزن...... لیکن عمیر اور رمشا ایک دوسرے کو بہت پسند کرتے ہیں۔ آپ کا One Sided Love ان کی محبت کی تباہی کا باعث بن سکتا ہے۔“ ”اور اس معاملے میں، میں کیا کر سکتی ہوں۔“

کرن، نائلہ کی بات سن کر صوفے سے اٹھی اور کرن کے پاس زمین پر آ کر بیٹھ گئی اور اس کے دونوں ہاتھ تھام لئے۔ ”تم میری مدد کر سکتی ہو...... میرا ساتھ دو...... عمیر صرف اور صرف میرے ساتھ خوش رہ سکتا ہے...... اسے میرا بنانے میں میری مدد کرو۔“ آنسو کرن کے گالوں سے بہتے جا رہے تھے۔

کرن اپنے آنسوؤں کو صاف کرتے ہوئے اٹھی اور اپنے بیگ سے دو لاکھ روپے نکالے۔ اور نائلہ کی گود میں رکھتے ہوئے بولی۔ ”یہ دو لاکھ روپے ہیں...... میرا کام کر دو تو پانچ لاکھ اور ملیں گے...... دیکھو عمیر، رمشا سے محبت نہیں کرتا وہ صرف وقتی کشش ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ دم توڑ دے گی...... وہ اس کے ساتھ خوش نہیں رہ پائے گا...... کیا اپنے دوست کی خوشی کے لئے میری مدد نہیں کرو گی۔“

”او کے فائن۔“ نائلہ بولی۔ ”میں تمہارا ساتھ دینے کے لئے تیار ہوں صرف عمیر کی خوشی کے لئے۔ بتاؤ مجھے کیا کرنا ہوگا۔“

کرن کے چہرے پر طمانیت بھری مسکراہٹ پھیل گئی، اپنی منزل کے حصول کے لئے وہ پہلا کامیاب قدم اٹھا چکی تھی۔ وہ نائلہ کو اس کا کام سمجھانے لگی۔

☆......☆......☆

سمسٹر کا رزلٹ آ چکا تھا۔ نائلہ نے اپنی کلاس میں ٹاپ کیا تھا...... نائلہ عمیر کی توسط سے رمشا کو بھی بخوبی جانتی تھی۔ بلکہ وہ دونوں اچھی سہیلیاں تھیں۔ ٹاپ کرنے کی خوشی میں نائلہ اپنے دونوں بیسٹ فرینڈ عمیر اور رمشا کو ٹریٹ دے رہی تھی۔ وہ تینوں اس وقت ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھے ہوئے تھے۔

رمشا نے کہا۔ ”نائلہ اس بار تو تم نے واقعی کمال کر دیا۔“

”ہاں بس اللہ کی مہربانی ہے۔“ نائلہ نے کہا۔

”ہاں اور تمہاری محنت کا صلہ ہے۔“ عمیر نے کہا۔

”اب تم دونوں بتاؤ۔“ نائلہ نے کہا۔ ”شادی کا کب تک پروگرام ہے۔“

”شادی کا تو ابھی کوئی ارادہ نہیں۔“ رمشا مسکراتے ہوئے بولی۔ ”میں نے پہلے بی بی اے کمپلیٹ کرنا ہے۔ اس کے بعد ایم بی اے پھر سوچوں گی۔“

”اور تم عمیر؟“ نائلہ نے عمیر کی طرف دیکھا۔

”میرے خیالات بھی رمشا سے ملتے جلتے ہیں۔“ عمیر نے کہا۔

”یار یہ کیسی دو نمبر محبت ہے تم دونوں کی...... محبت کرنے والے تو اپنے ملن کی گھڑیاں گنتے رہتے ہیں...... اور تم دونوں......“

”نہیں ایسی بات نہیں ہے۔“ عمیر نے کہا اور رمشا کا ہاتھ تھامتے ہوئے بولا۔ ”ہم دونوں ایک دوسرے سے بہت پیار کرتے ہیں اور دونوں ایک دوسرے پر بھروسہ بھی بہت کرتے ہیں لیکن ہم دونوں پہلے اسٹیبلش ہونا چاہتے ہیں...... ہماری محبت نفسانی ہوس سے پاک ہے۔“

”میں نہیں مانتی اس بات کو۔“ نائلہ نے کہا۔ ”رمشا ایک خوب صورت لڑکی ہے اور کئی لڑکوں کی آئیڈیل ہے...... اور تم ایک جوان مرد ہو اسی لئے رمشا تم سے محبت کرتی ہے اور تم رمشا کو اس لئے چاہتے ہو کہ رمشا حسین اور جوان ہے۔“

”نائلہ تم غلط کہہ رہی ہو اب۔“ رمشا ذرا غصے سے بولی۔

”نہیں میں ٹھیک کہہ رہی ہوں اب تم ہی بتاؤ کہ اگر عمیر اتنا ہینڈسم نہ ہوتا تو تم اس سے محبت کرتی...... نہیں ناں...... تو پھر تمہاری محبت ہوس سے کیسے پاک ہو سکتی ہے...... اگر ہے تو پھر ثابت کرو اپنی محبت کی پاکیزگی کو......“

عمیر نے کہا۔ ”ہم دونوں کے دل صاف ہیں اور ہمیں اپنی محبت کسی پر ثابت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“

رمشا نے کہا۔ ”نہیں عمیر ضرورت ہے...... اور میں اپنی محبت ثابت کروں گی...... بتاؤ کیا کرنا ہوگا۔“

نائلہ بولی۔ ”کیا تم اپنی محبت کی خاطر ایک رات اپنے گھر سے باہر رہو گی...... عمیر کے ساتھ ایک ہی بیڈ روم میں پھر وقت ثابت کر دے گا کہ محبت کی سچائی۔“

عمیر نے کہا۔ ”نائلہ تمہیں ہو کیا گیا ہے...... تم ہماری دوست ہو یا دشمن۔“

نائلہ بولی۔ ”میں نے صرف تمہارے سامنے ایک راستہ رکھا ہے اس راستے پر چلنے کے لئے میں تم دونوں پر دباؤ نہیں ڈال رہی کیونکہ تم دونوں ہی اپنی مرضی کے مالک ہو۔“

رمشا نے کہا۔ ”ٹھیک ہے...... مجھے تمہاری بات منظور ہے...... میں تم پر ثابت کر کے رہوں گی کہ میری محبت میں ہوس کا کھوٹ شامل نہیں ہے......“

عمیر نے کہا۔ ”رمشا تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا...... کیا تم اپنے ہوش و حواس میں ہو۔“

”میں لڑکی ہو کر مان گئی۔“ رمشا بولی۔ ”اور تم لڑکے ہو کر اس قدر ہچکچا رہے ہو...... کہیں نائلہ کی باتیں سچ تو نہیں......“

”ٹھیک ہے۔“ عمیر نے کہا۔ ”اگر تم بھی یہی چاہتی ہو تو مجھے منظور ہے۔“

”او کے، نائلہ نے کہا۔ کل شام سات بجے اس ریسٹورنٹ میں آ جانا...... ساتھ میں ڈنر کریں گے اور میں تم دونوں کو بتا دوں گی کہ جانا کہاں ہے۔“

رمشا اور عمیر نے اثبات میں سر ہلا دیا اور نائلہ کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

☆......☆......☆

موسم کے تیور سر شام ہی خراب تھے...... نائلہ نے ریسٹورنٹ میں آنے کے لئے عمیر اور رمشا کو سات بجے کا کہا تھا...... لیکن خود ساڑھے چھ بجے آ گئی اور ایک ویٹر کو اپنے پاس بلایا۔

”یس میم۔“ ویٹر نے پوچھا۔

”مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ ایک چھوٹا سا کام کرنا ہے۔“ اتنا کہہ کر نائلہ نے اپنے بیگ سے پانچ پانچ سو کے کچھ نوٹ نکالے اور ویٹر کو تھما دیئے اور بولی۔

”ابھی تھوڑی دیر کے بعد میرے پاس ایک لڑکا اور لڑکی آ کر بیٹھیں گے میں اس لڑکی کو تمہارے پاس بھیجوں گی اور تم نے اسے اس وقت تک اپنی باتوں میں الجھائے رکھنا ہے جب تک وہ لڑکا اسے بلانے کے لئے نہ آ جائے سمجھ گئے۔“

”سمجھ گیا میم آپ بے فکر ہو جائیں۔“ اتنا کہہ کر ویٹر چلا گیا اور نائلہ نے اپنے ہینڈ بیگ سے اپنا موبائل فون نکالا اور کرن کا نمبر ڈائل کیا۔

"ہیلو نائلہ کام کہاں تک ہوا؟" کرن نے بے صبری سے پوچھا۔

"70% کام ہوگیا ہے...... بس اب ان کے آنے کی دیر ہے۔" نائلہ نے بتایا۔

کرن بولی۔ "ہاں میں بھی نوٹ کر رہی ہوں کہ عمیر کل سے بہت پریشان ہے۔"

نائلہ نے دیکھا کہ رمشا اور عمیر ریسٹورنٹ میں داخل ہو رہے ہیں۔

"او کے کرن وہ آ گئے ہیں بعد میں بات کرتے ہیں۔" نائلہ نے کہا اور کال کاٹ دی۔

"آؤ بیٹھو......" نائلہ نے کہا۔ وہ دونوں سامنے والی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

"کیسی ہو؟" رمشا نے پوچھا۔

"میں ٹھیک ہوں......" نائلہ نے کہا۔ "یار میں تم دونوں کو بالکل کچھ نہیں کہہ رہی...... میں تمہاری محبت کو تسلیم کر چکی ہوں...... تمہیں کہیں جانے کی اور اپنی محبت کو ثابت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں تم دونوں کو کسی امتحان میں نہیں ڈالنا چاہتی۔"

"نہیں نائلہ۔" رمشا نے کہا۔ "یہ صرف میں تمہارے لئے نہیں کر رہی...... اپنے لئے کر رہی ہوں...... میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ میری محبت کتنی سچی ہے۔"

"او کے جیسے تمہاری مرضی......" نائلہ نے کہا۔ اور بولی۔ "کوئی ویٹر نظر نہیں آ رہا...... جاؤ جا کے چائے کا آرڈر دے آؤ۔"

رمشا اٹھ کر چلی گئی...... نائلہ کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی۔

اس نے عمیر کی طرف دیکھا جو گم صم سا بیٹھا تھا۔ نائلہ نے پوچھا۔ "عمیر تمہیں کیا ہوا ہے؟"

عمیر بولا۔ "نائلہ یہ تم نے ٹھیک نہیں کیا۔ مجھے یہ سب مناسب نہیں لگ رہا۔"

"یار اب میں منع کر رہی ہوں۔" نائلہ بولی۔

"لیکن اب رمشا ضد پر اڑ گئی ہے تو اس میں میرا کیا قصور۔"

"رمشا کو یہ راستہ دکھانے والی تم ہی تھی۔ یہ بات مت بھولو کہ......" عمیر نے اتنا ہی کہا۔

"یہ رمشا کہاں رہ گئی۔ میں اسے دیکھ کر آتا ہوں۔" اتنا کہہ کر عمیر اٹھا اور کاؤنٹر کی طرف چلا گیا۔

نائلہ اکیلی تھی...... وہ جو سچویشن کری ایٹ کرنا چاہتی تھی وہ ہو گئی تھی...... اس نے جلدی سے اپنے پرس سے ایک شیشی نکالی اور عمیر اور رمشا کی چائے میں دو دو قطرے ٹپکا دیئے۔

اتنی دیر میں عمیر اور رمشا واپس آ گئے۔ "رمشا کہاں رہ گئی تھی۔" نائلہ نے پوچھا۔

"ایک ویٹر پیچھے پڑ گیا تھا۔" رمشا نے کہا۔ "وہ کہہ رہا تھا کہ میں اس کی کزن کی ہمشکل ہوں۔"

"او کے چائے لو۔" نائلہ نے کہا۔ اور ایک چابی رمشا کو تھماتے ہوئے بولی۔ "یہ میری خالہ کے اپارٹمنٹ کی چابی ہے۔"

رمشا اس کی بات سمجھ گئی تھی۔ عمیر نائلہ کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

رمشا نے کہا۔ "میں پہلے گھر جاؤں گی اور پھر وہاں سے اپارٹمنٹ میں۔"

"او کے ہنی...... اس اپارٹمنٹ میں ویسے بھی ایک ہی بیڈ روم ہے۔" نائلہ نے معنی خیز انداز میں کہا اور وہ بیوقوف اور جذباتی لڑکی کچھ بھی سمجھ نہ سکی۔

اس رات بارش ہو رہی تھی...... ہوائیں زور زور سے چل رہی تھیں۔ رمشا نے ڈرتے، سہمتے اور ہچکچاتے ہوئے گھر کی دہلیز سے اپنا قدم باہر نکالا تھا۔

رمشا کا دل کچھ کہہ رہا تھا تو دماغ کچھ اور...... دل نادان کی بات مان کر وہ اس اپارٹمنٹ میں پہنچ گئی۔

عمیر بھی وہاں موجود تھا...... صرف آدھا گھنٹہ اپنی محبت کی آزمائش دے پائے تھے...... کہ شیطان نے ہمیشہ کی طرح اپنا کام شروع کر دیا...... اور دونوں معص[illegible] انسان شیطان کے بہکاوے میں نہ آتے اگر نائلہ [illegible] چائے میں انہیں وہ دوا نہ پلائی ہوتی۔ دونوں کے جذبا[illegible] انہیں ایسی دلدل میں دھنساتے چلے گئے جہاں سے نکلنا مشکل ہی نہیں ناممکن تھا۔

☆......☆......☆

وہ تاریک رات اپنے جوبن پر تھی...... بارہ بج رہے تھے...... اور بارش بدستور ہو رہی تھی۔ نائلہ کے امی ابو دونوں ہی اپنے رشتہ داروں کے پاس شادی اٹینڈ کرنے کے لئے گئے ہوئے تھے۔ نائلہ گھر پر تنہا تھی جب دروازے پر دستک ہوئی۔

نائلہ اپنے کمرے میں بستر میں گھسی سو رہی تھی...... زوردار دستک کی وجہ سے اس کی آنکھ کھلی...... ابھی دروازہ کھولنے کے لئے وہ اٹھ کر بیٹھی ہی تھی کہ اس کے کمرے کا دروازہ کھلا اور کرن اندر داخل ہوئی۔

"کرن تم۔" نائلہ حیرت سے بولی۔ "اس وقت یہاں...... دروازہ لاک تھا...... اندر کیسے آئی؟"

"ہمارے لئے دروازے اور دیواریں کوئی معنی نہیں رکھتیں۔" کرن بدلے ہوئے لہجے میں بولی۔

نائلہ کو اب کرن سے ڈر لگنے لگا تھا۔ وہ بولی۔ "کرن کیا ہوا ہے تمہیں۔"

"لگتا ہے اب تمہیں بتانا ہی پڑے گا کہ ہم کون ہیں۔" کرن نے اتنا کہا اور ایک دم وہ تبدیل ہو گئی...... اب وہاں ایک حسین دوشیزہ کھڑی تھی۔ اگرچہ کرن بھی خوب صورت تھی مگر اس مہ جبین کے سامنے کرن کا حسن کچھ بھی نہ تھا۔

"یہ کک...... کیا ہے...... تت...... تم بدل کیسے سکتی ہو۔" نائلہ اب بہت ڈر گئی تھی...... باہر بارش کے ساتھ ساتھ آسمانی بجلیاں بھی چمکنے لگی تھیں۔

"ہمارا نام روزینہ ہے...... اور ہم ایک جن زادی ہیں...... بلکہ یوں کہو کہ ہم ایک لاوارث جن زادی ہیں...... کیونکہ ایک ظالم نے ہم سے ہمارا خاندان چھین لیا...... اور پھر ہم اس انسانی بستی میں آئے...... ہم نے اصلی کرن کو مار ڈالا...... کیونکہ وہ بھی ہمارے عمیر سے محبت کرتی تھی...... اور ہمارے راستے کا کانٹا تھی...... اور آج ہم تمہیں ماریں گے کیونکہ تم ہمارے راز میں شریک ہو چکی ہو اور ہم اپنا رازدار کسی آدم زاد کو نہیں بناتے۔"

نائلہ کا خوف کے مارے برا حال تھا...... وہ اس لڑکی کو دیکھنے لگی جس نے سفید رنگ کا فراک نما لباس پہن رکھا تھا...... کھلے ہوئے بال...... اور چاند سا روشن چہرہ...... وہ تو کسی زاویے سے چڑیل نہ لگتی تھی۔

"دیکھو کرن...... یا روزینہ آپ جو بھی ہو...... آپ کا راز میرے ساتھ قبر تک جائے گا...... میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گی...... خدا کے لئے مجھے مت مارو...... میں نے تمہاری مدد کی ہے۔" نائلہ نے اپنے دونوں ہاتھ اس روزینہ جن زادی کے سامنے جوڑ دیئے۔

"یقین کرو نائلہ۔" جن زادی نے کہا۔ "ہم تمہیں مارنا نہیں چاہتے لیکن اب یہ ہماری مجبوری ہے۔ ہمیں معاف کر دینا" اتنا کہہ کر جن زادی آگے بڑھی اور اپنا داہنا ہاتھ اوپر اٹھایا تو اس کے ہاتھ میں ایک تیز دھار چھرا آ گیا اور پھر اس نے نائلہ کی طرف بڑھ کر نائلہ کی گردن کو کاٹ ڈالا اور نائلہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئی۔

☆......☆......☆

صبح ہلکی ہلکی دھوپ پھیل رہی تھی...... بارش کا زور ٹوٹ گیا تھا...... بادل بھی خاموش تھے...... رو رہی تھی تو صرف رمشا رو رہی تھی...... رو رو کر برا حال تھا اس کا...... وہ محبت کے اس امتحان میں ناکام ٹھہری تھی...... محبت کے سارے دعوے ملیامیٹ ہو چکے تھے۔ عمیر مسلسل اسے چپ کروانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"رمشا بس کرو۔ جو ہونا تھا وہ ہو چکا اب رونے سے کیا حاصل؟" عمیر نے کہا۔

"عمیر میں کیسے اپنا سامنا کروں...... نہیں کر سکتی جب میں خود اپنا سامنا نہیں کر سکتی تو میں اس سوسائٹی کو کیسے فیس کروں گی اور تو اور میں نائلہ کو کیا منہ دکھاؤں گی۔" رمشا روتے ہوئے بولی۔

"بس اب پچھتانے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ آج میں ابو سے جا کر بات کرتا ہوں...... انہیں بتاتا ہوں کہ میں تم سے جلد از جلد شادی کرنا چاہتا ہوں۔" عمیر نے کہا......

"اب مجھے گھر جانا چاہئے۔" رمشا نے کہا۔

"ویسے تو آج سنڈے ہے سب لیٹ اٹھیں گے ان کے اٹھنے سے پہلے مجھے گھر پہنچنا ہوگا...... تم گھر جا کر اپنے ابو سے ہماری شادی کی بات کرو۔"

اتنے میں عمیر کا موبائل بج اٹھا۔ "ہیلو کون!" عمیر نے پوچھا۔

"کیا کہہ رہے ہیں آپ...... اوکے میں آتا ہوں۔"

عمیر نے کال ڈسکنکٹ کردی۔ عمیر کا چہرہ خوف سے سفید پڑ گیا۔

"کس کا فون تھا۔" رمشا نے پوچھا۔

"یار کل رات نائلہ کا مرڈر ہوگیا ہے۔ ہمیں پولیس اسٹیشن چلنا ہوگا تفتیش کے لئے۔"

"کیا؟" رمشا کی سماعتوں میں واقعی بم پھٹا تھا......

"نائلہ کا مرڈر ہوگیا...... کیسے؟ کیوں؟"

عمیر نے کہا۔ "اب ان سوالات کے جوابات پولیس اسٹیشن میں ملیں گے۔"

"لیکن عمیر وہ ہم سے پوچھیں گے کہ ہم دونوں کل رات کہاں تھے تو کیا کہیں گے۔" رمشا پریشانی کے عالم میں بولی۔

"تمہاری بات سچ ہے۔" عمیر نے کہا۔ "اگر ہمارا راز کھل گیا تو پولیس ہمیں مجرم سمجھ سکتی ہے۔ سمجھداری کا تقاضا یہ ہے کہ تم اپنے گھر جاؤ...... اور بالکل انجان بن جاؤ...... میں پولیس اسٹیشن چلتا ہوں کیونکہ انہوں نے صرف مجھے بلایا ہے...... اور اس کے بعد ابو سے ہماری شادی کی بات کرتا ہوں۔"

☆......☆......☆

عمیر کے ستارے گردش میں تھے...... وہ پولیس اسٹیشن سے لوٹ کر واپس گھر جا رہا تھا...... اس نے عقلمندی سے کام لے کر پولیس والوں کو مطمئن کردیا تھا...... لیکن ایک طرف اپنی بیسٹ فرینڈ کے دنیا سے چلے جانے کا غم تھا...... تو دوسری طرف رمشا کی نظروں سے گر جانے کا دکھ بھی تھا...... پریشانی یہ تھی کہ اس کے والد وجاہت عالم اسے رمشا کو اپنانے کی اجازت دیں گے یا نہیں...... کیونکہ وہ اپنی بھتیجی کو اپنی بہو کے روپ میں دیکھنا چاہتے تھے...... عمیر اپنے ابو کی اجازت کے بغیر کچھ بھی نہیں کرنا چاہتا تھا...... کیونکہ وجاہت عالم نے بہت دکھ سہے تھے...... پہلے اپنے بھائی اور بھابھی کو کھویا...... اس کے بعد اپنی شریک حیات کو...... عمیر اور کرن ہی ان کی زندگی کا محور تھے......

کرن سے تو عمیر نے بات کرلی تھی...... لیکن عمیر اپنے ابو کو ساری بات بتانے سے بہت ڈرتا تھا۔

عمیر یہی ساری باتیں سوچتا ہوا کار ڈرائیو کر رہا تھا کہ اس کا موبائل بجنے لگا۔ اسکرین پر کرن کا نام جگمگا رہا تھا۔

"ہیلو کرن......؟" عمیر نے کال ریسیو کی۔ تو دوسری جانب کرن زاروقطار رو رہی تھی۔

"کیا ہوا کرن کیوں رو رہی ہو......" عمیر کو تشویش لاحق ہوئی تھی۔

"عمیر کہاں ہیں آپ...... خدا کے لئے جلدی اسپتال آئیں...... تایا جان کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے اور وہ اس وقت آئی سی یو میں ہیں...... پلیز جلدی آئیں۔"

الفاظ تھے یا ایٹم بم...... عمیر کو یقین نہیں آرہا تھا...... یقین تو بہرحال کرنا ہی تھا...... نجانے کیوں تقدیر امتحان پر امتحان لے رہی تھی۔

"ان کی حالت اب خطرے سے باہر تو ہے اور آپ ان سے مل بھی سکتے ہیں لیکن یاد رہے کہ کوئی بھی بات ان کے مزاج کے خلاف نہیں ہونی چاہئے...... ورنہ اگلا اٹیک جان لیوا ثابت ہوسکتا ہے۔" ڈاکٹر نے کہا اور چلا گیا۔

عمیر کو اسپتال میں آج دوسرا دن تھا...... کرن بھی کافی دیر سے وہاں تھی...... لیکن عمیر نے زبردستی اسے وہاں سے بھیج دیا تھا۔

عمیر کمرے میں داخل ہوا اور بیڈ کے پاس پڑے بینچ پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "کیسی طبیعت ہے ابو آپ کی۔"

وجاہت عالم مسکراتے ہوئے بولے۔ "اب میں پہلے سے بہت بہتر ہوں۔"

"آپ نے کون سی ایسی ٹینشن لی کہ آپ کی طبیعت خراب ہوگئی؟" عمیر نے پوچھا۔

"بس بیٹا یہ تو عمر کا تقاضا ہے۔" وجاہت عالم بولے۔ "اصل میں بزنس میں کچھ نقصان ہوگیا اور اب جب سے مجھے ہارٹ اٹیک آیا ہے...... تو پتا چلا کہ زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں ہے...... بہت فکر مند ہوں بیٹا۔"

عمیر اپنے ابو کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے بولا۔ "اللہ آپ کی عمر دراز فرمائے اور آپ کا سایہ ہمارے سروں پر سلامت رکھے...... پریشان کیوں ہیں آپ۔"

"بیٹا میں کرن کی وجہ سے پریشان ہوں۔ نجانے کیوں میرے دل میں وہم سا بیٹھ گیا ہے...... وہ لڑکی ذات ہے...... چاہتا ہوں کہ اپنی زندگی میں ہی اسے تمہاری دلہن بنادوں بس بیٹا اگر تمہیں اپنے باپ کی ذرا بھی پرواہ ہے تو پرسوں تمہیں کرن سے نکاح کرنا ہوگا باقاعدہ شادی ایک مہینے بعد کریں گے۔"

"کیا...... لیکن ابو میں۔" عمیر نے کہنا چاہا تو اسے ڈاکٹر کی تاکید یاد آگئی کہ "انہیں کسی قسم کا اسٹریس ٹینشن نہیں دینا۔"

عمیر نے دھیرے سے والد کا ہاتھ بیڈ پر رکھا اور کمرے سے نکل آیا...... والد بولے۔ "شرما گیا گدھا۔"

☆......☆......☆

کچھ وقت کی روانی نے ہمیں یوں بدل ڈالا
وفا پر اب بھی قائم ہیں لیکن محبت کرنا چھوڑ دی ہم نے

عمیر سگریٹ پر سگریٹ پھونکے جا رہا تھا...... سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا...... عقل ماؤف ہوگئی تھی...... ایک طرف تو اس کی بیسٹ فرینڈ نائلہ کا مرڈر ہوگیا تھا۔ اور وہ اس کا سوگ تک نہ منا سکا...... دوسری طرف وہ لڑکی جس سے اسے بے پناہ محبت تھی...... وہ اس کی وجہ سے اپنی دوشیزگی کھو بیٹھی تھی...... اور تیسری طرف اس کا باپ...... جو ابھی ابھی موت سے لڑ کر لوٹا تھا...... اور چاہتا تھا کہ عمیر کرن سے شادی کرلے...... لیکن اگر عمیر کرن سے شادی کرلیتا تو یہ رمشا کے ساتھ بہت بڑی زیادتی تھی...... اور اگر عمیر رمشا کو اپنا لیتا تو اس کے باپ کی زندگی خطرے میں آسکتی تھی...... دونوں صورتوں میں خسارہ اس کا ہی تھا۔

آخر پوری رات جاگنے کے بعد عمیر نے فیصلہ کر ہی لیا...... وہ نہیں جانتا تھا کہ یہ فیصلہ ٹھیک یا نہیں...... لیکن اسے پتا تھا کہ وقت ثابت کردے گا کہ وہ کتنا دانشمند ہے۔

☆......☆......☆

نقلی کرن نے بہت عمدہ پلاننگ کی تھی...... وہ سمجھ رہی تھی کہ جب رمشا اور عمیر میں ایسے تعلقات پیدا ہوں گے تو بعد میں عمیر رمشا سے نفرت کرنے لگے گا...... لیکن ہوا اس کے برعکس تھا...... عمیر رمشا کو اپنانے کے لئے تیار تھا...... لیکن تقدیر نے یہاں پر پلٹا کھا کر اس جن زادی کا ساتھ دیا تھا اور وجاہت عالم کو ہارٹ اٹیک ہوگیا...... اور بعد میں انہوں نے عمیر کو منا ہی لیا...... آج عمیر اور کرن کا نکاح تھا۔

☆......☆......☆

اس تاریک رات کے بعد تو جیسے رمشا کے لب سل سے گئے تھے۔ لیکن کسی نے بھی اتنا خاص نوٹس نہ لیا تھا...... کیونکہ اس کے ابو ہارون مرزا اپنا بزنس چلانے میں بہت بزی رہتے تھے اور اس کی ماں اپنا این جی او چلا رہی تھی۔ بھائی سی ایس ایس کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا۔ اس لئے کسی کے پاس کسی کے لئے ٹائم نہیں تھا۔

رمشا، نائلہ کی موت پر حیران تھی...... اسے عمیر کے دوست اسد بلال کی توسط سے پتا چلا کہ عمیر کے ابو کو ہارٹ اٹیک آیا ہے...... وہ اسپتال جانا چاہتی تھی لیکن جا نہ پائی تھی......

اور آج اس کا موبائل مسلسل رنگ کر رہا تھا۔ رمشا نے موبائل اٹھا کر دیکھا اسد بلال کا نمبر جگمگا رہا تھا۔

ہیلو...... رمشا نے کہا۔ "کیسے ہو اور کیسے یاد کیا مجھے۔"

"رمشا یہ میں کیا دیکھ اور کیا سن رہا ہوں۔" اسد بلال نے کہا۔ "عمیر کا نکاح ہوگیا ہے اور اس کی کزن کرن

سے...... اور اس نے ہمیں بتایا تک نہیں...... چلو کوئی بات نہیں...... لیکن جہاں تک میرا علم ہے اس کے مطابق تو تم دونوں ایک دوسرے میں انٹرسٹڈ ہو...... پھر اس نکاح کا کیا مطلب...... رمشا یہ کیا......"

رمشا نے اس سے آگے اور کوئی بات نہ سنی اور کال کاٹ دی۔

اسے یاد آیا کہ کیسے نائلہ نے بڑے دعویٰ کے ساتھ عمیر سے کہا تھا کہ وہ اس سے محبت نہیں کرتا صرف ہوس ہے اور اب تو عمیر کی ہوس پوری ہو چکی تھی پھر کیسے وہ رمشا کو اپناتا......

رمشا نے اپنا سیل فون نکالا اور عمیر کا نمبر ڈائل کیا۔

"ہیلو رمشا کیسی ہو......" عمیر نے اپنی کیفیت پر قابو پاتے ہوئے کہا...... کیونکہ اس وقت وہ رمشا سے سب کچھ چھپانا چاہتا تھا۔

"عمیر کیا تم نے نکاح کر لیا ہے۔ اپنی کزن کے ساتھ؟" رمشا نے ڈائریکٹ پوچھا۔

چند لمحے عمیر کو سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا بولے۔

"دراصل میں وضاحت کرتا ہوں......" عمیر نے ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں کہنا چاہا۔

"اوکے میں سمجھ گئی کہ اسد ٹھیک کہہ رہا تھا...... مجھے مل سکتے ہو؟"

عمیر نے کہا۔ "اوکے رمشا مل کر ساری بات کلیئر کرتے ہیں۔"

عمیر اور رمشا پارک میں راؤنڈ لگا رہے تھے۔

"رمشا کب سے خاموش ہو نہ تم میری طرف دیکھ رہی ہو نہ مجھ سے بات کر رہی ہو اور نہ ہی مجھ سے میرے نکاح کی وجہ پوچھ رہی ہو...... اتنی بے رخی کیوں؟"

رمشا نے عمیر کی کلائی پکڑ کر یکدم اسے اپنی طرف موڑ لیا...... اب وہ دونوں آمنے سامنے تھے...... وہ بولی۔

"عمیر میں نے تم سے محبت نہیں کی تھی...... عشق کیا تھا...... اور وہ بھی جنون کی حد تک...... مجھے اپنی ذات پر اتنا یقین نہ تھا جتنا تمہارے پیار کی سچائی پر...... یہی وجہ تھی کہ اپنا پیار ثابت کرنے کے لئے میں نے وہ قدم اٹھایا جو شاید ہی اس ملک کی کوئی اور لڑکی اٹھائے...... لیکن تم نے میرے یقین کے شیش محل کو ایک ہی جھٹکے میں زمین بوس کر دیا...... مجھے پھر بھی لگتا تھا کہ تم مجھے اپناؤ گے...... لیکن تم نے مجھے دھوکہ دیا...... پیار کا کھیل کھیلا میرے ساتھ...... اور ایسے ڈھونگی لوگوں کو رمشا کبھی معاف نہیں کرتی...... بلکہ ان کی سزا بھی خود تجویز کرتی ہے۔ تو بھگتو اپنی سزا......" اتنا کہہ کر رمشا نے دوپٹے میں چھپا اپنا ہاتھ باہر نکالا۔

ایک تیز دھار چاقو اس کے ہاتھ میں تھا...... اس نے وہ چاقو اپنے محبوب کے پیٹ میں گھونپ دیا......

عمیر ہلکا سا چلا کر درد سے دہرا ہونے لگا...... اور آنسو رمشا کی آنکھوں سے بہنے لگے...... جیسے چاقو اسے لگا ہو...... لیکن رمشا نے ایک ہاتھ سے اپنے چہرے کو بے دردی سے رگڑ کر آنسوؤں سے صاف کیا اور ایک جھٹکے سے وہ چاقو عمیر کے پیٹ سے باہر نکالا۔ اب کی بار عمیر کی چیخ قدرے بلند تھی۔

رمشا نے ایک بار پھر وہ چاقو عمیر کے پیٹ میں گھونپا تھا...... اور اس کے بعد رمشا جیسے اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھی۔ وہ عمیر کے پیٹ سے چاقو نکال کر بار بار گھونپ رہی تھی...... عالم جنون میں وہ سب کچھ بھول گئی...... اور گر کر بے ہوش ہو گئی۔

جس وقت رمشا نے عمیر کو مارا تھا وہ دوپہر کا وقت تھا...... اور پارک میں کوئی بھی نہ تھا...... یہ پارک بھی ذرا آبادی سے ہٹ کر تھا...... اس لئے کوئی دیکھ نہ سکا تھا...... لیکن جب رمشا عمیر پر پے در پے وار کر کے بے ہوش ہو گئی تھی۔ اسی وقت پارک میں دو لڑکے آئے تھے......

عمیر بہت مضبوط اعصاب کا مالک تھا...... اس لئے وہ اس وقت زندہ تھا اور جانتا تھا کہ اگر یہ بات ثابت ہو گئی کہ اس کا قتل رمشا نے کیا ہے تو رمشا کو پھانسی ہو جائے گی...... مرتے مرتے بھی عمیر نے رمشا کو بچا کر اپنی ناکردہ غلطی کی تلافی کر دی...... اس وقت اس نے ہمت کر کے چاقو کو اس نے پاس والے تالاب میں پھینک دیا تھا...... کیونکہ اس پر رمشا کی انگلیوں کے نشانات تھے۔

آنے والے دونوں لڑکوں نے انہیں دیکھ لیا اور ان کے پاس آئے...... جب انہوں نے عمیر سے اس کی حالت کے بارے میں پوچھ کر اسے اسپتال لے جانا چاہا تو عمیر نے انہیں یہ بتایا کہ ”دو نقاب پوش آئے تھے جنہوں نے اسے چاقو سے لہولہان کردیا اور اس کی ساتھی رمشا یہ منظر دیکھ کر بے ہوش ہوگئی۔“

خیر عمیر نے اس پارک میں ہی دم توڑ دیا تھا۔

البتہ وہ دونوں لڑکے رمشا کو اسپتال لے گئے اور ان لڑکوں کی گواہی کی وجہ سے وہ پولیس کی انوسی گیشن سے بچ گئی تھی۔

تقدیر بھی ہمارے ساتھ کیسے کیسے کھیل کھیلتی ہے۔ سیانے سچ ہی کہتے ہیں کہ کبھی کبھار تقدیر ہماری ساری تدابیر کو پلٹ کر رکھ دیتی ہے۔

اس لاوارث جن زادی روزینہ کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا...... اپنی شکتیوں کے بل بوتے پر وہ بڑے سے بڑے شہ زور کو مات دے سکتی تھی...... مگر تقدیر اس سورما کا نام ہے جو ہمیشہ اپنی ہی منواتا ہے......

عمیر کو پانے کے لئے روزینہ نے اپنی زندگی کا مقصد بدل ڈالا...... کرن اور نائلہ کو بے موت مار دیا...... رمشا کو برباد کروا ڈالا...... کرن کے روپ میں انسانی زندگی گزارنے لگی مگر رمشا نے سب کچھ بدل ڈالا۔

رمشا نے اپنے ہی ہاتھوں اپنی محبت عمیر کی جان لے کر اس جن زادی کی دنیا بھی اندھیر کردی تھی۔

عمیر کی موت کا صدمہ بہت بڑا تھا، جو اس کا باپ سہہ نہ پایا تھا اور دوسرے ہی روز وہ بھی قبرستان میں اپنے بیٹے کے پاس پہنچ گئے۔

اب روزینہ پھر تنہا رہ گئی تھی...... پہلے اس بھجن ناتھ نے اس سے اس کا اصلی خاندان چھینا تھا...... اور اپنی موت مر چکا تھا...... اور رمشا نے اس سے اس کا دوسرا خاندان بھی چھین لیا۔

وہ جن زادی کمرے میں بیٹھی ہوئی تھی...... اور وہیں بیٹھے بیٹھے اس نے طے کرلیا تھا کہ وہ رمشا سے ایک بھیانک انتقام لے گی...... اس کے خاندان کی موت کی کہانی اپنے ہاتھوں سے لکھے گی۔

☆......☆......☆

رمشا اسپتال سے واپس گھر آ گئی تھی...... لیکن وہ نارمل نہ تھی...... ڈاکٹرز نے اسے مکمل بیڈ ریسٹ کرنے کو کہا تھا۔ کیونکہ جو حادثہ ہوا تھا، اس نے رمشا کے اعصاب پر اچھا اثر نہیں چھوڑا تھا...... وہ بہت زیادہ ڈسٹرب تھی۔

رمشا اپنے کمرے میں بیڈ پر لیٹی ہوئی تھی...... آنسو اس کی آنکھوں سے ہوتے ہوئے تکیے کو بھگو رہے تھے۔

اسے سب پتا چل گیا تھا کہ کیسے عمیر نے مرتے مرتے بھی اسے پھانسی کے پھندے سے بچالیا تھا...... اسے یاد آیا تھا کہ کیسے اس نے اس انسان کی جان لی جس سے وہ بے تحاشا محبت کرتی تھی۔

کمرے میں رمشا کی والدہ داخل ہوئی اور بولیں۔ ”رمشا تم سے ملنے کے لئے تمہاری کوئی دوست کرن آئی ہے۔“ رمشا کی امی نے اتنا کہا اور کمرے سے باہر آ گئی۔

اور نقلی کرن چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی۔

رمشا کی کرن نام کی کوئی دوست نہ تھی اور نہ ہی وہ اس نئے مہمان کو جانتی تھی...... پھر اسے یاد آیا کہ کرن تو عمیر کی کزن کا نام ہے۔

کرن نے کہا۔ ”ہاں میں عمیر کی کزن ہوں اور تم سے ملنے کے لئے آئی ہوں۔“

”آئیں بیٹھیں......“ رمشا اٹھ کر بیٹھتے ہوئے بولی۔

کرن نے بیڈ کے پاس کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”لگتا ہے کہ ایک مہینہ گزرنے کے باوجود تمہارا غم ہلکا نہیں ہوا۔“

لیکن تم اتنا سوگ کیوں منا رہی ہو...... سیاہ لباس پہن کر ماتم کرنے کا بھی تمہارے پاس حق نہیں ہے کیونکہ تم عمیر کی قاتل ہو۔

رمشا حیرت سے بولی۔ ”کون ہو تم اور کیسے جانتی ہو کہ عمیر کو میں نے مارا تھا۔“

کرن کرسی سے اٹھی اور کمرے کے دروازے کو لاکڈ کردیا...... اور اپنی شکل بدل دی...... اب کرن کی جگہ وہ حسین دوشیزہ تھی...... جس نے سفید رنگ کا فراک نما لباس پہن رکھا تھا۔

رمشا کو اب خوف آنے لگا۔ ”کون ہو تم...... میں جان گئی ہوں کہ تم کوئی بدروح ہو...... خدا کے لئے یہاں سے چلی جاؤ۔“

”چلی جاؤں گی۔“ روزینہ نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”لیکن پہلے جس کام کے لئے آئی ہوں وہ کام تو کرلوں۔“ اتنا کہہ کر روزینہ آگے بڑھی اور رمشا کے بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر ایک زوردار جھٹکا دیا۔

رمشا زور سے چلائی۔ ”امی امی کہاں ہیں آپ مدد کریں میری...... یہ لڑکی نہیں چڑیل ہے۔“

ہاہاہا...... روزینہ نے قہقہہ لگایا اور بولی۔ ”آدم زادی تو نے ہمیں اتنا بیوقوف سمجھا ہوا ہے...... اس کمرے کے آس پاس ہم نے اپنی شکتیوں سے ایک حصار قائم کردیا ہے...... اب نہ تو باہر کی آواز اندر جاسکتی ہے اور نہ ہی اندر کی آواز باہر آسکتی ہے۔“

”تم کون ہو اور کیا چاہتی ہو؟“ رمشا نے خوف سے لرزتے ہوئے پوچھا۔

روزینہ، رمشا کو اپنی حقیقت بتانے لگی کہ کیسے اس نے اصلی کرن اور نائلہ کو موت کے گھاٹ اتارا...... کیسے اس نے عمیر اور اس کے درمیان وہ تعلق قائم کروایا۔

ساری بات سننے کے بعد رمشا کا خوف قدرے دور ہوگیا لیکن اس کے دل میں اس منحوس جن زادی کے لئے نفرت بھرتی چلی گئی...... رمشا بولی۔ ”تم نے معصوم جانوں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگے ہیں...... اور تقدیر نے تمہیں اس کی سزا بھی دے دی ہے...... تم سے وہ انسان چھن گیا جس کے لئے تم نے یہ سب کیا...... اب یہاں میرے پاس کیا لینے کے لئے آئی ہو؟“

رمشا کی بات ختم ہوئی تو روزینہ نے اس کے منہ پر ایک زوردار طمانچہ مارا...... رمشا کو لگا کہ اس کے منہ میں خون کا ذائقہ گھل ہو...... اس کا سر بیڈ کے کراؤن سے ٹکرایا...... روزینہ نے اس کے بالوں کو زور سے پکڑا اور جھٹکا دے کر اسے اپنی طرف موڑا وہ بولی۔

”تو پوچھ رہی تھی ناں کہ ہم یہاں کیا لینے کے لئے آئے ہیں...... تجھ سے ایک بھیانک انتقام لینے کے لئے آئے ہیں...... جیسے تو نے ہمیں ایک بار پھر لاوارث بناڈالا ویسے ہی ہم تجھ سے تیرا سب کچھ چھین کر تجھے ایک دردناک موت دیں گے۔ اپنی موت اور تباہی سے بچنے کے لئے جو تیاری کرنا چاہتی ہے کرلے......“ اتنا کہہ کر روزینہ نے رمشا کے بالوں کو زور سے جھٹکا دے کر اسے بیڈ پر پھینکا اور کمرے سے نکلتے ہوئے اپنے بنائے ہوئے حصار کو توڑ دیا۔

رمشا نے اپنے گھر والوں کو کچھ بھی نہ بتایا کیونکہ اگر وہ روزینہ کے بارے میں بتادیتی تو اس کی فیملی یہ بھی جان لیتی کہ وہ عمیر کی قاتل ہے۔

رات کا وقت تھا...... رمشا ڈنر کرنے کے لئے ڈرائنگ روم میں بیٹھی ہوئی تھی...... سب خاموشی سے کھانا کھا رہے تھے...... امی کے اصرار پر وہ کھانا کھانے کے لئے آ تو گئی تھی لیکن اس کا کچھ کھانے پینے کا بالکل موڈ نہیں تھا...... وہ پلیٹ میں بس چمچ گھماتے ہوئے مسلسل کچھ سوچے جارہی تھی۔

اچانک اسے سامنے روزینہ دکھائی دی...... اس کے ہاتھ میں وہی چاقو تھا جس سے اس نے عمیر کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ وہ چاقو سے اس کے بھائی عدنان کی طرف اشارہ کررہی تھی۔

وہ زور سے چلائی۔ ”نہیں عدنان کو کچھ مت کہنا۔“

رمشا کی والدہ نصرت بیگم اور ابولقمان حیدر نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

نصرت بیگم اٹھ کر اس کے پاس آئی۔ ”کیا ہوا ہے بیٹا، عدنان کو کون کیا کہہ رہا ہے۔“

”امی وہ دیکھیں ناں۔“ رمشا نے روزینہ کی طرف اشارہ کیا جس کے چہرے پر زہریلی مسکراہٹ

پھیلی ہوئی تھی۔ ”وہ چڑیل عدنان کو مار دے گی...... دیکھیں اس کے ہاتھ میں چاقو بھی ہے۔“

عدنان نے کہا۔ ”رمشا جا کر آرام کرو اور ہارر موویز کم دیکھا کرو یہاں کوئی چڑیل نہیں ہے۔“

نہیں عدنان، رمشا نے کہا۔ ”میں سچ کہہ رہی ہوں اسے دیکھو وہ تم لوگوں کی بیوقوفی پر ہنس رہی ہے۔“

لقمان حیدر بولے۔ ”بیٹا جاؤ جا کر آرام کرو۔“

رمشا سمجھ گئی کہ اب ان سے بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے...... اس لئے وہ اپنے کمرے میں آ گئی...... وہ جن زادی پہلے سے اس کے کمرے میں موجود تھی۔

”آخر تم چاہتی کیا ہو...... خدا کے لئے میرا پیچھا چھوڑ دو۔“ رمشا نے کہا۔

”باہر دیکھو...... ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی ہے۔“

روزینہ اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔ ”ادھر آؤ کھڑکی کے پاس اور آ کر میری طاقتوں کا کرشمہ دیکھو۔“

روزینہ نے تحکم بھرے انداز میں کہا اور رمشا کھڑکی کی جانب آئی جو باغیچے میں کھلتی تھی...... رمشا نے کھڑکی کھولی بارش ہو رہی تھی۔

روزینہ نے اپنا ہاتھ بارش کی جانب کیا اس کے ہاتھ سے دو نیلی لکیریں نکلیں اور دیکھتے ہی دیکھتے اب وہاں ایک ہولناک منظر تھا۔

بارش کی جگہ خون کی بوندیں برس رہی تھیں اور نجانے کہاں سے انسانی اعضاء ہاتھ پیر آنکھیں اور کھوپڑیاں زمین پر گر رہی تھیں۔

روزینہ نے رمشا کے بالوں کو اپنی مٹھی میں پکڑ لیا اور اس پر کچھ پڑھ کر پھونک ماری...... رمشا کو لگا جیسے وہ پتھر کا بت بن گئی ہو...... وہ اپنے جسم کو جنبش بھی نہ دے پا رہی تھی......

روزینہ بولی۔ ”اب تم کچھ نہیں کر سکتی، اب دیکھو میں کیسے تمہارے اکلوتے بھائی کو تمہاری آنکھوں کے سامنے بنا ہاتھ لگائے ماروں گی۔“

رمشا بس کھڑکی کے باہر کا منظر دیکھ رہی تھی......

خون برسنا بند ہو گیا تھا...... انسانی اعضاء بھی غائب ہو گئے تھے...... اب نارمل بارش ہو رہی تھی...... اچانک وہاں عدنان آ گیا...... شاید وہ چہل قدمی کرنے کے لئے اس باغیچے میں آیا تھا...... وہ جن زادی روزینہ رمشا کے پاس سے غائب ہو کر اب کھڑکی کے سامنے اس باغیچے میں تھی...... اس نے پیچھے سے عدنان کو اپنی بانہوں میں جکڑ لیا...... اور اپنے نوکیلے دانتوں سے اس کی زندگی ختم کر کے اس کا خون پینے لگی...... عدنان نے اپنے آپ کو بچانے کی بہت کوشش کی تھی...... لیکن وہ بچا نہ پایا...... وہ ایک جن زادی کا کیسے مقابلہ کر سکتا تھا۔

رمشا کھڑکی میں کھڑی یہ سارا منظر دیکھ رہی تھی...... برستی ہوئی بارش میں وہ جن زادی مسلسل اس کے بھائی کا خون پیے جا رہی تھی...... بہت بھیانک اور دردناک منظر تھا وہ...... رمشا کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے...... لیکن وہ اپنے بدن کو ہلا بھی نہ سکتی تھی......

☆......☆......☆

آج عدنان کا چالیسواں تھا۔ لقمان حیدر اور نصرت بیگم جوان بیٹے کی ناگہانی موت پر ٹوٹ سے گئے تھے۔

یہ وقت...... یہ دن رمشا کے لئے کسی قیامت سے کم نہ تھے...... پہلے اس نے اپنے ہی ہاتھوں اپنی محبت کے آشیانے کو برباد کر دیا...... اور اب اس کے بھائی کو اس جن زادی نے اس کی آنکھوں کے سامنے مارا اور وہ کچھ نہ کر سکی......

رمشا عدنان کے کمرے میں اس کی چیزوں کو چھو چھو کر اسے محسوس کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ اچانک روزینہ کمرے میں ظاہر ہوئی۔

رمشا نے روزینہ کو دیکھا اور حیرت سے بولی۔

”اب کیا لینے آئی ہو مجھے برباد کر چکی ہو...... میری ہی نظروں میں مجھے گرا چکی ہو...... کیا چاہتی ہو اب مجھ سے۔“

”پرسکون ہو جاؤ۔“ روزینہ نے کہا۔ ”میں نے تم سے کہا تھا کہ جلد یا بدیر میں تمہیں بھی اپنی طرح لاوارث

بنا دوں گی اور پھر تمہیں ایک دردناک موت دوں گی...... ابھی تو میں نے صرف تمہارے بھائی کو مارا ہے...... ابھی تو تم نے اپنے ماں باپ کی موت کا صدمہ بھی برداشت کرنا ہے۔“

”نہیں...... تم ایسا ہرگز نہیں کرو گی۔“ رمشا زور سے چلائی اور روزینہ کے پیروں میں گر کر اس نے اس جن زادی کے پیر پکڑ لئے۔ ”خدا کے لئے مجھے معاف کر دو...... رحم کرو مجھ پر...... میں اور کوئی صدمہ نہیں اٹھا سکتی......“

روزینہ نے اپنے پیر کی زوردار ٹھوکر رمشا کے منہ پر ماری اور کہا۔ ”یہ سب تمہیں عمیر کو مارنے سے پہلے سوچنا چاہئے تھا...... اب کچھ نہیں ہو سکتا۔“ روزینہ غائب ہو گئی۔

☆......☆......☆

رمشا گہری نیند سوئی ہوئی تھی...... اس نے خواب میں دیکھا کہ ایک بزرگ اس کے پاس آئے...... ان کا روشن چہرہ تھا...... وہ بولے۔

”بیٹا میں چاہتا ہوں کہ اس جن زادی نے تمہاری زندگی اجیرن بنائی ہوئی ہے...... اس نے کئی جانیں لی ہیں...... بیٹا تم جانتی ہو کہ میں کون ہوں...... میں اس کا باپ ہوں...... وہ ایسی نہ تھی لیکن پہلے ہم سب کی موت اور پھر عمیر کی موت نے اسے ایسا بنا ڈالا...... ہم مسلمان جنات ہیں اور ہم انسانی خون نہیں پیتے نہ ہی کسی کو بلاوجہ ستاتے ہیں...... لیکن روزینہ انتقام کی آگ میں یہ سب روایات بھول گئی ہے...... بیٹا وہ تمہارے ماں باپ کو بھی مار ڈالے گی اسے اب صرف ایک شخص روک سکتا ہے وہ ہے عمیر۔“

رمشا نے پوچھا۔ ”لیکن عمیر تو مر گیا ہے...... اس کی قاتل میں ہوں۔“

وہ بزرگ بولے۔ ”میں بھی تو مر گیا ہوں...... لیکن عالم ارواح سے مہلت لے کر آیا ہوں...... کل جمعرات ہے...... اور ہر جمعرات کو مغرب کے بعد نیک روحیں اور بد روحیں زمین پر آتی ہیں...... عمیر کی روح بھی آئے گی بس تمہیں اسے پکارنا ہے...... اپنی طرف متوجہ کرنا ہے وہ ضرور تمہاری مدد کرے گی۔“

رمشا کی آنکھ کھل گئی...... پہلے تو وہ کچھ سمجھ نہ سکی لیکن پھر اسے اس خواب کا مطلب سمجھ میں آ گیا۔

☆......☆......☆

”عمیر...... عمیر کہاں ہو...... عمیر میں تمہیں بلا رہی ہوں...... آ جاؤ...... آ جاؤ...... تمہاری رمشا تمہیں بلا رہی ہے...... تمہاری رمشا کو تمہاری مدد کی ضرورت ہے...... عمیر آ جاؤ۔“ رمشا اس وقت عمیر کے گھر اس کے کمرے میں کھڑی اسے بلانے کی کوشش کر رہی تھی۔

یکدم ہوا کے تیز جھونکے سے کھڑکی کے پٹ کھل گئے۔ پھر کمرے کے کونے میں دھواں اٹھنا شروع ہوا، اور جب دھواں چھٹا تو رمشا کے سامنے عمیر کھڑا تھا...... اس نے سفید لباس پہن رکھا تھا...... لیکن اس کے پیٹ سے وہاں سے اب بھی خون بہہ کر سفید کپڑوں کو رنگین کر رہا تھا جہاں رمشا نے چاقو مار مار کر اس کی زندگی کا دیا گل کیا تھا۔

عمیر کو اپنے سامنے پا کر رمشا کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ”عمیر معاف کرنے کے قابل تو نہیں ہوں میں...... لیکن مجھے معاف کر دو...... میں جنون میں یہ بات بھول ہی گئی تھی کہ تمہاری کوئی مجبوری ہو سکتی ہے...... معاف کر دو......“ رمشا اتنا کہہ کر زاروقطار رونے لگی۔

عمیر کی روح بولی۔ ”رمشا میں تمہیں سمجھ سکتا ہوں...... شاید میری موت تمہارے ہاتھوں ہی لکھی تھی...... اب تم نے مجھے کیوں بلایا ہے۔“

”عمیر تمہاری کزن کرن کب کی مر چکی ہے اسے ایک جن زادی......“ رمشا نے یہاں تک ہی کہا تھا کہ عمیر نے کہا۔ ”میں سب جانتا ہوں رمشا......“

رمشا بولی۔ ”پھر تو تم جانتے ہو گے کہ میرے ماں باپ کی زندگی خطرے میں ہے...... میں اپنی بیسٹ فرینڈ نائلہ کو کھو چکی ہوں...... تمہیں اور اپنے بھائی عدنان کو بھی کھو دیا...... لیکن اب میں اپنے ماں باپ کو نہیں کھو سکتی...... میری مدد کرو...... میرے لئے روزینہ سے بات کرو...... اسے کہو کہ اپنی دنیا میں لوٹ جائے...... اور مجھے میری دنیا میں زندگی گزارنے دے۔“

"ٹھیک ہے۔" عمیر نے کہا۔ "اگر تم چاہتی ہو تو میں روزینہ سے بات کرتا ہوں۔

اتنا کہہ کر عمیر نے کچھ پڑھا۔ تو دیکھتے ہی دیکھتے وہاں پر روزینہ کھڑی تھی...... روزینہ اپنے اصلی روپ میں تھی......

عمیر کی روح بولی۔ "روزینہ میں تم سے اس بات کا حساب نہیں لوں گا کہ کیوں تم نے میرے اپنوں کی جان لی...... کیوں تم نے مجھے اندھیرے میں رکھا...... لیکن میری قاتل رمشا نہیں تم ہو۔"

"نہیں عمیر ایسا مت کہو۔" روزینہ درد بھرے لہجے م یں بولی۔ "میں تم سے محبت کرتی ہوں...... میں تمہاری قاتل نہیں...... یہ آدم زادی رمشا تمہاری قاتل ہے۔"

"نہیں رمشا کو تم نے اکسایا تھا...... نہ تم نائلہ کے ساتھ مل کر وہ کھیل کھیلتی، نہ رمشا مجھے مارنے پر مجبور ہوتی، تم نے وہ سازش اس لئے کی تھی کیونکہ تم رمشا کو میری نظروں سے گرانا چاہتی تھی...... لیکن ہوا اس کے برعکس تھا...... میں رمشا کی نظروں سے گر گیا...... اور اس کا بھروسہ بحال کرنے کے بجائے میں نے ابو کے پریشر میں آ کر تم سے شادی کرلی۔ ایسے میں تم ہی بتاؤ وہ کیا کرتی۔" عمیر نے کہا۔

روزینہ نے اپنے دونوں ہاتھ عمیر کے سامنے جوڑ دیئے۔ "عمیر میں تمہاری نظروں سے گر گئی ہوں...... لیکن میں تم سے بہت محبت کرتی ہوں...... میں جانتی ہوں کہ ہمارا ملن ممکن نہیں...... کیونکہ تم انسان...... اور میں ایک آتشی مخلوق...... لیکن تم مجھے معاف تو کرسکتے ہو...... مجھے محبت نہیں دے سکتے لیکن مجھے اپنی نظروں سے تو نہ گراؤ۔"

عمیر نے کہا۔ "تمہیں میں اس شرط پر معاف کروں گا کہ تم وعدہ کرو کہ تم کسی جناتی بستی میں چلی جاؤ گی اور لوٹ کر کبھی واپس نہیں آؤ گی...... میں ہر جمعرات کو تم سے ملنے آؤں گا...... ہم اچھے دوست رہیں گے...... بولو منظور ہے؟"

عمیر کی بات سن کر روزینہ خوش ہوگئی۔ "مجھے تمہاری شرط منظور ہے۔" پھر وہ رمشا کی طرف مڑتے ہوئے بولی۔ "میں تمہارے بھائی کی قاتل ہوں مجھے معاف کردو...... لیکن میں نے تمہارے بھائی کو عمیر کی محبت میں مارا تھا...... اور اب میری محبت مجھے مل رہی ہے...... اس لئے میں اس انسانی دنیا سے لوٹ کر جارہی ہوں، ہوسکے تو مجھے معاف کردینا۔" اتنا کہہ کر روزینہ نے عمیر سے کہا۔ "میں ہر جمعرات کو تمہارا انتظار کروں گی۔" اور وہاں سے غائب ہوگئی۔

رمشا نے عمیر کی روح سے کہا۔ "عمیر تم نے محبت کا حق ادا کردیا...... مرتے مرتے بھی مجھے پھانسی کے پھندے سے بچایا...... اور آج میرے گھر والوں کو اس جن زادی کے شر سے بھی بچالیا۔ میں تمہاری محبت کی قدر نہ کرسکی۔" اتنا کہہ کر رمشا خاموش ہوگئی اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

عمیر نے کہا۔ "بس اب جو ہوگیا اس پر پچھتانے کا کوئی فائدہ نہیں...... جاؤ ایک نئی زندگی تمہاری منتظر ہے۔ اور راز کی بات بتاؤں۔" آخر میں عمیر نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

"ہاں بتاؤ۔" رمشا اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے بولی۔

عمیر نے کہا۔ "میں تم سے ملنے کے لئے آتا رہوں گا...... بس مجھے ہر جمعرات کو یونہی پکار لینا...... بیک وقت میں دو لڑکیوں سے محبت کروں گا۔"

عمیر کا لہجہ شریر ہوا تو رمشا مسکرانے لگی۔ "بس یونہی ہنستی رہا کرو۔ اب میں جارہا ہوں۔" عمیر نے کہا اور غائب ہوگیا۔

رمشا نے واپسی کے لئے قدم بڑھا دیئے۔ کیونکہ اس نے نئی زندگی شروع کرنی تھی۔ صرف اپنے والدین کے لئے...... کیونکہ وہ دوبارہ اپنے والدین کو اولاد کا دکھ نہیں دینا چاہتی تھی۔





گمراہی

سعدیہ اشرف۔ چنیوٹ

سیاہ رات نے ہر شے پر اندھیرے کی چادر پھیلا رکھی تھی، ایسا لگتا تھا کہ اندھیرا ہر چیز کو نگل جانا چاہتا ہے، آسمان سیاہ بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا اور پراسرار آوازیں شور مچاتی آگے بڑھیں کہ......

سبک رفتاری سے ذہن پر خوف کی دھند طاری کرتی رائٹر کے سوچ کی شاہکار کہانی

سیاہ اندھیری رات تھی ماحول پر عجیب سا سکوت چھایا ہوا تھا، کالی سیاہ رات نے ماحول کو اور بھی خوفناک بنادیا تھا۔ سیاہ رات نے ہر چیز پر اندھیرے کی چادر پھیلا رکھی تھی، ایسا لگتا تھا کہ اندھیرا ہر چیز کو نگل جانا چاہتا ہے۔ آسمان سیاہ بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ بادلوں کی چادر سے آنکھ مچولی جاری تھی۔ لوگ سردی سے بچنے کے لئے سرشام ہی بستروں میں دبک گئے تھے دور کہیں اُلو کی آواز رونگٹے کھڑے کررہی تھی، کتوں کے بھونکنے کی آوازیں پراسرار ماحول کی خاموشی کو توڑنے میں ناکام ثابت ہورہی تھیں۔ ایک پل کے لئے چاند بادلوں سے نکلتا تو ہر چیز روشنی میں نہا جاتی، سرسبز درخت روشنی میں نکھرے نظر آتے......

"تمہیں خدا کا واسطہ یہاں سے چلے جاؤ تمہارا یہاں آنا بہت برا انجام لاسکتا ہے یہاں بہت خطرہ ہے،

جان پیاری ہے تو یہاں سے چلے جاؤ۔" ایمان نے بھیگی آواز میں رضا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں ایمان یہاں جو بھی خطرہ ہو میں ہر خطرے کے لئے تیار ہوں۔" رضا نے ایمان کا چہرہ ہاتھوں کے پیالے میں بھرتے ہوئے کہا۔ "جو آنسوؤں سے تر تھا، اس کے رخسار پر آنسو کے قطرے یوں گر رہے تھے جیسے گلاب کے پھول پر شبنم، چاند کی چاندنی میں اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے گلابوں کو شبنم سے غسل دیا گیا ہو۔

ایمان نے جب رضا کو اس طرح اپنی طرف دیکھتا پایا تو شرما کر آنکھیں جھکالیں جیسے چاند بدلیوں میں چھپ گیا ہو، رضا ایک پل کے لئے بے اختیار ہوا مگر موقع کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے نہایت دھیمی آواز میں بولا۔ "میں تمہیں چھوڑ کے نہیں جاسکتا، ایمان چاہے جس راہ پر چلنا پڑے جہاں رکنا پڑے چاہے اپنی جان کی قربانی ہی کیوں نہ دینی پڑے میں تمہارے بنا یہاں سے نہیں جاؤں گا۔"

ایمان کے آنسو بے اختیاری میں اور شدت اختیار کر گئے۔ "نہیں رضا اگر تم یہاں سے نہیں گئے تو بے موت مارے جاؤ گے۔ اور میں تمہیں زندہ دیکھنا چاہتی ہوں۔"

ایمان اور رضا بہت گہرے دوست تھے، دونوں کی دوستی مثالی تھی دونوں ایک دوسرے کے بنا ادھورے تھے ایسا لگتا تھا کہ خدا نے ان دونوں میں ازل سے محبت ڈال دی ہو، نجانے کب دونوں نے پیار کی سرزمین پر قدم رکھا محسوس ہی نہ ہوسکا۔ دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم بن گئے۔ رضا اس کی ہر بات پر جاں نثاری کرتا ایسا لگتا تھا دونوں ایک دوسرے کے لئے ہی بنے ہوں۔

مگر کبھی کبھی قسمت وہ کھیل بھی کھیل جایا کرتی ہے جو انسان سوچ بھی نہیں سکتا، کبھی انسان وہ راستہ بھی اختیار کر جاتا ہے جو اس کا راستہ نہیں ہوتا، مگر انسان اس پر چلتا ہے، ایسا دشوار گزار راستہ جو خواب و خیال میں بھی نہیں ہوتا۔

جہاں انسان ایک حیوان اور خطرناک درندہ بن جاتا ہے ایسا خون پینے والا درندہ جس کا دل رحم سے خالی ہوتا ہے۔ جس کی آنکھیں اشکوں سے بے نیاز ہوتی ہیں، اس کے دل سے درد احساس اور محبت کا نام و نشان تک مٹ جاتا ہے، ایسا لگتا ہے کہ دل کی سرزمین پر کبھی محبت کی کاشت ہی نہیں ہوئی، برسوں سے کبھی محبت کی بارش تک نہ ہوئی ہو، انسان اتنا خوفناک بن جاتا ہے کہ سوچنے سے روح تک کانپ اٹھتی ہے۔

☆......☆......☆

ایمان کو بخار میں تپتے آج چوتھا دن تھا۔ چاند جیسا چہرہ مرجھا کر سورج کی سی تمازت لئے ہوئے تھا۔

"ایمان بیٹا کچھ کھالو، تم کل سے بھوکی ہو۔" اس کی ماں نے نہایت پیار سے اس کے بال سنوارتے ہوئے کہا۔

"نہیں ماں بھوک نہیں ہے مجھے۔" اس نے نقاہت سے جواب دیا۔

"نجانے کیا ہوگیا ہے۔ اس کو پہلے تو ہنستی کھیلتی رہتی تھی چودھویں کے چاند کی طرح چمکتی تھی اب نہ ہوش نہ کوئی خیال، یااللہ میری بچی کو صحت دے، میں اسے اس حال میں نہیں دیکھ سکتی۔" اس کی ماں آنسو بہاتے ہوئے وہاں سے اٹھ گئی۔

☆......☆......☆

رضا کا دل بری طرح ٹوٹ گیا تھا۔ یہ سن کر کہ ایمان کے گھر والے ایمان کی پسند کی شادی کے خلاف ہیں۔

"رضا چاہو تو میری جان لے لو مگر میں گھر میں بات نہیں کرسکتی، ہمارے خاندان میں لڑکی ایک کٹھ پتلی ہے، زبان کھولے تو زندہ گاڑ دی جاتی ہے یا خوفناک درندوں کے حوالے کردی جاتی ہے، ایسے درندے جو انسانی خون کے پیاسے ہوتے ہیں۔"

"تم یہاں سے چلے جاؤ۔"

ایمان نے روتے ہوئے رضا کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔

"آج تو میں یہاں سے جارہا ہوں مگر تمہاری خاطر اگر مجھے خونی درندہ بھی بن جانا پڑا تو قبول ہے، چاہے لوگ مجھ سے پناہ مانگیں مگر میں تمہیں پاکے رہوں گا، چاہے مجھے غلط راستہ ہی کیوں نہ اختیار کرنا پڑے۔" رضا

یہ کہتے ہوئے نہایت غصے سے چل پڑا۔

اور ایمان شکستہ قدموں کے ساتھ گھر پہنچی تو اس کی ماں اسی کی راہ دیکھ رہی تھی یہ دیکھ کر اس کی جان میں جان آئی۔

"کہاں چلی گئی تھی بیٹی؟" بہت بے قراری سے ماں نے سوال کیا۔

"میں میں رخسانہ کے گھر گئی تھی۔" ایمان نے محلے میں رہنے والی اپنی دوست کا نام لیا جہاں اکثر جاتی رہتی تھی۔

"مجھے تم سے ایک بات کرنی ہے بیٹا۔"

"بولو ماں ایسی کون سی بات ہے جو آج تم اجازت لینے لگ گئی ہو، ضرور کوئی خاص بات ہے۔" ایمان نے اپنے چہرے پر تازگی پیدا کرتے ہوئے کہا۔

"بیٹا وہ تیرا ماموں ہے نا، آج تیرے رشتے کی بات کرنے آیا تھا۔" ایمان نے یہ سن کر شدت سے آنکھیں بند کرلیں اور آنسو ضبط کرنے کی کوشش کرتی ہے کہ ماں دل کا حال نہ جان لے مگر وہ بھول گئی تھی کہ ماں کی نظر بیٹی کا چہرہ تو کیا دل کی گہرائی تک دیکھ رہی تھی۔

ادھر رضا ایمان سے ملنے کے بعد بہت افسردہ تھا، وہ گھر جانے کے بجائے انجان راستے پر چلنے لگا۔ چلتے چلتے وہ راستہ بھٹک کر بہت دور نکل گیا۔

"یااللہ یہ میں کہاں آ گیا۔" رضا دل میں خدا کو یاد کرکے بولا۔ اور ایک پتھر پر بیٹھ گیا، آس پاس نگاہ دوڑائی تو ہر طرف جنگل ہی جنگل نظر آیا، چرند پرند اس کو دیکھ کر حیران ہوئے کہ جنگل میں آدم زاد کا کیا کام۔

"یاخدا میں تو اپنی سوچوں میں اتنی دور نکل آیا نہ واپسی کا پتا نہ کھانے کا سامان رات بھی ہو رہی ہے، گھنا جنگل ہے شام ہوتے ہی آدم خور جانور میرا حشر کردیں گے۔" رضا اسی سوچ میں گم ہوگیا کہ آخرکار شام سر پر آگئی، ہر طرف جنگل کا بیابان اور کیڑے مکوڑوں کی آوازیں گردش کرنے لگیں۔ ماحول خوفناک دکھائی دینے لگا، درخت اندھیرے میں یوں معلوم ہونے لگے جیسے جنگلی جانور منہ کھولے کھڑے ہوں، حشرات کا شور کان پھاڑ دینے والا ہوگیا۔

رضا خوف اور حیرانگی کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ جنگل کا خوفزدہ آنکھوں سے غور کرنے لگا، جب آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہوگئیں تو اس کو وہاں ایک سایہ سا نظر آیا، جس کے جسم پر بس ایک چادر اس انداز میں لپٹی ہوئی تھی جیسے کفن پہنادیا گیا ہو۔

اچانک چاند نکل آیا تو سایہ واضح طور پر دکھائی دینے لگا۔ سوکھا ہوا جسم جس کی ہڈیاں باہر نکلی ہوئی تھیں، چہرہ ایسا جیسے قبر سے مردہ اٹھ آیا ہو، لال انگارہ آنکھیں، گال اندر کو دھنسے ہوئے، کالے سیاہ ہونٹ، گلے میں موتیوں کی مالا اور جسم پر کالے رنگ کا کفن نما چوغہ جو اس کی دہشت میں اضافہ کررہا تھا۔

اچانک اس سایہ نے آگ کا ایک بہت بڑا آلا روشن کردیا، جس سے جنگل میں ہر طرف روشنی پھیل گئی، پھر اس نے اپنے گرد ایک سفید رنگ کے سفوف کو پھیلا کر حصار قائم کیا اور منہ میں کچھ پڑھنے لگ گیا، رضا اپنی جگہ پر بیٹھا اس کی ہر ایک حرکت کو نوٹ کررہا تھا۔

پھر اس سایہ نما انسان نے اپنے ساتھ لائے ایک بڑے سے تھیلے سے کچھ جانور کی ہڈیاں اور کھوپڑیاں نکالنی شروع کردیں تو رضا کی آنکھیں حیرت انگیز منظر کو دیکھ کر پھٹی کی پھٹی رہ گئیں، کھوپڑیوں کو ایک جگہ رکھا تو وہ حرکت کرنے لگ گئیں، ان کی آنکھیں انگاروں کی طرح جلنے لگ گئیں، آنکھوں کی پتلیاں ساکت تھیں یہ سب دیکھ کر رضا کے منہ سے ایک خوفناک چیخ برآمد ہوئی اور ماحول پر چھایا سکوت ٹوٹ گیا۔

پھر اس انسان کی نظر بھی رضا پر پڑ گئی تو رضا کا دل چاہا کہ وہاں سے بھاگ جائے، مگر رضا کے قدم جیسے من من کے ہوگئے تھے۔

"کون ہو تم اور یہاں کیا کررہے ہو؟" اس انسان نے اپنی کڑک دار آواز میں رضا کو مخاطب کیا۔

"میں مسافر ہوں، راستہ بھٹک گیا ہوں۔" رضا سہمے ہوئے لہجے میں بولا۔

رضا کی آواز جیسے گہرے کنوئیں سے آرہی تھی۔

”میرا نام گنیش ہے اور میں ایک عامل ہوں۔“ اس نے رضا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ اتنی کڑک آواز سے رضا کے کان سائیں سائیں کرنے لگے، اچانک وہ عامل مسکرایا اور رضا کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو رضا کو ایسا لگا جیسے وہ انسانی ہاتھ نہیں کسی نے وزنی پتھر کندھے پر رکھ دیا ہو۔

”پریشان ہو نا تم؟“

عامل نے مسکراتے ہوئے رضا کو کہا، اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔

”مگر تم کیسے جانتے ہو بابا میرے بارے میں؟“

عامل نے اونچا قہقہہ لگایا تو جنگل اس کے قہقہے سے گونج گیا۔ ”تم بھول رہے ہو نوجوان کہ میں ایک عامل ہوں، سب جانتا ہوں تمہارے بارے میں، تم مسافر نہیں ہو اور نہ ہی راستہ بھٹکے ہو، تم اپنی الجھن کو سوچتے سوچتے یہاں تک آگئے اور راستہ بھٹک گئے اپنی منزل پانے کے لئے تم بے چین ہو تمہیں راستہ سجھائی نہیں دے رہا۔“

اتنا سننا تھا کہ رضا حیرت کے سمندر میں غوطے کھانے لگ گیا، اسے اس عامل سے بے پناہ خوف محسوس ہوا دل میں آیا یہاں سے بھاگ جاؤں، عامل اس کے چہرے کی طرف بغور دیکھ رہا تھا جیسے کھوئی ہوئی چیز کا متلاشی ہو۔ ”پریشان نہ ہو نوجوان میں تمہاری مدد کروں گا جس سے تم اپنی منزل پالو گے۔“ یہ سن کر رضا کی آنکھوں میں ایک دم جیسے دیئے سے جل اٹھے اس کو اب عامل سے خوف بھی محسوس نہیں ہو رہا تھا۔

”راستہ تھوڑا کٹھن ہے جوان مگر تم اپنی منزل کو پاسکتے ہو۔“ عامل نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”بابا میں ہر راستہ اپنانے کو تیار ہوں۔“ رضا نے جوش سے جواب دیا۔ عامل کی آنکھیں رضا کا جوش دیکھ کر چمکنے لگ گئیں۔

”میرے ساتھ آؤ نوجوان۔“ یہ کہتے ہی عامل نے رضا کو اپنے پیچھے چلنے کا اشارہ کیا تو رضا لمبے لمبے ڈگ بھرتا عامل کے پیچھے ہولیا، چند قدم کا فاصلہ طے کرکے وہ ایک چھوٹی سی کٹیا میں آگئے جو گھاس پھونس کی بنی ہوئی تھی۔ اندر ایک دیا جل رہا تھا۔ ایک چارپائی پر بستر اور تکیہ رکھا تھا، پاس ہی پانی کا ایک گھڑا تھا، کچھ کھوپڑیاں دیواروں پر لٹکی تھیں، غور سے دیکھنے پر یوں معلوم ہوتا کہ کھوپڑیاں ابھی حرکت کرنے لگ جائیں گی، آگ کا ایک الاؤ بھی روشن تھا جس سے اس کٹیا کا ماحول نہایت گرم اور پراسرار لگ رہا تھا۔ کٹیا کا جائزہ لینے کے بعد رضا نے عامل کی سمت دیکھا تو وہ بھی اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

”تم آرام کرو نوجوان، رات بہت ہوگئی ہے۔“ عامل نے بستر کی طرف اشارہ کیا۔

رضا دن بھر چل چل کے تھک گیا تھا، جسم درد سے چور چور تھا اور بھوک سے برا حال تھا، جیسے ہی وہ بستر کی طرف بڑھا تو عامل نے ایک پلیٹ اس کی جانب بڑھائی تو رضا ایک دم ٹھٹک کر اپنی جگہ پر رک گیا۔

”کھالو نوجوان تمہیں بھوک لگی ہے۔“ رضا ایک بار پھر حیرت زدہ ہوگیا۔

کھانا کھاتے اور بستر پر لیٹتے ہی اسے نیند نے اپنی آغوش میں بھر لیا اور وہ دنیا مافیہا سے بیگانہ ہوگیا۔

☆......☆......☆

سورج طلوع ہوتے ہی ہر طرف چرند پرند کی چہچہار سنائی دینے لگی، سورج کی کرنوں نے پورے جنگل میں اپنا ڈیرہ ڈال لیا، رضا آنکھیں ملتا اٹھ کھڑا ہوا اب تازہ دم تھا، کٹیا سے باہر آیا تو عامل ہاتھ میں کچھ پکڑے جنگل کی طرف سے آتا دکھائی دیا۔

”کیسے ہو نوجوان اٹھ گئے؟“

عامل نے رضا کو دیکھتے ہی مخاطب کیا۔

”جی بابا اب مجھے میرا کام بتائیں جس سے اپنی منزل پاسکوں۔“ رضا نے بہت بے تابی سے عامل کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”عامل نے ایک بھرپور قہقہہ لگایا اور رضا کو ایک طرف چلنے کا اشارہ کیا تو رضا خاموشی سے عامل کے پیچھے ہولیا۔

رات کے وقت جنگل جتنا خوفناک لگ رہا تھا دن کی روشنی میں اتنا ہی سرسبز اور ہرا بھرا دکھائی دیا، ہر طرف

درخت، پھل دار پودے، ایک جھیل بھی نظر آئی۔

خیر چلتے چلتے وہ جنگل کی حدود سے آگے نکل آئے جہاں چٹیل میدان تھا، یوں لگتا تھا کہ یہاں برسوں سے کوئی ذی روح کا گزر نہ ہوا ہو۔ چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کا نا ختم ہونے والا سلسلہ تھا، رضا چلتے چلتے تھک گیا۔

”بابا اور کتنا چلنا ہوگا۔“ رضا نے پوچھا۔

”بس جوان وہ سامنے پہاڑ کی بائیں جانب جو غار دیکھ رہے ہو نا وہاں تک جانا ہے۔“ عامل نے بنا پیچھے مڑے ہی جواب دیا۔

رضا کی ٹانگیں چل چل کر شل ہونے لگیں، مگر اسے اپنی منزل عزیز تھی، یہی سوچ کر اس کے قدموں میں تیزی آگئی، بنا رکے وہ چلنے لگا آخر کار دونوں پہاڑ کے پاس پہنچ گئے اور غار میں داخل ہوگئے جہاں انسانی گوشت اور خون کی مہک پھیلی ہوئی تھی، ایک بڑا سا سانپ ان کے قدموں کی آواز سن کر رینگتا ہوا غار سے باہر چلا گیا۔

”ہم یہاں کیوں آئے ہیں بابا؟“ رضا نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے گھبرا کے پوچھا۔

”بیٹھ جاؤ جوان۔“ عامل نے اشارہ کیا اور خود بھی وہاں چوکڑی مار کر بیٹھ گیا۔

”مگر بابا ہم یہاں کیوں آئے ہیں؟“ رضا نے اپنا سوال پھر دہرایا۔

”اس کو پی لو۔“ عامل نے سوال نظر انداز کرکے ایک پیالہ رضا کی جانب بڑھایا جسے اس نے تھام لیا اور ہونٹوں سے لگا لیا اسے ابکائی سی آئی، ایسا لگا کہ انسانی خون ہے، مگر غار میں پھیلی بو کی وجہ سے اسے اپنا وہم معلوم ہوا اور وہ پیالہ ایک ہی سانس میں پی گیا جسے دیکھ کر عامل کی آنکھوں کی چمک اور بھی بڑھ گئی۔

”دیکھو ادھر جوان جو میں کہوں وہ غور سے سننا۔“

عامل نے نہایت پراسرار انداز میں کہا۔

”جی بابا میں سن رہا ہوں۔“

”اپنی منزل پانے کے لئے تمہیں سات ایسے انسانوں کی قربانی دینی ہوگی جن کی گردن پر کالے تل کا نشان ہو تمہیں ان کی بلی دینی ہوگی۔“

”بابا آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں۔“ رضا نے حیرت اور صدمے سے ملے جلے تاثرات سے کہا۔

”میں جانتا ہوں جوان، تمہیں یہ سب عجیب لگ رہا ہے مگر تمہاری منزل دور نہیں، بس تمہارے سامنے کھڑی ہے۔“ عامل نے سبز باغ دکھاتے ہوئے کہا۔

رضا کی پیشانی پر حیرت کی لکیریں نمودار ہونے لگیں، اس کا دل مطمئن ہوا اور عامل نے بھانپ لیا اور دیکھا کہ یہ کشمکش میں ہے تو بوکھلاہٹ کے مارے چند قدم اور نزدیک ہوگیا اور چکنی چپڑی باتوں میں الجھا دیا تو رضا کا دل عامل کی باتوں سے نرم پڑ گیا۔

”میں تیار ہوں بابا اپنے کام کے لئے۔“ رضا نے سنجیدگی سے کہا۔

”ٹھیک ہے نوجوان، تم آج سے ہی اپنا پہلا شکار ڈھونڈنے نکل جاؤ مگر یاد رکھنا کام کو بیچ راستے میں مت چھوڑنا ورنہ نقصان کی تلافی بہت مشکل ہے تمہاری جان بھی جاسکتی ہے۔“ عامل نے اپنی کڑک دار آواز میں کہا۔

اور پھر رضا بنا کچھ بولے وہاں سے اپنی منزل کی جانب چل دیا، جس کا اسے راستہ تک معلوم نہ تھا۔

جب انسان نفسیاتی خواہشات کی راہ پر چل نکلتا ہے تو وہ یہ بھول جاتا ہے کہ کیا اچھا کیا برا، کیا حلال ہے اور کیا حرام ہے۔

رضا دن بھر خاک چھانتا رہا، اسے ایک چھوٹا گاؤں نظر آیا وہ اس میں داخل ہوگیا لوگ اسے دیکھ کر حیران ہوتے رہے۔ جنگل میں رہنے کی وجہ سے اس کا حلیہ بھی جنگلی جیسا لگنے لگا تھا۔

”لگتا ہے مجھے پہلے اپنا حلیہ بدلنا چاہئے۔“ رضا نے اپنے آپ سے سوال کیا۔

عامل نے اسے چلتے وقت کچھ روپے دیئے تھے کہ خرچ بھی کرنا، اور تم جب جیب میں ہاتھ ڈالنا تو اتنے کے اتنے ہی ہوں گے۔

رضا نے اپنا حلیہ بدلا، چلتے چلتے وہ تھک گیا۔ مگر ایک بھی اس کو ایسا انسان نظر نہ آیا جس کی گردن پر تل کا نشان ہو، تھک ہار کر وہ ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔

اچانک گھوڑے کی ٹاپوں کی آوازیں آنے لگیں۔ پھر جب گھڑ سوار قریب آیا تو نوجوان کی شکل نظر آئی جو گھوڑے سے اتر کے رضا کے قریب آیا۔

"یہاں کیا کر رہے ہو بھائی؟" نوجوان نے دوستانہ انداز میں رضا کو مخاطب کیا۔

رضا نے ایک پل تو سوچا کہ نہ بتاؤں مگر دل میں خیال آیا کہ کیا پتا کوئی راستہ مل جائے، مجھے اپنی منزل تک جانے کا کیا پتا یہاں اپنا پہلا شکار مل جائے۔

"میں اس جگہ نیا ہوں بھائی اور کام کی تلاش میں آیا ہوں چھوٹے چھوٹے بچے ہیں پیٹ تو پالنا ہے ان کا۔" رضا نے اپنے لہجے میں بے چارگی پیدا کرتے ہوئے جواب دیا۔

"چلو میرے ساتھ پاس ہی میرے بھائی کی دکان ہے تمہیں کام مل جائے گا۔" نوجوان نے رضا کو پیار سے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

دونوں دکان میں داخل ہوئے جو اس نوجوان کے بھائی کی تھی۔ نوجوان نے مختصر سا تعارف اپنے بھائی سے کروایا۔ پھر تھوڑی دیر بعد ایک بچے کو آواز دی کہ کھانا لائے کیونکہ رضا بہت زیادہ بھوکا تھا۔

☆......☆......☆

دوسری طرف ایمان کی حالت خراب تھی، رضا پورے ایک ہفتے سے غائب تھا، وہ نہیں جانتی تھی کہ کہاں ہے کیسا ہے، اور آنے والے رشتے کو سوچ کر دل ہلکان ہو رہا تھا، روزانہ وہ رضا کا انتظار کرتی۔

"کاش میں اس کو روک لیتی انجام چاہے جو بھی ہوتا۔" ایمان نے لمبا سانس لیتے ہوئے خود کلامی کی۔

"یا اللہ رضا کی حفاظت کرنا اسے صحیح سلامت واپس لانا میں تو جانتی بھی نہیں کہ وہ کہاں ہے۔"

اتنے میں ایمان کی ماں اندر کمرے میں داخل ہوئی تو ایمان نے اپنے آنسو جھٹ پونچھ ڈالے۔

"ایمان بیٹا میں ذرا تمہاری خالہ کنیز کی خیر خیریت معلوم کرنے جا رہی ہوں۔ شام ہونے والی ہے، بھائی آتا ہی ہوگا تم ہانڈی چڑھا لینا۔" اور یہ کہتے ہوئے ماں گھر سے نکل گئی۔

☆......☆......☆

جیسے ہی لڑکا کھانے کی ٹرے لے کر دکان میں داخل ہوا تو نوجوان سے ٹکرا گیا، سارا کھانا اس گھڑ سوار نوجوان کے اوپر گر گیا تو نوجوان نے جلدی سے اپنی قمیض اتار کر ایک طرف رکھ دی۔

جیسے ہی رضا کی نظر اس نوجوان پر پڑی تو اس کے قدموں سے زمین نکل گئی، یہ دیکھ کر کہ اس گھڑ سوار نوجوان کی گردن پر چونی برابر کالے تل کا نشان ہے جو قمیض اتارنے کی وجہ سے واضح نظر نہیں آیا تھا۔ اور پھر رضا نے اپنے منصوبے کے تحت گھڑ سوار نوجوان سے چکنی چپڑی باتیں شروع کر دیں۔

"بھائی یہ آپ کی گردن پر نشان کو دیکھ رہا ہوں یہ کیسا نشان ہے۔" نوجوان نے ہنس کر رضا کی بات کا جواب دیا۔

"یہ نشان ہر اس بچے کی گردن پر پیدا ہوتے وقت ہوتا ہے جو چاند کی چودھویں یا چاند گرہن یا سورج گرہن والے دن پیدا ہو، ہماری والدہ تو بچپن میں ہی فوت ہو چکی تھیں، جو ٹھیک طرح بتاتیں مگر لوگوں سے سن رکھا ہے کہ یہ نشان چونی برابر تل کی صورت میں ہوتا ہے، ہم دونوں جڑواں بھائی ہیں یہ تل کا نشان تو ہم دونوں کی گردن پر ہے۔" نوجوان نے نہایت سادگی سے جواب دیا۔

یہ سن کر رضا کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں کہ ایک ساتھ دو شکار میرے سامنے آ گئے ہیں۔

"ٹھیک ہے میرے بھائی میں چلتا ہوں اب یہاں تمہیں کام بھی ملے گا۔ اور کھانا پینا بھی، پاس ہی دکان کے ساتھ میرا گھر ہے کسی چیز کی ضرورت ہو تو حاضر ہیں ہم۔" نوجوان یہ کہہ کر چل پڑا۔

"میرے محسن رکو تو سہی کچھ دیر بیٹھو پھر چلے جانا۔" رضا نے بے تابی سے کہا کہ شکار ہاتھ سے چھوٹ نہ جائے۔

"نہیں میرے بھائی مجھے دوسرے گاؤں آج ہی جانا ہے پھر ملاقات ہوگی۔ میں نے شام تک پہنچنا ہے۔" نوجوان نے عجلت میں جواب دیا اور گھوڑے پر سوار ہو گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے گھوڑا نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ "بھائی آج آپ آرام کریں کل سے آپ کو کام سمجھا دوں گا۔" نوجوان کے بھائی درزی نے محبت بھرے انداز میں کہا۔

"مجھے ہر حال میں آج رات تک اپنا پہلا شکار حاصل کرنا ہے اور عامل کے پاس پہنچانا ہے پہلے اس کا کام تمام کروں پھر اس کے بھائی کی تلاش میں جاؤں گا۔"

رضا نے اپنی بے صبری دکھاتے ہوئے ذہن میں پلان بنانے شروع کئے، وہ درزی کو بہت ہی گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ جو کہ اپنے کام میں مگن تھا، اور اپنی موت سے بے خبر بھی تھا جو آج رات اسے آنے والی تھی۔

☆......☆......☆

رات کا آخری پہر تھا، درزی کی چارپائی کی سمت ایک سایہ بڑھتا ہوا دکھائی دیا جس کے ہاتھ میں چمک دار خنجر تھا جو اس نے مضبوطی سے تھام رکھا تھا، وہ سایہ آہستہ آہستہ چارپائی کے پاس کھڑا ہو گیا اور فضا میں اپنے ہاتھ بلند کئے جس میں خنجر تھا اور نہایت بے دردی سے وہ خنجر درزی کے عین دل کے مقام پر جا لگا فضا میں ایک ہلکی سی چیخ برآمد ہوئی جسے خواب خرگوش کے مزے لوٹتے ہوئے لوگ سن نہ سکے۔

سائے نے اس لاش کو سیاہ چادر میں لپیٹا اور کندھے پر ڈال کر گھر سے نکل کھڑا ہوا۔

دن ہونے سے پہلے اسے یہ لاش عامل تک پہنچانی تھی۔ سورج طلوع ہونے سے پہلے پہلے وہ غار میں جا پہنچا اور لاش کو عامل کے سامنے رکھ دیا۔

"یہ لو بابا میرا پہلا شکار بلی کے لئے۔" رضا نے عامل سے کہا۔

"شاباش رضا مجھے پتا تھا تم اپنی منزل پانے کے لئے کچھ بھی کرو گے مجھے تم سے امید تھی۔" عامل کی آنکھیں پر اسرار طور پر چمکنے لگیں جنہیں رضا محسوس نہ کر سکا، عامل لاش کو گھسیٹ کر غار کے اندر گم ہو گیا اور رضا گم صم ہو گیا، اسے بس اپنی منزل کی فکر تھی جو اسے ہر حال میں پانی تھی کسی بھی طرح سے۔

سورج پوری طرح طلوع ہو چکا تھا۔ رضا اپنے دوسرے شکار کے لئے نکل پڑا اس نے [illegible] ابھی درزی کی دکان پر نہیں جانا چاہئے [illegible] نوجوان نے بھائی کی گمشدگی کی خبر مل چکی ہوگی [illegible] رضا [illegible] میں چلنے لگا۔ "میں [illegible] کہیں [illegible] جلدی [illegible] جائے گا یہ منزل تک کا پہلا قدم [illegible] منزل مل جائے گی۔" رضا خود کلامی کرتا ہوا جا رہا تھا۔ ایک قتل کے بعد اس کے حوصلے بلند ہو گئے تھے۔

لیکن اس کا انجام بہت ہی عبرت ناک تھا مگر رضا ہر چیز سے بے خبر تھا۔ چلتے چلتے شام ہو گئی وہ ایک قبرستان میں داخل ہو گیا، قبرستان اتنا بڑا تھا کہ رضا کو معلوم ہی نہ ہو سکا کہ راستہ کدھر ہے، کچھ اندھیرا پھیل گیا تھا۔ وہ ایک قبر کے پاس درخت کے نیچے بیٹھ گیا اسے بیٹھے کچھ دیر ہی گزری تھی کہ مشرق کی سمت سے زبردست قسم کا طوفان اٹھنے لگا، یکا یک آسمان لہو رنگ کا ہو گیا اتنی زور سے آندھی چلنے لگی کہ درخت جیسے جڑوں سے اکھڑنے لگ گئے رضا خوف سے دبک کر بیٹھ گیا، اچانک اس کے ہاتھ پر بوندیں گرنے لگیں، اسے لگا بارش شروع ہو گئی ہے اور جیسے ہی اس نے اوپر سر اٹھا کے دیکھا تو وہ تھر تھر کانپنے لگا، خوف سے اس کی آنکھیں پھٹ گئیں، جہاں سے بوندیں گر رہی تھیں، وہاں ایک تازہ کھوپڑی لٹکی ہوئی تھی۔ وہ بوندیں بارش کی نہیں اس کھوپڑی کے خون کی تھیں۔

پھر دیکھتے ہی دیکھتے سارا درخت کھوپڑیوں سے بھر گیا اور رضا جان بچانے کے لئے وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔

پھر اچانک ساری قبریں پھٹنے لگ گئیں اور مردے سفید کفن پہنے قبروں سے باہر نکلنے لگے، اور یہ دیکھ کر رضا کو اپنی سانس سینے میں اٹکتی ہوئی محسوس ہوئی، اس کے قدم من من کے ہو گئے اور پھر طوفان نے موسلا دھار بارش کی شکل اختیار کر لی۔

سارے مردے رضا کے آس پاس جمع ہو کر قہقہے لگانے لگے، رضا کو لگا آج میری موت کا دن ہے، پھر وہ اپنی ہمت جمع کر کے اٹھ کھڑا ہوا، اور بھاگنے لگا، بھاگتے بھاگتے وہ ایک کوٹھری میں پہنچ گیا اس کی سانس بری طرح

پھولی ہوئی تھی، دھڑ ادھڑ کوٹھری کا دروازہ پیٹنے لگا، اور پیچھے مڑ کے دیکھا تو سفید کفن پہنے سارے مردے اس کے پیچھے آ رہے تھے یہ دیکھ کر اس کے رہے سہے اوسان بھی خطا ہو گئے اور وہ پوری طاقت سے کوٹھری کے دروازے کو اور بھی زور زور سے پیٹنے لگا جیسے توڑ رہا ہو مگر اتنی موسلا دھار بارش میں شاید دستک کی آواز اندر والوں کو سنائی نہیں دے رہی تھی۔

اچانک ایک ڈھانچے نے رضا کو دبوچ لیا تو وہ چکرا کے زمین پر گر گیا۔

ہوش میں آتے ہی اسے لگا میں قبر میں ہوں کوٹھری میں گھپ اندھیرا تھا۔ اچانک کوٹھری کا دروازہ کھلا اور سورج کی تیز روشنی نے اس کا استقبال کیا۔

☆......☆......☆

"کیسے ہو بیٹا رات تم یہاں بے ہوش ملے، میں نماز پڑھ رہا تھا تو دروازہ کھولنے میں دیر ہو گئی تب تک تم بے ہوش ہو چکے تھے۔ میں یہاں کا گورکن ہوں۔" "تم آرام سے بیٹھو میں تمہارے لئے کچھ کھانے کو لاتا ہوں۔" یہ بول کر گورکن پلٹا تو رضا کی نظر اس کی گردن پر پڑی تو رضا چونک پڑا کیونکہ گورکن کی گردن پر چونی برابر سیاہ تل تھا۔

رضا نے کہا۔ "کوئی بات نہیں آپ جائیں، میں اب ٹھیک ہوں، دراصل رات کام سے واپسی پر لیٹ ہو گیا تو سوچا شارٹ کٹ راستہ اپنا لوں مگر جیسے ہی قبرستان میں پہنچا تو بارش شروع ہو گئی اور آپ کی جھونپڑی نظر آئی بارش سے بچنے کے لئے میں ادھر آ گیا۔" رضا نے کمال ہوشیاری سے جھوٹ بولتے ہوئے گورکن کی سمت دیکھ کے کہا۔

گورکن جیسے ہی باہر کی جانب بڑھا تو رضا نے اپنے پلان کو ترتیب دینا شروع کر دیا۔ "بس اب جلد سے جلد مجھے اپنا دوسرا شکار بھی حاصل کرنا ہے تاکہ جلدی سے عامل مجھے میری منزل تک پہنچائے، پتا نہیں ایمان کس حال میں ہو گی۔" رضا نے خود سے سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔

دوسری جانب رضا عامل کے پلان سے بے خبر تھا۔ وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ کس راستے پر چل نکلا ہے جو بربادی کی طرف جائے گا۔

"ارے بیٹا تم ابھی تک بیٹھے ہو کیا سوچ رہے ہو کوئی پریشانی تو نہیں، اٹھ کر نہا لو پھر کچھ کھا لو تم۔" گورکن نے رضا کو بیٹھا دیکھ کر کہا تو وہ چونک اٹھا اس نے سر اٹھا کے گورکن کی جانب دیکھا جو آرام سے کھانے پینے کی چیزیں رکھ رہا تھا۔

رضا نے ایک لمحہ لگایا آنکھ جھپکتے ہی پاس پڑا بیلچہ اٹھا کر گورکن کے سر پر مارا تو وہ بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑا، ساری زمین گورکن کے سر سے نکلنے والے خون کے باعث سرخ ہونے لگی وہ اپنی کامیابی پر جھوم اٹھا مگر اب یہ ڈر تھا کہ رات نہیں صبح تھی اگر لاش غار میں لے کر جاتا تو لوگ دیکھتے۔ "مجھے رات ہونے کا انتظار کرنا پڑے گا ورنہ میں پکڑا جاؤں گا مگر لاش کو چھپاؤں کہاں؟"

"ٹھک ٹھک ٹھک۔" اچانک دروازے پر دستک ہونے لگی۔

"کون؟" رضا نے گھبرا کے پوچھا۔

"جی میں سامنے محلے کا رہنے والا ہوں۔ میرا رشتہ دار فوت ہو گیا ہے قبر تیار کروانی تھی۔" نوجوان کی آواز آئی۔

"جی میں ان کا بھانجا ہوں، ضروری کام کی وجہ سے ماموں کو شہر جانا پڑ گیا۔ وہ صبح سے پہلے ہی نکل گئے لیکن پریشان نہ ہو میں قبر تیار کر دوں گا۔" رضا نے خود پر قابو رکھتے ہوئے کہا۔

"جی ٹھیک ہے یہ کچھ پیسے رکھ لیں اور ذرا جلدی کریں میت اس حالت میں نہیں کہ زیادہ دیر تک رکھا جا سکے۔" نوجوان نے اتنا کہہ کر رضا کے ہاتھ پر تھوڑے پیسے رکھے اور جواب کا انتظار کئے بغیر واپس مڑ گیا......

قبر تیار کرنے اور جنازے تک شام سر پہ آ گئی۔ اتنے ٹائم تک رضا نے گورکن کی کوٹھری کو تالا لگا کے رکھا تاکہ کوئی اندر نہ جا سکے، جیسے ہی اندھیرا پھیلا چپ چاپ لاش کو کندھے پر ڈال کے غار کی طرف روانہ ہو گیا۔ پورے غار میں آگ کا الاؤ روشن تھا۔ رضا نے گورکن کو عامل کے سامنے پھینکنے والے انداز میں رکھا اور وہیں آلتی

پالتی مار کر بیٹھ گیا۔

"کیا بات ہے رضا تھک گئے یا ہار مان لی؟" عامل نے رضا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔

"نہیں بابا نہ تھکا ہوں نہ ہارا ہوں مجھے میری منزل تک پہنچا دو۔" رضا نے اپنی ازلی بے صبری دکھاتے ہوئے عامل کو مخاطب کیا۔

"ہاہاہا......رضا میں نے پہلے بھی کہا تھا تھک کر کام ادھورا چھوڑا تو تیری جان بھی جا سکتی ہے تو نہیں جانتا بڑی طاقت پانے والا ہے تو۔"

عامل نے پراسرار انداز میں کہا اور رضا کو جانے کا اشارہ کیا، وہ غار سے نکل کر ایک بار پھر چل پڑا پاس ہی گاؤں سے ڈھول بجنے کی آوازیں آ رہی تھیں، ایسا لگتا تھا کسی کی شادی ہو، وہ چلتے چلتے وہاں پہنچ گیا اور ایسا ظاہر کیا کہ اسی گاؤں کا ہو۔

"آ جاؤ بھائی ذرا بھنگڑا ڈالیں ابھی بارات آنے والی ہے؟" ایک جوشیلے نوجوان نے رضا کو دیکھتے ہوئے کہا تو وہ بھی ان میں شامل ہو گیا، تھوڑی دیر بعد بارات آئی اور نکاح کے بعد کھانا لگا دیا گیا۔ رضا صبح کا بھوکا تھا۔ کھانے پر ٹوٹ پڑا خوب سیر ہو کر کھانے کے بعد وہ اسٹیج کی طرف آ گیا اور رونق دیکھنے لگا، ایسے میں ایک لڑکا اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا، لڑکا لگ بھگ چودہ یا پندرہ سال کا تھا مگر باتوں سے کافی بڑا لگ رہا تھا۔

"تم اسی گاؤں کے ہو؟"

"لڑکے نے اچانک رضا کو غور سے دیکھے ہوئے سوال کیا۔

"ہاں میں پاس والے گاؤں کا ہوں، میرے دوست کی شادی میں آیا ہوں۔" رضا نے جھوٹ سے کام لیا۔

وہ لڑکا رضا کے پاس بیٹھا رہا اور ادھر ادھر کی ہانکتا رہا، اچانک اسی کی عمر کے دو اور لڑکے بھی وہاں آ گئے۔

"ابے تلو تو یہاں بیٹھا ہے، ہم تجھے ڈھونڈتے رہے۔" دونوں لڑکوں نے ایک ساتھ بولتے ہوئے کہا۔

"تلو؟ تلو یہ کیسا نام ہے۔" رضا نے حیرت سے لڑکوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ دونوں نے ہنس کر رضا کو دیکھا اور کہا۔

"ارے صاحب یہ تلو ہی ہے اس کے تل کی وجہ سے پورا گاؤں اس کو اس نام سے پکارتا ہے اب تو یہی اس کا نام پڑ گیا ہے، کیوں بے تلو۔"

"تل کا نشان؟ کہاں ہے تل کا نشان؟"

رضا نے بڑی بے تابی سے پوچھا تو لڑکوں نے اسے آگے کر کے گردن دکھائی جہاں بڑا سا کالے تل کا نشان موجود تھا۔ رضا کو بڑی خوشی محسوس ہوئی۔

"اچھا صاحب ہم ابھی آئے۔"

دونوں لڑکے کسی کے پکارنے پر غائب ہو گئے، رضا نے تلو میں دلچسپی لینا شروع کر دی۔

"تم پڑھتے ہو؟" رضا نے سوال کیا۔

"نہیں۔"

"کیوں نہیں پڑھتے؟"

میں سلامت کے ہوٹل میں چائے کے برتن دھوتا ہوں صبح سے رات تک اچھے پیسے بن جاتے ہیں، پھر رات کو وہیں سو جاتا ہوں۔"

لڑکے نے وضاحت میں کہا۔

"میرے ساتھ چلو گے کام پر؟"

"نہیں صاحب یہ میرا گاؤں ہے یہاں ٹھیک ہوں میں، پھر ہوٹل کے برتن کون دھوئے گا میں چلا گیا تو؟" لڑکے نے جواب دیا۔

رضا کسی بھی طرح بہلا پھسلا کر اس کو ساتھ لانے میں کامیاب ہو گیا۔

"اور کتنا چلنا پڑے گا میں تھک گیا۔" لڑکے نے چلتے چلتے پوچھا۔

"وہ بس سامنے پہاڑی کے پاس میرا گھر ہے۔" رضا نے ہوشیاری سے کہا اور چلنے لگا، چلتے چلتے وہ غار میں پہنچ گئے، عامل آنکھیں بند کئے کچھ پڑھ رہا تھا۔

"ہم یہاں کیوں آئے ہیں؟"

لڑکے کی آواز پر عامل نے پٹ سے آنکھیں

کھول دیں۔

"اسے سنبھالو بابا۔" رضا نے کہا۔

عامل کی آنکھوں میں شیطانی چمک پیدا ہوگئی، لڑکا ناسمجھی کے عالم میں دونوں کو دیکھ رہا تھا، اچانک عامل نے لڑکے کی کلائی پکڑی اور غار کے مخصوص حصے کی جانب بڑھ گیا اور کچھ ہی دیر میں پورا غار انسانی چیخ سے گونج اٹھا۔

"میں ایک بار پھر اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا۔" رضا نے خوش ہوتے ہوئے خود کلامی کی۔ اب اس کا رخ اگلے شکار کی طرف تھا۔ جنگل کے بائیں جانب چلتے ہوئے اسے دریا دکھائی دیا وہ دریا کے کنارے کنارے چلنے لگا۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد اسے دریا پر ایک دھوبی کپڑے دھوتا دکھائی دیا، رضا دھوبی کے قریب جا پہنچا۔

"سلام چاچا۔"

رضا نے دھوبی کو سلام کیا اور پاس ہی بیٹھ گیا۔

"کہاں کے ہو نوجوان اور یہاں کیا کر رہے ہو، کپڑے دھلوانے ہیں تو لے آؤ، اپنی تو روزی روٹی ہی یہ ہے۔" دھوبی بہت باتونی تھا۔

"میں مسافر ہوں پیاس لگی تو پانی پینے رک گیا آپ کو دیکھا تو سوچا یہاں تھوڑی دیر سستا لوں، پھر آگے بڑھ جاؤں گا۔" رضا نے جواب دیا۔

بھائی اس پیٹ کے لئے کہاں کہاں بھٹکنا پڑتا ہے، مجھے ہی دیکھ لو جب میں پیدا ہوا تو ماں باپ ایک ایکسیڈنٹ میں مارے گئے سب کو لگا میں منحوس ہوں، مجھے گھر سے باہر کردیا کہ تیری منحوسیت تیرے ماں باپ کو کھا گئی، میں در بدر ہوگیا، گاؤں کے چوہدری نے نوکر بنا کے پرورش کی، حویلی کے کام کرتا کپڑے دھوتا اور دھوبی بن گیا، اب پورے گاؤں کے کپڑے دھوتا ہوں۔" دھوبی نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔

"بچے تو فرشتوں کا روپ ہوتے ہیں آپ منحوس کیوں بن گئے۔" رضا نے دھوبی کو دکھ سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"بس کیا بتاؤں تو ہم پرست گاؤں ہے، میں چاند کی چودھویں کو پیدا ہوا، اس دن چاند گرہن تھا اور سونے پر سہاگہ یہ گردن پر کالے تل کا نشان لے کر پیدا ہوا سب نے کہا یہ منحوس نشان ہے، ماں باپ کو ہڑپ کر گیا۔" دھوبی نے نہایت دکھ سے اور سادگی سے داستان سنائی۔

"اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔" رضا کو اپنا کام آسان لگا۔

"اچھا تو اگر میں آپ سے کہوں کہ آپ میرے ساتھ میرے گھر چلیں میرے بچوں کے پاس رہیں گھر کا سودا سلف لایا کرنا تو کیا آپ مانیں گے؟"

رضا نے بڑی صفائی سے شکار پر جال پھینکا اور شکار کے پھنسنے کا انتظار کرنے لگا۔

سودا تو برا نہیں کپڑے دھو دھو کے کیا ملا آج تک چوہدری کا نوکر ہی کہلاتا ہوں۔ کیا ہی اچھا ہو باقی زندگی ٹھاٹ باٹ سے گزاروں، قسمت خود چل کر آئی ہے۔" دھوبی نے دل میں سوچتے ہوئے لالچ سے کہا۔

"ٹھیک ہے میں چلتا ہوں، تمہارے ساتھ مگر پہلے یہ سب کپڑے میں چوہدری کے گھر تک پہنچا آؤں۔" دھوبی یہ کہتے ہوئے کپڑے سمیٹنے لگا تو رضا دل ہی دل میں خوشی سے پھولے نہ سمایا وہیں دھوبی کا انتظار کرنے لگا۔

کچھ ہی دیر میں کچے راستے پر دھوبی واپس آتا ہوا دکھائی دیا، رضا اٹھ کھڑا ہوا، اور دوڑنے کے انداز میں دھوبی کے قریب پہنچا، دونوں باتیں کرتے کرتے ساتھ چلنے لگے۔

جنگل کے قریب جا کر دونوں تھوڑی دیر تک رک گئے۔ "ایسا کرتے ہیں کچھ کھا لیتے ہیں، میں کچھ پھل توڑ لاتا ہوں۔" رضا دھوبی سے کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا، دھوبی تھکا ہوا تھا درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر آرام کرنے لگا۔

رضا تھوڑی دور چلنے کے بعد مخالف سمت سے پیچھے کی طرف آنے لگا اور ایک پتھر اٹھا لیا، بنا قدموں کی آہٹ کئے دھوبی کے قریب پہنچ گیا اور پتھر دھوبی کے سر پر دے مارا تو دھوبی کے سر سے خون کا فوارہ ابل پڑا۔ اور چند لمحوں میں ٹھنڈا ہوگیا تو رضا نے لاش کندھے پر ڈالی اور

غار کا رخ کیا۔

☆......☆......☆

رضا دو دن سے اداس تھا کوئی شکار ہاتھ نہ لگا تو وہ ایک درخت کے پاس جا بیٹھا، تھوڑی دیر گزری تو ایک قافلہ آتا ہوا دکھائی دیا، قافلہ تقریباً پچاس افراد پر مشتمل تھا، رضا اٹھ کھڑا ہوا جب وہ لوگ پاس پہنچے تو کسی جنگلی قبیلے کے تھے۔ رضا ایک دم ڈر کے درخت کے پیچھے ہولیا۔

قافلہ نہایت تیزی سے گزر رہا تھا۔ کہ دو انسان رسیوں میں ایک ساتھ جکڑے ہوئے دکھائی دیئے ان کے منہ بندھے ہوئے تھے اور آنکھوں پر پٹی تھی۔

رضا نے نہایت تیزی سے مٹی لے کر اپنے چہرے پر ملی اور قافلے میں داخل ہوگیا اپنی جاسوس فطرت کے باعث یہ جاننے کے لئے کہ یہ دو انسان کون ہیں۔

تھوڑی دور چلنے کے بعد قافلے نے اپنے خیمے لگا کے ستانے کے لئے لیٹ گئے۔

دو شخص ایک ہرن کا شکار کر لائے جو جسامت میں بہت بڑی تھی اسے ذبح کر کے آگ پر بھونا گیا اور سب مزے لے کر کھانے لگے۔ رضا ابھی تک ان رسیوں میں بندھے دونوں انسانوں کے متعلق سوچ رہا تھا۔

رات کا اندھیرا پھیلنے لگا سب گدھے بیچ کر سو گئے مگر رضا کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی اچانک اسے آہٹ سی محسوس ہوئی تو خیمے سے نکل کر باہر آ گیا آسمان ستاروں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ آہٹ کی سمت بڑھنے لگا اچانک اسے وہی دو انسان رسیوں کو توڑنے کی کوشش میں لگے نظر آئے وہ قریب گیا تو سرگوشی کے سے انداز میں بولا۔

"بھائیوں ڈرو مت میں تمہاری مدد کروں گا بس یہ بتا دو کہ تم کون ہو اور یہاں کیسے آ گئے۔" رضا نے آگے بڑھ کر ایک کا منہ کھول دیا اس کی رکی سانس بحال ہوئی اور گھبرا کے بولا۔

"خدا کے لئے ہمیں یہاں سے بچا لو ہماری جان خطرے میں ہے، یہ لوگ ہمیں نہیں چھوڑیں گے ہمیں بھون کے کھا جائیں گے۔" ایک نے جلدی جلدی بات مکمل کی کہ کوئی آ نہ جائے۔

رضا نے ادھر ادھر دیکھا تو ہمت کر کے بولا۔ "بتاؤ تم دونوں ہو کون اور یہ لوگ کون ہیں تمہیں اس طرح کیوں باندھ رکھا ہے رسیوں کے ساتھ یہ تم سے کیا چاہتے ہیں؟"

رضا نے ایک ہی سانس میں کئی سوالات پوچھ ڈالے۔

"ہم دونوں تاجر ہیں بحری جہاز کے ذریعے ہم کپڑے کا کاروبار کرتے ہیں ایک دن ہم جہاز میں تھے کہ خوفناک سمندری طوفان آ گیا اور جہاز ایک چٹان کے ساتھ ٹکرا کے ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا، ہم دونوں کے علاوہ کچھ افراد اور بھی زندہ بچ گئے وہ تعداد میں تین تھے ہم ایک جزیرے پر پہنچ گئے۔ وہاں ہم بھٹکتے رہے، گھاس پھونس کھا کر گزارہ کرتے رہے، روز کنارے پر جا کر کسی جہاز کا انتظار کرتے مگر ناکام لوٹ آتے، ایک ہفتہ ہمیں اس جزیرے پر گزر گیا لوگ بھوک سے مرنے لگے اچانک رات کے وقت کچھ لوگ آتے دکھائی دیئے اور آوازیں آنے لگیں ساتھ ہی ان کے ہاتھ میں جلتی مشعلیں تھیں، ہم لوگوں میں جینے کی امنگ جاگ اٹھی۔ نوجوان نے اپنی داستان سناتے ہوئے کھو جانے کے انداز میں کہا۔

"مگر وہ لوگ کیا یہی انسان تھے یا کوئی اور؟"

رضا نے بہت بے قراری سے پہلو بدل کے پوچھا۔

"ہاں وہ یہی انسان تھے مگر یہ انسان کے روپ میں ہیں، تم نہیں جانتے نوجوان نے خوف سے جھرجھری لی، یا لگتا تھا وہ کسی چیز سے ڈر رہا ہو۔"

"آگے کیا ہوا، بتاؤ کیا ان لوگوں نے تمہیں بچا لیا؟"

رضا نے اس کی بات نظر انداز کر کے کہا۔

"نہیں وہ جب ہمارے قریب آئے تو بہت بڑا قافلہ تھا جسم ننگا تھا ہمیں دیکھ کر وہ اونچے اونچے قہقہے لگانے لگے اور بھنگڑے ڈالنے لگے۔ ہم ناسمجھی کے عالم میں حیرت میں ڈوب گئے اور سوچنے لگے نجانے اب کیا مصیبت آنے والی ہے۔"

"سردار آج تو خوب کباب کھائیں گے، بہت بھوک لگی ہے۔" ایک نوجوان نے جو کافی بھیانک شکل کا تھا، دانت نکالتے ہوئے موٹے ننگ دھڑنگ بھیلے جتنے

دمی کو مخاطب کیا جو غالباً اس قبیلے کا سردار تھا۔

"ساتھیوں ان کو پکڑ لو اور آگ جلا کر یہاں خیمے لگاؤ۔"

اس سردار نے سب کو متوجہ کرتے ہوئے کہا اور مارے اوسان خطا ہوگئے سوچنے سمجھنے کی بھی دیر نہ لگی اور ہم یوں میں جکڑے گئے، خیمے لگا کر آگ روشن کردی گئی، مارے سامنے ہمارے ایک ساتھی کو پکڑا گیا اور اس کے کپڑے پھاڑ دیئے گئے، اور جزیرہ چیخوں سے گونج اٹھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے ان آدم خوروں نے ہمارے تھی کے ٹکڑے کردیئے اور سب سے پہلے دل نکال کے دار کو پیش کیا وہ مزے لے کر دل چبانے لگا یہ سب دیکھ رہم نے آنکھیں بند کرلیں، اب وہ سب ایک ایک رکے بوٹی بوٹی کھا گئے، ہمارے ساتھی کو ہم بچا نہ سکے ب ہمیں ہماری موت صاف نظر آنے لگی یہ آدم خور ہمیں ی نہیں چھوڑنے والے تھے، ایک ایک کرکے ہمارے تھی ختم ہوگئے ہم دونوں بچ گئے۔" اتنا ہی بولا کہ وہ پانک رضا نے خیمے کی طرف سے آہٹ سنی۔

"تم یہاں سے بھاگ جاؤ ورنہ یہ لوگ تمہیں بھی بں چھوڑیں گے۔" نوجوان نے خوف سے زرد پڑتے ے کے ساتھ کہا۔

"مگر تم لوگ زندہ کیسے بچ گئے؟"

"رضا نے جھاڑی میں پیچھے چھپتے ہوئے سرگوشی تب تک آہٹ کی آواز بھی آنی بند ہوچکی تھی۔

"یہ ایک الگ کہانی ہے۔" نوجوان نے سر گھٹنوں ٹکتے ہوئے کہا۔

"جب ہم دو ہی بچ گئے تو ان کی نظر ہم پر ہی تھی ہماری رات بھی ہم رو رو کر خدا کو پکارنے لگے کیونکہ زندگی سب پیاری ہوتی ہے اور ہمارے سامنے بس دو قدم پر موت تھی ں کا آلاؤ روشن کردیا گیا سب ارد گرد جمع ہوگئے۔

"سردار کیا خیال ہے آج دونوں کا ایک ساتھ مزہ ۔" خبیث چہرے والے ایک آدم خور نے کہا۔

"اس کو میں اکیلا کھاؤں گا نوجوان کا گرم گرم خون یہ س گا بہت مزہ آئے گا۔" سردار نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

میری حالت ایسی کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔"

اس نے رضا کو بتاتے ہوئے کہا۔

"جیسے ہی وہ لوگ ہماری طرف بڑھے خوف سے ہماری زبان تالو سے چپک گئی، ہمیں گھسیٹتے ہوئے لے جانے لگے جھاڑیوں میں الجھ کر ہمارے کپڑے خود بخود پھٹ گئے وہ سب قہقہے لگانے لگے جیسے ہی انہوں نے ہمیں مارنے کے لئے ہتھیار ہاتھ میں اٹھا کے فضا میں بلند کیا تو اچانک سردار چیخ اٹھا۔

"رک جاؤ مت مارو ان کو۔"

سردار کا اتنا کہنا تھا کہ ہم سمیت تمام قافلے والے آدم خور سردار کی جانب دیکھنے لگے تو ہماری رکی ہوئی سانسیں بحال ہوئیں۔

سب حیرانگی سے سردار کو تکنے لگے۔ جو ہمیں بری طرح گھور رہا تھا۔

"مگر سردار آج تک ہم نے کسی شکار کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔"

سب نے ایک آواز میں ہو کر کہا۔ سردار جو ہمیں گھور رہا تھا سب کی طرف دیکھتے ہوئے گویا ہوا۔ "نامرادو ان کے جسم کی طرف غور سے دیکھو تمہیں دکھائی کیوں نہیں دے رہا۔" سردار نے اتنا کہنا تھا کہ سب کی نظریں ہماری طرف اٹھ گئیں۔ ہماری سمجھ سے باہر تھا کہ ایسا کیا دیکھا ہم میں۔" رسیوں میں جکڑے انسان نے آگے بولنے کی کوشش کی تو سامنے سے آتے سردار کے آدمی کو دیکھ کر چپ ہوگیا۔ تو رضا سمجھ گیا کہ کوئی گڑبڑ ہے۔ تینوں اس آدمی کو دیکھ کر سوتا بن گئے۔ اندھیرا ہونے کے باعث وہ دیکھ ہی نہ سکا کہ تینوں ایک ساتھ کیسے ہیں جب تینوں کو اطمینان ہوگیا کہ وہ چلا گیا ہے تو نوجوان پھر سے بولنے لگا۔ "جب سردار نے روکنے کا اشارہ دیا تو ہمیں حیرانگی ہوئی۔"

"مگر سردار نے مارنے سے کیوں روکا؟"

رضا نے اس کے بولنے سے پہلے ہی سوال داغ دیا۔

"سردار نے ہمیں گردن سے پکڑ کے سب کے سامنے کیا اور سب کو دکھانے لگا ابھی بھی ہمیں کچھ سمجھ نہیں آسکا جب سردار نے ہمیں جھٹکا دے کر ہمارا منہ دوسرے رخ کیا تو زور سے چلایا۔ "کم بختو ان کی گردن دیکھو یہ سانپ کے ڈسے ہوئے ہیں جب تک یہ ٹھیک نہیں ہوتے ہم ان کو کھا نہیں سکتے۔ یہ زہریلے ہیں جب تک یہ ٹھیک نہیں ہوتے ان کو باندھ کے رکھو بعد میں کھائیں گے۔ ورنہ ہم مرجائیں گے۔"

"لیکن تم لوگوں کو سانپ نے کب کاٹا؟"

رضا نے بے وقوفی دکھاتے ہوئے کہا تو دونوں آدمی ایک دوسرے کو دیکھنے لگا۔

"ارے بھائی سانپ نے نہیں کاٹا ہمیں۔" یہ سردار بے وقوف اور جنگلی آدم خور ہیں۔

"تو پھر سردار نے ایسا کیوں کہا؟" رضا نے ایک بار پھر عجلت دکھائی۔

"بھائی یا تم نہایت معصوم ہو یا پھر بہت بہت تیز خود بتاؤ سانپ کاٹتا تو ہم تمہارے سامنے زندہ ہوتے۔"

اس نے نہایت غصے بھرے انداز میں کہا اور گردن موڑ کے رضا کے سامنے کردی جسے دیکھ کر رضا ہکا بکا رہ گیا۔

رضا نے دونوں کی جانب دیکھا تو چاند کی روشنی میں بھی گردن پر کالے تل کے نشان نظر آرہے تھے۔ رضا کو یہ بھی اس عامل بابا کی کرامات لگی۔

صبح ہوگئی ایک بار پھر وہ دونوں رسیوں میں جکڑے انسان ان آدم خوروں کے رحم و کرم پر تھے دو لوگ جنگل سے شکار پکڑ کے لائے اور بھون کے کھانے لگے رضا سمیت ان دونوں نے بھی کسی بھی چیز کو ہاتھ تک نہ لگایا آدم خوروں کا قافلہ ایک بار پھر چل پڑا۔

"سردار ہم اتنے دنوں سے چل رہے ہیں آخر ہم جا کہاں رہے ہیں۔" ایک لمبے قد والے ننگ دھڑنگ آدمی نے پوچھا۔ "ہم ایک ایسی جگہ جارہے ہیں جہاں انسانوں کی بھرمار ہے۔" سردار اور بھی کچھ کہہ رہا تھا۔ مگر رضا کو بس اپنے دونوں شکار کی فکر تھی کہ کیسے ان کو آزاد کروا کے غار تک لے جائے۔

یوں ہی چلتے چلتے ایک بار پھر رات سر پر آئی اور خیمے لگا دیئے گئے آگ پر بھون کے چرند پرند سب ہضم کرکے خواب خرگوش کی طرح لیٹ گئے۔

اور جب رضا کو اطمینان ہوا کہ سب سو گئے ہیں تو وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ان کے قریب گیا دونوں رسیوں میں جکڑے بری طرح بے خبر پڑے تھے۔

"اٹھو چلو یہاں سے میں تمہاری رسیاں کھول دیتا ہوں۔" رضا نے کہا دونوں ہڑبڑا کے آنکھیں کھول کے دیکھنے لگے۔ "چلو جلدی چلو کوئی آواز مت نکالنا ورنہ ہم تینوں پکڑے جائیں گے۔" رضا نے رسیاں کھولتے ہوئے کہا تینوں بنا آواز کئے وہاں سے کھسکنے لگے جب تھوڑی دور گئے تو بھاگنا شروع کردیا وہ جلد سے جلد اس جگہ سے دور جانا چاہتے تھے پوری رفتار سے بھاگتے گئے مگر انہوں نے ہمت نہ ہاری کافی دور نکلنے کے بعد انہیں جب احساس ہوا کہ وہ جگہ پیچھے رہ گئی تو تینوں کو اطمینان ہوا۔

صبح ہونے سے پہلے پہلے وہ نہ صرف اس جنگل سے بلکہ اس جگہ سے بھی دور نکل آئے، تینوں تھک ہار کے ایک جگہ سستانے لگے، رضا کو بس ایک ہی فکر تھی "کہ کیسے ان کو غار تک لے جاؤں۔"

"بہت شکریہ تمہارا ہمارے محسن تم ہمیں درندوں سے آزاد کروا لائے ورنہ پتا نہیں ہم کب تک وہاں قید رہتے۔" دونوں نے احسان مند نگاہوں سے رضا کو دیکھا۔

"انسان ہی انسان کے کام آتا ہے میں نہ ہوتا تو کوئی اور بچا لیتا دنیا میں اچھے انسانوں کی کوئی کمی نہیں۔"

رضا چالاکی سے گویا ہوا دونوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "مگر اب تم دونوں جاؤ گے کہاں؟"

"ہمارا سب کچھ جہاز کے ساتھ ہی تباہ ہوگیا نہ جانے اب کہاں کہاں بھٹکنا پڑے گا۔" دونوں مایوسی سے بولے اور آسمان کو تکنے لگے اور کسی سوچ میں گم ہوگئے۔

"تم دونوں میرے ساتھ چلو میرے والد کی فیکٹری ہے کپڑے کی میں تو شکار کے شوق میں نکلا تھا راستے میں بھٹک گیا۔" رضا نے ہمیشہ کی طرح جھوٹ بولا۔

"نہیں میرے بھائی تمہارا پہلے ہی ہم پر بہت

احسان ہے ہماری زندگی بچائی مزید ہم بوجھ کیوں بنیں تم پر۔" دونوں نے کہا۔

"ارے احسان کیا بس میں نے کہا تم چلو آج سے ہم دو نہیں تین پارٹنر ہیں۔" رضا کی اتنی محبت دیکھ کے انہیں رضامند ہونا ہی پڑا، اور وہ چلنے کو تیار ہوگئے اور دونوں کو لے کر رضا نے غار کا رخ کیا۔

"لیکن ہم لوگ اس راستے پر کیوں جارہے ہیں؟"

غار دار راستہ دیکھ کے دونوں چونک گئے اور رضا کا چہرہ تکنے لگے تو وہ گھبرا گیا۔ وہ جو غار دیکھ رہے ہو نا اس کے پاس ہی ایک راستہ پہاڑی ار کے دوسری طرف اتر جاتا ہے، وہاں سے شہر شروع ہوتا ہے، وہی فارم ہاؤس ہے میرا۔" رضا نے غلط بیانی سے کام لیا تو دونوں سر ہلاتے ہوئے چلنے لگے۔

غار کے قریب پہنچ کے رضا جان بوجھ کے غار کے اندر جھانکنے لگا بولا۔ "دوستو یہ بہت سال پرانا غار ہے۔ معلومات کے تحت یہاں سے ہیرے جواہرت نکلنے کا امکان ہے۔" رضا کی بات پر دونوں دلچسپی سے غار میں داخل ہوگئے۔

اچانک غار کا منہ جادوئی طریقے سے بند ہوگیا اور چیخ وپکار سنائی دینے لگی۔

☆......☆......☆

ساتواں اور آخری شکار ہفتہ بھر بھٹکنے کے بعد بھی رضا کو نہ مل سکا تو وہ مایوس ہونے لگا اور پانی کے لئے وہ ایک کنویں کے پاس پہنچا اور پانی پینے کے بعد وہ کنویں کے منڈیر پر ہی بیٹھ گیا، تھوڑی دیر گزری تو ایک خواجہ سرا کا وہاں سے گزر ہوا سلام دعا کے بعد وہ بھی پانی پی کر اس کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔

"کیا بات ہے جوان بڑے پریشان ہو کہیں جارہے ہو یا کہیں سے آرہے ہو؟" خواجہ سرا اپنے سلکی بالوں کو پونی میں باندھتے ہوئے کہا تو رضا اس مسکرادیا۔

"نہیں بس تھک کے بیٹھ گیا۔ پیاس کی وجہ سے چلا نہیں گیا تو پانی پینے بیٹھ گیا۔" رضا نے جواب دیا۔ اور پوچھا۔ "آپ کہاں جارہے ہیں؟"

"میں دربار شریف پر جارہی ہوں۔ وہاں عرس ہے کوئی سواری نہیں ملی تو پیدل ہی چل پڑی۔" خواجہ سرا نہایت عقیدت سے بولا۔

"لیکن آپ رہتے کہاں ہیں اور کہاں کے ہیں میرا مطلب کس گاؤں کے ہیں؟" رضا نے سوال کیا۔

"میرا کوئی گھر نہیں جوان، بس دربار ہی میرا سہارا ہے۔ پیدا ہوئی تو بدقسمت ٹھہری۔

ایک دن میرا باپ کسی تعویذ گنڈے والے ایک فقیر کو گھر لے آیا۔ مجھے گھر سے نکالنے کی سازش تھی جو میری معصوم ماں سمجھ نہ سکی۔" خواجہ سرا کی داستان میں رضا کھو سا گیا۔

"تیرا یہ پتر شیطان ہے بالک جتنی جلدی ہوسکے اس کو ختم کر ورنہ یہ پورا گاؤں تباہ ہوجائے گا۔" تعویذ گنڈے والے نے میرے باپ کو کہا تو وہ میرا منہ دیکھنے لگے۔

"ہم نے کہا مار دے اسے ورنہ پتا نہیں کتنوں کی جان لے گا۔" فقیر غصے سے گویا ہوا۔

"نہیں میں اپنی جان دے دوں گی مگر میرا بچہ میرے جگر کا ٹکڑا ہے تو بتا کہاں سے یہ شیطان ہے۔"

یہ دیکھ کر وہ نقلی تعویذ گنڈے والا مسکراتا ہوا بولا۔

"ذرا بچے کی گردن دیکھ شیطانی نشان ہے جب یہ بڑا ہوگا تو سب کی گردن پر وار کر کے مارے گا۔" مسکراتا ہوا بولا۔ اور چلتا بنا اس کے بعد میرے ماں باپ کا کیا بنا مجھے نہیں پتا مگر ہوش سنبھالتے ہی خود کو درگاہوں پر پایا، بس اس منحوس تل کی وجہ سے۔" خواجہ سرا نے اپنی گردن کی سمت اشارہ کیا۔

رضا جو اتنی دیر سے اس کی داستان میں گم تھا اچانک چونک اٹھا اور چہرہ چمکنے لگا۔ خواجہ سرا اپنی ہی دھن میں مگن اس کا کام آسان کرگیا۔

"سنا ہے تم لوگوں کی دعائیں بہت سنی جاتی ہیں میرے ساتھ چلو میری ماں بہت بیمار ہے تم اس کو دعا دے دو تمہاری بہت مہربانی ہوگی۔" رضا لجاجت سے بولا۔

"چلو اسی بہانے ہوسکتا ہے مجھے میرے ماں باپ مل جائیں، میں تمہاری ماں کے پاس چلتا ہوں خدا شاید

مجھے میری ماں سے ملوادے۔" خواجہ سرا اٹھتے ہوئے بولا۔

رضا ایک دم حیران ہوا اسے امید نہیں تھی کام اتنی آسانی سے ہوجائے گا، خواجہ سرا اتنی جلدی مان جائے گا۔ وہ ایک دم خوش ہوکر اس کے ہاتھ چومنے لگا اور بولا۔

"تمہارا یہ احسان میں ہمیشہ یاد رکھوں گا۔" خواجہ سرا مسکرا کے ساتھ چلنے لگا۔

چلتے چلتے اچانک خواجہ سرا گر کے بے ہوش ہوگیا، رضا بہت دیر اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرتا رہا مگر نا کام رہا۔

"مجھے لگتا ہے اس کو ایسے ہی اٹھا لینا چاہئے مجھے اپنی منزل تک جانا ہے۔ آج آخری رات ہے پھر میں سب کچھ پالوں گا۔" رضا خود سے بولا اور خواجہ سرا کو کندھے پر اٹھا لیا۔

غار میں آج بہت اندھیرا تھا، پچھلی راتوں کا چاند جیسے کہیں سو گیا تھا۔

رضا کو آج عجیب سا خوف محسوس ہورہا تھا وہ تیز تیز قدموں سے چلنے لگا اور پسینے میں نہا گیا آج غار میں عامل نہیں تھا، رضا نے آہستہ سے خواجہ سرا کو ایک جگہ غار میں لٹا کر غار کا پہلی بار جائزہ لینے لگا کہ اچانک اسے غار کے چھوٹے سے سوراخ سے روشنی کا گمان ہوا وہ غار کے مزید اندر جانے لگا روشنی اب اور بڑی دکھائی دینے لگی کہ رضا کے قدم اچانک آگے بڑھنے کے بجائے رک گئے۔

"ہاہاہا دیکھا کیسے اس محبت کے مارے جوان کو میں نے بے وقوف بنایا، مجھے بہت سالوں سے ایسے ہی نوجوان کی تلاش تھی جو میرے کام آسکے۔ ہاہاہا۔" عامل کی آواز پر رضا چونک اٹھا اور ماجرہ سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔

"میں نے دیکھتے ہی پہچان لیا تھا یہ نوجوان میرے کام آئے گا، دیکھ لو مجھے ایسے سات انسانوں کی تلاش تھی جن کی گردن پر کالے تل کے نشان ہوں تا کہ ان کی بلی دے کر میں مزید طاقت ور بن جاؤں۔ آج آخری شکار آئے گا اس کے بعد میں اپنی طاقت پالوں گا

پھر اس نوجوان کا بھی خاتمہ کردوں گا ہاہاہا۔" عامل کسی سے باتیں کررہا تھا۔

رضا تھر تھر کانپنے لگا اس کے قدموں سے زمین نکل گئی، یہ سب سن کر اس نے خود کو کنٹرول کیا اور بنا آواز کیے پاس پڑی کلہاڑی اٹھالی اور آنکھیں شعلے اگلنے لگ گئیں۔

"نامراد خبیث آج میری آنکھیں تو نے کھول دیں، اپنے مقصد کی خاطر تو نے مجھے غلط کام پر لگایا اور بے پناہ نقصان کروایا، بے گناہوں کے خون کروائے میرے ہاتھوں آج تو ہی آخری شکار بنے گا۔" یہ کہتے ہی رضا نے کلہاڑی کے وار سے ایک دم عامل کی گردن تن سے جدا کردی۔

"یہ سب اتنا اچانک ہوا کہ عامل خود کو بچا نہ پایا۔" رضا غار میں بیٹھا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

وہ دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا، ایسا لگتا تھا اس کی آنکھوں سے آنسو ہی ختم ہوجائیں گے۔ اسے اپنی غلطی کچوکے لگانے لگی۔

"یا اللہ میں نے کیا کردیا میں کیوں اتنا ظالم بن گیا کہ بے گناہ بندوں کی جان لے لی، مجھے ذرا رحم نہ آیا نہ جانے کیوں میری آنکھوں پر پٹی بندھ گئی، میں درندہ بن کر تیری رحمت کے سائے سے محروم ہوگیا، میں بھول گیا کہ میں مسلمان ہوں ایک بت کے پوجنے والے کی باتوں میں آگیا جن پر تو نے جنت حرام کردی ہے، اور میں نے اپنی جنت کو اپنے ہاتھوں سے گنوادیا۔ تیری نافرمانی کی۔" اپنی ماں کا خیال آتے ہی وہ اور شدت سے رونے لگا۔ "نجانے میری ماں کس حال میں کس جگہ ہوگی زندہ بھی ہوگی یا......"

خود کلامی کرتے ہی وہ یہ سوچ کر تھر تھر کانپنے لگ گیا اور اس کے رونے میں اور شدت آگئی۔

اچانک خواجہ سرا کی آنکھ کھلی اور ہوش میں آکر ادھر ادھر حیرانگی سے دیکھنے لگ گیا کہ میں کہاں ہوں کس جگہ ہوں وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اسے رونے کی آوازیں آنے لگیں، وہ حیرت زدہ سا ہوکر دو قدم آگے گیا اور رضا کو روتے دیکھا۔

"کیا بات ہے جوان تو رو کیوں رہا ہے، اور اس

جگہ کیا کر رہا ہے؟ تو مجھے اپنی ماں کے پاس لے کر جا رہا تھا، تو ہم یہاں کیوں آ گئے؟" خواجہ سرا بولا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت تھی۔

"مجھے معاف کر دے میرے بھائی میں مرجانا چاہتا ہوں، تو مجھے اپنے ہاتھوں سے مار دے، نہیں تو میرا ضمیر مجھے جینے نہیں دے گا، میں انسان کہلانے کے لائق نہیں، نفرت ہے مجھے خود سے، تو ایک کام کر مجھے مار دے، مجھ پر احسان کر میں قاتل ہوں اتنے سارے لوگوں کا، مجھے جینے کا کوئی حق نہیں، مجھے کبھی خدا معاف نہیں کرے گا میں تو تجھے بھی اسی ارادے سے لایا تھا کہ تجھے بھی اس عامل کے حوالے کر دوں، مگر دیکھ میری آنکھیں کھل گئیں، میرے یہ ہاتھ جن سے میں نے ان معصوم لوگوں کی جان لی۔ کتنے گھر اجاڑے، کتنے بچوں کو یتیم کیا، خدا مجھے سزا دے۔"

رضا اپنے جرم کا اعتراف کرتے کرتے خواجہ سرا کے پاؤں میں گر کر معافی مانگنے لگا اور غم سے نڈھال ہو گیا۔ خواجہ سرا صدمے کی کیفیت میں کھڑا نا سمجھی کے عالم میں دیکھتا رہا۔

رضا ایک ایک بات اور گناہ خواجہ سرا کے سامنے قبول کرتا گیا وہ نہایت حیران تھا۔

"دیکھ نوجوان تو نے جو بھی کیا وہ معافی کے قابل تو نہیں مگر خدا تجھے ہدایت کا راستہ دکھانا چاہتا ہے، یوں سمجھ کہ خدا نے تجھے روشنی کی طرف مائل کیا ہے، خدا ایک موقع دے رہا ہے تجھے کہ تو اپنی غلطیوں کی معافی مانگے، سیدھے راستے پر چلے، وہ تو ستر ماؤں جتنا پیار کرنے والا ہے، کاش تو ایک بار اس سے مانگتا تو کبھی نامراد نہ رہتا، آج تو سب کچھ پا لیتا تو یہ کیوں بھول گیا کہ وہ پاک ذات ہے ان کو بھی نوازتا ہے جو شیطانوں کے ساتھ ملے ہوئے ہیں تو صبر کرتا اور دعا کرتا خدا کوئی نہ کوئی ضرور معجزہ کرتا مگر تو غلط راستے پر چل پڑا، گمنامی کے اندھیروں میں نکل پڑا، اب بھی وقت ہے معافی مانگ خدا سے اور لوٹ جا اپنی دنیا میں خوش رہے گا۔" خواجہ سرا سب کچھ سن کر غم سے بولا اور رضا کو سمجھانے لگا۔

دونوں غار کی ہر ایک چیز دیکھنے لگے۔ غار کی دیواریں سیاہی مائل تھیں اور ایک عجیب سی بو پھیلی ہوئی تھی انسانی ہڈیاں اور کھوپڑیاں جا بجا پڑی تھیں۔

ایک بت تھا جس کے بہت سارے بازو تھے اور شکل نہایت خوفناک، خواجہ سرا نے جیب سے ماچس نکال کر پورے غار کو آگ لگا دی اور خود باہر آ گئے۔ غار سے بہت خوفناک چیخوں کی آوازیں گونجنے لگیں، ایسا لگ رہا تھا کہ بہت ساری روحیں مل کر بین کر رہی ہوں، آگ رفتہ رفتہ ٹھنڈی پڑی اور ہر چیز جل کر خاک ہو گئی۔

دونوں بت بنے ہر چیز کو خاک میں ملتا دیکھتے رہے۔

رضا کی آنکھوں سے اب بھی آنسو جاری تھے وہ ایک جگہ پتھر پر بیٹھ کے غمگین نظروں سے آسمان کو تکنے لگا۔

"بس نوجوان دیر نہ کر خدا نے تجھے جو موقع دیا ہے اس سے فائدہ اٹھا ماں کے قدموں میں جا، ہو سکتا ہے تیری توبہ کے پیچھے کوئی معجزہ چھپا ہو، قسمت والوں کو توبہ کا موقع ملتا ہے تو بہت قسمت والا ہے، میری ماں تو نہیں، تیری ماں تو زندہ ہے مگر تو نے اسے بھی بھلا دیا ایک ناجائز مقصد کے پیچھے لگ کے۔

جا اب اس طرف کبھی لوٹ کر نہ دیکھنا ہر چیز پیچھے چھوڑ جا، میری دعا ہے خدا تجھے تیری منزل دلائے ایک خواجہ سرا کی دعا ہے دیکھنا تجھے اتنی خوشیاں ملیں گی کہ تو اپنا ہر گناہ بھول جائے گا۔ میری بات پر اور اللہ پر یقین رکھنا۔" خواجہ سرا رضا کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا اور ایک پل میں غائب ہو گیا۔

ماں کا خیال آتے ہی گھر جاتے جاتے رضا کو شام ہو گئی، جیسے ہی دروازے پر دستک دی، دروازہ کھل گیا وہ ادھر ادھر دیکھتا گھر میں داخل ہوا ماں چارپائی پر بیٹھی تسبیح پڑھ رہی تھی۔ رضا نے جھکے سے ماں کی گود میں سر رکھ دیا تو ماں کی آنکھیں کھل گئیں۔ "رضا کدھر چلا گیا تھا۔ میرے بچے کہاں کہاں نہیں ڈھونڈا تجھے، میں خدا کے آگے سجدہ ریز ہو کر عرض کرتی تھی

بیٹا لوٹ آئے۔" ماں روتے ہوئے اس سے لپٹ گئی، وہ خود بھی زار و قطار رونے لگا، سب گھر والے جمع ہو گئے اور حیرانگی سے ماں بیٹے کو دیکھنے لگے سب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے رضا اپنی بہن بھائی سے مل کر بہت خوش ہوا، سب اس کے ارد گرد جمع ہو گئے ماں نے اپنے ہاتھ سے اسے کھانا کھلایا۔

"تو کدھر گیا تھا بیٹا نہ کوئی خیر خبر دی نہ بتایا؟"

"بس ماں ایک جگہ پھنس گیا تھا، تیری دعاؤں نے نکال لیا۔" رضا نے اصل بات چھپا لی اور آنکھوں سے نمی صاف کی، رات گئے تک سب باتوں میں مصروف رہے۔

"اماں میں آج آپ کے کمرے میں سوؤں گا۔" اچانک اس نے کہا تو سب ہنس پڑے۔ "ہاں بیٹا ضرور، میں ہر رات روتی تھی کہ تو واپس آئے ایک پل چین نہیں تھا۔ میں خدا سے رو رو کے دعائیں مانگتی کہ میرا بیٹا واپس آئے خیریت سے دن رات سجدہ کیے تیری راہ دیکھتی۔"

ماں کی یہ بات سن کر رضا شرم سے پانی پانی ہو گیا۔

"تیرا شکر ہے خدایا تو نے مجھے مزید ظلم سے بچایا۔ مجھے معاف کر دے میری توبہ قبول کر۔"

"کیا سوچ رہا ہے بیٹے اب شادی کر لے میں جیتے جی تیرا گھر آباد کرنا چاہتی ہوں۔" ماں کی اس بات پر رضا کی آنکھوں میں ایمان کا چاند سا سراپا لہرایا مگر اس نے آنکھیں بند کر لیں اور ماں کو کہا۔

"ماں جہاں تم کہو میں شادی کے لئے تیار ہوں۔" اس نے نہایت دکھی دل سے کہا مگر وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ اس کی توبہ کا پھل اسے ملنے والا ہے۔

☆......☆......☆

"بیٹا رضا تیرے لئے ایک رشتہ دیکھا ہے لڑکی چاند کا ٹکڑا ہے پہلے اپنے ماموں کے گھر رشتہ ہوا تھا، اس کا اور اس کے ماموں زاد کا، ایک ایکسیڈنٹ میں ہلاک ہو گیا۔" ماں نے بتاتے ہوئے بولی۔

"نہیں اماں مجھے ان باتوں سے کوئی لینا دینا نہیں بس آپ کی خوشی میری خوشی ہے۔" رضا کہتے ہی گھر سے نکل گیا۔

شادی نہایت دھوم دھام سے ہوئی رضا دل سے ایمان کے لئے بہت دکھی تھا۔ اسے بھلا نہیں پا رہا تھا کہ اماں نے کہا۔

"ارے بیٹا تو یہاں، جا اور اندر بہو تیرا انتظار کر رہی ہے۔" اماں نے حیرانگی سے کہا تو وہ دل ہی دل میں شرمندہ ہوتا ہوا کمرے کے اندر چلا گیا۔

ایک وجود وسیع بیڈ پر بیٹھا شاید تھک کے بیٹھے بیٹھے سو گیا تھا، رضا تھوڑا آگے جھکا اور اسے ہلایا، پھر دونوں کی آنکھیں ایک ہوئیں اور زمین آسمان گھوم گئے، ایک پل میں۔

"ایمان تم یہاں؟"

"رضا تم ہی ہو ناں......"

دونوں ہنس بھی رہے اور آنکھوں سے آنسو بھی جاری تھے وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ایسا معجزہ بھی ہو گا، دونوں کو خبر ہی نہیں تھی کہ اس طرح مل جائیں گے دونوں کو ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا۔

"یا خدا میں سوچ بھی نہیں سکتا کہ تو مجھے اتنا نواز دے گا میں تو اتنا گناہ گار تھا، تو نے خوشیوں سے میری جھولی بھر دی، اتنی بھر دی کہ میں تصور نہیں کر سکتا۔" رضا سجدے میں پڑا سسک کے رو پڑا، ایمان کی بھی حالت ایسی ہی تھی۔

ٹھیک کہتے ہیں خدا اپنے بندے کو خالی ہاتھ نہیں لوٹاتا، ماں باپ کی خوشیوں کے پیچھے ہماری خوشی چھپی ہوتی ہے، کائنات میں ہمارا جتنا حصہ ہوتا ہے ہمیں مل کر ہی رہتا ہے۔ خدا مہربان ہے نیکی اور توبہ کا اجر اتنا دیتا ہے کہ جتنی انسان کی اوقات نہیں ہوتی۔

رضا اپنی شریک حیات اپنا پیار اپنی محبوب بیوی کو آغوش میں بھر کر ایک نئی زندگی کے آغاز کے متعلق سوچنے لگا۔ سچ کہتے ہیں دنیا میں معجزے آج بھی ہوتے ہیں اگر نیت سچی ہو توکل اللہ اور لگن پکی ہو تو......



قوسِ قزح

قارئین کے بھیجے گئے پسندیدہ اشعار

ساحل کو دیکھ کر یوں مطمئن نہ ہو
اکثر سفینے ڈوبتے ہیں ساحل کے آس پاس
(ایس حبیب خان......کراچی)

سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے بہاروں کا
کس نے مقام پرکھا ہے تاروں کا
حوصلہ دیتے ہیں آج کل کے یار بھی
وہ پہلے سا جلوہ نہ تھا نظاروں کا
(محمد اسلم جاوید......فیصل آباد)

کہتے ہیں چپ چاپ سے رہتے ہیں وہ اکثر
زلفیں بھی سنا ہے کہ سنوارا نہیں کرتے
دن رات کہ ان کے گزرتے ہیں پریشان
آرام سے بھی تو گزارا نہیں کرتے
(جان محمد......میرپور)

یاد رکھتے ہیں ہم آج بھی تمہیں پہلے کی طرح
کون کہتا ہے فاصلے دوستوں کی یاد مٹادیتے ہیں
کبھی اس درد سے گزرو تو معلوم ہو تم کو دوست
محبت وہ بلا ہے جو دلوں کا خون پیتی ہے
(شرف الدین جیلانی......ٹنڈوالہ یار)

ہے پھر مجھے دعاؤں کے سہارے کی ضرورت
اے کاش آج مجھے پھر کوئی دل سے دعا دے
(سلمٰی ممتاز......ٹنڈوالہ یار)

پھولوں کی طلب میں تیری خوشبو ہی رہی ہے
سچ پوچھ تو اس دل کو تیری آرزو ہی رہی ہے
میری آنکھوں میں کوئی خواب آتے بھی تو کیسے
ان آنکھوں میں صبح و شام بس تو ہی رہی ہے
(عامر شہزاد......ننکانہ صاحب)

میں آج بھی تمہیں یاد کرتی ہوں پہلے کی طرح
کون کہتا ہے کہ فاصلے بڑھنے سے یاد نہیں آتی
(رابعہ عباس......بستی فتے والی)

انسان سے محبت کی سزا کتنی کڑی ہے
وقت کے طمانچے میرے رخسار تک آئے
(انتخاب: عامر علی......لاہور)

ملے بھی تو کیوں ملے مجھے زندگی کے اس موڑ پر
جب کچھ بھی نہ رہا میرا زندگی کے اس موڑ پر
(ماسٹر محمد خالد عباس......ننکانہ صاحب)

جب راس نہ آئی تو چھوڑ گیا
اک شخص نے محبت کا تجربہ کیا ہم پر
(محسن عزیز حلیم......کوٹھا کلاں)

آج جی بھر کر رونے کو جی چاہتا ہے
پل بھر میں مرجانے کو جی چاہتا ہے
خدا تمہیں رکھے سلامت تا عمر بھر
جن کی وجہ سے ایسا کرنے کو جی چاہتا ہے
(عبدالکریم طارق......کوٹھا کلاں)

اب کی بار خود ایسی سزا دیں گے ہم رضی
کہ نفرت کرنے والے بھی رو پڑیں گے
(عبدالکریم طارق......کوٹھا کلاں)

تیری جھیل سے آنکھوں میں کھو جانے کو جی چاہتا ہے
اک بار تو دیکھو ہمیں پیار سے
(طارق......کوٹھا کلاں)

کیا غضب کا شخص تھا کہ کیا غذاب کی ادائیں
اے خدا ہم فدا نہ ہوتے تو اور کیا کرتے
(طارق کریم......کوٹھا کلاں)

تم تہجد کے وقت اٹھ جانا
مل کر ایک دوسرے کو مانگیں گے
(رشک نور......فیصل آباد)

محبت ملن ہے اس میں تن کا ملن مت مانگو
جسے چھولیا جائے اسے پوجا نہیں کرتے
(انتخاب: عارفہ عامر......نواب شاہ)

تیری پلکوں کے آنسوؤں سے عقیدت مجھے بھی ہے
تیری طرح زندگی سے محبت مجھے بھی ہے
تو اگر نازک ہے تو میں بھی نہیں پتھر
تنہائی میں رو دینے کی عادت مجھے بھی ہے
(انتخاب: عمران......کراچی)

☆☆



حکایت غم جاناں اب اور کیا کہئے
کبھی تو زیست کی تلخی کا ماجرہ کہئے
چھپائے بیٹھے ہیں ہم سے وہ زخمی دل اپنا
اب اس کو حسن تغافل نہیں تو اور کیا کہئے
کسی کی ایک نظر نے جو بات کہہ ڈالی
ہوئے اسی کے، بھلا کہئے یا برا کہئے
عجیب بے سرد سامان ہوگئے ہیں ہم
صلہ ملا ہے وہ ہجرت کا بس سزا کہئے
خموش رہیے تو جیسے ہمالیہ کا سکوت
کبھی جو کہیے تو پھر کھل کے برملا کہئے
مرے یہ زخم فروزاں رہے شب ہجراں
وہ انتظار کی شدت کی بس بلا کہئے
(انتخاب: ایس حبیب خان)

ادھر وہ ہاتھوں کے پتھر بدلتے رہتے ہیں
ادھر بھی اہل جنوں سر بدلتے رہتے ہیں
بدلتے رہتے ہیں پوشاک دشمن جانی
مگر جو دوست ہیں پیکر بدلتے رہتے ہیں
ٹھکانہ آج کے احباب کا نہ موسم کا
جو رنگ روپ برابر بدلتے رہتے ہیں
مہک اٹھیں نہ غریبوں کے خون کے دھبے
امیر زادے تو چادر بدلتے رہتے ہیں
بدل سکیں نہ مقدر لکیریں ہاتھوں کی
ہم اپنے آپ مقدر بدلتے رہتے ہیں
یہ دبدبہ یہ حکومت یہ نشۂ دولت
کرائے دار ہیں سب گھر بدلتے رہتے ہیں
ہم ایک بار جو بدلے تو آپ روٹھ گئے
مگر جناب تو اکثر بدلتے رہتے ہیں
غریب لوگ تلاش معاش میں امتیاز
وطن سے دور سمندر بدلتے رہتے ہیں
(ایس امتیاز احمد......کراچی)

ہماری چاہت کی تجھے نہ کچھ خبر ہوگی
تڑپتے ہوئے یوں ہی یہ شب بسر ہوگی
تیری وفا سے ہے یہ جہاں پھر روشن
تمہاری کے لائق نہ یہ نظر ہوگی
یہ تو ممکن نہیں اپنی وفا کو رسوا کریں
نہ یہ زباں کھلے گی نہ آنکھ تر ہوگی
رواں ہے کون سی منزل کو کارواں دل کا
تیری یاد صرف اس کی ہموا ہوگی
میری خاموشی کا سبب نہ جانا تو نے کبھی
میرے بچھڑنے کے بعد پھر تجھے قدر ہوگی
تیرے پیار کے چراغ ہیں اس طرح فروزاں
نہ ہوگی شام کبھی اس کی نہ سحر ہوگی
وہ تو ہیں سنگدل ان سے کیا گلہ جاوید
پھر تمہاری آہ و فغاں بے اثر ہوگی
(محمد اسلم جاوید......فیصل آباد)

ہر نفس ہے مسائل کا اژدہام یہاں
ہے سعی حل مسائل بھی تلخ کام یہاں
ہر ایک جنبش لب پر زباں کٹتی ہے
مجال ہے کہ کوئی کرسکے کلام یہاں
قدم قدم پہ دبائے ضمیر کی آواز
تو جا کے پھر کوئی پائے کہیں مقام یہاں
جو اہل زر ہیں وہ انسانیت کے ہیں آقا
ہیں خالی ہاتھ تو انسان کب ہے نام یہاں
نصیب نیکی فطرت میں بس ہے محرومی
فریب کا ہے نقرا حصول جام یہاں
نہ جرم کے تھے معاون نہ آپ مجرم تھے
لگا ہے ایسے ہی لوگوں پہ اتہام یہاں
برائیاں جو نہ پھولیں پھلیں تو کیوں واجد
ہے ان کی پشت پناہی کا انتظام یہاں
(پروفیسر واجد نگینوی......لاہور)

روشنی کی اس طرح تشہیر ہونی چاہئے
ظلمتوں کی پھر بری تقدیر ہونی چاہئے

واعظو ہیں آج اس جہاں میں کچھ ہمارے بھی حقوق
میکدے میں آج اک تقریر ہونی چاہئے
تجھ سے تیرے ظلم کی روداد کہنے کیلئے
تیرے در پہ عدل کی زنجیر ہونی چاہئے
چاندنی ہے دھوپ جیسی دھوپ سایہ داز ہے
ہے اگر یہ خواب پھر تعبیر ہونی چاہئے
آج پھر سے عید شاکر پھر وہی تنہائیاں
وہ نہیں تو ان کے گھر تصویر ہونی چاہئے
(محمد حنیف شاکر......ننکانہ صاحب)

یونہی بے سبب نہ پھرا کرو کوئی شام گھر بھی رہا کرو
وہ غزل کی سچی کتاب ہے اسے چپکے چپکے پڑھا کرو
کوئی ہاتھ بھی نہ ملائے گا جو گلے ملو گے تپاک سے
یہ نئے مزاج کا شہر ہے ذرا فاصلے سے ملا کرو
ابھی راہ میں کئی موڑ ہیں کوئی آئے گا کوئی جائے گا
تمہیں جس نے دل سے بھلا دیا اسے بھولنے کی دعا کرو
مجھے اشتہار سی لگتی ہے یہ محبتوں کی کہانیاں
جو کہا نہیں وہ سنا کرو جو سنا نہیں وہ کہا کرو
کبھی حسن پردہ نشین بھی ہو ذرا عاشقانہ لباس میں
جو میں بن سنور کے کہیں چلوں میرے ساتھ تم بھی چلا کرو
نہیں بے حجاب وہ چاند سا کہ نظر کا کوئی اثر نہ ہو
اسے اتنی گرمی شوق سے بڑی دیر تک نہ تکا کرو
یہ خزاں کی زردی شال میں جو اداس پیڑ کے پاس ہے
یہ تمہارے گھر کی بہار ہے اسے آنسوؤں سے ہرا کرو
(شرف الدین جیلانی......ٹنڈوالہ یار)

میں تنہا ہوں مجھ کو تنہا ہی رہنے دو
یہ زندگی کے زخم اکیلے ہی سہنے دو
ایک مدت سے دل کو سمجھائے رکھا تھا
دیکھ کسی کی چاہ کہا محبت کرنے دو
مان کر ہار جو بات دل کی مانی تھی
ہوا قصور سزا جرم محبت سہنے دو
تھام کر ہاتھ تنہا چھوڑا اس نے
بیچ منجدھار میں یونہی ڈوبنے دو

چھلکتے صبح و شام اس کی یاد میں جو
ہے آنسو کی عادت انہیں بہنے دو
تنہا رہنا ہے اب تو مشغلہ اپنا دوست
تنہائی میں صبح و شام تڑپ لینے دو
سکوں ایک پل بھی میسر نہیں ہے مجھے نینا
کرو ایسی دعا کہ ابدی نیند سونے دو!!!
(شاعرہ: ایڈووکیٹ نینا خان......کراچی)

کیسے بیان کروں اس ظالم کو
جو کاٹ کھاتی ہے
جس کی خوراک
اس کی ذات ہے
جو چیر کے رکھ دیتی ہے دل کو
جو عذاب ہے روح کو
اکھاڑ دیتی ہے یہ رنگ زندگی کے
اجاڑ دیتی ہے یہ خوشیاں دل کی
تنہائی اک نشا ہے ایسا
انسان کو خاموش کر جائے جیسا
اس کو مدہوش کر جائے جیسا
اس کی ذات میں
اس کی بات میں
تنہائی سے بچ کر رہنا یارو
اگر بچ سکو تم
کہ تنہائی
کبھی کرتی نہیں بے وفائی؟
یہ ساتھ جیتی ہے
ساتھ مرتی ہے
انسان کی خاموشی
خودکشی ہے
یہ ساتھ جیتی ہے
ساتھ مرتی ہے
انسان کی لاچاری
اک بے بسی ہے
جو دیکھو کبھی کسی تنہائی کو منت

اگر دیکھو تم کبھی
اگر دیکھ پاؤ تم
اس کی خاموشی کو سننا تم
اگر سن پاؤ تم
اس کی اداس و گہری آنکھوں سے
اس کے دل میں اتر جانا
اگر اتر پاؤ تم
اس سے پیار جینا!
اگر جینا پاؤ تم
(شاعرہ: رشک نور......فیصل آباد)

دل کی چوکھٹ پر جو اک دیپ جلا رکھا ہے
تیرے لوٹ آنے کا امکان سجا رکھا ہے
سانس تک بھی نہیں لیتے ہیں تجھے سوچتے وقت
ہم نے اس کام کو بھی کل پہ اٹھا رکھا ہے
روٹھ جاتے ہو تو کچھ اور حسین لگتے ہو
ہم نے یہ سوچ کے ہی تم کو خفا رکھا ہے
تم جسے روتا ہوا چھوڑ گئے تھے اک دن
ہم نے اس شام کو سینے سے لگا رکھا ہے
چین لینے نہیں دیتا یہ کسی طور مجھے
تیری یادوں نے جو طوفان اٹھا رکھا ہے
جانے والے نے کہا تھا کہ وہ لوٹے گا ضرور
اک اسی آس پہ دروازہ کھلا رکھا ہے
تیرے جانے سے جو اک دھول اٹھی تھی غم کی
ہم نے اس دھول کو آنکھوں میں بسا رکھا ہے
مجھ کو کل شام سے وہ یاد بہت آنے لگا
دل نے مدت سے جو اک شخص بھلا رکھا ہے
(عامر شہزاد......ننکانہ صاحب)

جب کانچ اٹھانے پڑجائیں
تم ہاتھ ہمارے لے جانا
جب سمجھو کہ کوئی ساتھ نہیں
تم ساتھ ہمارا لے جانا
جب دیکھو کہ تم تنہا ہو
اور راستے ہیں دشوار بہت
تب ہم کو اتنا کہہ دینا
بے باک سہارا لے جانا
جو بازی بھی تم جیتو گے
جو منزل بھی تم پاؤ گے
ہم پاس تمہارے ہوں نہ ہوں
احساس ہمارا لے جانا
اگر یاد ہماری آجائے
تم پاس ہمارے آجانا
بس ایک مکان ہمیں تم دینا
تم جان ہماری لے جانا
جب کانچ اٹھانے پڑجائیں
تم ہاتھ ہمارے لے جانا
(انتخاب: رابعہ عباس......بستی فتے والی)

دیتا رہا فریب کوئی سادگی کے ساتھ
اتنا بڑا مذاق میری زندگی کے ساتھ
شاید ملی سزا اس جرم کی مجھے
کہ تھا مجھے پیار اک اجنبی کے ساتھ
وہ زہر بھی دیتا رہا دوا کی طرح
اتنا برا سلوک میری عاشقی کے ساتھ
اپنا سمجھ کے جس کے لئے ہم اجڑ گئے
کل شام جا رہا تھا وہ اک اجنبی کے ساتھ
(عثمان غنی......پشاور)

ہم جلتے رہے موم کی طرح
وہ بے خبر چلتے رہے ہوا کی طرح
ہم ڈرتے رہے پرندوں کی طرح
وہ گرجتے رہے بادلوں کی طرح
ہم سہم گئے بچوں کی طرح
وہ چمکتے رہے بجلیوں کی طرح
ہم بھیگ گئے چڑیا کی طرح
وہ برس کر چل دیئے بارش کی طرح
(عبدالکریم طارق......کوٹھا کلاں)

☆☆

گونگا طاعون

ایس امتیاز احمد-کراچی

وہ صبح عوام کے لئے دہشت ناک تھی سارے لوگ دہل کر رہ گئے، ہر شخص پر لرزہ طاری ہوگیا تھا لوگوں کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مفقود ہوگئی تھی کہ اتنے میں……

ایک بین الاقوامی مجرم کی خونی داستان خیرت جو دنیا کو موت سے ہمکنار کررہا تھا

لاری بل حسب معمول کام سے واپس آیا تو دروازے پر بیوی کا چاند سا، مسکراتا چہرہ دکھائی نہ دیا۔ اس کا دل کسی انجانے خدشے سے دھڑک اٹھا۔ خدا خیر کرے جین خیریت سے ہو…… وہ تو گذشتہ تین سال سے اپنا معمول بڑی باقاعدگی سے نبھا رہی تھی۔

اس نے سائیکل سے اترتے ہی پھاٹک کھولا اور لپکتا ہوا وسیع وعریض احاطے میں داخل ہوگیا۔ جین کہیں دکھائی نہ دی پھر اس نے اپنے خوبصورت اور جنت نظیر گھر کا گوشہ گوشہ چھان مارا مگر جین کا حسین وجود اس کی بیقرار نگاہوں کے سامنے نہ آسکا۔

باورچی خانے سے نکل کر اس نے غسل خانے کا دروازہ کھولا تو جین وہاں موجود تھی۔ اچانک صدمے اور حیرت سے لاری کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ جین فرش پر چت پڑی تھی۔ بازو دونوں جانب بے اختیاری کے عالم میں پھیلے ہوئے تھے۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ اور اس کے عنابی ہونٹ بات کرنے کے انداز میں حرکت کررہے تھے مگر آواز معدوم تھی۔

”آہ…… خدایا……!“ لاری بڑی درد آمیز آواز میں بولا۔ ”یہ تمہیں کیا ہوگیا میری جان میری روح……!“ جین نے جواب میں کچھ کہنا چاہا۔ اس کے ہونٹ ہلے مگر اس کی مترنم آواز سے لاری کے کان محروم رہے۔

”یہ تمہیں کیا ہوگیا میری روح۔“ لاری نے اسے پھول کی طرح اٹھا لیا۔ ”تمہارے بغیر تو میری زندگی ویران ہوجائے گی۔“ لاری بیوی کو سینے سے لگائے بیڈ روم میں پہنچا۔ اسے بستر پر لٹایا اور اس کا جسم ٹٹولنے لگا۔ جسم گرم تھا مگر بے جان ہر نوع کی حرکت سے محروم۔ صرف آنکھوں کی غیر معمولی چمک، اور بات کرنے کے انداز میں ہونٹوں کی حرکت سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ زندہ ہے۔

”میں ابھی ڈاکٹر کو فون کرتا ہوں جینی۔ گھبراتا نہیں میں تمہارے پاس مسز کارٹر کو بیٹھا جاؤں گا۔“

لاری دیوانہ وار بھاگتا ہوا احاطے سے باہر نکلا تو سامنے مسٹر ڈیوڈ کارٹر کی بوڑھی کار نظر آئی۔ لاری نے آگے بڑھ کر گاڑی رکوائی اور مسٹر ڈیو کو اس اچانک افتاد سے آگاہ کیا۔ مسٹر ڈیو جینی کے پاس آبیٹھا۔ اور لاری ان کی کار میں گاؤں کون کی طرف روانہ ہوگیا۔ وہ کون کے پوسٹ آفس سے ڈاکٹر ڈیموک کو فون کرنا چاہتا تھا۔ جو پندرہ میل دور لورسٹن میں رہتا تھا۔

اتفاق سے ڈاکٹر ڈیموک اپنے کلینک ہی میں موجود تھا۔ اس نے غور سے لاری کی بات سنی اور بولا۔ ”میں اپنے معاون ڈاکٹر کو روین کو بھیجتا ہوں۔ گھبراؤ نہیں

یہیں پوسٹ آفس پر اس کا انتظار کرو۔“

”بہت اچھا ڈاکٹر شکریہ۔“

اسے سیاہ فام ڈاکٹر کورَوین کا زیادہ دیر انتظار نہ کرنا پڑا۔ اور وہ اپنی موٹر سائیکل دوڑاتا ہوا لاری سے آن ملا۔ ”مسز کے دائیں بازو پر مچھر یا اسی نوعیت کے کسی کیڑے کے کاٹنے کے نمایاں نشان ہے۔ کیا یہاں مچھروں کی بہتات ہے؟“ نوجوان ڈاکٹر نے مفلوج اور گنگ مریضہ کا معائنہ کرنے کے بعد کہا۔

”مل کے قریب ایک جوہڑ ہے جس کی سطح مچھروں سے ڈھکی رہتی ہے۔“ لاری نے جواب دیا۔ ”میں کونسل سے اس کی صفائی کی متعدد بار درخواست کر چکا ہوں یہ کم بخت رات کو سکون سے سونے بھی نہیں دیتے۔“

ڈاکٹر کورَوین نے کچھ سوچتے ہوئے مسز لاری کو ایک انجکشن لگایا جس کے نتیجے میں اس کی حالت قدرے سنبھلی اور وہ ڈاکٹر کورَوین کے سوالات کا سر کی جنبش سے جواب دیتی رہی۔

اسی اثناء میں مسز کارٹر آ پہنچی۔ اس نے سیاہ فام ڈاکٹر کو دیکھتے ہی ناک بھنوں چڑھائی اور خاموشی سے جینی کے پاس بیٹھ گئی۔

”آپ کی بیوی گلے کے ایک عجیب اور نامعلوم وبائی مرض کا شکار ہوئی ہیں۔ اس لئے ہم ان کی سخت نگہداشت کا اہتمام کریں گے۔ میں ڈاکٹر ڈیموک سے سفارش کروں گا کہ وہ ایک نرس کا انتظام کر دیں۔“ ڈاکٹر کورَوین نے اپنا بیگ سنبھالتے ہوئے کہا۔ ”میں دس بجے پھر انہیں دیکھنے آؤں گا۔“ پھر وہ جینی سے مخاطب ہوا۔ ”آپ بولنے کی کوشش نہ کریں۔ گلے کا ورم تحلیل ہوتے ہی قوت گویائی بحال ہو جائے گی۔“ پھر وہ رخصت ہو گیا۔

جب ڈاکٹر کورَوین جنگل کے انتہائی گنجان حصے میں پہنچا تو پیچھے سے نمودار ہونے والی ایک تیز رفتار کار نے آگے نکل کر اس کا راستہ روک لیا۔ پھر دوسرے ہی لمحے دو لمبے تڑنگے آدمی ہاتھوں میں ریوالور لئے اس کے سر پر آن دھمکے۔ اس سے پیشتر کہ ڈاکٹر کورَوین کوئی ردعمل ظاہر کر پاتا ایک آدمی نے پوری قوت سے اس کے پیٹ میں لات ماری اور دوسرے نے اس کے جھکتے ہی سر پر ریوالور کی دستے کی ضرب لگائی۔ وہ بے ہوش ہو گیا۔

جب اسے ہوش آیا تو گھپ اندھیرا تھا۔ نہ جانے رات کتنی گزر چکی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اسی کو احساس ہوا کہ اس کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہے۔ ہاتھ پاؤں بھی بندھے ہوئے تھے اور وہ گاڑی کی عقبی نشست پر بے بس پڑا تھا۔ گاڑی کی حرکت اور طاقتور انجن کی گھن گرج سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کوئی ڈھلان چڑھ رہی ہے۔

کچھ دیر بعد گاڑی رک گئی۔ اور ایک دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی۔ خوف سے ڈاکٹر کورَوین کی رگوں میں خون منجمد ہو گیا۔ اور اسے اپنے باس ڈاکٹر پالفر کی یہ ہدایت یاد آ گئی۔

”مرتے مر جانا مگر میرا نام زبان پر نہ لانا......!“

اب اس ہدایت پر پوری پامردی اور استقامت سے عمل کرنے کا وقت شاید آ پہنچا تھا۔ لے آئے اسے؟ کسی نے کرخت آواز میں پوچھا۔ ہاں! کار میں سے ایک شخص نے جواب دیا۔ ”تو باہر نکالو اسے۔“ نو وارد نے تحکم آمیز لہجے میں کہا۔

کورَوین کو گاڑی سے نکال کر ایک درخت سے باندھ دیا گیا۔ آنکھوں سے پٹی نوچ لی گئی۔ ”تم ڈاکٹر ڈیموک آف لوزٹین کے آدمی ہو اور تمہارا نام کورَوین ہے؟“ اسمتھ نامی نو وارد بڑی سفاک آواز میں بولا۔

”ہاں......“ کورَوین نے جواب دیا۔ ”اس نے تمہیں مسز لاری ہل کے پاس کیوں بھیجا تھا؟ وہ مفلوج ہو گئی تھیں۔ ان کا معائنہ کرنے بھیجا تھا۔ اس نے تمہیں کچھ خاص ہدایت دی تھیں؟“ پوچھا گیا نہیں۔

”تو تم نے کیا مرض تشخیص کیا؟“ موت و حیات کی اس کشمکش میں بھی کارَوین کے کان کھڑے ہو گئے۔ بالکل وہی چیز سامنے آ رہی تھی جس کی ڈاکٹر پالفرے نے نشاندہی کی تھی۔

”کسی وبائی بیماری کی وجہ سے اس کا گلا متورم ہو گیا ہے......اور......“ ”اف......!“ اسمتھ اچھل پڑا۔ جیسے اس نے کوئی غیر متوقع بری خبر سن لی ہو۔ پھر بولا۔ ”کیا وہ

گونگی ہو گئی ہے......؟“

”ہاں......!“

”مجھے تمہاری بات پر یقین ہے۔“ اسمتھ نے یکا یک نرم لہجہ اختیار کیا۔ ”اور یہ بھی یقین ہے کہ تم انٹرنیشنل سیکرٹ سروس کے چیف ڈاکٹر پالفرے کے آدمی ہو۔“

”نہیں۔“ ڈاکٹر کورَوین نے احتجاج آمیز لہجے میں کہا۔ ”سنو پالفرے تمہارا باس ہے۔“ اسمتھ نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ”اسٹیفن اور برٹن تمہارے ساتھی ہیں۔“

”نہیں......!“

”اسے رخصت کر دو......“ اسمتھ اس کے بجائے اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہوا۔ اپنا حکم مرگ سن کر ڈاکٹر کورَوین چیخ اٹھا۔ مگر اسے ہزاروں فٹ بلند چٹان سے سمندر کی طرف لڑھکا دیا گیا۔ سمندر کی شوریدہ سر لہروں تک پہنچنے سے قبل ہی اس کی روح نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔

ڈاکٹر کورَوین نے واپسی میں غیر معمولی تاخیر کی تو ڈاکٹر ڈیموک کو تشویش ہوئی۔ ایک پہر رات گزر چکی تھی۔ وہ ایک عزم کے ساتھ اٹھا اور اپنی گاڑی میں کون گاؤں کی طرف روانہ ہو گیا۔ لاری ہل کے ہاں پہنچا تو مریضہ پرسکون تھی۔ مگر لاری اس کی قوت گویائی سلب ہونے پر سخت پریشان تھا۔ ڈاکٹر نے مریضہ کو بیدار کر کے اس کا معائنہ کیا تو کچھ ایسا حواس باختہ ہوا کہ لاری بے چین ہو اٹھا۔

”ک......ک...... کیا...... کیا محسوس کیا آپ نے ڈاکٹر......؟“

”ک......ک ک...... کچھ نہیں۔ ب...... ب...... بس...... ٹھ...... ٹھیک ہو جائے گی۔“ ڈاکٹر بولا پھر اپنے بیگ سے گولیوں کی ایک شیشی نکال کر اس کے سپرد کرتے ہوئے بولا۔ ”مریضہ صبح بیدار ہو تو دودھ کے ساتھ دو گولیاں کھلا دینا۔ پھر ہر چار گھنٹے کے بعد دو گولیاں...... اور ہاں...... یہ ٹھیک ہو جائے گی۔“ ”اور ڈاکٹر کورَوین یہاں سے کب رخصت ہوا......؟“

”ٹھیک ساتھ بجے......“ لاری نے جواب دیا۔ ”دس بجے پھر آنے کو کہہ گئے تھے۔“

”اف...... ہاں...... اچھا تو خدا حافظ......!“

ڈاکٹر نے کہا اور باہر نکل آیا۔ دوسرے لمحے اس کی گاڑی 60 میل فی گھنٹے کی رفتار سے کون فورسٹ کی طرف فراٹے بھر رہی تھی۔ لیکن جنگل کے وسط میں پہنچ کر اسے رفتار میں تخفیف کرتے ہی بن پڑے کیونکہ ایک کار سڑک روکے کھڑی تھی۔ اڑسٹھ برس کی عمر میں بھی ڈاکٹر ڈیموک کا دماغ نوجوانوں کی سی مستعدی کے ساتھ کام کرتا تھا۔ اس پر یہ ہولناک حقیقت منکشف ہو گئی کہ نوجوان اور ایثار پیشہ ڈاکٹر کورَوین پر کیا بیتی ہو گی؟

یکا یک گاڑی کے سامنے اکڑوں بیٹھا آدمی اٹھا اور ڈاکٹر کو ہاتھ سے رکنے کا اشارہ کرتے ہوئے آگے بڑھا۔ مگر ڈاکٹر نے یکلخت ایکسیلیٹر پر دباؤ بڑھایا اور نیم دائرے کی صورت میں راہ میں حائل گاڑی کے برابر سے گھومتا ہوا آگے نکل گیا۔ پیچھے سے پے در پے متعدد فائر ہوئے اور گولیاں کار کے عقبی شیشے سے ٹکرائیں۔

اسپیڈومیٹر کی سوئی۔ ساٹھ، ستر، پچھتر۔

لیں......!! ڈاکٹر نے قہقہہ لگایا گاڑی کی رفتار مزید بڑھا دی۔ گاڑی سڑک کو تیزی سے نگل رہی تھی۔ کار بھی بڑی مستعدی سے تعاقب میں چلی آ رہی تھی۔ یہاں تک کہ ڈاکٹر کولورسٹن سے ایک میل باہر وائیڈ ورلڈ فوڈ پلانٹ کی زردی مائل نیلگوں روشنیاں دکھائی دینے لگیں۔ وہ چونک سا پڑا۔ اشیائے خوراک کے اس عظیم الشان کارخانے میں نائٹ شفٹ کبھی نہیں چلتی تھی۔ تو کیا اس کی مصنوعات دنیا میں اتنی ہی مقبول ہو گئی ہیں؟ یہ فیکٹری کئی مربع میل رقبے میں پھیلی ہوئی تھی۔ اور اس کے اندر کیننگ، ڈیپ فریز، پروسینگ، اینڈ اسٹوریج سبھی کچھ تھا۔ مین لندن ریلوے اس کے قریب سے گزرتی تھی تاکہ مال کی ترسیل وحصول میں آسانی رہے۔

ڈاکٹر موڑ گھوم کر پلانٹ کی دیوار کے ساتھ ہو لیا اور تعاقب کرنے والی کار کی ہیڈ لائٹ اس کے عقب نما آئینے سے غائب ہو گئی۔ وہ دوسرے موڑ پر پہنچا تو وہ کار پچھلے موڑ سے نمودار ہوئی۔ ڈاکٹر اس گاڑی کو جل دے کر سیدھا پولیس اسٹیشن پہنچا۔ پولیس فوراً حرکت میں آ گئی۔

اور ڈاکٹر اپنے گھر پہنچ گیا۔ اس کی بیوی سو چکی تھی۔ بھوک کے ہاتھوں مجبور ہو کر ڈاکٹر نے باورچی خانے کی طرف لپکا پہلے کمرے کا دروازہ نیم وا تھا اور کمرہ تاریک تھا۔ اس کمرے سے گزر کر اس نے باورچی خانے کے دروازے میں قدم رکھا ہی تھا کہ پیچھے سے کپڑوں کی مدھم سی سرسراہٹ سنائی دی۔ ڈاکٹر نے چونک کر پیچھے دیکھا مگر اس سے پیشتر وہ کچھ دیکھ یا سمجھ پاتا کسی نے لمبے پھل کا ایک خنجر دستے تک اس کے سینے میں اتار دیا اور ڈاکٹر کے حلق سے خفیف سی آواز نکالے بغیر وہیں ڈھیر ہو گیا۔

صبح ڈاکٹر کے قتل کی اطلاع پاتے ہی پولیس جائے واردات پر پہنچی تو لاش کے قریب ڈاکٹر کورین کا ایک دستانہ پڑا ملا۔ ڈاکٹر کورین کے چند گھونگھریالے بال بھی وہاں موجود تھے۔ اس پر مستزاد یہ کہ ڈاکٹر ڈیموک کے باغیچے سے قاتل کا خون آلود خنجر بھی ملا اور یہ خنجر بھی ڈاکٹر کورین کی ملکیت تھا۔ قرائن و شواہد سے ڈاکٹر کورین ہی ڈاکٹر ڈیموک کا قاتل تھا مگر اسی روز...... ڈاکٹر کورین کی لاش بھی سمندر میں تیرتی ہوئی پائی گئی۔ قریب ہی ساحل پر موٹر سائیکل کا تباہ شدہ ڈھانچہ پڑا ہوا تھا۔ کیس عدالت میں پہنچا تو کوئی عینی شاہد میسر نہ آنے کے باعث عدالت نے یہ فیصلہ سنایا۔ ”ڈاکٹر ڈیموک اور ان کی معاون ڈاکٹر کورین کو نامعلوم شخص یا اشخاص نے ہلاک کیا ہے۔“

لاری ہل کی پری چہرہ بیوی قوت گویائی سے محروم ہی رہی اور دس دن تک بستر علالت پر دراز رہنے کے بعد بالآخر چل بسی۔ لاری کی نگاہوں میں دنیا تاریک ہو گئی اور اس کا گھر اجڑ گیا۔

جین ہل کی موت کے دوسرے روز انٹرنیشنل سیکرٹ سروس کا سربراہ ڈاکٹر پالفرے اپنے زیر زمین ایئر کنڈیشنڈ دفتر میں بیٹھا تھا۔ اس کی نظریں اخبار کی ایک شہ سرخی پر جمی ہوئی تھیں اور وہ آئی ایس ایس کے ایک گرم جوش اور معتمد رکن کورین کی موت پر افسوس کر رہا تھا۔ اس نے ایک گہرا سانس لے کر ٹیلیفون کا ریسیور اٹھایا۔

”ہیلو جم...... ذرا اسٹیفن کو میرے پاس بھیج دو۔“ پھر ریسیور کریڈل پر رکھ کر اسٹیفن کا انتظار کرنے لگا۔ ایک منٹ ہی بعد دیو قامت اور مردانہ وجاہت کا شاہکار روسی اسٹیفن اس کے کمرے میں داخل ہوا۔ اور اپنے لئے خصوصی طور پر بنائی گئی بہت بڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔

”کہیے......!“ اسٹیفن نے کہا۔

”صرف ایک منٹ پلیز......!“ پالفرے نے کہا۔ اور ریسیور اٹھا کر بولا۔ ”ہیلو جم۔ بوڈاپسٹ قاہرہ بونس آئرس نیویارک اور عدن کال کرو اور کیس نمبر 37 پر رپورٹ طلب کرو...... فوری ضرورت ہے۔“

”آل رائٹ سر......“ جم نے جواب دیا۔ اور سلسلہ منقطع ہو گیا۔ ڈاکٹر پالفرے دیو قامت اسٹیفن سے مخاطب ہوا۔

”کورین اور ڈیموک کی موت نے صورت حال سنگین کر دی ہے مگر اس سے ہم پر آگے بڑھنے کا راستہ روشن ہو گیا ہے۔ کیس نمبر 37 کے بارے میں اب تک کوئی حوصلہ افزا رپورٹ نہیں ملی۔ اب تک ہمیں صرف اس قدر معلوم ہو سکا ہے کہ رونڈی تیرہ ہفتے قبل روپوش ہوا تھا۔ اس کی منظور نظر لڑکیوں میں سے ایک اسی انوکھے وبائی مرض میں مبتلا ہو کر گونگی ہوئی اور پھر مر گئی۔ ہم نے ایک آدمی کی ڈیوٹی لگا دی ہے کہ وہ معلوم کرے کہ گذشتہ بارہ ماہ کے دوران رونڈی نے کن کن مقامات کا دورہ کیا تھا۔ کورین کو ہم نے یہ معلوم کرنے پر مامور کیا تھا کہ رونڈی کون کے جنگل میں کس غرض سے آیا تھا۔ وہ ایک ایسی عورت کے علاج کی غرض سے کون گاؤں گیا تھا جو رونڈی کی گرل فرینڈ جیسی بیماری کا شکار ہو کر مفلوج اور گونگی ہو گئی اور پھر چل بسی میں نے پوسٹ مارٹم رپورٹ دیکھی مگر کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔

یہ دونوں ڈاکٹر جین ہل کو دیکھنے گئے تھے۔ اور دونوں مارے گئے۔ اس سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جین ہل اور اس کا شوہر اور دونوں ڈاکٹر رونڈی کو جانتے تھے۔

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ہمیں فوری طور پر کسی آدمی کو کون کی طرف بھیجنا چاہیے۔ کسی کا نام تجویز کرو۔“

”میٹ اسٹون!“ اسٹیفن نے کہا۔

”بہت خوب یہ خوبصورت اور چاق و چوبند امریکی نوجوان ہی موزوں رہے گا۔ ڈاکٹر پالفرے نے کہا۔

چند منٹ بعد خوش منظر میٹ اسٹون ڈاکٹر پالفر کے سامنے کھڑا تھا۔ مگر ڈاکٹر کسی گہری سوچ میں ڈوب چکا تھا۔ یکایک اس نے چونک کر اسٹیفن کی طرف دیکھا۔

”یہ بھی تو ممکن ہے کہ کورین محض اس لئے مارا گیا ہو کہ وہ ان کے کسی اہم راز سے واقف ہو گیا ہو۔ یعنی مرض کی صحیح تشخیص کر کے معاملے کی تہہ تک پہنچ گیا ہو اور یہی بات ڈاکٹر ڈیموک کی موت کا باعث ہوگی۔“

”ناممکن ہے۔“ اسٹیفن نے تائید کی۔ ڈاکٹر نے وجیہہ میٹ اسٹون کو کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ عین اسی لمحے ٹیلیفون کی گھنٹی بج اٹھی۔

”ہیلو...... جم......؟“ ڈاکٹر نے ریسیور کان سے لگایا اور پھر چند لمحے سنجیدگی سے سننے کے بعد جلدی سے بولا۔ ”تو پھر میں بوڈاپسٹ سے خود رابطہ قائم کروں گا۔ لائن ملاؤ۔“ پھر ریسیور کو کریڈل پر پٹخ کر بولا۔ ”اسٹیفن بوڈاپسٹ میں ہمارا ایجنٹ کورفل بھی مفلوج ہو کر قوت گویائی سے محروم ہو گیا ہے۔ یہ خبر دوسرے ایجنٹ السمین نے دی ہے۔ اب تم اپنا کیس کسی اور کے سپرد کر دو۔ ہم دونوں کیس نمبر 37 پر کام کریں گے۔“ پھر اس نے فوری طور پر ڈاکٹر مچیسن کو کورفل کے طبی معائنے کے لئے بوڈاپسٹ روانہ کرنے کے احکامات دیئے۔

پھر کوئی سوا بارہ بجے کے قریب ایک حیرت انگیز خبر موصول ہوئی نیویارک قاہرہ اور پاؤ میں متعین آئی، ایس، ایس کے ایجنٹ بھی اس وبا کا شکار ہو چکے ہیں۔ صرف بونس، آئرس اور عدن والے آدمی محفوظ تھے۔

صورت حال انتہائی سنگین ہو چکی تھی۔ پالفرے نے میٹ اسٹون کی طرف دیکھا۔ ”میٹ تمہیں اس شیطان کا سراغ لگانے کے لئے منتخب کیا گیا ہے۔ بتاؤ اس کے بارے میں تم کیا کچھ جانتے ہو؟“

”وہ ایک گمنام سا فزیشن ہے۔“ میٹ نے جواب دیا۔ ”وہ آسٹریلیا کا باشندہ ہے۔ اس نے اپنے ملک میں حیوانات پر ریڈیو ایکٹیوٹی کے اثرات کی تحقیق کی اور اسی کارخانے نے اسے کچھ شہرت عطا کی۔ پھر اسی کے لئے وقف ہو کر رہ گیا۔ اور اس سلسلے میں ناگاساکی اور ہیروشیما بھی گیا۔ جہاں کے ہسپتالوں میں ایٹمی تابکاری سے متاثرہ افراد اب تک زیر علاج تھے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے وہ اس تحقیقاتی دورے کے کوئی مثبت نتائج بیان نہ کر سکا۔ اس نے متعدد بار اخبارات کو یہی بیان دیا کہ وہ ایک عظیم دریافت کے آخری مرحلے میں داخل ہو چکا ہے۔ کوئی ایک سال قبل وہ آسٹریلیا سے عالمی دورے پر نکلا۔ وہ انہی خطوط پر ریسرچ کرنے والے دوسرے سائنسدانوں سے مشاورت کا ارادہ رکھتا تھا۔ وہ بیانس آئرس، نیویارک، عدن، قاہرہ، بوڈاپسٹ اور فرانس کے متعدد مقامات پر بھی گیا۔ اس طویل دورے میں سنہری بالوں والی ایک پر شباب اور حسین لڑکی بھی اس کے ساتھ ساتھ تھی۔

”رونڈی کے بارے میں تمہاری معلومات اطمینان بخش ہیں۔“ ڈاکٹر پالفرے نے کہا۔

”ہم اس کی کڑی نگرانی کر رہے تھے مگر وہ اچانک روپوش ہو گیا۔ اور اب کون فورسٹ میں ایٹمی تابکاری سے ایک عورت کی موت واقع ہو چکی ہے۔ پھر تمہاری بیان کردہ شہروں میں ہمارے اکثر ایجنٹوں کے اسی مرض میں مبتلا ہونے کی اطلاع اس امر کا ثبوت ہے کہ یہ اس رونڈی ہی کی کارستانی ہے۔ اب اس کا سراغ لگانا ہی پڑے گا۔ تم نہیں جانتے کہ وہ کوئی چار ہفتے پہلے کون کے فورسٹ ہوٹل سے اچانک روپوش ہوا تھا اور ہوٹل میں ملازم ایک آئرش لڑکی بھی اس کے ساتھ ہی غائب ہو گئی تھی۔ تم اسی ہوٹل میں قیام کرو گے۔ اس کے بعد پالفرے نے اسے اب تک رونما ہونے والے تمام واقعات سے آگاہ کر کے ضروری ہدایات دیں اور کہا۔ ”تم صرف یہ معلوم کرو گے کہ ڈاکٹر کورین اور ڈاکٹر ڈیموک کو کیوں ہلاک کیا گیا۔ علاوہ ازیں جین کے شوہر اور اس کی نگہداشت کرنے والی کارٹر فیملی کی حفاظت کے انتظامات کرو گے۔ چونکہ وہ بھی مسز لاری سے براہ راست متعلق ہیں۔ اس لئے امکان غالب ہے کہ ان پر بھی حملہ کیا جائے۔“

عین اسی وقت ٹیلیفون کی گھنٹی بجی خبر ملی کہ بوڈا

پسٹ میں متعین ایجنٹ کورنل ایٹمی تابکاری کی زہر سے چل بسا۔ ڈاکٹر کا رنگ متغیر ہوگیا اور کمرے میں غم انگیز سکوت طاری ہوگیا۔

آخر ڈاکٹر ہی نے مہر سکوت توڑ دی۔ وہ میٹ سے مخاطب ہوا۔ ”تم علی الصباح فورسٹ ہوٹل کی جانب روانہ ہو جاؤ۔ مس براؤن تمہارے جائے گی۔ وہ کیس نمبر 37 کے بارے میں مکمل معلومات رکھتی ہے ہوٹل میں تم دونوں امریکی سیاحوں کی حیثیت سے ٹھہروں گے۔ تمہاری گاڑی پر بھی نیویارک کی نمبر پلیٹ لگی ہوئی ہوگی۔“

پھر سائنسدان رونڈی اروا اس کے ساتھ ہوٹل سے غائب ہونے والی لڑکی مورین اوشیا اور دوسرے ساتھیوں کی تصویریں اس کے سپرد کردی گئیں۔

دوسرے دن علی الصباح مسکراہٹ سے محروم مس براؤن کے ہمراہ میٹ اسٹون اپنی کرسلر میں کون فورسٹ ی طرف روانہ ہوگیا۔ فورسٹ ہوٹل جنگل کے کنارے نچسٹر ک جانب ایک سرسبز وشاداب پہاڑی پر تھا۔ وسیع و عریض جنگل کے اس پار ان ثمر دار باغات کا سلسلہ بھی کھائی دیتا تھا جو وائیڈ ورلڈ فوڈز پلانٹ کی ملکیت تھے۔ ہوٹل بلاشبہ عظیم الشان اور انتہائی پرآسائش تھا۔

میٹ اور مس براؤن نے اپنے کمرے میں سامان ھا اور ڈائننگ روم میں چلے آئے۔ وہاں میٹ ایک نو ان ویٹرس کو دیکھ کر چونک پڑا۔ یہ لڑکی خدوخال سے رش لگتی تھی اور قیامت کی خوبصورت تھی۔ مگر میٹ اس حسن وشباب سے نہیں چونکا تھا بلکہ رونڈی کے ساتھ ل سے روپوش ہونے والی لڑکی مورین اوشیا کی تصویر ی غیر معمولی مشابہت سے چونکا تھا۔ لگتا تھا یہ اس کی ن ہے۔

کھانے سے نمٹ کر انہوں نے کون ویلج جانے کا وگرام بنایا۔ وہ اس مکان کا معائنہ کرنا چاہتے تھے جس مسز لاری وبا کا شکار ہوئی تھی۔ کارٹر فیملی اور لاری ہل مذاکرات کرنا بھی ان کے پروگرام میں شامل تھا۔

کارٹر خاندان پہاڑیوں کے قریب ہی ایک کاٹیج میں رہتا تھا۔ ”بالائی سڑک پر ڈرائیونگ کے دوران ہم ان کے مکان کو دیکھ سکتے تھے۔ سامنے نظر آئے گا۔“ مس براؤن نے کہا۔

”آل رائٹ......تو آؤ چلیں......“ میٹ اٹھ کھڑا ہوا۔ چند لمحے وہ مس براؤن کی رہنمائی میں منزل کی طرف جارہا تھا۔ ایک مقام پر مس براؤن نے اسے گاڑی روکنے کا اشارہ کیا۔ وہ دونوں باہر نکل آئے۔

”وہ دیکھو......“ مس براؤن نے ہاتھ سے ایک سمت اشارہ۔ ”کون گاؤں کے چرچ کا ٹاور نظر آرہا ہے۔ یہ سڑک سیدھی لاری ہل کے گھر تک جاتی ہے۔ ادھر بائیں جانب جو مختصر آبادی ہے اس کے کنارے پر ایک الگ تھلگ کاٹیج نظر آرہا ہے۔ یہی کارٹر خاندان کا مسکن ہے۔“

یکا یک ایک موٹا سا مچھر اس کی منور پیشانی پر آبیٹھا۔ دیکھو میٹ چونک سا پڑا۔ ”تمہارے ماتھے پر ایک مچھر آن بیٹھا ہے۔“

”اوہ اس نے ڈنگ مار دیا۔“ مس براؤن نے کھٹاک سے پیشانی پر ہاتھ مارا۔ مچھر مر گیا اور اس کی ہتھیلی پر مچھر کا خون چمکنے لگا۔ اسے گھن آ گئی۔

پھر وہ مچھر کو بھول کر گرد و نواح کے دلکش مناظر میں کھو گئے۔ کچھ دیر بعد انہیں کون فارسٹ اور کون گاؤں کی جانب سے ایک آسٹن کار آتی دکھائی دی۔ میٹ نے دوربین آنکھوں سے لگائی تو اس میں ایک عورت اور مرد دکھائی دیئے۔ یہ غالباً مسٹر اور مسز کارٹر تھے۔ جو اپنے گھر کی طرف جارہے تھے۔ ان کا گھر کم وبیش ایک میل کے فاصلے پر تھا۔ گاڑی کی رفتار خاصی تیز تھی۔ جب گاڑی لاری ہل کے مکان سے کافی آگے نکل گئی تو یکا یک بہکی۔ عین اسی لمحے میٹ کو گاڑی کے بائیں جانب درختوں کے جھنڈ میں حرکت سی محسوس ہوئی۔ اس نے چونک کر مس براؤن کی طرف دیکھا جو پیشانی کو بری طرح سہلا رہی تھی اور اس کی نگاہیں مسٹر کارٹر کی گاڑی پر گڑی ہوئی تھیں۔ جو بے قابو ہو کر کبھی دائیں کبھی بائیں حرکت کررہی تھی۔ آخر گاڑی رک گئی اور مسٹر کارٹر ہاتھ لہرا لہرا کر انہیں اپنی جانب متوجہ کرنے لگے جیسے وہ مدد مانگ

رہے ہوں۔ درختوں کا جھنڈ گاڑی سے تھوڑے فاصلے پر تھا۔ پھر نہ جانے کیا ہوا کہ اچانک ہولناک دھماکہ ہوا۔ گاڑی الٹ گئی اور پھر آگ کے غضب ناک شعلوں نے گاڑی کو لپیٹ میں لے لیا۔

”یہ کیا ہوا......؟“ مس براؤن چیخ اٹھی۔ ”یہ پکڑو......“ میٹ نے جلدی سے دوربین اس کے ہاتھ میں تھمادی۔ وہ دونوں آدمی پھر درختوں میں غائب ہو گئے تھے۔

میٹ نے اسے کلائی سے پکڑ کر گاڑی کی عقبی نشست پر پھینکا۔ اور پھر طوفانی رفتار سے گاڑی چلاتا ہوا جائے حادثہ پر پہنچا۔

کار کے پرخچے اڑ چکے تھے۔ اور میاں بیوی دونوں کی لاشیں دھڑا دھڑ جل رہی تھیں۔ دونوں کچھ دیر ساکت وصامت کھڑے یہ دہشتناک منظر دیکھتے رہے۔

پھر میٹ زیرلب بڑبڑایا جیسے خود سے مخاطب ہو۔

”مسز لاری کی بیماری کے دو عینی شاہد ختم کردیئے گئے۔ اب لاری ہل کی باری ہے۔“ پھر وہ با آواز بلند بولا۔ ”لاری ہل اس وقت کہاں ہوگا؟“

”فیکٹری میں......“ مس براؤن نے کہا۔ ”یعنی ورلڈ فوڈ پلانٹ کی عمارت کے اندر وہ وہیں ملازم ہے۔“

پھر وہ ایک دم چونک پڑی۔ ”وہ دیکھو۔“

ایک گاڑی اورسٹن کی طرف تیزی سے جارہی تھی۔ ”یہ انہی بدمعاشوں کی گاڑی ہے۔“ میٹ نے مس براؤن کو گاڑی کی طرف گھسیٹتے ہوئے کہا۔ ”خدا کرے ہم ان سے پہلے وہاں پہنچ جائیں۔ یہ خبیث لاری کی تلاش میں جارہے ہیں۔“

چند لمحے بعد ان کی گاڑی وائیڈ ورلڈ فوڈ پلانٹ کی طرف فراٹے بھر رہی تھی۔ انہوں نے فوڈ پلانٹ کی جانب مختصر راستہ اختیار کیا تھا میٹ نے عقب نما آئینے میں دیکھا۔ مس براؤن اب بھی اپنی پیشانی سہلا رہی تھی۔ جہاں مچھر نے کاٹا تھا وہاں اب سرخ رنگ کا ابھرا ہوا ننھا سا دھبہ نمایاں نظر آرہا تھا۔ جب وہ پلانٹ کے مین گیٹ پر پہنچے تو گیٹ کیپر غائب تھا۔ میٹ اندر جا گھسا۔ اسی اثناء میں گیٹ کیپر فون کیبن سے برآمد ہوا۔

”کیا آپ نے سامنے سے کوئی گاڑی فیکٹری کی جانب آتے دیکھی ہے۔“ میٹ نے پوچھا۔ ”نہیں جناب۔“ گیٹ کیپر نے اسے متجسس نگاہوں سے دیکھا۔ ”میں تو فون کیبن میں کال سن رہا تھا۔“

”لاری ہل کہاں ہے؟“

”فیکٹری میں کام کررہا ہے جناب۔“ گیٹ کیپر نے جواب دیا۔ ”اچھا تو اس سے گھر پر ملوں گا۔ خدا حافظ“ میٹ نے کہا اور باہر نکل آیا۔ لاری فیکٹری میں محفوظ تھا۔

وہ لپکتا ہوا گاڑی کے پاس پہنچا تو مس براؤن دروازہ کھول کر ایک ٹانگ باہر نکالے اس انداز میں بیٹھی تھی جیسے باہر نکلنے کے بے سود کوشش کررہی ہو۔

”کیا ہوا خیریت سے تو ہو؟“ میٹ مضطرب ہو گیا بدن اینٹھ سا رہا ہے...... مس براؤن گھٹی گھٹی سی آواز میں بولی۔ ”شاید غلط انداز میں بیٹھنے سے ہاتھ پاؤں سن ہوگئے ہیں۔“ پھر وہ پیشانی پر ورم آلود سرخی کو سہلانے لگی۔ اس کے ہونٹ خشک ہوچکے تھے۔

”ذرا ان کم بخت مچھروں سے بچو۔“ میٹ نے ڈرائیونگ وہیل پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”مسٹر اینڈ مسز کارٹر ہماری آمد پر مارے گئے، گویا ہماری آمد کی خبر ہوچکی ہے۔ خیر اب میں ان بدمعاشوں کا راستہ روکوں گا۔“

اس نے گاڑی ریورس میں ڈالی تو ایک گاڑی سامنے کے موڑ سے نمودار ہوئی۔ میٹ اسٹون نے اپنی گاڑی کا رخ نووارد گاڑی کی طرف کیا اور یکلخت ایکسلریٹر پر دباؤ بڑھا دیا۔ پھر چند سیکنڈ بعد آنے والی گاڑی سے کچھ فاصلے پر کار روک کر راستہ مسدود کردیا اور اچھل کر باہر آ گیا۔ دوسری گاڑی بھی رک چکی تھی۔

”ہمیں جلدی ہے راستے سے ہٹ جاؤ۔“ ڈرائیور نے میٹ سے کہا۔ ”پہلے یہ بتاؤ مسٹر اینڈ مسز کارٹر پر کیا بیتی؟“ میٹ نے جیب میں گن کے دستے پر اپنی گرفت مضبوط کرکے کہا۔ دونوں آدمیوں کا رنگ فق ہو گیا۔ انہیں گویا سانپ سونگھ گیا۔ میٹ نے ان پر اپنی آٹو میٹک گن تان لی۔ ”گاڑی سڑک سے نیچے کھڑی کرو۔“ وہ

گرجا۔ اور اپنی نشستوں پر حرکت کئے بغیر بیٹھے رہو۔"

وہ لوگ اس ناگہانی افتاد سے بے دست و پا ہو چکے تھے۔ انہیں مٹ کے حکم پر بے چوں وچرا عمل کرنے ہی میں عافیت نظر آئی۔ انہوں نے گاڑی سڑک سے اتار کر انجن بند کردیا۔ میٹ نے جلدی سے پلٹ کر اپنی گاڑی کی طرف دیکھا۔ مس براؤن گاڑی سے باہر نہیں نکلی تھی۔ وہ کانپ گیا ایک ہولناک خیال خنجر کی طرح اس کے ذہن میں پیوست ہوگیا۔ اس نے آدمیوں کی طرف رخ کیا اور اپنی گن کا ٹریگر دبا دیا۔ دھماکے کی بجائے سر سراہٹ سی سنائی دی۔ اور گن کے منہ سے کوئی غیر مرئی گیس خارج ہوئی۔ دونوں آدمیوں نے چیخنے کے لئے منہ کھولے لیکن انہیں اس کی مہلت نہ ملی۔ اور بے ہوش ہوکر گاڑی میں ڈھیر ہوگئے۔

میٹ اپنی گاڑی کی طرف متوجہ ہوا، خوف اس پر اب تک مسلط تھا۔ جس نے ہر طرح کے دوسرے جذبات کو دبا لیا تھا۔ مس براؤن بدستور گاڑی میں بیٹھی تھی۔ اس کی ایک ٹانگ دروازے کی جانب پھیلی ہوئی تھی۔ اور ایک ہاتھ دروازے کے ہینڈل پر تھا۔ جیسے باہر نکلنے کی کوشش میں ہو۔ اس کے سامنے کھڑکی کھلی تھی اور اس کا حسین سر کھڑکی سے لگا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں اور ان میں غیر معمولی اور غیر فطری سی چمک تھی۔ اس کے ہونٹ حرکت کررہے تھے جیسے وہ کچھ کہنا چاہتی ہو مگر آواز ناپید تھی۔

"اچھا تو یہ بات ہے۔" میٹ زیر لب بڑبڑایا۔ پھر تیزی سے بولا۔ "تشویش نہ کرو۔ جلد ٹھیک ہوجاؤ گی۔ ڈاکٹر پالفرے کے پاس زہر کا ہدف تریاق موجود ہے۔"

"ہونہہ...... جھوٹا کہیں کا! بس صحتیاب ہوجاؤ گی۔ گھبراؤ مت۔" مس براؤن نے بولنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے اپنی پھٹی پھٹی آنکھوں کو دوسری گاڑی کی طرف حرکت دی۔ جیسے کہہ رہی ہو کہ وہ آدمی جانے نہ پائیں۔

"وہ ٹھیک ٹھاک ہیں فکر نہ کرو۔" میٹ نے جلدی سے کہا۔ "بڑے مزے سے سو رہے ہیں۔" اس نے مس براؤن کو آرام سے سیٹ پر لٹایا اور فوڈ پلانٹ کے گیٹ کیپر کی مدد سے ڈاکٹر پالفرے کو فون کیا۔ ڈاکٹر پالفرے نے رپورٹ سننے کے بعد اسے ہدیت کی کہ مس براؤن کو فوری طور پر اورسٹن ہسپتال پہنچا دے۔ وہاں گونگے طاعون کا ایک وارڈ قائم کردیا گیا ہے اور ان دونوں آدمیوں کو پیٹرس کے سپرد کردے۔ پیٹرس فوڈ پلانٹ میں ملازم ہے۔" ڈاکٹر پالفرے نے مزید کہا کہ "وہ فوری طور پر اورسٹن پہنچ رہا ہے۔ اس لئے اس کی آمد سے قبل علاقے سے باہر نہ نکلے مسٹر اینڈ مسز کارٹر کی موت کے بعد لاری ہل پر قاتلانہ حملے کا خدشہ ہے اس کی حفاظت کے ہر ممکن انتظامات کرے۔ وغیرہ وغیرہ۔" ابھی اس نے گیٹ سے باہر قدم رکھا ہی تھا کہ ایک لمبا تڑنگا آدمی اس کی طرف بڑھا۔

"میں پیٹرس ہوں۔"

"اوہ ...... میٹ چونک پڑا۔" زندہ باد ڈاکٹر پالفرے میرا نام میٹ اسٹون ہے۔ ان دونوں آدمیوں کو سنبھالو۔ اس کے بعد لاری ہل کے گھر کا رخ کرو۔"

"اوکے......" پیٹرس نے کہا۔ اور میٹ پیشانی سے پسینہ پونچھتا ہوا اپنی گاڑی میں آن بیٹھا۔ اور پھر اورسٹن ہسپتال کی طرف روانہ ہوگیا۔

میٹ دوبارہ فوڈ پلانٹ کے گیٹ پر پہنچا تو معلوم ہوا کہ لاری ہل آج رات بھی کام کرے گا اور صبح پانچ بجے چھٹی کرے گا۔ وہ اپنی کار کی طرف بڑھا تو ایک مکھی بھنبھناتی ہوئی اس کے چہرے سے ٹکرا کر گزر گئی...... وہ سر سے پاؤں تک لرز گیا۔ پھر ایک مچھر دائروں میں گھومتا ہوا بڑھا۔ اس نے بے اختیار ایک ہاتھ کی ضرب سے اسے پرے ہٹا دیا۔ یکا یک اس کی کہنی پر سوئی سی چبھی۔ اس کے حلق سے غراہٹ برآمد ہوئی اور اس نے گھوم کر کہنی پر دوسرا ہاتھ مارا۔ گیٹ کیپر ہنس پڑا۔

"جناب آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"ہاں ٹھیک ہے۔" میٹ نے جواب دیا۔ پھر اس نے اپنے چہرے کے قریب گھومتے ہوئے مچھروں پر ہاتھ چلایا۔

"نہیں جناب مجھے تو شک پڑتا ہے آپ کی طبیعت کچھ ناساز ہے۔" گیٹ کیپر نے پھر قہقہہ لگایا۔ اس بار اس کا لہجہ بڑا معنی خیز تھا۔

میٹ جلدی سے گاڑی میں آن بیٹھا۔ انجن اسٹارٹ کرنے سے پہلے اس نے رومال سے اپنا چہرہ پونچھا۔ اس کا پورا بدن خوف اور سراسیمگی کے ٹھنڈے پسینے میں نہا گیا تھا۔ اسے یقین سا ہوگیا تھا کہ گونگے طاعون کا سبب یہ مچھر ہی ہیں۔

آخر وہ کارٹر فیملی کے گھر کی جانب چل پڑا۔ جب وہ کون فورسٹ کے کنارے پر پہنچا تو ایک چھوٹے سے جوہڑ پر اسے سیاہ رنگ کی گرد کا ایک بادل سا چھایا نظر آیا۔ اس نے گاڑی کی رفتار سست کرکے اس بادل کو غور سے دیکھا تو اس میں چند موٹے موٹے مچھر گھوم رہے تھے۔ وہ نہ جانے کیوں کانپ گیا۔

"میرا دماغ چل گیا ہے۔" وہ پلٹ کر دیکھتے ہوئے بڑبڑایا۔ مگر وہ پاگل نہیں ہوا تھا۔ جوہڑ پر گردش کرنے والی گرد نے اسے ڈرا دیا تھا۔ اس کا وجد ہی پراسرار اور انہونا سا تھا۔ جب وہ اس آبادی کے قریب پہنچا جس میں کارٹر خاندان کا گھر تھا تو ایک جھونپڑے کے سامنے چند بچے کھیلتے نظر آئے۔ ان میں سے ایک بچہ ہاتھ سے اپنے چہرے کے سامنے سے مچھروں کو دور ہٹانے کی کوشش کررہا تھا۔ پھر میٹ کو سیاہ گرد کا ایک بگولا سا نظر آیا۔ جس کے قریب ہی ایک بچہ بری طرح اپنا رخسار سہلا رہا تھا۔ اور اس کے رخسار پر میٹ کو ویسا ہی خون نظر آیا جیسا مس براؤن کی پیشانی پر دکھائی دیا تھا۔ خوف سے اس کی پشت پر چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ اور اسٹیئرنگ وہیل پر اس کے ہاتھوں کی گرفت مضبوط ہوگئی۔ اسے پختہ یقین ہوگیا کہ اس غبار کا بھی گونگے طاعون سے براہ راست کوئی تعلق ہے۔ اس نے پوسٹ آفس کے ٹیلیفون بوتھ کے پاس گاڑی روکی اور اورسٹن ہسپتال کے انچارج کو اطلاع دی کہ "مرویل کاٹیج کے قریب چند بچے بھی گونگے طاعون کی زد میں معلوم ہوتے ہیں فوری انتظامات کئے جائیں۔"

پھر وہ مسٹر اور مسز کارٹر کی کار کے قریب پہنچا تو گاڑی کا ڈھانچہ اور ناقابل شناخت لاشیں دکھائی دیں۔ وہاں پولیس ابھی تک نہیں پہنچی تھی۔ اس نے گاڑی روکی اور غور سے لاشوں کو دیکھا۔ یکا یک ایک مچھر ونڈ اسکرین پر آ بیٹھا۔

"ہٹ تیری کی......!" وہ غرایا اور ایک ہی ضرب میں مچھر کو کچل دیا۔ مگر اس بار خون کا دھبہ ظاہر نہ ہوا۔ مگر کیوں؟ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ اسے آس پاس وہ پراسرار گرد بھی دکھائی نہ دی۔ وہ نقشے کی رہنمائی میں لاری ہل کے گھر جا پہنچا مین گیٹ بند تھا۔ دوپہر ڈھل چکی تھی۔ اسے اندرونی عمارت کی ایک کھڑکی کھلی نظر آئی۔ وہ گیٹ کھول کر اندر داخل ہوگیا۔ کھڑکی سے کمرے میں جھانک کر دیکھا تو اندر مچھروں کی بھنبھناہٹ سنائی دی۔ ساتھ ہی سیاہ رنگ کی گرد کا ایک بادل بھی منڈلاتا نظر آیا۔ پھر اس نے غور سے دیکھا تو کمرے میں لاتعداد مچھر اور بہت سے بادل فضا میں معلق نظر آئے۔ وہ پتھر کے بت کی مانند زمین پر گڑا رہ گیا۔ دفعتاً اسے ایک مچھر اپنے چہرے کی طرف بڑھتا نظر آیا۔ اس نے تیزی سے ہاتھ چلایا اور اسی لمحے پیچھے ہٹا۔ پھر کسی فوری خیال کے پیش نظر وہ بھاگم بھاگ گاڑی کے پاس پہنچا اور اسپرے پمپ میں کیڑے مارنے کی کوئیک کل مار کر دوا بھر کر کھڑکی کے پاس آ کھڑا ہوا۔ گرد کے بادل اور مچھر موجود تھے۔ اس نے جلدی سے پمپ چلایا اور کمرے میں دوا کا فوارہ چھوڑ دیا۔ پھر پیچھے پلٹ آیا...... پانچ منٹ بعد یہ دوا اپنا اثر دکھاتی تھی۔ پھر اس نے اپنا معجزہ نما اثر دکھایا۔ نہ صرف تمام مچھر مر کر فرش پر گر گئے بلکہ بادل بھی غائب ہوگئے۔ وہ خوشی سے دیوانہ سا ہوگیا۔ گویا اس نے ان ہلاکت آفرین مچھروں اور ان کے بادلوں کا علاج دریافت کرلیا تھا۔

اچانک اسے کسی کار کی غراہٹ سنائی دی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ دور سے ایک کار اس کی جانب چلی آرہی تھی۔ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے کار بہکی اور دائیں بائیں حرکت کرنے لگی۔ وہ دیوانوں کی طرح بھاگتا ہوا گاڑی میں بیٹھا اور اس کار کی طرف روانہ ہوگیا۔ مگر اس کے قریب پہنچنے سے قبل ہی گاڑی منہ کے بل ایک گڑھے

میں گر گئی۔ اور اس کے پچھلے پہیے اوپر اٹھ کر تیزی سے گھومنے لگے۔ میٹ نے قریب پہنچ کر گاڑی روکی۔ باہر نکلا تو اس کی گاڑی کی اگلی نشست سے ایک آدمی باہر نکلنے کی بے سود کوشش کررہا تھا۔ اور اس کے قریب ہی لاری مل (اس نے تصویر سے پہچانا) آنکھیں پھاڑے بے حس و حرکت پڑا تھا۔ دونوں کو تنگے طاعون کی لپیٹ میں آچکے تھے۔

گڑھے میں گندا پانی تھا اور کنارے پھسلن۔ میٹ نے انہیں باہر نکالنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ اور جب اسے گندے پانی سے کئی درجن مچھر اڑتے دکھائی دیئے اور اس کے ساتھ ہی سیاہ گرد کا بادل نظر آیا تو وہ اچھل کر پیچھے ہٹ گیا۔ اور اس کا دل وحشیانہ انداز میں دھڑکنے لگا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے کئی اور بادل نمودار ہو گئے۔ اسے اپنی سلامتی کی فکر پڑ گئی۔ کیونکہ اس علاقے میں وہ آئی ایس ایس کا واحد رکن تھا جسے پالفرے کو رپورٹ پیش کرنا تھی۔ اس لئے اس کا زندہ رہنا اشد ضروری تھا۔ یہ علاقہ اس وبا کی لپیٹ میں آچکا تھا۔ گاؤں متاثر ہو چکا تھا۔ ان خطرات کے تدارک کے لئے بھی اس کی زندگی ضروری تھی۔

"میں کچھ اور آدمیوں کو لاتا ہوں۔" وہ بڑی مشکل سے بولا۔ آدمی نے اسے بڑے رحم طلب نگاہوں سے دیکھا۔ مگر بول نہ سکا اور پھر اسی لمحے کئی مچھر اس کی پیشانی پر بیٹھ گئے۔ اور ایک بادل اس پر منڈلانے لگا۔ میٹ چیخ سا پڑا۔ اور جلدی سے اپنی گاڑی میں گھس گیا۔ گاڑی میں متعدد مچھر گھوم رہے تھی۔ ونڈ اسکرین پر بیٹھے مچھر کو اس نے کچلا۔ نہ خون کا دھبہ ظاہر ہوا نہ کوئی بادل دکھائی دیا۔

دوسرے لمحے اس کی گاڑی تیزی سے کون گاؤں کی طرف دوڑ رہی تھی۔ گاڑی ایک بڑے بادل سے گزری۔ مچھر تو ونڈ اسکرین سے ٹکرا ٹکرا کر ہٹتے گئے۔ مگر بادل کے ذرات ونڈ اسکرین پر جم گئے اس نے سوچا پہلی فرصت میں اسے صاف کردے گا۔ گاؤں پہنچا تو عجیب ہو کا عالم تھا۔ کچھ دیر پہلے گاؤں زندہ تھا۔ ہر طرف زندگی رقص کررہی تھی۔ دوکانوں، بازاروں، باغوں، میدانوں میں لوگ ہی لوگ نظر آتے تھے۔ مگر اب تو یہ عالم تھا کہ جیسے پورا گاؤں نیند کی آغوش میں ڈوب گیا ہو۔ کوئی متحرک شے نظر نہیں آتی تھی۔ اس نے گاڑی کی رفتار سست کردی۔ ایک سائیکل فٹ پاتھ پر پڑی تھی اس کے قریب ہی ایک آدمی چاروں شانے چت بے حس و حرکت لیٹا تھا۔ اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں چہرے پر خوف و دہشت کی علامات تھیں۔ اور ہونٹ متحرک تھے۔

ایک کاٹیج کا دروازہ کھلا تھا۔ اور اندر خوبصورت فرنیچر نظر آرہا تھا مگر کوئی ذی روح دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ ایک دکان کے قریب سے گزرا تو کاؤنٹر پر ایک آدمی بت کی طرح ساکت و جامد اور خاموش بیٹھا نظر آیا۔ وہ بھی مفلوج ہو چکا تھا۔ وہ پوسٹ آفس کے سامنے پہنچا تو ایک پوسٹ مین کاؤنٹر کا سہارا لئے کھڑا تھا۔ اس نے ایک ہاتھ کسی چیز کی طرف پھیلا رکھا تھا وہیں مفلوج ہو کر رہ گیا تھا۔ اس کے ہونٹ حرکت کررہے تھے اور آنکھیں حلقوں سے ابلی پڑ رہی تھیں۔

اب جھونپڑوں کے سامنے بچہ کھیلتا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ البتہ ایک جھونپڑے کے سامنے ایک بچہ ٹانگیں پھیلائے بیٹھا تھا۔ اس نے مدد طلب انداز میں اپنا ننھا منا سا بازو پھیلا رکھا تھا۔ جو پھیلا ہی رہ گیا تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں اور خوبصورت ہونٹ حرکت کررہے تھے۔

"اوہ...... خدایا......!" خدائے رحیم و قادر مطلق......!" میٹ چلایا۔ اس قہر سے کیسے نجات ہو...... اس آفت کا سدباب میں کیسے کروں؟ میری مدد کر! میری مدد کر خدائے لایزال۔ میری مدد فرما۔"

تنہائی اور اذیت ناک خون کی سیاہ چادر نے اسے بری طرح لپیٹ لیا تھا۔ اس نے اورسٹن پہنچنے کا فیصلہ کیا۔ اورسٹن جو بارہ میل کی طویل مسافت پر تھا۔

وہ ایک موڑ سے گھوما تو ایک موٹر سائیکل سوار پر نظر پڑی جو مفلوج ہو کر فٹ پاتھ پر پڑا تھا۔ اور اس کی پیشانی پر مچھر کے خون کا داغ نظر آرہا تھا۔ معاً اس نے گاڑی واپس موڑی۔ اسے خیال آگیا تھا کہ کیوں نہ

گاؤں کی اس المناک صورت حال سے ڈاکٹر پالفرے کو مطلع کردے تاکہ وہ گاؤں کی جانب لوگوں کی آمد و رفت کا سلسلہ ختم کرنے کا اہتمام کردے۔ وہ پوسٹ آفس کے قریب پہنچا تو ٹیلیفون بوتھ میں مچھر بھرے ہوئے تھے اور ان پر ایک بادل بھی نظر آرہا تھا۔ اس نے جلدی سے بوتھ میں دوائی چھڑکی چند منٹ بعد فضا صاف ہو گئی۔ اس نے اندر گھس کر دروازہ بند کیا اور اورسٹن پولیس اسٹیشن کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔

"ہیلو سپرنٹنڈنٹ میں میٹ بول رہا ہوں۔ پورا کون گاؤں اور یہ علاقہ کو تنگے طاعون کی لپیٹ میں آچکا ہے۔ موت نے ہر فرد کو جکڑ لیا ہے۔ کوئی آدمی ادھر نہ آنے پائے۔ ورنہ ایک بھی زندہ نہیں بچے گا۔"

"ایک سیکنڈ ٹھہرو۔" سپرنٹنڈنٹ کی ہراساں آواز آئی۔ چند لمحوں کے سکوت کے بعد ڈاکٹر پالفرے کی آواز سنائی دی۔

ڈاکٹر نے یہ سنسنی خیز اور رونگٹے کھڑے کردینے والی خبر سننے کے بعد بڑے سکون سے کہا۔ "اس مصیبت کا سدباب کیا جائے گا۔ پولیس اور سول ڈیفنس یونٹ فوری طور پر حرکت میں آئیں گے۔ کیا تم بتاسکتے ہو کون گاؤں سے باہر کہاں تک یہ وبا پھیل چکی ہے؟"

"بہت دور دور تک......" میٹ نے ہانپتے ہوئے کہا۔ "آل رائٹ میٹ۔" پالفرے بولا۔ پولیس نے راستہ روکنا شروع کردیا۔ "اس وقت کہاں سے بول رہے ہو؟"

"پوسٹ آفس سے۔"

"یہ جگہ محفوظ ہے کیا؟"

"نہیں میں نے کو نیک کل چھڑک دیا ہے۔ یہ موذی مچھروں کو ہلاک کردیتا ہے۔"

"اچھا تو ہوٹل فورسٹ کا رخ کرو۔ نصف میل ...ر گاڑی روکو۔ تمہاری گاڑی پر اسپرے کردیا جائے گا۔ ...ھر ہوٹل پہنچو۔ اگر ہوٹل محفوظ ہوا تو تم سے ملاقات ہوگی۔ ...ر ہوٹل بھی متاثر نظر آئے تو ہوٹل کے قریب ہی کھڑے ...چھڑکنے والے عملے سے رابطہ قائم کرنا۔"

"اوکے......" میٹ نے کہا اور شیشے سے باہر جھانکا۔ مچھر نظر آرہے تھے۔ اس نے جلدی سے دروازہ کھولا اور ایک ہی زقند میں کار کے پاس پہنچ گیا۔ پھر کار کا دروازہ کھول کر اندر گھسا شیشے چڑھائے اور اندر دوا چھڑک کر تیزی سے جنگل کی طرف روانہ ہوگیا۔ جنگل کے کنارے سڑک کی ایک جانب اسے ایک کار کھڑی نظر آئی جس میں دو عورتیں اور ایک مرد ڈرائیور مفلوج ہو چکے تھے۔ اس نے نگاہیں پھیر لیں اور جنگل کے قلب کی جانب گھستا چلا گیا۔ کوئی ایک میل آگے سے ایک سائیکل سوار اپنی جانب آتا نظر آیا۔ اس کے قریب آنے پر معلوم ہوا کہ لڑکی ہے اور یہ وہی لڑکی ہے جو ہوٹل میں ویٹرس کی حیثیت سے ملازم ہے اور مورین اوشیا سے بہت مشابہت رکھتی ہے۔ اس نے گاڑی روکی۔ "رک جاؤ......" وہ چیخا۔

لڑکی نے سائیکل روک کر الجھی الجھی نگاہوں سے اسے دیکھا۔ "سائیکل پھینک کر میری گاڑی میں آبیٹھو۔ اس علاقے میں دوا چھڑکی جارہی ہے کیونکہ اس میں ایک وبا پھیل چکی ہے۔ میری گاڑی میں آبیٹھو میں تمہیں محفوظ مقام پر پہنچادوں گا۔"

"معلوم ہوتا ہے تمہارا دماغ چل گیا ہے۔" لڑکی ہنسی۔ "مجھے راستہ دو۔" وہ گاڑی سے نکل کر بانہیں پھیلائے لڑکی کی طرف بڑھا، لڑکی نے سائیکل موڑلی مگر میٹ اس تک پہنچ گیا۔

"میرے قریب مت آؤ بدمعاش۔" وہ چیخی۔ عین اس لمحے لڑکی کے عریاں خوبصورت بازو پر ایک مچھر آبیٹھا۔ میٹ نے ہاتھ سے اسے اڑادیا۔ مگر وہاں گرد کا کوئی بادل نہیں تھا۔ پھر اس نے لڑکی کو بازوؤں میں جکڑ کر اٹھایا اور سیٹ پر لا پھینکا۔ پھر خود اسٹیئرنگ وہیل پر آبیٹھا۔ لڑکی نے دوسرے دروازے سے باہر نکلنے کی کوشش شروع کردی۔

"ڈرو نہیں میں تمہارا دشمن نہیں۔ میں تمہاری جان بچانا چاہتا ہوں۔" میٹ اکھڑے اکھڑے سانس سے بولا اور اسپرے پمپ نکال کر گاڑی میں دوا چھڑکنے میں مصروف ہوگیا۔ پھر اسپرے پمپ کو ڈیش بورڈ پر رکھ کر

لڑکی سے مخاطب ہوا۔

''تمہارے بازو پر ایک مچھر بیٹھ گیا تھا۔ کہیں اس نے تمہیں کاٹا تو نہیں؟'' لڑکی نے جلدی سے بازو سہلایا۔ اور اس کی آنکھوں میں خوف کے سائے لہرانے لگے۔ جیسے اسے یکا یک کسی انجانے خطرے کا احساس ہوا ہو۔ بازو پر سرخ نشان نظر آ رہا تھا۔ ''لاؤ...... میں اس زخم کا زہر نکال دوں۔'' میٹ نے کہا۔ لڑکی نے متذبذب سی ہو کر بازو اس کی طرف بڑھایا، عین اسی لمحے کار کا دروازہ کھلا اور میٹ کے جبڑے پر ایک زبردست گھونسا لگا۔ اس کا سر ونڈ اسکرین سے ٹکرایا۔

''بدمعاش لڑکی کو اغوا کر رہا ہے۔'' ایک آواز سنائی دی۔ میٹ نے پلٹ کر دیکھا۔ ادھیڑ عمر کا ایک توانا اور لمبا تڑنگا آدمی کھڑا تھا۔ لڑکی گاڑی سے نکل کر اس کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ میٹ نے اسے ہولناک خطرے سے لاکھ ڈرایا مگر اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔

''جاؤ...... اپنا راستہ ناپو ورنہ ہڈیاں توڑ دوں گا۔'' وہ گرجا پھر لڑکی سے مخاطب ہوا۔ ''کیتھلین چلیں۔''

''یس سر......!'' کیتھلین نے بڑے ادب سے کہا۔

پھر گاڑی میں بیٹھ کر فورسٹ ہوٹل کی طرف روانہ ہو گیا۔ ایک جگہ اسے پولیس والوں کا ایک گروہ سڑک کے درمیان رکاوٹیں کھڑی کرتا نظر آیا۔ اس گروہ کے علاوہ ایک گروہ دوا چھڑکنے میں مصروف تھا۔ انہوں نے بڑی محفوظ وردیاں پہن رکھی تھیں اور ان کے سر پر آہنی خول تھے جن پر ململ کے نقاب چڑھے ہوئے تھے۔ میٹ ڈاکٹر پالفرے کے مستعدی اور منتظمانہ صلاحیتوں پر حیران رہ گیا۔ اس کی کار میں بھی اسپرے کیا گیا اور اسے بتایا گیا کہ ڈاکٹر پالفرے ہوٹل فورسٹ میں اس کا انتظار کر رہا ہے۔

ہوٹل کی فضا پرامن تھی۔ کسی کو احساس تک نہ تھا کہ ان کے چہار اطراف موت رقص کر رہی ہے۔ ''کیا آپ میٹ اسٹون ہیں؟'' ایک قوی ہیکل آدمی نے اس کا راستہ روکا۔

''جی ہاں۔''

''میں آپ کا دوست ہوں۔'' وہ مسکرایا کمرہ نمبر سات میں آپ کا انتظار ہو رہا ہے۔''

''شکریہ!'' میٹ نے کہا۔ اور وہ جب کمرے میں پہنچا تو اس نے ڈاکٹر پالفرے کو ایک میز کے سامنے بیٹھے پایا اس کے سامنے دو ٹیلیفون رکھے ہوئے تھے۔ اور کاغذوں کا ایک ڈھیر سامنے پڑا ہوا تھا۔ ایک سلپ پر اس نے کچھ لکھ کر دروازے پر چپراسی کی طرح کھڑے پست قامت اور ٹھوس جسم والے آدمی کی طرف بڑھایا۔

''اسے نیچے لے جاؤ سارک'' پھر میٹ کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ میٹ کی پوری روداد سننے کے بعد بولا۔ ''متاثرہ لوگوں کو اورسٹن ہسپتال پہنچایا جا رہا ہے اور لندن سے اسپیشلسٹ آ رہے ہیں۔ ان دونوں بدمعاشوں نے بتایا ہے کہ انہیں پانچ سو پونڈ کے عوض مسٹر اینڈ مسز کارٹر پر قاتلانہ حملہ کرنے بھیجا گیا تھا۔ اس سے زیادہ انہوں نے کچھ نہیں بتایا۔ ایک بات قابل غور ہے کہ وہ متاثرہ علاقے سے سلامت کیسے واپس آ گئے؟'' اس کے ساتھ ہی پالفرے نے تیز اور معنی خیز نگاہوں سے میٹ کی آنکھوں میں جھانکا۔ پھر بولا۔ ''اس علاقے میں ہوائی جہازوں کے ذریعے دوائی چھڑکنے کا اہتمام کر دیا گیا ہے۔''

اتنے میں فون کی گھنٹی بجی۔

''ہیلو...... ہیلو...... اچھا اسٹیفن؟'' پھر وہ خاموشی سے سنتا رہا۔ ''ہاں...... ہاں میٹ اس وقت میرے پاس موجود ہیں؟ کیا کہا؟ اچھا!'' ڈاکٹر نے ریسیور رکھا اور میٹ کو بڑے مشکوک نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ ''اب جاؤ اور نہاؤ!''

میٹ پریشان سا ہو کر اپنے کمرے میں چلا آیا۔ نہا کر ڈاکٹر کے پاس پہنچا تو اس نے ہوٹل کی حسین ویٹرس کیتھلین کا ذکر چھیڑا۔

''وہ یہاں سے رونڈی کے ساتھ غائب ہونے والی لڑکی مورین اوشیا کی چھوٹی بہن ہے۔ اسے مچھر نے کاٹا مگر متاثر نہیں ہوئی یہ بہت اہم بات ہے۔ وہ اپنی بہن مورین اوشیا کے غائب ہوتے ہی یہاں آئی تھی۔ جنگل میں تم سے مزاحم ہونے والا کرٹ لارنس تھا۔ ہوٹل فورسٹ کا مالک......'' یہ کہہ کر پالفرے ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔ ''اب ہمیں کھل کر سامنے آنا پڑے گا۔ جلد از جلد رونڈی کو تلاش کرنا ضروری ہے۔ اگر لندن جیسا عظیم شہر وبا کی لپیٹ میں آ گیا تو کیا ہوگا۔ اس سلسلے میں اس ہوٹل کے تمام عملے سے بھی پوچھ گچھ کرنی پڑے گی۔ اور ہاں کیتھلین سلامتی سے ہوٹل واپس آ چکی ہے۔ وہ مچھر کے کاٹے سے قطعاً متاثر نہیں ہوئی۔ اسی طرح لارنس بھی محفوظ رہا تم کیتھلین سے ملو اور معلوم کرو کہ آخر وہ محفوظ کیسے رہی؟''

''میں کوشش کروں گا۔''

فون کی گھنٹی بجی...... اسٹیفن نے ایک روح فرسا خبر سنائی۔ ''بوس آئرس کے مضافات میں بھی کونگا طاعون پھوٹ پڑا ہے۔ لوگ تیزی سے مفلوج ہو رہے ہیں۔''

''کوئی اور خبر؟'' ڈاکٹر نے پوچھا۔ ''ہاں حکومت برطانیہ کی طرف سے تنبیہ کی گئی ہے کہ میٹ اسٹون کی شخصیت انتہائی مشکوک ہے۔ اس پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔'' اسٹیفن نے جواب دیا۔ ''یہ وارننگ وزیر اعظم نے دی ہے۔''

اس بار ڈاکٹر نے میٹ کو کچھ ایسی متجسس اور گہری نظروں سے دیکھا کہ وہ کانپ کر رہ گیا اور ڈاکٹر کے مشکوک خیالات اس پر ظاہر ہو گئے۔

''میں کیتھلین کو چائے لے کر تمہارے کمرے میں بھیجنے کا انتظام کروں گا۔'' ڈاکٹر پالفرے نے کہا۔ اور دیکھو......'' پالفرے نے اس کے متغیر چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ہوٹل کا مالک لارنس بھی اسی علاقے میں آزادانہ گھومتا رہا ہے۔ اسے بھی کوئی گزند نہیں پہنچا ایریا نمبر 23 میں اب تک بیسیوں افراد وبا کا شکار ہو چکے ہیں۔'' پھر پالفرے نے اسے کچھ ایسی معنی خیز نگاہوں سے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو اور تم بھی تو اس جہنم میں گردش کرتے رہے مگر زندہ سلامت کھڑے ہو۔ یہ محسوس کرتے ہی میٹ اسٹون چکرا گیا۔ اور اس کے چہرے سے دل صدمے اور بیزاری کے آثار ظاہر ہونے لگے۔

فون کی گھنٹی بجی۔ ڈاکٹر نے سر کے اشارے سے میٹ کو رخصت کیا اور ریسیور کان سے لگا لیا۔ ڈاکٹر مچیسن نے اطلاع دی کہ گرد کے بادل کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ یہ حقیقت میں بیکٹیریا ہیں اور انہیں سب سے بڑا کیڑا خارج کرتا ہے۔ یہ کیڑا حقیقت میں مچھر نہیں تاہم ابھی تک ہم اسے شناخت نہیں کر پائے۔

ڈاکٹر نے ہراساں ہو کر ریسیور رکھا اور سوچنے لگا کہ میٹ اسٹون سے مزید کام لیا جائے یا نہیں۔ کہیں وہ سچ مچ دشمن کا آدمی تو نہیں۔ ادھر یہ ناگہانی آفت تھی کہ اپنا دامن وسیع سے وسیع تر کئے جا رہی تھی۔

میٹ اسٹون اپنے کمرے میں خاموش بیٹھا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے کہا۔ ''آ جاؤ۔'' دروازہ کھلا اور سرو قامت کیتھلین ہاتھوں میں چائے کی ٹرے تھامے اندر داخل ہو گئی۔ جونہی اس کی نظر میٹ اسٹون پر پڑی تو ٹھٹک کر رک گئی۔

''پہچانتی ہو مجھے؟'' میٹ مسکرایا۔

''خوب پہچانتی ہوں۔'' وہ بڑبڑائی پھر اس نے جلدی سے اپنے بازو کی طرف دیکھا جس پر مچھر نے کاٹا تھا۔ ''ان مچھروں نے تو تباہی مچا دی ہے۔'' پھر اس نے آگے بڑھ کر ٹرے میز پر رکھ دی۔ ''مگر تم تو محفوظ ہو۔'' میٹ نے کہا۔

''ہاں ڈاکٹر نے بتایا ہے کہ مجھے ایک عام مچھر نے کاٹا تھا۔'' کیتھلین نے کہا۔ ''بہرکیف ایک ہفتہ قبل مچھروں کی بہتات کے پیش نظر ہوٹل کے عملے کو انسدادی دوا ضرور کھلائی گئی تھی پھر وہ قدرے تامل کے بعد بولی۔'' میں نے آپ کو بہت تکلیف دی...... معذرت خواہ ہوں۔''

''کوئی مضائقہ نہیں......'' میٹ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''بیٹھ جاؤ۔''

''نہیں...... اگر مسٹر لارنس کو پتہ چل گیا کہ میں کسی مہمان سے فلرٹ کر رہی ہوں تو وہ مجھے ملازمت سے نکال کر باہر کریں گے۔''

''تو کیا اسی جرم میں کسی اور لڑکی کو بھی ملازمت سے نکالا گیا تھا؟'' میٹ نے استفسار کیا۔

''ہاں میری بہن مورین اوشیا کو......'' وہ سادگی سے بولی۔ ''اس نے ایک آسٹریلوی مہمان سے راہ و رسم

بڑھائی تھی۔"

"کیا اس آسٹریلوی کا نام رونڈی ویلو تھا؟" میٹ نے پوچھا۔ لڑکی اچھل پڑی اور حیران حیران نظروں سے میٹ کو دیکھنے لگی۔ پھر جلدی سے بولی۔ "ان دنوں میں یہاں نہیں تھی اور نہ میں اس کا نام جانتی ہوں۔"

اتنا کہہ کر وہ دروازے کی طرف مڑی۔

"اب آپ جائیے پلیز! پھر اس سے پیشتر کہ میٹ اس کا راستہ روکتا وہ پھرتی سے دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ مگر دوسرے ہی لمحے دروازہ کھول کر پھر اندر داخل ہوئی۔ اس کے پیچھے ہی سارک داخل ہوا۔ لڑکی نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھا اور سارک میٹ اسٹون سے مخاطب ہوا۔

"ڈاکٹر نے کہا کہ اس سے رونڈی کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کرو۔ کیا تمہاری بہن رونڈی کو پہلے سے جانتی تھی؟" میٹ نے پوچھا۔

"نہیں۔" وہ بولی۔ "وہ اس ہوٹل میں ملازمت اختیار کرنے کے بعد اس سے متعارف ہوئی تھی۔"

"رونڈی ویلو ہی نے یہ وبا پھیلائی ہے۔" میٹ بولا۔ "کیا تم بتا سکتی ہو وہ کہاں ہے؟"

"نہیں...... میں اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی۔ کیتھلین نے متوحش سی ہو کر کہا۔ "میں یہاں اپنی بہن سے ملنے آئی تھی۔ مگر وہ میرے آنے سے پہلے ہی روپوش ہو چکی تھی۔ اس کی جگہ مجھے ملازم رکھ لیا گیا۔"

"کیا تم نے اسے اور رونڈی کو تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی۔" میٹ نے استفسار کیا۔ "نہیں۔" وہ چیخ سی پڑی۔

"میں کچھ نہیں جانتی۔" پھر اس نے لپک کر دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ ڈالا۔ مگر دروازہ مقفل تھا۔

اس کے ردعمل سے صاف ظاہر تھا کہ اس سوال سے وہ بری طرح خوفزدہ ہوئی تھی۔ ہاں وہ کچھ نہ کچھ جانتی ضرور تھی جسے وہ زبان پر لانے سے گریزاں تھی...... اچانک دروازے پر دستک ہوئی اور کیتھلین چیخ اٹھی۔ "کون ہے؟ مجھے یہاں سے نکالو......!"

سارک دایاں ہاتھ جیب میں ڈال کر ایک دم دیوار سے چپک گیا...... پھر دروازہ کھلا اور لارنس کمرے میں داخل ہوا۔ اس کی آنکھوں میں ایک پراسراری چمک تھی اور ہاتھ میں گھوڑا ہانکنے کا چابک تھا۔

"معلوم ہوتا ہے مرمت کرائے بغیر چین نہ لو گے۔" وہ میٹ کو شعلہ فشاں نگاہوں سے دیکھتا ہوا غرایا۔ پھر کیتھلین سے مخاطب ہوا۔ "تم جاؤ کیتھی۔"

"نہیں!" کیتھلین چیخی۔ چابک فضا میں سنسنایا۔ میٹ نے مسکراتے ہوئے ہاتھ سر سے بلند کیا اور چابک انگوٹھے اور ایک انگلی کی مدد سے یوں پکڑ لیا جیسے مکھی پکڑ لی ہو۔ پھر ایک ہی جھٹکے میں چابک لارنس کے ہاتھ سے نکل کر بستر پر جا پڑا۔

"یہ تو آپ بھول ہی گئے مسٹر لارنس کہ میں ایری زون کا ایک گلہ بان ہوں۔ مدتوں مویشی پالتا رہا ہوں۔ مجھے کیتھی سے محبت ہے اور میرے احساسات پر کوئی پہرہ نہیں لگا سکتا۔ ہاں تو آپ نے کمرے کا تالا کیسے کھولا؟"

"میرے پاس ایک کی ہے۔" لارنس نے حواس پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ مگر غصے سے اس کا برا حال تھا۔ "اگر آئندہ آپ نے میرے کمرے میں بغیر اجازت داخل ہونے کی کوشش کی تو سر توڑ دوں گا۔ سمجھے آپ......" میٹ گرجا۔

"دیکھا جائے گا۔" لارنس پھٹ پڑا۔ "آدھ گھنٹے کے اندر اندر ہوٹل سے نکل جاؤ۔ ورنہ اٹھا کر باہر پھینک دیئے جاؤ گے۔" کیتھلین کمرے سے نکل جاؤ۔ دوبارہ ادھر رخ نہ کرنا۔ اگر تم نے اس شخص سے کوئی بات کی تو ملازمت سے نکال دوں گا۔ سمجھیں......؟"

"یس سر......" کیتھلین نے کہا اور دروازے کی طرف بڑھی۔ مگر اچانک نمودار ہونے والے ایک شخص نے راستہ روک لیا۔ یہ ڈاکٹر پالفرے تھا۔

"معاف کرنا مسٹر لارنس...... آپ کو زحمت ہوئی۔" ڈاکٹر نے اپنے پیچھے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔ "ابھی میٹ اسٹون ہوٹل نہیں چھوڑ سکتا۔ اس علاقے میں ہنگامی حالات کے تحت مارشل لاء نافذ کر دیا گیا ہے۔

اگر اس سور نے پھر کیتھلین کو پریشان کیا تو میں اس کی گردن توڑ دوں گا۔ لارنس گرجا۔ اور میٹ کو قہر آلود نگاہوں سے دیکھتا ہوا کیتھلین کے ساتھ کمرے سے نکل گیا۔

"آخر لارنس کیتھلین میں اتنی دلچسپی کیوں رکھتا ہے؟" ڈاکٹر بولا۔ وہ آج گھوڑے پر سوار ہو کر اس کے تعاقب میں بھی گیا۔ اور اب اس کی آبرو بچانے یہاں آن دھمکا۔ آخر ماجرا کیا ہے؟ اور ہاں یاد آیا۔ یہ بیماری صرف انسانوں پر اثر انداز ہوتی ہے حیوانوں پر نہیں پھر قدرے توقف کے بعد بولا۔ تمہیں کیتھلین سے کیا معلومات حاصل ہوئیں......؟"

"کوئی خاص بات معلوم نہیں ہوئی۔" میٹ نے جواب دیا۔ "میں نے یہی نتیجہ اخذ کیا ہے کہ لارنس نہیں چاہتا کہ کیتھلین مجھے رونڈی کے بارے میں کچھ بتائے۔"

"تو پھر لارنس کو اتنی مہلت دینی چاہیے کہ وہ لڑکی کو یہاں سے غائب کر دے۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "وہ کہیں اسے قتل نہ کر دے۔" میٹ نے خدشہ ظاہر کیا۔

"وہ ایسا نہیں کر سکے گا۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "اس کی کڑی نگرانی کی جا رہی ہے۔ پھر ہمیں ابھی اس امر کا ثبوت بھی تو درکار ہے کہ لارنس بھی اس شیطانی کام میں ملوث ہے۔" پھر وہ قدرے دھیمے لہجے میں بولا۔ "اولین فرصت میں کیتھی سے کچھ اگلوانے کی کوشش کرو۔ میں اس سے تمہاری ملاقات کا انتظام کروں گا اور کیا تم جانتے ہو اس وقت دنیا میں کیا کچھ رونما ہو رہا ہے؟"

"نہیں...... بتایئے......!" میٹ نے چونک کر پوچھا۔ پانچ منٹ کے بعد ریڈیو پر ایک اور نیوز بلیٹن نشر کیا جانے والا ہے۔" ڈاکٹر نے کہا۔

"بس یوں سمجھو کہ پوری دنیا ایک ہولناک خطرے میں گھر چکی ہے۔ اور اس گاؤں کی مصیبت اس خطرے کا پیش خیمہ ہے۔ اپنے وسیع بین الاقوامی دورے کے بعد رونڈی اسی علاقے میں روپوش ہوا۔ اب ہمیں صرف اس بات کا انتظار ہے کہ لارنس عنقریب کیا اقدام کرتا ہے۔ اگر وہ آئندہ ایک گھنٹے کے اندر حرکت میں آئے گا تو ٹھیک ورنہ ہم ہوٹل کے عملے پر تشدد کریں گے۔ اور ہر قیمت پر اس گھناؤنے راز سے پردہ اٹھائیں گے۔ سمجھے؟"

پالفرے نے ریڈیو کا سوئچ آن کر دیا۔ بی بی سی اناؤنسر کی مانوس آواز سنائی دینے لگی۔

"حکومت برطانیہ نہایت قلق سے اعلان کرتی ہے کہ مچھر کی شکل کے کیڑوں اور ان کے ساتھ گردش کرنے والے گرد کے بادلوں کا طاعون اب خطرناک صورت اختیار کر چکا ہے۔ یہ حیرت انگیز اور روح فرسا وبا برطانیہ، فرانس، ہنگری، ارجنٹائن، امریکہ، عدن اور مصر کے بعض علاقوں میں بھی پھیل چکا ہے۔ اس وبا کے زیر اثر لوگ فوری طور پر مفلوج اور گونگے ہو جاتے ہیں۔ دنیا بھر کے ڈاکٹروں کو اس مرض کے تدارک کی مفصل ہدایات چند منٹ بعد جاری کر دی جائیں گی برطانیہ بھر کے مقامی حکام کو احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کی ہدایات جاری کر دی گئی ہیں۔ دریں اثنا حفظ ماتقدم کے طور پر گھریلو استعمال کی عام کیڑے مار دوائیں چھڑکی جائیں جو عارضی طور پر ان مہلک جراثیم سے نجات دلانے کی طاقت رکھتی ہیں۔"

کیتھلین سیدھی کچن میں پہنچی۔ اس کے حواس پراگندہ تھے۔ نئے بھرتی ہونے والے ایک باورچی نے اسے غور سے دیکھا اتنے میں لارنس وارد ہوا۔ اس نے قریب آتے ہی کیتھلین سے مدہم آواز میں پوچھا۔

"کیا تم نے اس امریکی کو کچھ بتا دیا ہے؟"

"نو سر......! قسم لے لیجئے جو میں نے اس سے ایک لفظ بھی کہا ہو سر میں نے آپ کی ہدایات پر حرف بحرف عمل کیا ہے۔" کیتھلین نے کہا اور نیا بھرتی ہونے والا باورچی ہمہ تن گوش ہو گیا۔

"تمہارے منہ سے ایک لفظ بھی نکل گیا تو تمہاری بہن زندہ نہیں رہے گی۔ سمجھیں؟"

"یس سر...... میں جانتی ہوں......!"

"تو جاؤ...... ساڑھے چھ بج چکے ہیں۔ چھٹی کرو!" لارنس نے کہا۔ کیتھلین دروازے کی طرف بڑھ گئی جو اسٹاف کوارٹرز کی جانب کھلتا تھا۔

ڈاکٹر پالفرے بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا کہ اسٹیفن نے فون پر اطلاع دی۔ آج رات برطانوی کابینہ کا ایک

ہنگامی اجلاس بلایا جانے والا ہے۔ کل صبح جنیوا میں بین الاقوامی ریڈکراس کی میٹنگ میں امدادی پروگرام طے کیا جائے گا۔ اور کل سہ پہر اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کا اجلاس بھی منعقد ہونے والا ہے مزید یہ کہ اب روس اور چین کے بھی کچھ اہم علاقے اس آفت کی لپیٹ میں آچکے ہیں۔

ڈاکٹر پالفرے لارنس سے براہ راست بات چیت کا فیصلہ کرکے اٹھا اور لارنس کے دفتر پہنچا جس کے دروازے پر اس کا نیا آدمی متعین تھا۔

”کیا لارنس آفس ہی میں ہے؟“ پالفرے نے پوچھا۔ ”جی ہاں...... کوئی بیس منٹ سے اندر ہی بیٹھا ہے۔ اس کی بیوی بھی اس کے پاس ہے۔“

پالفرے نے دروازے پر دستک دی مگر کوئی رد عمل ظاہر نہ ہوا۔ اس نے ہینڈل پر ہاتھ ڈالا تو معلوم ہوا کہ دروازہ مقفل ہے۔ پالفرے نے جیب سے چابیوں کا ایک گچھا نکالا اور قفل کھول کر اندر داخل ہوگیا۔ سامنے صوفے کی پشت سے ٹیک لگائے لارنس بیٹھا تھا۔ اور مسز لارنس آرام سے کرسی پر بیٹھی تھی۔ دونوں کے درمیان ایک میز پر شراب کی بوتل رکھی تھی اور وہ دونوں بتوں کی طرح بے حس وحرکت بیٹھے تھے۔ دونوں مرچکے تھے مگر مچھروں کے طاعون سے نہیں زہر خانی۔ ڈاکٹر لپکتا ہوا اسٹاف کوارٹرز کی طرف چلا۔ کیتھلین اپنے کوارٹر میں موجود تھی۔ مگر پریشانی اضطراب اور دکھ سے اس کا برا حال تھا۔ خوف ودہشت سے اس کا رنگ برف کی طرح سفید ہورہا تھا۔ ڈاکٹر نے، سے مسٹر لارنس اور اس کی بیوی کی موت سے آگاہ کرکے اس سے مزید پوچھ گچھ کرنا چاہی۔ مگر مایوسی ہوئی وہ واپس اپنے کمرے میں آیا تو وزیر داخلہ کی کال موصول ہوئی۔

”صورت حال کیسی ہے ڈاکٹر......؟“ وزیر داخلہ نے کہا۔ ”بد سے بدتر ہورہی ہے۔“ ڈاکٹر نے جواب دیا۔ اور ہم اب تک اندھیرے میں ہیں۔ ”اُف...... ! تو میٹ اسٹون کے خلاف آپ نے کیا کارروائی کی......؟“

”تو کیا وہ واقعی غدار ہے؟“ ڈاکٹر نے پوچھ ہی لیا۔ وزیر خوراک وزراعت مسٹر ڈومنی نے ہمیں بتایا تھا کہ واشنگٹن سے وارننگ کی گئی ہے کہ میٹ اسٹون دشمن کا آدمی ہے۔ اس نے اس سلسلے میں تفصیلات طلب کی ہیں جو تاحال موصول نہیں ہوئیں۔ خیر کچھ بھی ہو تم میٹ کا صفایا کردو۔“

”او کے کوئی معقول بہانہ ہاتھ آجائے تو......“ پالفرے نے کہا۔ ”آپ فکرمند نہ ہوں۔“ اس نے ریسیور ہاتھ سے رکھا ہی تھا کہ ڈاکٹر میتھیسن نے اطلاع دی کہ ان خونی مچھروں اور گرد کے بادلوں میں خفیف سی ریڈیو ایکٹویٹی پائی گئی ہے۔ اور یہ گرد کے بادل اصل میں جراثیم کے بادل ہیں۔ ہر ٹکڑے میں کروڑوں جراثیم ہیں۔ مگر کسی جوہڑ یا تالاب میں ان کی پرورش گاہ نہیں پائی گئی۔ مزید یہ کہ مس براؤن کی حالت خطرے سے باہر ہے اور تاحال اس مرض کا شافی علاج دریافت نہیں ہوسکا۔“

چند منٹ بعد اسٹیفن نے بتایا کہ لندن کے ایک تھیٹر میں مچھروں اور گرد کے بادلوں نے حملہ کردیا ہے اور شہر میں خوف وہراس پھیل گیا ہے۔ لوگ ہوائی جہازوں، بحری جہازوں، کاروں اور ریلوے کے ذریعے شہر چھوڑ رہے ہیں۔ اور امن وامان برقرار رکھنے کے لئے پولیس نے فوج کی مدد طلب کرلی ہے۔

ایک اچھی خبر ہے۔“ اسٹیفن نے کہا۔ ”وہ کیا ہے......“

”آپ کی ریسرچ اسٹیبلشمنٹ نے ایک ایسی دوا ایجاد کی ہے جس کا انجکشن لے کر بیکٹیریا کے بادل میں سانس لینے سے کوئی ضرر نہیں پہنچتا۔ مگر سردست دوا قلیل مقدار میں تیار ہوئی ہے۔“

دوا کی کچھ مقدار مجھے فراہم کردو۔ تاخیر نہ ہو!

”ڈاکٹر سیدھا کیتھلین کے کوارٹر پہنچا۔ دروازے پر میٹ کھڑا تھا۔ ڈاکٹر نے اسے ہدایت کی کہ وہ کیتھلین کو اپنے کمرے میں لے جائے اور وہیں اس سے پوچھ گچھ کرے۔“ دراصل میٹ کے کمرے میں ایک مائیکرو فون نصب تھا اور ڈاکٹر ان کی بات چیت آسانی سے سن سکتا تھا۔

میٹ نے کیتھلین کو اٹھا کر کاندھے پر ڈالا اور

اپنے کمرے کی طرف روانہ ہوگیا۔ ہر طرف ڈاکٹر پالفرے کے آدمی پھیلے ہوئے تھے۔ اسی لئے کسی سمت سے مزاحمت کا امکان نہیں تھا۔

اس نے اپنے کمرے میں کیتھلین کو ایک آرام کرسی پر دراز کیا اور سگریٹ سلگا کر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ ڈاکٹر پالفرے کو اس پر اعتماد نہیں رہا۔ اور وہ پھر اپنے تئیں قابل اعتماد ثابت کرنے کا متمنی تھا۔ میٹ نے ریڈیو کا سوئچ آن کردیا۔

ریڈیو سے گونگے طاعون کی تباہ کاریوں کی خبریں نشر ہورہی تھیں۔ دونوں بڑے خوف اور سراسیمگی سے سنیں۔ ملک میں ہنگامی حالات کا اعلان کردیا گیا ہے۔ اور اور امن وامان کو برقرار رکھنے کے لئے احتیاطی تدابیر اختیار کی جارہی ہیں۔ عوام سے درخواست ہے کہ نقل مکانی کا سلسلہ ختم کردیں۔ عوام کا یہ رجحان اس آفت سے بھی کہیں خطرناک ثابت ہوسکتا ہے گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ ان موذی کیڑوں سے بچنے کے لئے گھریلو استعمال کے کیڑے مار دوائیں چھڑکیے۔ اس طاعون کا علاج دریافت کرلیا گیا ہے۔ اور بعض مریض روبصحت ہو رہے ہیں۔ کرفیو نافذ کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے 9 1/2 بجے کرفیو شروع ہوجائے گا۔ اور میٹ نے ریڈیو بند کرکے خوف سے لرزتی ہوئی کیتھلین کی طرف دیکھا۔

”خبریں تم نے سن لیں وہ بولا۔ دیکھ لو دنیا پر کیا قیامت گزررہی ہے۔ اب مجھے بتادو۔“

”نہیں نہیں۔“ وہ چیخ سی پڑی۔ ”وہ میری بہن مورین اور والدین کو ہلاک کردیں گے۔“

”مگر کیوں ہلاک کردیں گے......؟“ میٹ نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ ”لارنس بھی اس شیطانی کام میں شریک ہے۔“ وہ سسکیاں لیتی ہوئی بولی۔ ”اس نے مجھے دھمکی دی تھی کہ اگر میں نے اس راز سے پردہ اٹھایا تو نہ صرف مجھے بلکہ مورین سمیت تمام خاندان کو نیست ونابود کردیا جائے گا۔“

”مگر لارنس تو چل بسا...... اب ڈر کس بات کا ہے؟“ میٹ کو اس پر بے اختیار پیار آگیا۔ اور اس نے اٹھ کر کیتھلین کو سینے سے لگالیا۔ ”بتاؤ...... وہ راز کیا ہے؟“

”میں نے وہ ٹھکانہ ڈھونڈ لیا تھا۔“ اس نے روتے ہوئے اس کے چوڑے سینے میں سر چھپا لیا۔ رونڈی اور مورین وہیں تھے۔

پھر ایک سوال کے جواب میں کیتھلین نے بتایا کہ لارنس کو رونڈی ویلو کے آدمیوں نے ہی ہلاک کیا ہے۔ کیونکہ گزشتہ ہفتے سے لارنس نے رونڈی ویلو کی انسانیت دشمن سرگرمیوں کے خلاف احتجاج کرنا شروع کردیا تھا۔ اور اس نے کیتھلین کو بتایا تھا کہ وہ جلدی ہی رونڈی ویلو کے خلاف حکومت کی حمایت کرنے والا ہے۔ اور اس نے شاید شکایت کے لئے مقامی حکام سے رابطہ قائم کیا تھا۔ مگر اسے ختم کردیا گیا۔

”اف......“ میٹ نے اسے کرسی پر بٹھاتے ہوئے کہا۔ ”ٹیلیفون پر ڈاکٹر سے درخواست کی کہ مورین اور کیتھلین کے والدین کی حفاظت کے فوری انتظامات کئے جائیں۔ ابھی وہ کیتھلین کی طرف متوجہ ہوا ہی تھا کہ بلیک آؤٹ ہوگیا۔ گردونواح کا تمام علاقہ اندھیرے میں ڈوب گیا۔ عین اسی لمحے جنگل کے وسط میں آگ کے شعلے بلند ہوئے۔ وہ دونوں کھڑکی میں آکھڑے ہوئے۔ اتنے میں ڈاکٹر پالفرے بھی آگیا۔ آگ دیکھتے ہی دیکھتے ایک وسیع دائرے میں پھیلتی چلی گئی۔

اس دائرے کے اندر ہی رونڈی اور مورین کی پناہ گاہ ہے۔ کیتھلین بولی۔ ”مگر ہم تو اس علاقے کو اچھی طرح کھنگال چکے ہیں۔“ وہ جلدی سے بولا۔

”اسے میرے کمرے میں لے آؤ میٹ۔“

چند منٹ کے بعد وہ ڈاکٹر پالفرے کے کمرے میں پہنچے تو وہ فون پر فائر بریگیڈ کو آگ پر قابو پانے کی ہدایت دے رہا تھا۔ اس کام سے فارغ ہوا ہی تھا کہ اسٹیفن نے فون پر اطلاع دی کہ لارنس نے وہائٹ ہال کو فون کیا تھا مگر اسے کوئی جواب نہ ملا۔ گویا یہی اقدام اس کی موت کا باعث ہوا تھا۔

کیتھلین نے ڈاکٹر کے استفسار پر یہ سنسنی خیز انکشاف کیا کہ وہ یہاں آئی تو معلوم ہوا کہ اس کی بہن

رونڈی ویلو کے ساتھ جنگل میں مقیم ہے۔ اور وہ سے زرعی تجربات میں مدد دے رہی ہے۔ لیتھلین سائیکل پر سوار ہو کر اس کی تلاش میں گئی۔

اور کامیاب رہی...... مگر مورین کو روپوش کر دیا گیا۔ وہ پھر اسے کبھی دکھائی نہ دی۔ پھر اس نے بتایا کہ وہ آج بھی بہن کی تلاش میں گئی تھی کہ میٹ نے اس کا راستہ روکا اور لارنس سے اس کا ٹکراؤ ہوا۔

یکا یک ہیلی کاپٹر کی آواز گونجی۔ ڈاکٹر بولا۔ آگ بجھانے کی کارروائی شروع ہو رہی ہے مگر ابھی ہم ادھر کا رخ نہیں کریں گے کیونکہ میرے خیال میں یہ آگ ہمیں اس طرف متوجہ کرنے کے لئے بھڑکائی گئی ہے۔ اس میں یقیناً کوئی گہرا راز ہے۔ ہمیں بے وقوف بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

پھر ڈاکٹر نے میٹ کا ہاتھ پکڑا اور باہر ایک سائبان کے نیچے آ کھڑا ہوا۔ اب ہمیں معلوم کرنا چاہیے کہ آگ کس نے لگوائی ہے۔ ڈاکٹر دھیمے سے لہجے میں گویا ہوا۔ پھر یکا یک تیز آواز میں بولا۔ ”بتاؤ میٹ یہ آگ کس نے لگائی ہے......؟“

سوال قطعاً غیر متوقع تھا۔ میٹ گنگ ہو گیا پھر سنبھل کر بولا۔ ”ڈاکٹر معلوم ہوتا ہے اب میں آپ کی نظروں میں قابل اعتماد نہیں رہا۔“ اس کی آواز میں شکایت اور دکھ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔

”ہاں واشنگٹن سے ہمیں تم سے ہوشیار رہنے کی ہدایت ملی ہیں۔“ ڈاکٹر نے کہا۔ ”میں آپ کا وفادار ساتھی ہوں ڈاکٹر۔ میں بے گناہ ہوں۔“ میٹ نے غم آلود آواز میں کہا۔ ”مگر اپنا دعویٰ کیسے ثابت کروں؟“

”بہت آسانی سے ثابت کر سکتے ہو۔“ ڈاکٹر نے جیب سے ماچس کے برابر ایک ڈبیا نکالتے ہوئے کہا۔ ڈبیہ شفاف پلاسٹک کی بنی ہوئی تھی۔ اس میں بیکٹیریا کا بادل بند ہے۔ دیکھ رہے ہو نا۔ اس میں وبائی مچھر بھی موجود ہیں چلو اس کمرے میں اس نے میٹ کو سامنے کمرے کی طرف دھکیل دیا۔ تم اس علاقے میں کوئی خاص حفاظتی تدابیر اختیار کئے بغیر گھومتے رہے ہو مگر تم پر اس وبا نے کوئی اثر نہ کیا۔ اس سے ہمارے شک کو تقویت ملتی ہے۔ چلو اندر...... ڈاکٹر نے کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ میٹ کا رنگ خوف سے سفید پڑ گیا اور جسم کپکپانے لگا۔ مگر ڈاکٹر نے اسے اندر دھکیل کر ڈبیا کو پوری قوت سے فرش پر دے مارا۔ ڈبیہ ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گئی اور ڈاکٹر جلدی سے کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہوا۔ مچھروں کی بھنبھنانے کی آواز میٹ کے کانوں سے ٹکرائی اور خوف سے اس کا دل ڈوبنے لگا پھر جاندار گرد کے بادل نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس نے چیخنا چاہا مگر آواز گلے میں گھٹ گئی۔ پھر ایک مچھر اس کے ہاتھ کی پشت پر بیٹھ گیا اور دوسرا پیشانی پر اس نے اپنی پیشانی پر ہاتھ مارا۔ مگر بہت دیر ہو چکی تھی۔ دونوں مچھروں نے اسے کاٹ لیا تھا۔ اس نے اپنی ہتھیلی کو دیکھا جس پر خون کا دھبہ چمک رہا تھا۔ میٹ کے جسم پر لرزہ شدت اختیار کر گیا اور پالفرے کے لئے اس کے دل میں نفرت کا طوفان موجیں مارنے لگا۔ اس کا جسم اینٹھنے لگا اور گلا دکھنے لگا۔ اتنے میں دروازہ کھلا اور کسی نے کمرے میں اسپرے پمپ سے دوا چھڑکنی شروع کر دی۔

پھر اسے اٹھا کر ڈاکٹر پالفرے کے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ ”گھبراؤ نہیں میٹ......!“ پالفرے نے پر سکون آواز میں کہا۔ ”تم بے گناہ ثابت ہو چکے ہو۔ تمہیں نہیں معلوم اس خوفناک مرض کا علاج دریافت ہو چکا ہے۔“ یہ کہہ کر ڈاکٹر نے میز کی دراز سے ایک ننھی سی شیشی اور سرنج نکالی۔ اس نے سرنج میں دوا بھرتے ہوئے کہا۔

”یہ دوا تمہیں تھوڑی دیر بعد اصل حالت میں لے آئے گی۔ یہ دوا کوئی ایک گھنٹہ قبل اسٹیفن نے فراہم کی تھی۔“ پھر اسے انجکشن لگانے کے بعد بولا۔

”اب تم یہیں آرام کرو۔ میں جلد واپس آؤں گا۔“ اور کمرے سے نکل گیا۔ میٹ نے عالم بے ہوشی میں بھی سکون کا گہرا سانس لیا۔

ڈاکٹر ہوٹل میں گھومنے لگا۔ مہمانوں میں بلیک آؤٹ کی وجہ سے سراسیمگی سی پھیل گئی تھی۔ اور جنگل کی آگ نے جلتی پر تیل کا کام کیا تھا۔ ادھیڑ عمر کے ایک بھاری بھرکم آدمی نے ڈاکٹر سے احتجاج آمیز لہجے میں

شکایت کی کہ اس کی آدمی اسے ہوٹل سے باہر نہیں نکلنے دیتے۔ ڈاکٹر نے معذرت طلب کی اور ہوٹل کا ایک چکر لگا کر اوپر کی منزل پر اپنے کمرے میں آ گیا۔ جارج دو زور آدمیوں کے ساتھ اس کا منتظر تھا۔

”کوئی تازہ خبر جارج؟“ ڈاکٹر نے پوچھا۔

”کابینہ کا اجلاس شروع ہو چکا ہے۔“ جارج نے جواب دیا۔ ”آپ لازمی طور پر لندن پہنچیں۔“

میں اسٹیفن سے بات کروں گا۔ ڈاکٹر نے کہا کوئی اور خبر؟ اموات کا لامتناہی سلسلہ جاری ہے۔ جارج نے کہا۔ شافی علاج تو دریافت ہو چکا ہے لیکن اس کا فائدہ کیا ہو گا۔ مچھروں کی پیدائش کا سلسلہ تو رک نہیں سکے گا۔ آخر دنیا کا حشر کیا ہو گا......؟ ضرورت اس بات کی ہے کہ مچھروں اور گرد کی پیدائش کے راز سے پردہ اٹھایا جائے۔

پھر اس نے ریسیور اٹھا کر ایک نمبر ڈائل کیا۔

”ہیلو اسٹیفن......“ ڈاکٹر بولا۔ ”کیبنٹ روم ہی میں بیٹھے ہو نا......؟“

”جی ہاں......!“ اسٹیفن نے کہا۔ آپ کی شرکت ضروری تھی۔

پھر اس نے ایک بٹن دبایا اور ڈاکٹر کی آواز ایک لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے کیبنٹ روم میں گونجنے لگی۔ ڈاکٹر عملاً اجلاس میں شریک ہو گیا۔

”کیا آپ نے میٹ اسٹون کا محاسبہ کیا ہے ڈاکٹر اسٹیفن نے استفسار کیا۔“ ”ہاں اس پر مچھر اور گرد چھوڑی گئی۔ وہ طاعون میں مبتلا ہو گیا۔ ثابت ہوا کہ وہ بے گناہ ہے۔ ڈاکٹر سرگوشی کے انداز میں بولا۔ پھر با آواز بلند گویا ہوا۔ ”کون فوریسٹ میں شاید رونڈی ویلو کا ہیڈ کوارٹر ہے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس وبا کے بل پر بلیک میلنگ کا سلسلہ شروع کرنے والا ہے۔ ہوٹل کا عملہ بھی مشکوک ہے اس میں مقیم بیشتر افراد وائیڈ ورلڈ فوڈ پلانٹ میں ملازم ہیں۔ ایک ایک سے پوچھ گچھ کی جائے...... کیا منسٹر آف فوڈ اینڈ ایگریکلچرل سپلائیز، مسٹر ڈومنی بھی اجلاس میں شریک ہیں......؟“

”جی ہاں......!“ اسٹیفن نے جواب دیا۔ میٹ کے بارے میں انہی کو پیغام موصول ہوا تھا۔ سنا ہے فوڈ پلانٹ کے تمام اعلیٰ عہدیداروں سے ان کے گہرے تعلقات ہیں۔

یکا یک وزیر اعظم نے فون کا ریسیور اٹھایا۔ ڈاکٹر پالفرے۔ ”لیس سر ہمیں تو معلوم نہیں ہو سکا کہ ان وبائی مچھروں کا سرچشمہ کہاں ہے۔ یوں لگتا ہے کہ یہ کسی اور سیارے سے حملہ آور ہوئے ہیں۔ کیا آپ کو کچھ معلومات حاصل ہوئی ہیں؟“

”جی نہیں۔“ ڈاکٹر نے سرد آواز میں کہا۔ البتہ اتنا معلوم ہوا ہے کہ اب دنیا کا کوئی ملک بھی اس سے محفوظ نہیں رہا۔

یہ خدا کا قہر نازل ہوا ہے۔ یکا یک وزیر زراعت و خوراک ڈومنی بول اٹھا۔ ہمیں ہمارے گناہوں کی سزا مل رہی ہے۔ کیبنٹ روم میں سرگوشیاں گونجنے لگیں۔

مسٹر پرائم منسٹر ڈومنی کی آواز پھر گونجی ہماری سب تدبیریں بیکار ثابت ہوئیں۔ اب گڑگڑا کر دعائیں مانگنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ دعا کرو ممکن ہے خدا کا رحم و کرم جوش میں آ جائے۔ پھر وہ قدرے متوقف ہو کر بولا۔

مجھے دنیا بھر کو آگاہ کرنے کا اختیار دیا گیا ہے کہ اس قہر خداوندی کو روکا جا سکتا ہے بشرطیکہ ہماری حکومت اور دنیا کی تمام حکومتیں ایک شرط مان لیں۔

ہال میں سناٹا چھا گیا۔ اور سب کی نگاہیں ڈومنی کے چہرے پر مرکوز ہو گئیں۔ اوہ میرے خدا ایک وزیر بے اختیار پکار اٹھا۔ سن رہے ہو ڈاکٹر......! اسٹیفن نے ماؤتھ پیس میں کہا۔

ہاں...... ہاں......! ڈاکٹر ہیجان آواز میں بولا۔

صرف ایک شرط......! ڈومنی اٹھ کھڑا ہوا۔ صرف ایک شرط...... اس نے ایک انگلی کھڑی کی۔ معمولی پستول سے لے کر ایٹم بم تک تمام اسلحہ تلف کر دیا جائے۔

ہال میں مرگ سکوت طاری ہو گیا۔ ان تباہ کن ہتھیاروں کے تلاف سے دنیا میں سکون و امن قائم ہو جائے گا اور انسان تعمیری کام میں مصروف ہو جائے گا۔ زرا ٹھنڈے دل سے سوچئے جب تمام جنگی جہاز، طیارے،

توپیں، میزائل، راکٹ، رائفلیں، بارود، گاڑیاں وغیرہ تباہ ہوجائیں گی تو انسان کی روح سے خوف کا بے پایاں بوجھ ٹل جائے گا اور وہ اپنی صلاحیتوں کو لڑنے بھڑنے کی بجائے تعمیری کاموں میں صرف کرے گا۔ میں اس سلسلے میں کوئی معاہدہ کرنے کے لئے تمام دنیا کی حکومتوں کو پر امن مذاکرات کی دعوت دیتا ہوں۔ ڈومنی نے تقریر روک کر طائرانہ نگاہوں سے ماحول کا جائزہ لیا۔

ڈاکٹر ڈومنی الٹی میٹم دے رہا ہے۔ اسٹیفن ماؤتھ پیس میں بڑبڑایا۔ فوری طور پر آدمی بھیجے تاکہ اسے گرفتار کر لیا جائے۔

تم اپنا وقت ضائع کررہے ہو۔ ڈومنی اسٹیفن سے مخاطب ہوکر بولا۔ ڈاکٹر پالفرے اور تمہارے دوسرے ساتھی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ میں فورسٹ ہوٹل لندن اور دنیا بھر میں ان کے لئے ٹھوس حفاظتی انتظامات کرچکا ہوں۔ میں جانتا ہوں تم دنیا کے مایہ ناز عظیم سائنسدان روونڈی ویلیو کی تلاش میں سرگرداں ہو۔ پھر اس کی آواز پہلے سے بھی بلند ہوگئی۔ مسٹر پرائم منسٹر میں آپ سے التماس کرتا ہوں کہ آپ دنیا کی تمام حکومتوں کو میرا پیغام پہنچادیں۔ اور میں دنیا کو متنبہ کرتا ہوں کہ اگر مجھے کوئی ضرر پہنچانے کی کوشش کی گئی تو اس کی بھاری قیمت ادا کرنی پڑے گی کیونکہ میں عظیم سائنسدان روونڈی ویلیو کا واحد نمائندہ ہوں۔

پھر وہ وزیراعظم کے چہرے پر نگاہیں گاڑ کر بولا۔ اگر دنیا والوں نے میری بات مان لی تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ اسی لمحے طاعون پر قابو پالیا جائے گا۔ کیونکہ ہم نے دنیا بھر میں اسے فوری طور پر کنٹرول کرنے کے انتظامات کر رکھے ہیں ہاں...... تو کیا خیال ہے مسٹر پرائم منسٹر......؟

پالفرے نے بوکھلا کر ریسیور کریڈل پر پٹخا۔ کمرے میں موجود افراد چونک اٹھے۔ کیا ہوا ڈاکٹر......؟ جارج نے بڑے تشویشناک لہجے میں پوچھا۔ ڈاکٹر کی بوکھلاہٹ ان سب کے لئے ایک انہونی چیز تھی۔

ڈاکٹر نے نپے تلے لفظوں میں انہیں حقیقت حال سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اس سے پیشتر کہ وہ ہم پر غالب آجائیں ہمیں حرکت میں آجانا چاہیے۔ اس نے ہمیں عملاً ناکارہ کرنے کے انتظامات کر رکھے ہیں۔ تو پھر کیوں نہ ہم فوری طور پر منتشر ہوجائیں......؟“

”ٹھہرو......!“ ڈاکٹر نے کہا اور پیشانی کو انگلی سے کھٹکھٹا کر سوچ میں ڈوب گیا۔ یکایک دروازہ کھلا اور سارک بوکھلایا ہوا اندر داخل ہوا۔

ہوٹل کا عملہ ہمارے آدمیوں کو غیر مسلح کررہا ہے سر۔ وہ چیخا۔

سب ایک دم اٹھ کھڑے ہوگئے۔ اور پھر ان کے گرد مچھر منڈلانے لگے۔ گرد کے چند بادل بھی کمرے میں موجود تھے سب وحشیانہ انداز میں ہاتھ لہرا لہرا کر مچھروں کو دور ہٹانے کی کوشش کرنے لگے۔

رومال سے منہ ڈھانپ لو۔ جارج نے پیشانی پر بیٹھے مچھر کو ایک ہی ضرب میں ہلاک کرتے ہوئے کہا۔ اس گرد میں براہ راست سانس مت لو۔ پھر وہ بھاگتے ہوئے راہداری میں نکل آئے۔

تم بچ نہ سکو گے پالفرے...... ایک بھاری آواز ابھری وہی لحیم شحیم آدمی ان کا راستہ روکے کھڑا تھا جس نے ڈاکٹر سے احتجاج کیا تھا کہ اس کے آدمی اسے باہر نہیں نکلنے دیتے۔ ہوٹل کا تمام عملہ محفوظ رہا گا کیونکہ انہیں حفاظتی دوا کھلا دی گئی ہے۔ مگر تمہارے آدمی دیکھتے ہی دیکھتے گونگے اور مفلوج ہوجائیں گے۔

جارج نے آٹومیٹک گن نکالی اور اس پر پے در پے تین فائر کئے۔ وہ وہیں ڈھیر ہوگیا۔ پھر یہ سب راہداری میں ایک طرف ہوگئے۔ ڈاکٹر پالفرے کے رخسار پر ایک مچھر بیٹھا۔ پھر اس نے ڈنک مارا۔ ڈاکٹر کا گلا جلنے لگا۔ سارک جارج اور دوسرے ساتھی بری طرح کھانسنے لگے۔

تم میں سے کوئی باہر نہیں نکل سکے گا۔ ایک آواز گونجی۔ ہتھیار پھینک دو۔ آدمی نوجوان تھا اور ابھی ان سے کوئی پانچ گز کے فاصلے پر تھا۔ ڈاکٹر نے گن جیب سے نکال کر زمین پر ڈالی اور ساتھیوں سے گھٹی گھٹی آواز میں مخاطب ہوا۔

ہم انہیں جل دیں گے۔ میں فرسٹ ایڈ کے کمرے میں پہنچتا ہوں۔ تم سب ایک ایک کرکے میرے پاس

پہنچو۔ میں صرف پانچ منٹ تک تمہارا انتظار کروں گا۔ اتنے میں نوجوان ان کے قریب آگیا۔ اور تلخ لہجے میں بولا۔

جی تو چاہتا ہے تم سب کو ذبح کردوں۔ ہرچند کہ تم عملاً موت کے منہ میں ہو۔ تھوڑی دیر بعد خود بخود جہنم رسید ہوجاؤ گے۔ بس زیادہ سے زیادہ آدھے گھنٹے بعد مفلوج ہوجاؤ گے۔ پھر ایک دم گھٹنے کے بل اس موٹے آدمی کے قریب بیٹھ گیا۔ جو مرچکا تھا۔

اسمتھ اسمتھ تم بے وقت ساتھ چھوڑ گئے ہو۔

نوجوان نے افسردہ آواز میں کہا۔ ہاں یہ موٹا اسمتھ تھا وہی اسمتھ جس نے ڈاکٹر کورین اور ڈاکٹر ڈیسوک کو مروایا تھا۔ مفلوج ہونے سے پہلے اسے اٹھا کر اس کے کمرے میں پہنچاؤ۔ نوجوان نے ڈاکٹر اور اس کے ساتھیوں کو حکم دیا۔

اچھا ڈاکٹر نے کہا عین اسی لمحے اس کی پنڈلی میں سوئی سی چبھی۔ آگے بڑھو۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا اور خود لاش کو اٹھانے کے لئے جھکا۔ مگر جھکنے کے دوران اس کا ایک ہاتھ بجلی کے کوندے کی طرح لپکا اور نوجوان کے گن والے ہاتھ پر گرا۔ گن ہاتھ سے فرش پر گری۔ سارک نے چیتے کی سی پھرتی سے اس کا گلا اپنے آہنی پنجوں میں دبوچ لیا۔ اور اسے ڈھیر کردیا۔ راہداری میں ان کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ سب نے اپنے ہتھیاروں پر دوبارہ قبضہ کرلیا۔

گنیں چھپالو اور میرے پیچھے آؤ۔ جلدی۔ ڈاکٹر نے جلدی سے کہا۔ وہ ہال میں پہنچے تو وہاں خوبصورت اور جوان لڑکیاں دکھائی دیں جو سیڑھیوں پر کھڑے پالفرے کے ایک آدمی پر پھبتیاں کس رہی تھیں۔

گھڑی بھر کی دیر ہے گونگے ہوجاؤ گے۔ گوبر بن جاؤ گے۔ ہاہا...... ہاہا...... ان کے مترنم قہقہے گونجے۔ آدمی کے ماتھے پر دو مچھر بیٹھے ہوئے تھے۔

تم ٹھیک ہوجاؤ گے سام! ڈاکٹر نے اپنے ساتھی کو تسلی دی۔ ہاں ہاں ٹھیک ہوجاؤ گے ایک لڑکی ہنسی کیا تم نہیں جانتے ڈاکٹر کہ اس کی پیشانی پر کئی مچھروں نے کاٹا ہے؟ سیڑھیوں پر ایک اور آدمی کھڑا مسکرا رہا تھا۔ وہ ڈاکٹر سے بولا۔

”کہاں جارہے ہو ڈاکٹر......؟“

[illegible] بار ہا ہوں۔ میں باہر کھلی فضا میں مرنا چاہتا ہوں [illegible] سے بولا راستہ چھوڑ دو۔ باہر نہیں نکل سکو گے [illegible] آدمی ہنسا۔ صرف دس منٹ باقی ہیں۔ تمہیں [illegible] نے کی مہلت بھی نہیں ملے گی۔ پھر وہ را[illegible] گیا۔

[illegible] سٹ ایڈ روم کی طرف بھاگا۔ دوسرے بھی اس کے [illegible] بھاگے۔ فرسٹ ایڈ روم کا دروازہ کھولا تو میٹ اسٹون اچھل کر صوفے سے فرش پر [illegible] یا وہ صحیح سلامت تھا۔ انجکشن نے اس پر معجزہ نما اثر کیا تھا۔

ڈاکٹر نے جلدی سے اپنے اور دونوں ساتھیوں کو انجکشن لگائے۔ اور رندھی ہوئی آواز میں میٹ سے مخاطب ہوا۔

تم جلدی سے ہیلی کاپٹر کے پاس پہنچو۔ ہم تمہارے پیچھے آتے ہیں۔ میٹ راہداری سے نکل کر باہر آیا تو دو آدمی اس کی طرف بڑھے۔ ہوا میں کھلی فضا میں۔ ڈاکٹر بڑبڑایا ہاہا...... ہاہا آدمیوں نے قہقہہ لگایا۔ جاؤ باہر کھلی ہوا میں۔

اور وہ راستے سے ہٹ گئے۔ میٹ نے آنکھ بچا کر ایک آدمی کے سر میں ریوالور کے دستے کی ضرب لگائی۔ وہ وہیں ڈھیر ہوگیا۔ دوسرے پر سارک وحشی کتے کی طرح جھپٹا اور اسے بے بس کررکھ دیا۔

سارک یہ دوا اور سرنج لو۔ پالفرے نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اور یہیں ٹھہرو اپنا کوئی آدمی متاثر نظر آئے تو اسے انجکشن لگاؤ۔

چند لمحے بعد ہیلی کاپٹر کی گڑگڑاہٹ سے فضا گونج اٹھی اور دیکھتے ہی دیکھتے ہیلی کاپٹر پانچ سو فٹ کی بلندی تک جا پہنچا وہ وائیڈ ورلڈ فوڈ پلانٹ کے اوپر سے گزرے۔ نائٹ شفٹ میں کام ہورہا تھا۔ میٹ نے پالفرے کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھا۔ مگر ڈاکٹر کے ہونٹ ہل رہے تھے اور وہ آواز سے محروم ہوکر مفلوج ہوچکا تھا۔ دوا ابھی اثر انداز نہیں ہوئی تھی۔ البتہ اس نے نیچے پلانٹ کی طرف اشارہ کرکے اثبات میں سر ہلایا۔ میٹ

الجھ کر رہ گیا۔ نہ جانے ڈاکٹر کیا کہنا چاہتا تھا۔ اس نے پلانٹ کی طرف اشارہ کیوں کیا تھا۔ آخر وہ لندن میں جا اترے۔ مگر میٹ کے سوا سب کی حالت ابتر تھی۔

ایسا لگتا تھا جیسے انجکشن نے ان پر اثر نہیں کیا تھا۔

وائیڈ ورلڈ فوڈ پلانٹ کی وسیع عمارت اور وسیع وعریض احاطہ چکا چوند روشنیوں سے منور تھا۔ آج شام اسپیشل ورک کے لئے نائٹ شفٹ بلائی گئی تھی۔ مگر صرف منجمد خوراک اور سر بمہر ڈبوں کی پیکنگ پر تمام تر توجہ دی جارہی تھی۔ اس کے سوا عملی طور پر کوئی اور چیز باہر نہیں بھیجی جارہی تھی۔ اسپیشل ریل گاڑیاں طلب کر لی گئی تھیں۔ اور سینکڑوں مزدور ویگنوں میں ڈبے لاد رہے تھے۔ کارپوریشن کی لینڈنگ فیلڈ میں ہوائی جہاز تیار کھڑے تھے جن میں فروزن فوڈ کے ڈبے لادے جارہے تھے تاکہ شمالی علاقوں اسکاٹ لینڈ آئیر لینڈ اور مغربی یورپ کو سپلائی کئے جاسکیں۔

آفس بلڈنگ پلانٹ کے وسط میں واقع تھا۔ وسیع دفاتر میں سے صرف منیجر ڈائریکٹر کا کمرہ آباد تھا۔ جس کی کھڑکیوں سے روشنی باہر کی طرف چھن رہی تھی۔ اس کمرے میں صرف چار افراد تھے۔ تین مرد اور ایک لڑکی۔

لڑکی کی عمر بیس سال سے زیادہ معلوم نہیں ہوتی تھی۔ اگر اسے پالفرے کے آدمی دیکھ لیتے تو انہیں پہچاننے میں دیر نہ لگتی کہ یہ مورین اوشیا ہے جو آسٹریلوی سائنسدان کے ساتھ ہی کہیں روپوش ہوگئی تھی۔ وہ تینوں مردوں میں سے ہولناک حد تک موٹے آدمی کے پہلو میں بیٹھی تھی۔ موٹے کا سر لمبا تھا اور پیشانی غیر معمولی طور پر تنگ۔ اگر اس کی پیشانی ایسی نہ ہوتی تو وہ دیکھنے میں ایک عظیم دانشور معلوم ہوتا تھا۔ تینوں آدمیوں کے سامنے ٹیلیفون رکھے تھے۔ جن میں سے دو فون پر بات کررہے تھے۔ ایک عرب زبان میں اور دوسرا رواں ہنگرین میں لڑکی فل اسکیپ کاغذوں پر اندراجات کے ایک جانب نمبر لکھنے میں منہمک تھی۔ وہ کچھ مضطرب دکھائی دیتی تھی۔ اور گاہے گاہے موٹے آدمی کی طرف دیکھ لیتی تھی۔

اس میں کتنا وقت لگے گا؟ اس نے موٹے سے پوچھا۔ اب تو میں بے چین ہوتی جارہی ہوں مسٹر رونڈی ویلو۔ یہ مت پوچھو مائی ڈیر۔ رونڈی نے جواب دیا۔ ہمیں زیادہ سے زیادہ وقت درکار ہے۔ وہ دنیا کے ایک نقشے کا بغور مطالعہ کررہا تھا۔ جو اس کے مقابل ایک بورڈ پر چسپاں تھا۔ اور دائیں بائیں پھیلے کاغذات کو دیکھنے کے بعد نقشے پر مختلف جگہوں پر سرخ پنسل سے نشان لگاتا جاتا تھا۔ دوسرے دونوں آدمی دنیا کی تمام زبانوں میں باتیں کر رہے تھے۔ اب وہ اسپینش اور سویڈش بول رہے تھے۔ انہیں تمام زبانوں پر حیرت انگیز عبور حاصل تھا۔

لیس کینیڈا...... بس...... ایک آدمی نے سلجھی ہوئی انگریزی میں بولنا شروع کیا۔ سپلائی آپ کی جانب روانہ کی جانے والی ہے۔ بس تھوڑی دیر کی بات ہے۔ اس بار خاص قسم کے مشروب بھیجی جارہی ہے۔ آپ پسند کریں گے اس کا لہجہ بہت گھمبیر تھا۔ آپریشن کے کل شام کو شروع ہونے کا امکان ہے۔ اوٹاوا وانی پیگ اور وینکور سے آغاز ہوگا۔ نہیں کسی اور مقام سے ہرگز نہیں۔ جب تک اس سلسلے میں تمہیں ہدایت نامہ ملیں۔ پھر اس نے سلسلہ منقطع کیا اور ایک نمبر ڈائل کرنے کے بعد چینی زبان میں بولنا شروع کردیا۔

کیا آج شام کو کھانا نہیں کھاؤ گے؟ لڑکی نے اچانک سر اٹھا کے موٹے سے کہا۔ ”کھانا؟“ ہاں ہاں کیوں نہیں کچھ کھاؤں گا۔ موٹے نے اپنی پیشانی سہلاتے ہوئے کہا۔ مگر تم میرے بارے میں اتنی فکر مند کیوں ہورہی ہو میری جان۔ میں تو اس سے بھی کہیں سخت اور نامساعد حالات سے گذرا ہوں۔ اب ہم کامیابی کے مرحلے میں داخل ہوچکے ہیں۔ بس اب فتح وکامرانی ہم سے چند قدم کے فاصلے پر ہیں۔

مجھے شبہ ہے کہ ہم نے وقت کا تعین کرنے میں احتیاط سے کام نہیں لیا۔ لڑکی نے تشویش آمیز لہجے میں کہا۔ کہیں ایسا نہ ہو کے کرائے پر...... اوں ہوں۔ بدفال منہ سے نہ نکالو ڈارلنگ۔ موٹے نے لڑکی کی بات کاٹ دی۔ ”سب ٹھیک ہوگا۔ وہ مجھے کبھی نہ ڈھونڈ سکیں گے اور جب میں ان کے سامنے آؤں گا تو دنیا کی ہر طاقت میرے سامنے سرنگوں ہوجائے گی۔“

”کیا تمہیں یقین ہے کہ پوری دنیا ہمارے

سامنے ہتھیار ڈال دے گی۔“

”ہاں...... ہاں...... بے شک...... اس کے سوا دنیا والے کر بھی کیا سکتے ہیں۔“ اس کا گوشت آلودہ چہرہ بھیانک مسکراہٹ سے چمک اٹھا۔ ”یا تو وہ تمام اسلحہ تباہ کر دیں گے ورنہ انہیں طاعون نیست ونابود کرنا شروع کر دے گا۔ پوری دنیا میں طاعون جنگل کی آگ کی مانند پھیلے گا۔ اگر حکومتیں ہمارا مطالبہ ماننے سے گریز کریں گی تو عوام کا دباؤ ان پر بڑھ جائے گا۔ مثلاً اسی ملک کو لو۔ یہاں ریڈیو اخبارات پر یہ پابندی لگادی گئی ہے کہ موجودہ بحران کے بارے میں کوئی خبر نہ دیں۔ مگر ہم اپنے ریڈیو کے ذریعے ان کی چال ناکام بنادیں گے۔ ہم عوام کو بتائیں گے کہ اگر ہماری شرائط مان لی جائیں تو طاعون پر فی الفور قابو پایا جاسکتا ہے۔ اس وقت دنیا کے گوشے گوشے میں خوف وہراس پھیلا ہوا ہے۔ عوام ہماری پیش کش کو فوراً قبول کرکے اپنی حکومتوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے۔ اب ڈومنی ہمیں خوشخبری سنانے ہی والا ہوگا۔“

”وہ اسے کہیں گرفتار ہی نہ کرلیں......؟“ اوشیا نے اندیشہ ظاہر کیا۔ ٹیلیفون کرتے والے آدمیوں نے آپس میں معنی خیز نگاہوں کا تبادلہ کیا جیسے یہی خدشہ ان کے ذہن پر بھی سوار ہو۔

”یہ نہیں ہوسکتا......“ رونڈی نے تلخی سے کہا۔ ”تم اپنا دماغ کیوں نہیں استعمال کرتیں مورین؟ وہ اسے آزاد چھوڑ دیں گے تاکہ وہ اس کے ذریعے ہم تک پہنچ سکیں۔ وہ ان کی آخری امید ہے۔“ رونڈی نے ایک بھیانک قہقہہ لگایا۔ ”وہ ہم سے ریڈیو پر رابطہ قائم کرے گا اور حکومت ہمارا سراغ نہیں لگا سکے گی۔ ڈاکٹر پالفرے کے آدمی فورسٹ ہوٹل میں مفلوج ہوچکے ہیں۔ اور تمام دنیا کو الٹی میٹم موصول ہوچکا ہے۔ دنیا کو ہتھیار ڈالنے پڑیں گے۔“

پھر وہ غصے سے گرجا۔ ”اگر انہوں نے تاخیر کا مظاہرہ کیا تو میں اپنے لندن ایجنٹ کو اشارہ کردوں گا۔ وہ حرکت میں آجائے گا۔ وبائی خوراک کی بہت بڑی سپلائی اس وقت کنونٹ گارڈن میں موجود ہے۔ کل صبح کی تمام خوراک پھل سبزیاں اور فروزن فوڈ بیکٹیریا سے متاثر ہو

جائیں گے۔ جونہی ڈبے کھلیں گے انہیں سورج کی حرا[...]
ملے گی۔ بیکٹیریا پیدا ہو کر اڑنے لگیں گے اور پورا لن[...]
دیکھتے ہی دیکھتے گونگے طاعون کی لپیٹ میں آجا[...]
گا...... آہا...... کیسا معجزہ ہے؟“

”تو لندن سے ہی آغاز کرنے کا عزم ہے[...]
مورین نے پوچھا۔ ”بے شک“ رونڈی نے فیصلہ کن [...]
میں کہا۔ ”لندن کا حشر دیکھ کر دنیا بھر کی حکومتیں متزلزل [...]
جائیں گی۔“

رونڈی نے قہقہے لگانا شروع کر دیئے۔ پھر [...]
سنبھل کر بولا۔ ”دنیا بھر کے ہتھیار تباہ کر دیئے گئے تو [...]
بھر میں ہماری مسلح افواج حرکت میں آجائیں گی۔ تم[...]
دنیا ہمارے قبضے میں ہوگی۔ سائنسدان، دانشور، تباہ [...]
دیئے جائیں گے۔ اور ہم دنیا بھر کے مطلق العنان حکمرا[...]
ہوں گے...... ہاہاہا......“

یکا یک سامنے ریڈیو کے اسپیکر سے ایک آو[...]
ابھری۔ ”ہیلو...... جونو اسپیکنگ، اطلاع دی جاتی ہے [...]
ڈاکٹر پالفرے اپنے تین آدمیوں سمیت، فورسٹ ہوٹل [...]
سے فرار ہوگیا۔ وہ تینوں طاعون کا شکار ہوگئے۔ مگر ڈاک[...]
پالفرے نے اپنے آدمیوں اور خود کو ایک دوا انجیکٹ [...]
تھی۔ معلوم ہوتا ہے انہوں نے علاج دریافت کرلیا ہے[...]
پیغام ختم۔ ہدایت کا منتظر جونو۔“

رونڈی ویلو کا رنگ فق ہوچکا تھا۔ اور اس کی تنگ [...]
پیشانی پر پسینے کے قطرے چمکنے لگے تھے۔ اس نے کیبنٹ [...]
سے لگا مائیکروفون دبوچا۔ اور بولا۔ ”وہ کدھر گئے ہیں؟“

”اورسٹن اور ونچسٹر کی طرف۔“ جواب ملا۔

کوئی بیس منٹ پہلے کی بات ہے وہ ہیلی کاپٹر میں [...]
فرار ہوئے تھے۔“ رونڈی ویلو نے جلدی سے مائیکروفون [...]
ہک سے لٹکایا اور گھبرائی ہوئی آواز میں بولا۔

”ہمیں اس ہیلی کاپٹر کو تلاش کرکے فوری طور پر [...]
تباہ کرنا پڑے گا۔ نیکی...... گائیڈڈ میزائلوں سے مسلح د[...]
لڑاکا طیارے فوراً ہیلی کاپٹر کی تلاش میں بھیجو۔ ہیلی کاپٹر [...]
بچنے نہ پائے۔“

ڈاکٹر پالفرے کا ہیلی کاپٹر مصروف ترین شاہراہ[...]

کے قریب اترا تھا۔ اسے سینکڑوں لوگوں نے گھیر لیا۔ ایک پولیس افسر وارد ہوا۔ ”ہیلی کاپٹر اتارنے کی یہ کون سی جگہ تھی جناب؟“

ڈاکٹر پالفرے نے پوری قوت ارادی صرف کرتے ہوئے اٹک اٹک کر کہا۔ ”سی ایس ایس کے لئے مدد طلب کرو...... فون کو اورسٹن کی جانب...... کے تمام...... راستے...... بند کر دیئے اوہ مجھے...... جلد...... قریبی ملٹری اتھارٹی کے پاس پہنچادو۔“

پولیس افسر کو معاملے کی سنگینی کا احساس ہوا۔ اور جب اس نے ڈاکٹر کا کارڈ دیکھا تو گھبرا گیا۔ ڈاکٹر پالفرے چند منٹ بعد انہیں پولیس کی گاڑی میں جی حکام کی طرف روانہ کر دیا گیا۔

ہیلی کاپٹر کے گرد لوگوں کا ہجوم بڑھتا جا رہا تھا۔ یکا یک جیٹ طیاروں کی آواز سے آسمان میں گڑگڑاہٹ پیدا ہوئی۔ پھر ایک تیز چمک نظر آئی اور اس کے ساتھ ہی سر سراہٹ گونجی اور اسی لمحے ایک خوفناک دھماکا ہوا اور ہیلی کاپٹر کے پرخچے اڑ گئے۔ چاروں طرف آگ کے شعلے پھیل گئے اور ہجوم نیست و نابود ہو گیا۔ ایک فرد بھی زندہ نہ بچا۔

ڈاکٹر پالفرے ملٹری ہیڈ کوارٹر میں سی او سے بات چیت کر رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وبائی مچھروں کے بادل نمودار ہونا شروع ہوئے اور ہر طرف خوف و ہراس پھیل گیا۔ سی، او کو بھی مچھروں نے کاٹا اور وہ مفلوج ہو گیا مگر اس نے ڈاکٹر پالفرے کو اختیار تفویض کر دیئے اور ڈاکٹر نے فوڈ پلانٹ پر حملہ کرنے کے لئے مسلح نقاب پوش نوجوان کا ایک دستہ تیار کیا۔ اور ساتھ ہی ایئر فورس اور ٹینک فورس کو پلانٹ کا رخ کرنے کی ہدایت کی۔

لارنس کارپورل پلٹ کر سرکردگی میں وہ ریلوے لائن کے راستے پلانٹ میں داخل ہو گئے۔ ان کی گاڑی پر گولیوں کی باڑھ ماری گئی۔ مگر کوئی جانی نقصان نہیں ہوا اور پوری کمپنی تیزی سے پلانٹ کے مرکز کی طرف بھاگنے لگی۔

”ہوشیار رہنا آفیسر......“ ڈاکٹر پالفرے نے کہا۔

”یہاں، ورکروں کی فوج موجود ہے۔ فکر نہ کریں۔“ پلٹ نے بھاگتے بھاگتے کہا۔ ”اور کوئی خاص ہدایت سر؟“

”بس دفتر تک پہنچنے کی کوشش کرو۔“ ڈاکٹر نے جلدی سے کہا۔ وہ اور آگے بڑھے تو پلانٹ کے ہوائی اڈے پر ہوائی جہازوں کے انجنوں کی گڑگڑاہٹ گونجنے لگی۔

وہ دفتر کے قریب پہنچے تو تین مسلح آدمیوں سے سامنا ہوا جنہیں پلک جھپکتے میں بھون دیا گیا۔ پھر ڈاکٹر نے اپنے بیشتر آدمیوں کو مختلف سمتوں میں پھیلا دیا۔ اور تین سپاہیوں و پلٹ اور میٹ اسٹون سمیت ڈاکٹر دفتر کی طرف متوجہ ہوا۔

”کس دروازے سے جناب؟“ پلٹ نے پالفرے سے پوچھا۔ ابھی پالفرے کوئی جواب نہ دے پایا تھا کہ نامی گنوں سے مسلح چار آدمیوں نے ان کا راستہ روک لیا۔ مگر پلٹ کے ایک ہینڈ گرینیڈ نے ان کا صفایا کر دیا۔ ڈاکٹر ایک زخمی پر جھکا۔

”بتاؤ رونڈی اور وہ لڑکی کہاں ہیں؟“

”نہیں...... نہیں......“ زخمی کراہا۔ ”بتاؤ...... ورنہ......“

”تیسرے فلور پر......!“ نہ جانے زخمی کیوں بک پڑا۔ تیسرے فلور پر مکمل خاموشی تھی۔ لفٹ سے نکلتے ہی ان کی نظر راہداری میں ایک کمرے پر لگی تختی پر پڑی جس پر لکھا تھا۔ ڈائریکٹرز! وہ اس کمرے کی جانب بڑھے۔

انہوں نے سپاہیوں کو دروازے پر چھوڑا۔ اور پلٹ نے دروازہ کھولا یہ ایک کشادہ اور طویل راہداری تھی۔ ایک دیوار میں بہت سے دروازے نظر آ رہے تھے جن پر تختیاں لٹک رہی تھیں چیئر مین سیکریٹری بورڈ روم، آپریشن روم وغیرہ۔

وہ باری باری دروازے کھول کر اندر جھانکتے رہے سب کمرے خالی تھے۔ یہاں تک کہ انہوں نے آپریشن روم کا دروازہ کھولا۔ ایک آواز سنائی دی۔

”ہم نے انہیں وارننگ دی ہے۔ اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ کہا جاتا۔ اب ہم پر کوئی الزام نہیں آتا...... سمجھے......؟“

پلٹ پیچھے ہٹ گیا۔ اور ڈاکٹر پالفرے آگے بڑھا۔ میٹ اسٹون اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ تین آدمی ایک کیبنٹ

کے سامنے کھڑے تھے۔ ایک لڑکی دکھائی دے رہی تھی۔ ان کی پشت دروازے کی طرف تھی۔ لڑکی کے بالوں کی رنگت اور قد و قامت سے میٹ نے اندازہ لگایا کہ یہ تھلین اوشیا سے ملتی جلتی ہے۔ یقیناً یہ مورین اوشیا ہوگی۔

دونوں آدمی رونڈی ویلو کو دیکھ رہے تھے۔ لڑکی اس سے دو گز دور کھڑی تھی۔ اور بڑے غصے میں کہہ رہی تھی۔ ”تم نے تو کہا تھا کہ کسی کو ضرر نہیں پہنچایا جائے گا۔“

”اور اب تک تم ہزاروں افراد کی جان لے چکے ہو۔ یہ سب کیا ہے۔ تم تو شیطان سے بھی بدتر نکلے۔“ اس کے ساتھ ہی وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔

”تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔“ رونڈی ویلو گرجا۔ ”انہوں نے بری اور ہوائی فوج ہم پر مسلط کیوں کی......؟ میں انہیں عبرتناک سزا دوں گا۔ انہوں نے ہمارے ٹرک گاڑیاں اور تمام ٹرانسپورٹ کو معطل کر کے مختلف اسٹورز اپنے قبضے میں لے لئے ہیں...... مجھے جوابی کارروائی سے مت روکو۔ میں نے انہیں وارننگ دی تھی کہ اگر انہوں نے میری پیشکش ٹھکرا دی تو میں تمام مسلح افواج کو تباہ کر دوں گا۔ چنانچہ میں نے کارروائی شروع کر دی۔ اب مجھے کوئی نہیں روک سکتا۔ فتح کی دیوی ہمارے قدم چومنے والی ہے۔ سن رہی ہو؟ چند گھنٹے بعد تم دنیا بھر کی ملکہ کہلاؤ گی۔“

”میں ملکہ نہیں بننا چاہتی۔“ مورین چلائی۔ ”صرف تمہاری لاش خاک و خون میں تڑپتی دیکھنا چاہتی ہوں۔“ یہ سن کر رونڈی اس پر جھپٹا۔

”خبردار۔“ لارنس کارپول پلٹ گرجا اور اس نے ڈاکٹر کے پیچھے کمرے میں داخل ہو کر اپنی مشین گن سے کمرے میں موجود افراد کو نشانے پر لے لیا۔ رونڈی ویلو کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔ اور آنکھیں خوف و دہشت سے پھٹ گئیں۔ وہ بے اختیار پیچھے ہٹا ”ہینڈز اپ......“ پلٹ چیخا۔

رونڈی ویلو اور اس کے مرد ساتھیوں نے ہاتھ اوپر اٹھائے پلٹ پالفرے کی طرف دیکھا وہ مسکرا رہا تھا۔

”آپ فاتح ہیں ڈاکٹر۔“ پلٹ بولا میٹ اسٹون حیرت سے لڑکی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ بے انتہا خوبصورت تھی۔ وہ اپنی چھوٹی بہن کیتھلین سے بھی بے حد مشابہ تھی۔ لڑکی نے ڈاکٹر پالفرے کی طرف بڑی اپنائیت سے دیکھا۔ اور اس وقت تو میٹ اسٹون کی دنیا زیر و زبر ہو گئی جب اس نے سنا لڑکی ڈاکٹر پالفرے سے کہہ رہی تھی۔

”ڈاکٹر خدا کا شکر ہے کہ آپ عین موقع پر آ گئے ورنہ آج دنیا تباہ ہو جاتی۔“ میٹ کو اپنے کانوں پر یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ ”آل رائٹ مورین......“ ڈاکٹر بولا۔ ”اب آرام سے بیٹھ جاؤ۔ اور میٹ تمہیں لڑکی کے بارے میں اتنا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔“ ڈاکٹر نپے تلے قدموں سے رونڈی ویلو کی طرف بڑھنے لگا۔ دروازے پر کھڑے فوجیوں نے ان پر مشین گنیں تان رکھی تھیں۔ اس ہولناک ڈرامے کے دو مرکزی کرداروں کو سب لوگ دم سادھے دیکھ رہے تھے۔

مورین اور میٹ انہیں کچھ اس انداز میں دیکھ رہے تھے جیسے چند ثانیے بعد جو کچھ ہونے والا ہے دنیا کے مستقبل کا انحصار اسی پر ہے۔

”اگر اس تباہی و غارتگری کو روکنے کا کوئی موثر طریقہ تم جانتے ہو تو مجھے بتاؤ......“ ڈاکٹر کی پرسکون مگر بارعب آواز ابھری۔ ”کوئی انجکشن یا کوئی ایسا طریقہ جس سے پوری دنیا میں طاعون پر فوری قابو پایا جا سکتے۔ اگر تم نے انکار کیا تو ابھی گولی سے تمہارا بھیجہ پاش پاش کر دوں گا۔“

”میرے قریب مت آؤ۔“ رونڈی ویلو چیخا۔ ”اس وبا کا کوئی علاج نہیں۔ اگر تم نے مجھے کوئی ضرر پہنچایا تو کل تک پوری دنیا کا صفایا ہو جائے گا۔ جراثیمی خوراک دنیا بھر میں پھیل چکی ہے۔ میں نے تمام دنیا کے ایجنٹوں کو خوراک کی فروخت کے احکامات دے دیئے ہیں۔ بس ڈبے کھلنے کی دیر ہے۔ بیکٹیریا کے بادل اور وبائی مچھر پوری دنیا پر چھا جائیں گے۔ پھر کوئی زندہ نہ رہے گا۔ مجھے ہاتھ نہ لگاؤ۔ سمجھے؟“ پالفرے میں واحد انسان ہوں جو احکامات واپس لے سکتا ہے۔ اگر تم نے مجھے ہاتھ لگایا تو دنیا کی تباہی کے ذمہ دار تم ہو گے۔ مجھ سے دور ہٹ جاؤ۔“ اس کے ساتھ ہی وہ چند قدم پیچھے ہٹا۔

ڈاکٹر! مورین کی آواز گونجی۔ ”اس کیبنٹ میں

ایجنٹوں کی فہرستیں موجود ہیں۔ آپ ان کی مدد سے انہیں خوراک کی فروخت سے روک سکتے ہیں۔" یہ سنتے ہی رونڈی ویلیو بے اختیار مورین کی طرف لپکا۔

مگر مورین نے ایک اور کیبنٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اس کیبنٹ میں تریاق موجود ہے۔ اس وبائی بیماری کا انسدادی نسخہ اسی نے مجھے بتایا تھا۔ مگر دکھایا نہیں۔ سادہ نمک۔ یہاں تک کہ سمندر کا پانی بھی اثر انداز ہوگا۔ فوری طور پر فوری طور پر......" اب وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ "نمک کا ایک بڑا چمچہ ایک گلاس پانی کے ساتھ پینے سے وبا کا اثر زائل ہوجائے گا۔"

رونڈی ویلیو پھر اس پر جھپٹا۔ مگر پلٹ نے اس کے گھٹنے میں گولی ماری وہ لڑکھڑا کر ڈیسک کی طرف پلٹا۔ اب وہ حلق پھاڑ پھاڑ کر مدد، مدد پکار رہا تھا۔ مورین ساکت کھڑی تھی۔ وہ بولی۔ "افسوس کہ میں آپ کو کوئی پیغام نہ بھیج سکی۔ یہاں سے نکل ہی نہیں سکتی تھی۔ انہوں نے مجھے یہاں قید کررکھا تھا۔ ہوٹل بھی نہیں جانے دیتے تھے۔ ایک لمحے کے لئے تنہا نہ چھوڑتے تھے۔ میں صرف یہی ایک کام کرسکتی تھی کہ کسی طرح اسے یقین دلا دوں کہ میں اس سے محبت کرتی ہوں تاکہ مجھے موقع ملے تو آپ کو اطلاع دوں...... میں...... میں نے اپنا فرض ادا کیا ہے...... ہے نا؟" اب وہ بری طرح کانپ رہی تھی۔ جیسے اسے تپ لرزہ ہوگیا ہو۔ "میں نے وقت ضائع نہیں کیا ڈاکٹر......! یہاں قید ہونا بھی کیسا ہولناک تھا اس درندے کے ساتھ رہنا اور پھر اس سے باخبر ہونا کہ وہ کیا کررہا ہے......؟ میری روح پر کیا کیا عذاب نازل نہ ہوئے۔ اس نے وعدہ کیا تھا کہ ایک انسان کی جان نہیں لی جائے گی مگر...... مگر...... ورنہ......!"

"حوصلہ رکھو مورین۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ بیٹھ جاؤ۔" ڈاکٹر پالفرے بولا۔ پھر وہ پلٹ سے مخاطب ہوا۔ "اپنے ریڈیو مکینک کو اوپر بلاؤ۔"

پلٹ باہر نکل گیا۔ لیکن اسی لمحے پلٹ آیا۔ اور ڈاکٹر سے مخاطب ہوا۔ "ہمارا ایک آفیسر آیا ہے۔ اس کی رپورٹ سنیئے۔" پھر وہ باہر نکل گیا۔ اور چھوٹے رینک کا ایک فوری افسر داخل ہوا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔

"ہم چچوئیشن کو کنٹرول میں لے چکے ہیں۔" تہہ خانے سے بھاری مقدار میں اسلحہ اور گولہ بارود برآمد ہوا ہے۔ مکمل پلانٹ ہمارے قبضے میں ہے...... اور کوئی خدمت جناب......؟"

اس دوران پلٹ واپس آچکا تھا۔ ڈاکٹر مسکرا رہا تھا۔ اور رونڈی ویلوز زیر لب گالیاں بک رہا تھا۔ اتنے میں ریڈیو مکینک وارد ہوا اور اس نے ڈاکٹر کی نگرانی میں نیویارک، سڈنی اور دنیا بھر کے دوسرے دارالحکومتوں کو پیغامات نشر کرنے شروع کردیئے۔

فوج نے پلانٹ کو محاصرے میں لے لیا تھا۔ دنیا بھر میں فوڈ پلانٹ کی خوراک کی فروخت روک دی گئی تھی۔ ڈومینی نے زہر کھا کر خودکشی کرلی تھی۔ مگر رونڈی ویلوز زندہ تھا۔ شاید اس کا دماغ چل گیا تھا۔ وہ مسلسل خود کلامی کے انداز میں نہ جانے کیا کیا بکتا رہا تھا۔

ایک گھنٹے بعد وبا کے شکار کروڑوں افراد صحت یاب ہوگئے۔ سادہ نمک اور سمندر کے نمکین پانی نے حیرت انگیز اثر دکھایا تھا۔ اس کے بعد وسیع پیمانے پر وبائی خوراک کی تباہی کا اہتمام کیا گیا۔

ڈاکٹر پالفرے آئی ایس ایس کے ہیڈ کوارٹر میں بیٹھا تھا۔ اور اس ہولناک مہم میں حصہ لینے والے کارکنوں نے اسے گھیرے میں لے رکھا تھا۔

"میٹ تم سوچ رہے ہوگے کہ میں نے تمہیں یہ کیوں نہ بتایا کہ مورین ہماری ایک اہم ایجنٹ ہے۔" ڈاکٹر میٹ سے مخاطب ہوا۔ "اس کی وجہ یہ تھی کہ اگر تم پکڑے گئے تو کہیں تم سے وہ سب کچھ اگلوا نہ لیں۔"

"خیر مجھے کوئی شکایت نہیں۔" میٹ نے کہا۔ "ایک بات اور بتائیں کیا آپ جانتے تھے کیتھلین اوشیا ہوٹل میں ہے؟"

"ہاں ہاں...... وہ بھی ہماری ایجنٹ ہے......" پالفرے نے کہا۔ "وہ اب اپنے گھر روانہ ہوچکی ہے۔"

